جامعۃ الاسلامیۃ تفہیم القرآن مردان

علوم القرآن

جلد دوم

مولانا گوہر رحمٰن

شیخ القرآن والحدیث
جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن
مردان

ناشر: مکتبہ تفہیم القرآن مردان

علوم القرآن

جلد دوم

مولانا گوہر رحمن
شیخ القرآن والحدیث
جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن
مردان

ناشر: مکتبہ تفہیم القرآن مردان

نام کتاب ———— علوم القرآن (جلد اول)

تعداد صفحات ———— 650

مصنف ———— مولانا گوہر رحمٰن

ناشر ———— مکتبہ تفہیم القرآن مردان

کمپوزنگ ———— اشتیاق حسین خاکسار

مطبع ———— میٹرو پرنٹرز

سرورق ———— محمد طاہر حجازی 042-7574180

تاریخ اشاعت ———— جنوری 2010ء

تعداد (بار سوم) ———— 1100

قیمت ———— 340 روپے

تاریخ اشاعت .... جون 2012ء

نمبر شمار	فہرست عنوانات (جلد دوم)	صفحہ نمبر
۱	باب ہفتم مضامین القرآن	۱۳
۲	ابن جریرؒ اور ابن عربیؒ کے نزدیک قرآن کے بنیادی مضامین تین ہیں	۱۵
۳	شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن کے بنیادی مضامین ۵ ہیں	۱۶
۴	قرآنی مضامین کی ایک اور طرح کی تقسیم	۱۸
۵	قرآن کا مرکزی مضمون توحید ہے	۲۰
۶	خالقیت	۲۵
۷	مالکیت	۲۶
۸	حاکمیت	۳۰
۹	قرآن کا طرز استدلال	۳۶
۱۰	قرآنی دلائل کی قسمیں	۳۸
۱۱	(الف) اصحاب الکہف	۶۲
۱۲	(ب) اصحاب الاخدود کے مظالم اور اصحاب التوحید کی استقامت	۶۵
۱۳	(ج) لقمان حکیم کی وصیت	۷۰
۱۴	(د) جنات کی شہادت	۷۰
۱۵	سواد بن قاربؓ کے اسلام لانے کا واقعہ	۸۳
۱۶	جنات کی حقیقت	۸۸
۱۷	جنات کے بارے میں فرقہ باطنیہ اور دور جدید کے متجددین کی تاویلات فاسدہ	۹۱
۱۸	ملائکہ کی حقیقت	۱۰۳
۱۹	ملائکہ کے بارے میں متجددین کے اقوال باطلہ	۱۰۵

باب ہفتم

مضامین قرآن

باب ہفتم

مضامین القرآن

قرآن کریم انسانوں کے لئے دستورِ حیات اور زندگی کا آئین ہے۔ اس کی تعلیمات و ہدایات اور احکام و مضامین ہمہ گیر بھی ہیں اور عالمگیر بھی ہیں اور پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایمانیات' عبادات' اخلاقیات' معاملات' معاشیات' تعزیرات' معاشرتی نظام' عائلی نظام' سیاسی و اجتماعی نظام' صلح و جنگ کا نظام' بین الاقوامی نظام اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں قرآن کریم نے اصول و احکام بتائے ہیں اور سمجھائے ہیں جن کی جزئیات و تفصیلات سنت رسول میں بیان ہوئی ہیں۔ جب قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ آج ہم نے تمہارے لئے تمہاری زندگی کا نظام مکمل کر لیا ہے تو اس اعلان کا لازمی اور حتمی تقاضیٰ یہ ہے کہ قرآن کے مضامین پوری انسانی زندگی پر محیط ہوں اور ہمہ گیر ہوں۔ جب قرآن کو تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان کی پوری زندگی اور اس کے ہر شعبے کے لئے اصول و احکام موجود ہیں ان احکام کو سمجھنے کے لئے سورتوں کے خلاصے کافی نہیں ہیں بلکہ فہم قرآن اور فہم دین کے لئے تحقیقی اور تفصیلی مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔ علوم کے اس وسیع و عریض سمندر کے بے بہا موتیوں کا شمار کرنا اور ان کی مکمل فہرست مرتب کرنا تو مشکل ہے لیکن قرآنی مضامین کو اگر جامع قسم کے عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا جائے تو یہ تقسیم افادیت سے خالی نہیں ہو گی بلکہ افادیت کی حامل ہو گی۔

ابن جریرؒ اور ابن عربیؒ کے نزدیک قرآن کے بنیادی مضامین تین ہیں

اس سلسلے میں بعض مفسرین نے بہت زیادہ ایجاز سے کام لیا ہے مثلاً ابن جریر طبریؒ متوفی ۳۱۰ھ اور قاضی ابن عربی متوفی ۵۴۴ھ دونوں کے نزدیک قرآن کے اساسی مضامین صرف تین ہیں۔ توحید' تذکیر اور احکام دونوں کے الفاظ میں تو فرق ہے مگر مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ابن جریر فرماتے ہیں :

يَشْتَمِلُ عَلَىٰ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ اَلتَّوْحِيْدُ وَالْاَخْبَارُ وَالدِّيَانَاتُ.

"قرآن تین قسم کے مضامین پر مشتمل ہے توحید' اخبار اور دینی احکام۔"

اور ابن عربی اپنی کتاب "قانون التاویل" میں لکھتے ہیں :

وَ اُمُّ عُلُوْمِ الْقُرْآنِ ثَلَاثَةُ اَقْسَامٍ تَوْحِيْدٌ وَ تَذْكِيْرٌ وَ اَحْكَامٌ.

"قرآنی علوم کی اساسی قسمیں تین ہیں۔ توحید' تذکیر اور احکام۔"(۱)

توحید تو قرآن کا مرکزی مضمون ہے اور اس کے مفہوم میں اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور حاکمیت کا اثبات اور غیر اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور حاکمیت کا انکار شامل ہے۔اس کے ثبوت کے لئے انفس و آفاق کا علم بھی توحید ہی کا علم ہے۔ابن جریر کے کلام میں اخبار اور ابن عربی کے کلام میں تذکیر کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی قصص و حکایات اور قرون ماضیہ کے حالات و واقعات عبرت و نصیحت اور یاد دہانی کے لئے قرآن میں بیان ہوئے ہیں البتہ تذکیر کے مفہوم میں ترغیب و ترہیب اور وعد و عید بھی شامل ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار ہوا ہے۔ اسی طرح ابن جریر کے کلام میں دیانات اور ابن عربی کے کلام میں احکام سے مراد بھی ایک ہی

(۱)البرهان فی علوم القرآن از زرکشی ص۱۷۔۱۸ج ۱

چیز ہے اس لئے کہ دیانات سے دینی احکام مراد ہیں خواہ اعتقادی ہوں یا عملی' خواہ اوامر ہوں یا نواہی ہوں' خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں' خواہ انفرادی زندگی سے متعلق احکام ہوں یا اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام ہوں۔ غرض یہ کہ اوامر و نواہی' مشروعات و غیر مشروعات اور اصول و فروع پر مشتمل پورا نظام لفظ "احکام و دیانات" کے عموم میں شامل ہے۔ یہ تقسیم غلط نہیں ہے لیکن اس میں بہت زیادہ کلیت اور جامعیت سے کام لیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک قرآن کے بنیادی مضامین ۵ ہیں

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کو علوم القرآن میں ملکہ تامہ اور مہارت راسخہ حاصل تھی اور ان کی زندگی قرآن و سنت کے علوم و معارف اور احکام و مسائل کے فہم اور تفہیم میں گزری تھی۔ انہوں نے اپنے وقت کی عصری اور سرکاری زبان فارسی میں "فتح الرحمان" کے نام سے قرآن کا ترجمہ اور حواشی لکھے تھے جو اہل علم میں متداول ہیں اور اصول تفسیر میں "الفوز الكبير فی اصول التفسير" کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ لکھا تھا یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا تھا جس کا عربی زبان میں علامہ محمد منیر دمشقی نے بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے جو دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس رسالے کے آغاز میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن کے معانی و مضامین پانچ قسموں سے خارج نہیں ہیں۔ ان کے بیان کردہ علوم خمسہ کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) علم الاحکام :

احکام سے مراد واجبات' مستحبات' محرمات اور مکروہات ہیں خواہ عبادات ہوں معاملات ہوں' تدبیر منزل سے متعلق ہوں (عائلی اور خاندانی امور) یا سیاست مدنیہ سے متعلق ہوں

(ملکی اور ملی سیاست) شاہ صاحب کی تقسیم کے اعتبار سے احکام میں اعتقادی احکام اور عملی احکام یعنی اصول و فروع دونوں شامل ہیں۔

(۲) علم المخاصمہ :

مخاصمہ سے مراد ہے فرق ضالہ اور مذاہب باطلہ کے عقائد کا رد کرنا اور ان کے اعتراضات کا جواب دینا تاکہ لوگوں کے سامنے حق اور باطل کا فرق واضح ہو جائے' ان کے لئے لاعلمی کا کوئی عذر باقی نہ رہے اور جن کی قسمت میں ہو وہ باطل سے توبہ کر کے حق کو قبول کر لیں۔

نزول قرآن کے وقت یہود' نصاری' مشرکین عرب اور منافقین کے ساتھ مقابلہ درپیش تھا اس لئے قرآن کریم میں ان کے اعتراضات والزامات کے جوابات دیئے گئے ہیں اور ان کی عادات ورسوم کا تعارف کرایا گیا ہے تاکہ مسلمان ان سے اجتناب کریں' قرآن نے مخاصمے اور مباحثے کا بڑا دل نشین اور معقول اسلوب اختیار کیا ہے جو ہر دور کے فرق ضالہ اور مذاہب باطلہ کے مقابلے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

(۳) علم التذکیر بآلاء اللہ :

آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کی قدرت اور وحدانیت کی جو نشانیاں اور اس کی جو نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں ان کا ذکر قرآن میں بار بار ہوا ہے اور اسالیب متنوعہ کے ساتھ ان کا تذکار اور تکرار ہوا ہے تاکہ انسان ان میں غور و فکر کر کے اللہ کی معرفت حاصل کرے' اس کی توحید پر ایمان لے آئے اور ان نعمتوں کو استعمال کر کے اس کا شکر ادا کرے۔

(۴) علم التذکیر بایام اللہ :

مؤمنین و مشرکین کے درمیان جو واقعات ایام ماضیہ میں پیش آئے تھے قرآن کریم میں ان کا تذکار و تکرار بڑی کثرت کی ساتھ ہوا ہے اس لئے کہ حق و باطل اور توحید و شرک کی

کشمکش اور مخاصمت کے تاریخی واقعات و حکایات ہر دور میں دعوت دین کے کارکنوں کے لئے عبرت انگیز' سبق آموز اور مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۵) علم التذکیر بالموت ومابعدہ :

موت' بعث بعد الموت' حشر نشر' حساب' میزان' جنت' دوزخ اور آخرت سے متعلق مباحث و مضامین بھی قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں جنت کا شوق اور دوزخ کا خوف پیدا ہو جائے اور ان کے اندر آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب آجائے۔ شاہ صاحب ان علوم خمسہ کی حکمت اور ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"حقیقت میں قرآن کے نزول کا مقصد اصلی تین چیزیں ہیں۔ تہذیب و تزکیہ نفوس' عقائد باطلہ کی تردید اور اعمال فاسدہ کا ازالہ۔ تو عقائد باطلہ کا وجود آیات المخاصمہ کے نزول کا سبب ہے اور لوگوں کے اندر غفلت کا وجود اور تَیَقُّظ و تَنَبُّہ کا فقدان تذکیرات ثلاثہ سے متعلق آیات کے نزول کا سبب ہے۔(۱)

قرآنی مضامین کی ایک اور طرح کی تقسیم

حضرت شاہ صاحب کی تقسیم میں بڑی جامعیت ہے لیکن میرے ذہن میں ایک اور طرح کی تقسیم آئی ہے جس کا ذکر بھی شاید افادیت سے خالی نہ ہو گا۔

(۱) عقائد :

اس میں عقائد حقہ کا اثبات اور عقائد باطلہ کا ابطال دونوں شامل ہیں۔ صحیح عقیدے اور فکر کی صحیح تعمیر کے بغیر سیرت کی تعمیر نہیں ہو سکتی اور اعمال قبول ہی نہیں ہوتے۔ قرآن میں عقیدے کو درخت کی جڑوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اعمال واخلاق کو درخت کی

---

(۱) الفوز الکبیر فی اوائل الباب الاول مع تلخیص و تشریح

شاخوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں تعمیر افکار اور اصلاح عقائد کو ہمیشہ تقدم و فوقیت حاصل رہی ہے۔ قرآن کریم میں ۸۰۰ سے زائد آیات میں ایمان کا ذکر ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا اہم ترین مضمون عقائد ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں ۵ عقائد کا ذکر ہوا ہے جو یہ ہیں:

(۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالیوم الآخر (۳) ایمان بالملائکہ

(۴) ایمان بالکتب (۵) اور ایمان بالنبیین

اور بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث جبریل میں ان ۵ پر ایمان بالتقدیر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ وہ بنیادی عقائد ہیں جن پر ایمان کی عمارت قائم ہے اور ان کی جزئیات اور تفصیلات قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی ہیں۔

(۲) احکام و قوانین:

زندگی کے مختلف شعبوں اور دین کے مختلف ابواب سے تعلق رکھنے والے عملی احکام و قوانین قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں قرآن کو تبیانا لکل شیء اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں تمام ضروری احکام موجود ہیں جن کی جزئیات و تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یا قیاس و اجتہاد کے ذریعے قرآن و حدیث سے مستنبط کر کے فقہ میں مدون کی گئی ہیں۔

(۳) آیات اللہ:

آیت کے لفظ کا اطلاق معجزے پر بھی ہوتا ہے' قرآن کی آیت پر بھی ہوتا ہے اور احکام پر بھی ہوتا ہے لیکن اس جگہ آیات کو یہ مراد ہیں یعنی انفس و آفاق' بحر و بر اور ارض و سماء میں پھیلی ہوئی اشیاء۔ جن کا ذکر قرآن میں بار بار ہوا ہے تاکہ لوگ ان میں غور و فکر اور تدبر کے ذریعے اپنے رب کی معرفت بھی حاصل کریں اور ان سے اپنی دنیوی زندگی کی سہولتیں بھی حاصل کر سکیں۔

(۴) ایام اللہ :

انبیاء علیہم السلام اور دعاۃ الاسلام کے جو واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں یہی ایام اللہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں دلائل نقلیہ کے طور پر ہوا ہے اور جو دعاۃ الاسلام کے لئے مشعل راہ بھی ہیں۔

(۵) امثال :

قرآن میں تعلیم و تفہیم کے لئے عام فہم قسم کی مثالیں بھی بیان ہوئی ہیں تاکہ ایک معنوی چیز محسوس چیز کی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ مثال و تمثیل فہم و تفہیم کا موثر ترین ذریعہ ہے بشرطیکہ مخاطب عبد منیب ہو عبد عنید نہ ہو مثال پر اعتراض کرنے والوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا یعنی مثال کے ذریعے معاندین کی ضلالت میں اضافہ ہوتا ہے اور مومنین کی ہدایت میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن کا مرکزی مضمون توحید ہے

قرآن کریم کے علوم و معارف اور مباحث و مضامین کا منبع و سرچشمہ توحید ہے اور باقی ساری چیزیں شجرہ توحید کے اغصان ہیں۔ انس و جن کی تخلیق کا مقصد بھی توحید ہے ارسال رسل اور انزال کتب کی غرض و غایت بھی توحید ہے اور حیوۃ طیبہ کے حصول کا وسیلہ بھی توحید ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ اَلْقُرْآنُ كُلُّهٗ فِي التَّوْحِيْدِ یعنی سارا قرآن توحید پر بحث کرتا ہے تو یہ بات حقیقت کے مطابق ہو گی۔ توحید کے لغوی معنی ہیں یکتا و تنہا جاننا اور ماننا اور اس کے شرعی معنے ہیں "اللہ کو اس کی ذات اور صفات میں یکتا و تنہا اور لا مثال و لا شریک ماننا اور مخلوق میں سے کسی کو اس کی ذات و صفات اور الوہیت و معبودیت میں شریک نہ ٹھہرانا۔"

توحید کی بنیادی قسمیں تین ہیں۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی

الالوہیت۔ ان اقسام ثلاثہ کی مختصر سی تشریح پیش کی جارہی ہے تاکہ قرآن کے طالب علموں کو قرآن کے مرکزی مضمون کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جائیں۔

(۱) توحید فی الذات :

اس کا سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اللہ کا وجود ازلی اور ابدی ہے' وہ ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا اور اس کی ذات کے علاوہ کوئی بھی ازلی و ابدی نہیں ہے بلکہ پورے کا پورا عالم عدم سے وجود میں آیا ہے اور وجود کے بعد پھر معدوم اور فنا ہو جائے گا۔ صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ :

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهٗ'.(۱)

"اللہ موجود تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں تھی۔"

بخاری کتاب التوحید کے الفاظ یہ ہیں کہ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهٗ' یعنی اللہ موجود تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔ اور بخاری کے علاوہ دوسری روایات کے الفاظ اس طرح آئے ہیں کہ :

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ مَعَهٗ'.

"اللہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز موجود نہیں تھی۔"(۲)

سورۃ الحدید کی آیت ۲ میں اللہ کی ازلیت و ابدیت کا ذکر هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کے الفاظ میں ہوا ہے جس کی تفسیر صحیح مسلم میں خود رسول اللہ ﷺ سے اس طرح منقول ہے کہ :

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَ اَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ.(۳)

"یا اللہ تو سب سے اول ہے پس تجھ سے پہلے کوئی چیز موجود نہیں تھی اور تو سب سے

---

(۱) صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب اول

(۲) فتح الباری کتاب بدء الخلق باب اول ص۹۸ ج۷

(۳) صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء باب ما یقول عند النوم

آخر ہے پس تجھ سے بعد کوئی چیز موجود نہیں ہوگی۔"

انہی دلائل کی بنیاد پر امام طحاوی متوفی ۳۲۱ھ عقیدہ طحاویہ میں لکھتے ہیں :

قَدِيْمٌ بِلَا اِبْتِدَاءٍ دَائِمٌ بِلَا اِنْتِهَاءٍ لَا يَفْنٰى وَلَا يَبِيْدُ.

"قدیم ہے جس کے وجود کی ابتداء نہیں ہے ہمیشہ رہے گا جس کے وجود کی انتہا نہیں ہے اس پر فنا اور زوال نہیں آتا۔"

(۲) توحید فی الصفات :

اس کا مفہوم یہ ہے کہ :

"اللہ تعالیٰ تمام صفات الوہیت اور کمالات حقیقیہ سے متصف ہے اور ان صفات میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔"

قرآن وسنت سے اس کے جتنے نام ثابت ہیں وہ سب اچھے نام ہیں اور ان میں سے ہر نام ایک صفت پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ متصف ہے۔ ان اسماء و صفات کی نفی کرنا تعطیل ہے یعنی اللہ کی ذات کو صفات سے عاری قرار دینا ہے اور ضلالت ہے اور ان صفات کو مخلوق کی صفات کے ساتھ مشابہ قرار دینا تشبیہ ہے اور ضلالت ہے اور الوہیت کی ان صفات میں کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانا "شرک فی الصفات" ہے۔ مگر اللہ کو ان ناموں سے یاد کرنا اور ان صفات سے متصف سمجھنا جن کا ثبوت قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے "الحاد فی الاسماء" میں شامل ہے اور حرام ہے۔ البتہ اللہ کے اسماء و صفات کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا جاسکتا ہے اور توحید فی الصفات کے فہم و تفہیم کے لئے یہ ترجمہ ضروری بھی ہے۔ ایمان باللہ کے مفہوم میں ایمان بالصفات شامل ہے۔ جو شخص اللہ کے وجود کو مانتا ہو مگر اس کی صفات کو نہ مانتا ہو وہ مؤمن نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح قرآن کریم سے اللہ کی ذات کا وجود ثابت ہے اسی طرح اس کی صفات کا وجود بھی قرآن وسنت سے ثابت ہے اور ان سے انکار کرنا قرآن کی نصوص سے انکار کرنا ہے جو ایمان کے منافی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں کہ :

وَ مِنَ الْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ اَلْاِیْمَانُ بِمَا وَصَفَ بِہٖ نَفْسَہٗ فِیْ کِتَابِہٖ وَ وَصَفَ بِہٖ رَسُوْلُہٗ مُحَمَّدٌ ﷺ مِنْ غَیْرِ تَحْرِیْفٍ وَلَا تَعْطِیْلٍ وَ مِنْ غَیْرِ تَکْیِیْفٍ وَّ لَا تَمْثِیْلٍ.(۱)

''اللہ پر ایمان میں ان صفات پر ایمان لانا بھی شامل ہے جن سے اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے نفس کو متصف قرار دیا ہے یا ان سے اس کے رسول محمد ﷺ نے اسے متصف قرار دیا ہے بغیر اس کے کہ ان کے معانی کو تبدیل کیا جائے یا اللہ کی ذات کو ان صفات سے عاری اور معطل سمجھ لیا جائے اور بغیر اس کے کہ ان کی کیفیت اور نوعیت و ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے یا مخلوق کی صفات کے ساتھ ان کی تشبیہ و تمثیل مان لی جائے۔''

ابن تیمیہؒ اپنے دوسرے رسالہ ''تدمریہ'' میں لکھتے ہیں :

وَ قَدْ عُلِمَ اَنَّ طَرِیْقَۃَ سَلَفِ الْاُمَّۃِ وَ اَئِمَّتِھَا اِثْبَاتُ مَا اَثْبَتَہٗ مِنَ الصِّفَاتِ مِنْ غَیْرِ تَکْیِیْفٍ وَّ لَا تَمْثِیْلٍ وَ مِنْ غَیْرِ تَحْرِیْفٍ وَّ لَا تَعْطِیْلٍ.(۲)

''یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ امت کے سلف (صحابہ و تابعین) اور امت کے ائمہ کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لئے جن صفات کا اثبات کیا ہے ان کو تسلیم کیا جائے بغیر کیفیت بتانے کے' بغیر تمثیل و تشبیہ کے' بغیر معانی بدلنے کے اور بغیر اس کے کہ اللہ کی ذات کو اس کی صفات سے عاری اور معطل قرار دیا جائے۔''

بخاری و مسلم ترمذی' نسائی اور دوسری کتابوں میں ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث مرفوع میں آیا ہے کہ حلال و طیب مال اللہ تعالیٰ اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے۔ اَخَذَھَا الرَّحْمٰنُ بِیَمِیْنِہٖ اس کی تشریح میں امام ترمذی لکھتے ہیں :

''متعدد اہل علم نے اس حدیث کے بارے میں اور صفات سے متعلق اس طرح کی

(۱) العقیدۃ الواسطیہ بشرحھا طبع جمعیت احیاء التراث الاسلامی ۱۹۹۹ء ص ۱۳

(۲) التدمریہ طبع اول ۱۹۸۵ء ص ۷

دوسری روایات مثلاً قریبی آسمان پر اللہ کے نزول کے بارے میں کہا ہے کہ ان پر بغیر کسی وہم کے ایمان لایا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ صفات کیسی ہیں؟ امام مالکؒ، سفیان بن عیینہؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ ان احادیث پر کیفیت اور نوعیت کے بیان کے بغیر اسی طرح گزر جانا چاہئے۔ اہل سنت والجماعۃ کے اہل علم کا قول یہی ہے مگر جہمیہ نے اس قسم کی روایات سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تو اللہ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا ہے حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ ہاتھ، سننے، دیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ جہمیہ نے ان کی تاویل اہل علم کی تفسیر کے خلاف کی ہے اور کہا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا اور انہوں نے ید سے قوت مراد لی ہے۔

اسحٰق بن راھویہؒ فرماتے ہیں کہ:

"تشبیہ تو اس وقت لازم آتی جب کہا جاتا کہ اللہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کی طرح ہے اور اللہ کا سننا ہمارے سننے کی طرح ہے لیکن جب کہا جائے کہ اللہ کے لئے ید، سمع، بصر تو ہے مگر ہمارے ید، سمع اور بصر کی طرح نہیں ہے اور یہ نہ کہا جائے کہ کیسے ہے؟ تو یہ تشبیہ نہیں ہے بلکہ ایسا کہنا اس آیت کے مطابق کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (حم الشوریٰ ۱۱) کہ کوئی چیز بھی اس کی مثال نہیں ہے لیکن وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"(۱)

اہل سنت والجماعۃ کے اسی عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام طحاویؒ لکھتے ہیں:

وَ مَنْ لَّمْ يَتَوَقَّ النَّفْيَ وَالتَّشْبِيهَ زَلَّ وَلَمْ يُصِبِ التَّنْزِيهَ.(۲)

"جو شخص صفات کی نفی اور تشبیہ سے احتراز نہیں کرتا وہ پھسل جاتا ہے اور توحید و تنزیہ کی حقیقت کو پا نہیں سکتا۔"

یعنی اللہ کی صفات سے انکار بھی توحید کے منافی ہے اور ان کو مخلوق کی صفات کے

---

(۱) سنن ترمذی کتاب الزکوۃ باب ما جاء فی فضل الصدقۃ

(۲) العقیدۃ الطحاویہ مع شرحہ ص ۱۹۵

ساتھ تشبیہ دینا بھی توحید کے منافی ہے۔ معتزلہ اور جہمیہ انکار صفات کو توحید سمجھتے ہیں اور بعض غالی صوفیاء وحدۃ الوجود کو توحید کا نام دیتے ہیں۔

امام بخاریؒ نے "الجامع الصحیح" کی کتاب التوحید کے ابواب میں ان دونوں کی تردید کی ہے اور آیات واحادیث سے ثابت کیا ہے کہ توحید یہ ہے کہ اللہ کی تمام صفات کو تسلیم کیا جائے اور ان میں کسی کو اس کا شریک و شبیہ نہ ٹھہرایا جائے۔ توحید فی الصفات کو مثالوں کے ذریعے ذہن نشین کرانے کے لئے تین صفات کا بطور نمونہ ذکر کرنا مفید رہے گا۔

خالقیت

اہل لغت نے لکھا ہے کہ خلق کے دو معنے ہیں۔ ایک تقدیر اور دوسرا ابداع۔ تقدیر کے معنے ہیں چیزوں کا اندازہ لگانا اور مقادیر متعین کرنا اور ابداع کے معنے ہیں چیزوں کو عدم سے وجود میں لانا اور بغیر کسی مثال اور نمونے کے پیدا کرنا۔ خلق کے دونوں معنوں کے اعتبار سے کائنات کا خالق اللہ ہے یعنی چیزوں کی نوعیت اور کمیت کا تعین بھی وہی کرتا ہے اور ان کو عدم سے وجود میں لانے والا بھی وہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (الانعام ۷۳)

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔"

یعنی ہر چیز کی پیدائش اور پورے عالم کا نظام حکمت پر مبنی ہے کوئی کھیل تماشا نہیں ہے اور وہ حکمت تخلیق یہ ہے کہ اس تکوینی و تخلیقی نظام سے اس کی توحید کا علم حاصل کیا جائے اور اس کی الوہیت کی معرفت حاصل کی جائے۔ اس لئے کہ ؎

وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

"ہر چیز میں اس کی ایک نشانی ہے + جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔"

اور ؎ ہر گیاہے کہ از زمین روید وحدہ لاشریک لہ گوید

اور ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا تیری ذات　　حق یہ ہے کہ ہے تابندہ وپائندہ تیری ذات

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ. (الانعام ۱۰۱)

"اور اسی نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہی ہر چیز کو جاننے والا ہے۔"

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ (الانعام ۱۰۲)

"وہی ہے ہر چیز کا پیدا کرنے والا پس اسی کی عبادت کرو۔"

عالم عُلوِی 'عالم جوی 'عالم سِفلی 'بر و بحر اور ان میں موجود اجناس وانواع اور اصناف واجزاء پر مشتمل یہ عظیم کائنات کسی اندھے بہرے نیچر اور قانون فطرت کی تخلیق نہیں ہے اور اسے کسی فرشتے 'نبی 'ولی اور بزرگ نے بھی پیدا نہیں کیا بلکہ یہ تو خود اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی تخلیق و تقویم میں اس کے ساتھ کوئی شریک اور حصہ دار بھی نہیں ہے بلکہ وہ اس کائنات کو بنانے اور چلانے میں یکتا و تنہا ہے۔

﴿مالکیت﴾

ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ نے لکھا ہے کہ مِلک 'مُلک اور مَلک یعنی میم کی زبر 'پیش اور زیر کے ساتھ تینوں کے معنے ہیں :

اِحْتِوَاءُ الشَّيْءِ وَ الْقُدْرَةُ عَلَى الْاِسْتِبْدَادِ بِهٖ.(۱)

"کسی چیز پر قابو پانا 'اسے قبضے میں رکھنا اور بلا شرکت غیر تصرف کی قدرت رکھنا۔"

اسی مادے سے مَلِك اور مَلِيْك کا لفظ بنا ہے جس کی جمع مُلُوک آتی ہے اور اسی مادے سے مالک کا لفظ بنا ہے جس کی جمع مُلّاك آتی ہے۔ مَلِك مَلِيْك اور مَالِك تینوں کے معنے ہیں ذُو الْمُلْكِ یعنی تصرف کرنے والا اور اختیارات رکھنے والا۔ اللہ کی ذات مالک بھی ہے اور مَلِک بھی ہے۔ یعنی ہر چیز اسی کے قبضے میں ہے اور ہر چیز پر اختیارات بھی اسی کے چلتے ہیں اور اس کی مالکیت اور مُلوکیت میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

(۱) لسان العرب باب الکاف فصل المیم ج ۱۰ ص ۴۹۲

ظاہر ہے کہ جو خالق ہو وہی مالک اور مُلک ہوتا ہے جب پیدا کرنے والا اور عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے دوسرا کوئی نہیں ہے تو مختار کل متصرف کارساز، مشکل کشا، فریادرس اور حاجت روا بھی وہی ہے اور کوئی نہیں ہے۔ موت و حیوۃ، عزت و ذلت اور نفع و ضرر سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (آل عمران ۱۸۹)

"اور اللہ ہی کے پاس ہے اختیار آسمانوں اور زمین کا۔"

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ. (التوبہ ۱۱۶)

"بے شک اللہ ہی کے پاس ہے اختیار آسمانوں اور زمین کا، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔"

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ. (المؤمنون ۱۱۶)

"پس نہایت ہی بلند ہے شان اللہ کی جو حقیقی بادشاہ ہے۔"

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ. (الفرقان)

"اور نہیں ہے اس کا کوئی شریک اختیارات میں۔"

بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ. (یٰس ۸۳)

"اسی کے ہاتھ میں ہے اختیار ہر چیز کا۔"

ان آیات اور اس مفہوم کی دوسری آیات میں حصر و قصر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مختار کل صرف اللہ رب العالمین کی ذات ہے۔ ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور تمام جن و انس کے افعال و تصرفات ماتحت الاسباب ہیں اور محدود ہیں مگر اللہ تعالی کے اختیارات و تصرفات مافوق الاسباب ہیں اور غیر محدود ہیں۔ البتہ اللہ جب چاہے کسی نبی یا کسی ولی کے ہاتھ پر ایسے کام کر والیتا ہے اور وہ چیزیں ظاہر کر دیتا ہے جو مافوق الاسباب اور ماورائے طبیعت ہوں اگر نبی سے ظاہر ہوتی ہوں تو ان کو آیات اللہ یعنی اللہ کی قدرت کی نشانیاں اور معجزات کہا جاتا ہے اور اگر

کسی ولی اللہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوئی ہوں تو ان کو اصطلاحاً کرامات کہا جاتا ہے۔ لیکن اِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَاللّٰہِ معجزات اور خوارق العادات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ غیر اختیاری چیز کے ظہور پر کسی کو مختار کل تو نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حکم دیا ہے کہ:

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ. (اعراف ۱۸۸)

کہدو کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر اللہ جو چاہے وہی ہوتا ہے۔"

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا. (الجن ۲۱)

"کہدو کہ میں تم لوگوں کے لئے نہ کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی فائدے کا۔"

نَفْعًا' ضَرًّا اور رَشَدًا تینوں نکرہ کے صیغے ہیں اور نکرہ پر جب حرف نفی داخل ہو جائے تو وہ عموم و شمول اور سلب کلی کے لئے آتا ہے یعنی میں کسی قسم کے نفع و ضرر کے اختیارات نہیں رکھتا نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے۔ نہ زندگی دے سکتا ہوں اور نہ موت' نہ اولاد دے سکتا ہوں اور نہ اولاد لے سکتا ہوں' نہ عزت اور بادشاہی دے سکتا ہوں اور نہ عزت و بادشاہی لے سکتا ہوں' نہ بارش برسا سکتا ہوں اور نہ فصل اور درخت اگا سکتا ہوں' نہ صحت دے سکتا ہوں اور نہ صحت لے سکتا ہوں' نہ رزق دے سکتا ہوں اور نہ رزق لے سکتا ہوں۔ غرض یہ کہ میں اگرچہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں لیکن ہر چیز میں خود اللہ کی رحمت کا محتاج ہوں' میں غلام ہوں اللہ میرا مالک ہے' میں عبد ہوں اللہ میرا معبود ہے میں فقیر ہوں اور اللہ غنی ہے۔ لیکن اس نفع و ضرر سے غیبی اور تکوینی قوت کے ذریعے بغیر اسباب کے نفع و ضرر پہنچانا مراد ہے کہ جب چاہے' جہاں چاہے اور جس کو چاہے نفع پہنچادے یا ضرر پہنچادے اس لئے کہ تکوینی اور کن فیکونی قوت اللہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ باقی رہا ماتحت الاسباب نفع پہنچانا تو اس لحاظ سے محمد رسول اللہ ﷺ محسن انسانیت تھے۔ آپ کی دعوت و

تعلیم اور آپ کی سیرت طیبہ کے ذریعے لوگوں کو ایمان کی روشنی ملی ہے اور وہ شرک و کفر اور جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر توحید اور اسلام کی روشنی میں داخل ہوئے ہیں جس سے بڑا نفع اور احسان اور کیا ہو سکتا ہے؟

اسی طرح اللہ تعالی نے آپ کے ہاتھ پر معجزات اور خوارق العادات بھی ظاہر فرمائے ہیں جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا (بنی اسرائیل ۵۶)

"کہدو کہ پکارو جن کو تم کارساز سمجھتے ہو سوائے اللہ کے یہ تو اختیار نہیں رکھتے تم سے مصیبت ہٹانے کا اور نہ بدلنے کا۔"

اس آیت کی تفسیر میں ابن جریر نے تین سندوں کے ساتھ عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام اور فرشتوں کی جانب اشارہ ہے کہ تم ان کو پکارتے ہو مگر وہ تم سے مصیبت دور کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔(۱)

امام رازی فرماتے ہیں کہ:

"جن کی یہ لوگ پرستش کرتے تھے وہ فرشتے، جن، مسیح اور عزیر تھے اور یہ سب نہ تکلیف اٹھا سکتے تھے اور نہ نفع پہنچا سکتے تھے۔"(۲)

تفسیر قرطبی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری اور تفسیر روح المعانی میں بھی اسی طرح کہا گیا ہے کہ یہاں پر جن، فرشتے، انبیاء اور اولیاء مراد ہیں جو نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور ان میں سے کوئی بھی مختار کل نہیں ہے۔(۳)

(۱) تفسیر ابن جریر سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۶

(۲) تفسیر کبیر سورۃ بنی اسرائیل ۵۶

(۳) ملاحظہ کیجئے ان تفاسیر میں سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۶

حاکمیت

لفظ حاکم کا ماخذ حکم ہے اور حکم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "حکم تکوینی" یعنی تصرف کرنا' غیبی اور کن فیکونی قوت کے ذریعے کائنات کا نظام چلانا' کسی کو پیدا کرنا اور کسی کو صفحہ ہستی سے مٹادینا' کسی کو اٹھانا اور کسی کو گرانا۔ حکم کی اس قسم سے سرتابی اور سرکشی کوئی بھی نہیں کر سکتا اور کائنات کی ہر چیز اس کے حکم کے تحت مسخر ہے اور اسی تسخیر کائنات کا نام حکم تکوینی ہے۔

حکم کی دوسری قسم ہے حلال و حرام' جائز و ناجائز اور فرائض و واجبات کے بارے میں فرمان اور فیصلہ یعنی زندگی گزارنے کا طرز و طریقہ اور نظام بتانا۔ اس حکم کو حکم تشریعی یا حکم شرعی کہا جاتا ہے جس کو منوانے اور جس پر عمل کروانے کے لئے اللہ تعالی جبر و اکراہ نہیں کرتا البتہ احکام کے پہنچانے اور سمجھانے کے لئے اس نے انبیاء و رسل بھیجے تھے' صحف و کتب نازل کی تھیں اور ختم نبوت کے بعد تبلیغ دین اور تفہیم دین کا کام وارثان انبیاء یعنی علماء دین کے سپرد ہے جو تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور وقت موعود تک جاری رہے گا۔ انشاء اللہ۔ جو لوگ اپنی خوشی سے اخلاص کے ساتھ ان احکام کو مان لیں گے اور ان پر عمل کریں گے وہ دنیا و آخرت کی فلاح و صلاح حاصل کر لیں گے اور جو لوگ جان بوجھ کر ان احکام سے سرتابی اور سرکشی کریں گے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے کا سامنا کریں گے۔ حق اور باطل واضح ہو چکا ہے اور حق معلوم کرنے کے وسائل فراہم کر دیئے گئے ہیں پس جو چاہے اپنے لئے فلاح کا راستہ اختیار کرلے اور جو چاہے خسارے اور تباہی کا راستہ اختیار کرلے۔ سیاسی اصطلاح میں حاکمیت سے مراد ہے اقتدار اعلی اور اقتدار مطلق حاکم اعلی اور مقتدر اعلی وہ ہوتا ہے جس کی پسند اور مرضی سرچشمہ قانون ہو اور جس کا حکم اور فیصلہ سب پر بالادست ہو۔ عقیدہ توحید کے مطابق جس طرح خالقیت اور مالکیت میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح حاکمیت اور اقتدار اعلی میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور سپریم وبرتر ین

قانون اس کی وحی ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ جس طرح کہ غیر اللہ کو مختار کل اور تکوینی قوت کا حامل سمجھنا شرک ہے اسی طرح غیر اللہ کو تشریعی حاکمیت کا مقام دینا یعنی قرآن و سنت سے آزاد قانون سازی کا حق دینا بھی شرک ہے ' جس طرح کہ غیر اللہ کی تعظیم کے لئے سجدہ کرنا اس کے لئے نذر ماننا اور اسے غیبی مدد کے لئے پکارنا شرک ہے اسی طرح شرعی قانون کے مقابلے میں انسان کا وضعی قانون ماننا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا بھی شرک ہے اور جاہلیت ہے۔

اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ.

(المائدہ ۵۰)

"کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (شرعی قانون کی بجائے وضعی قانون پر فیصلہ) حالانکہ وہ کون ہے جس کا فیصلہ اللہ کے فیصلے سے زیادہ خوبصورت اور بہتر ہو ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔"

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا

(الانعام ۱۱٤)

"تو کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا حاکم تلاش کروں حالانکہ اسی نے اتاری ہے تم پر مفصل کتاب۔"

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ.

(البقرہ ۲۱۳)

"اور اتاری تھیں اس نے اپنے انبیاء کے ساتھ کتابیں حق کے ساتھ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے ان باتوں کا جن میں انہوں نے اختلاف کیا ہو۔"

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَائِنِيْنَ خَصِيْمًا. (النساء ۱۰۵)

"ہم نے اتاری ہے تیرے پاس کتاب حق کے ساتھ تاکہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان ان احکام کے مطابق جو اللہ نے تم کو بتائے ہیں اور نہ بن خیانت کرنے والوں کا وکیل۔"

سورۃ مائدہ کی آیت ۴۴ میں ارشاد خداوندی ہے کہ ہم نے تورات نازل کی تھی جس کے مطابق انبیاء اور خدا پرست مشائخ و علماء فیصلے کرتے تھے اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

آیت ۴۵ میں قصاص کا حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں اور آیت ۴۷ میں فرمایا گیا ہے کہ انجیل والے بھی اللہ کی نازل کردہ کتاب پر فیصلے کیا کریں اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر فیصلے نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اس کے بعد آیت ۴۸ میں محمد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ

"اور اتاری ہے ہم نے تیرے پاس کتاب حق کے ساتھ جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور وہ ان کتابوں کی محافظ ہے پس تم فیصلے کرتے رہو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق جو اللہ نے نازل کی ہے اور ان کی خواہشات پر نہ چلو اس حق کو چھوڑ کر جو تیرے پاس آچکا ہے۔"

ان آیات اور اس مضمون کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے ذی عقل بندوں کے درمیان تنازعات کے تصفیئے اور فیصلے کے لئے کتابیں نازل کی تھیں جن کے مضامین کا محافظ قرآن مجید ہے جو آخری نبی پر سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اور اب قیامت تک سپریم لاء اور برترین قانون یہی کتاب ہے اور اس کی شرح سنت رسول ہے اس لئے جو

لوگ قرآن و سنت کے خلاف وضع کردہ قوانین پر فیصلہ کرتے ہیں وہ شرک فی الحکم کا ارتکاب کرتے ہیں اور قرآن کے مرکزی مضمون توحید سے انحراف کر رہے ہیں اور جاہلیت کے راستے پر گامزن ہیں۔

(۳) توحید فی الالوھیت:

توحید کی تیسری قسم ہے "اللہ کو الہ واحد اور معبود بر حق ماننا' اسی کی عبادت کرنا اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرانا۔"

جب اللہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا و تنہا اور لا مثال ہے تو وہ اپنی الوہیت اور معبودیت میں بھی یکتا و تنہا اور لا مثال ہے۔

جوہری کی صحاح اور افریقی کی لسان العرب میں ہے کہ:

اِلٰه عَلٰی وَزْنِ فِعَال بِمَعْنٰی مَفْعُوْل لِاَنَّه' مَاْلُوْہٌ اَیْ مَعْبُوْدٌ.

"الہ کا وزن فعال ہے مفعول کے معنوں میں اس لئے کہ الہ مالوہ یعنی معبود کے معنوں میں ہے۔

لغت اور تفسیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ اسے کہا جاتا ہے جو مافوق الاسباب اور ماوراء طبیعت قوۃ کا مالک ہو اور اپنے تصرفات و اختیارات میں اسباب کا محتاج نہ ہو بلکہ اسباب اپنی تاثیر میں اس کے حکم کے محتاج ہوں۔ ابن منظور افریقی نے ابوالہیثم کا قول نقل کیا ہے کہ:

"الہ وہی ہو سکتا ہے جو معبود ہو اور جو اپنے عابد کا خالق' رازق' مدبر اور مقتدر اعلیٰ ہو جو یہ صفات نہ رکھتا ہو وہ الہ نہیں ہو سکتا۔"(۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید ابن القیم دونوں نے لکھا ہے کہ:

"الہ وہی ہوتا ہے جس کی طرف لوگ حوائج و حوادث کے وقت محبت و تعظیم' خوف و

---

(۱) لسان العرب مادہ الہ ص۶۸ ج۱۳

رجاء اور عاجزی کے ساتھ رجوع کرتے ہوں۔"(۱)

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں :

"اللہ کو الہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنی حاجات و مشکلات کے وقت اس کے دربار میں فریاد و زاری کرتے ہیں۔"(۲)

چونکہ عبادت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو غیبی اور کن فیکونی طاقت کا مالک ہو اس لئے الہ کے معنے ہیں معبود یعنی وہ ذات جس کی عبادت کی جاتی ہو اور جو عبادت کی مستحق ہو۔ عبادت کے لغوی معنے تو ہیں غایۃ الخضوع والتذلل یعنی انتہائی درجے کی عاجزی اور فروتنی اس بنیادی معنی کی مناسبت سے عبادت کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(۱) غلامی (۲) پرستش (۳) اطاعت و بندگی

اللہ کو مالک حقیقی اور اپنے آپ کو اس کا بندہ اور غلام سمجھ کر اس کی تعظیم کے لئے رکوع و سجود کرنا بھی عبادت ہے' اس کے لئے نذر و نیاز اور قربانی دینا بھی عبادت ہے' اس کے کلام کی تلاوت کرنا اور اس کے اسماء حسنیٰ کا ذکر کرنا بھی عبادت ہے' اسے غیبی مدد کے لئے پکارنا بھی عبادت ہے اور اسی کو حاکم اور مقتدر اعلیٰ جاننے اور ماننے کی بنا پر اس کے احکام کی غیر مشروط اطاعت کرنا بھی عبادت ہے۔

ائمہ لغت نے العبادۃ کے معنے الطاعۃ بھی ذکر کئے ہیں یعنی حکم ماننا اور اطاعت کرنا۔(۳)

سورہ مؤمنون میں فرعون اور اس کے اتباع کا قول نقل ہوا ہے کہ :

"کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں (موسیٰ و ہارون) کی بات مان لیں؟ حالانکہ ان کی قوم تو ہماری عبادت کرتی ہے۔"

---

(۱) العبودیہ لابن تیمیہ اور التفسیر لابن القیم

(۲) تفسیر قرطبی سورۃ فاتحہ لفظ اللہ

(۳) ملاحظہ کیجئے الصحاح للجوہری مادہ عبد ص۵۰۳ ج۲۔ لسان العرب للافریقی ص۲۷۲ ج۴ مادہ عبد۔ تاج العروس شرح قاموس للزبیدی مادہ عبد ص۳۳۰ ج۸

وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے ابن جریر طبری فرماتے ہیں :

"ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ یعنی بنی اسرائیل ہماری اطاعت کرتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں کمزور ہیں' ہمارے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور ہمارے تابع فرمان ہیں۔ عرب کسی بادشاہ کا حکم ماننے والے کو اس کا عابد کہتے ہیں۔"(۱)

سورہ یٰسین کی آیت ۶۰ میں اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ کی تفسیر کرتے ہوئے امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں کہ :

"یعنی شیطان کی اطاعت نہ کرو اس لئے کہ شیطان کو سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کے حکم کی تابعداری کرنا اور اس کی اطاعت کرنا بھی ممنوع ہے۔ اطاعت کرنا بھی عبادت ہے۔"

اس کے بعد امام رازیؒ نے ایک سوال قائم کیا ہے کہ ہم جو رسول اللہ ﷺ اور امراء کی اطاعت کرتے ہیں تو کیا یہ ان کی عبادت ہے ؟ اور اس کا جواب یہ دیا ہے کہ :

"رسول اللہ ﷺ اور اولوالامر کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جاتی ہے البتہ اگر کسی نے اللہ کے حکم کے مقابلے میں اور اس کی نافرمانی کرتے ہوئے امراء کی اطاعت کی تو یہ ان کی عبادت شمار ہو گی۔"

اس کے بعد ایک دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :

"اگر کسی انسان نے تم کو کوئی حکم دیا ہو یا خود تمہارے نفس نے تم کو کسی کام پر اکسایا ہو اور وہ حکم یا کام اللہ کی شریعت کے خلاف ہو تو اس صورت میں اگر تم نے اس حکم کی تعمیل کی تو یہ شیطان کی عبادت ہو گی جو شرک ہے۔"(۲)

---

(۱) تفسیر ابن جریر المؤمنون آیت ۴۷ ص ۲۵ ج ۱۸

(۲) تفسیر کبیر یسین آیت ۶۰ ص ۹۶-۹۷ ج ۲۶

قرآن کا طرزِ استدلال

توحید کو ثابت کرنے کے لئے اور لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانے کے لئے قرآن کریم نے استدلال کا جو منہج اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑا آسان' فطری' معقول اور دلنشین ہے' مناطقہ اور متکلمین کے اسلوب سے ممتاز ہے' ان کے تکلفات و قیاسات سے بلند تر ہے اور عقل سلیم اور قلب منیب کو بہت جلد متاثر کرتا ہے۔ امام غزالیؒ متوفی ۵۰۵ھ نے قرآنی دلائل اور متکلمین کے دلائل کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

فَاَدِلَّةُ الْقُرْآنِ مِثْلُ الْغِذَاءِ يَنْتَفِعُ بِهٖ كُلُّ اِنْسَانٍ وَ اَدِلَّةُ الْمُتَكَلِّمِيْنَ مِثْلُ الدَّوَاءِ يَنْتَفِعُ بِهٖ آحَادُ النَّاسِ وَ يَسْتَضِرُّ بِهِ الْاَكْثَرُوْنَ بَلْ اَدِلَّةُ الْقُرْآنِ كَالْمَاءِ الَّذِيْ يَنْتَفِعُ بِهِ الصَّبِيُّ الرَّضِيْعُ وَالرَّجُلُ الْقَوِيُّ وَسَائِرُ الْاَدِلَّةِ كَالْاَطْعِمَةِ الَّتِيْ يَنْتَفِعُ بِهِ الْاَقْوِيَاءُ مَرَّةً وَ يَمْرَضُوْنَ بِهَا الْاُخْرٰى وَلَا يَنْتَفِعُ بِهَا الصِّبْيَانُ اَصْلًا.(۱)

"قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے ہر انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے کچھ افراد تو فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی ہے جس سے ماں کا دودھ پیتا بچہ اور قوی شخص دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے سب دلائل کھانوں کی طرح ہیں جن سے قوی اور صحت مند لوگوں کو تو کبھی فائدہ پہنچتا ہے اور کبھی ضرر پہنچتا ہے مگر دودھ پیتے بچے اس سے بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔"

یعنی جن لوگوں کے اذہان کو یونانی فلسفے نے بگاڑ دیا ہے اور انہیں ذہنی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے ان کو تو شاید علم کلام کے دلائل سے تشفی ہو جائے لیکن اکثر لوگوں کو یہ دلائل الٹا شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جن کے سب لوگ

(۱) الجام العوام عن علم الكلام ص ۷۰

محتاج ہیں، سب لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور سب لوگ اس سے اپنی بھوک مٹاتے ہیں بلکہ قرآنی دلائل پانی کی طرح ہیں جس سے دودھ پیتا بچہ اور قوی و طاقتور مرد دونوں اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ متکلمین کے امام تھے اور کلام و فلسفہ کے مسائل میں ان کو امامت و سیادت کا مقام حاصل تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر اصبہانی سے جو طویل وصیت لکھوائی تھی اس میں کلام و فلسفہ کے بارے میں ان کی آخری رائے ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

لَقَدِ اخْتَبَرْتُ الطُّرُقَ الْكَلَامِيَّةَ وَالْمَنَاهِجَ الْفَلْسَفِيَّةَ فَمَا رَئَيْتُ فِيْهَا فَائِدَةً تُسَاوِيْ الْفَائِدَةَ الَّتِيْ وَجَدْتُهَا فِي الْقُرْآنِ لِاَنَّهٗ يَسْعٰى فِي تَسْلِيْمِ الْعَظْمَةِ وَالْجَلَالِ لِلّٰهِ وَ يَمْنَعُ عَنِ التَّعَمُّقِ فِي اِيْرَادِ الْمُعَارَضَاتِ وَالْمُنَاقَضَاتِ وَ مَا ذَاكَ اِلَّا لِلْعِلْمِ بِاَنَّ الْعُقُوْلَ الْبَشَرِيَّةَ تَتَلَاشٰى فِيْ تِلْكَ الْمَضَائِقِ الْعَمِيْقَةِ وَالْمَنَاهِجِ الْخَفِيَّةِ.(۱)

"میں نے کلام اور فلسفے کے طرق و مناہج کو آزمالیا ہے لیکن مجھے ان میں کوئی ایسا فائدہ دکھائی نہیں دیا جو اس فائدے کے مساوی ہو جسے میں نے قرآن میں پایا ہے اس لئے کہ قرآن اللہ کی عظمت و جلال کو منوانے کی کوشش کرتا ہے اور تعارضات و تناقضات میں تعمق سے روکتا ہے اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ کو علم ہے کہ انسانی عقول ان لمبی اور تنگ گھاٹیوں اور خفیہ راستوں میں بھٹک جاتی ہیں۔"

حافظ ابن کثیرؒ نے امام رازیؒ کے الفاظ اس طرح نقل کیے ہیں:

لَقَدِ اخْتَبَرْتُ الطُّرُقَ الْكَلَامِيَّةَ وَالْمَنَاهِجَ الْفَلْسَفِيَّةَ فَلَمْ اَجِدْهَا تَرْوِيْ غَلِيْلًا وَلَا تَشْفِيْ عَلِيْلًا وَ رَئَيْتُ اَقْرَبَ الطُّرُقِ طَرِيْقَةَ الْقُرْآنِ.(۲)

"میں نے کلام اور فلسفے کے طرق کو آزمالیا ہے۔ یہ نہ تو کسی پیاسے کی پیاس بجھا سکتے ہیں

---

(۱) طبقات الشافعية الكبرى لتاج الدين سُبكی ص ۹۱ ج ۸

(۲) البدايه والنهايه ص ۵۶ ج ۱۳

اور نہ کسی بیمار کو شفا دے سکتے ہیں۔ میں نے سمجھ لیا ہے اور دیکھ لیا ہے کہ تمام راستوں کے مقابلے میں قریب ترین اور آسان ترین راستہ قرآن کا راستہ ہے۔"

قرآنی دلائل کے بارے میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں اپنا تاثر اس طرح بیان کیا ہے:

"قرآن کریم کا طرز استدلال لوگوں کے اذھان کے زیادہ قریب ہے اور ان کی عقول میں بات کو بٹھانے کا موثر ترین ذریعہ ہے اور قرآنی دلائل کو اذھان و افھام کے قریب تر ہی ہونا چاہیئے تاکہ ان سے خواص و عوام دونوں نفع اٹھا سکیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنی دلائل کا مقصد مجادلہ و مناظرہ نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مقصد صحیح اور سچے عقائد کو دلنشین کرانا ہے اور اس مقصد کے لئے اس قسم کے دلائل دوسرے طرق سے زیادہ قوی اور مؤثر ہوتے ہیں۔"(۱)

قرآنی دلائل کی قسمیں

قرآن کریم میں توحید کے اثبات کے لئے چار قسم کے دلائل بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

دلیل عقلی ____________ دلیل عقلی مع اعتراف الخصوم

دلیل نقلی ____________ دلیل الوحی

ان انواع اربعہ کی تفصیل اور تمثیل درج ذیل ہے:

(۱) دلیل عقلی:

انفس و آفاق، بر و بحر، آسمان و زمین، شمس و قمر، نجوم و کواکب، جبال و اشجار، جمادات و نباتات اور حیوانات کے انواع و اصناف میں اللہ کے وجود اور توحید کی نشانیاں موجود ہیں جو

(۱) مفاتیح الغیب معروف بتفسیر کبیر البقرہ آیت ۲۱ ص ۹۸ ج ۲

عقل کو ایمان لانے کی دعوت دیتی ہیں اور اللہ کی الوہیت و حاکمیت کو عقلاً ثابت کرتی ہے۔

قرآن کریم نے ان آیات کونیہ اور مظاہر قدرت کو جگہ جگہ بطور عقلی دلیل پیش کیا ہے۔ مثلاً

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (حم السجدہ ۵۳)

"یقیناً دکھا رہے ہیں ہم ان کو اپنی نشانیاں اطراف عالم میں بھی اور خود ان کے اپنے نفسوں میں بھی تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ قرآن (اور اس کی دعوت توحید) حق ہے کیا تیرا رب کافی نہیں ہے جو ہر چیز پر گواہ ہے۔"

آفاق وانفس کی تفسیر قرطبیؒ نے عطاء اور ابن زید سے اس طرح نقل کی ہے:

فِي الْآفَاقِ يَعْنِي أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ مِنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُومِ وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالرِّيَاحِ وَالْأَمْطَارِ وَالرَّعْدِ وَالْبَرْقِ وَالصَّوَاعِقِ وَالنَّبَاتِ وَالْأَشْجَارِ وَالْجِبَالِ وَالْبِحَارِ وَ غَيْرِهَا ..... وَ فِي أَنفُسِهِمْ مِنْ لَطِيفِ الصَّنْعَةِ وَ بَدِيعِ الْحِكْمَةِ.(۱)

"آفاق سے مراد ہیں آسمانوں اور زمین کے اطراف میں موجود قدرت کی نشانیاں مثلاً سورج' چاند' ستارے' رات اور دن' ہوائیں اور بارشیں گرج چمک' کڑک' سبزے' درخت' پہاڑ اور دریا وغیرہ اور وفی انفسھم میں انسانوں کے نفسوں میں لطیف صنعت اور عجیب وغریب حکمت کی جانب اشارہ ہے۔"

وَ فِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَ فِي أَنفُسِهِمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ.

(الذاریات ۲۰۔۲۱)

"اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے نفسوں میں بھی نشانیاں موجود ہیں پس کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟"

---

(۱) تفسیر قرطبی حم السجدہ آیت ۵۳ ص ۲۴۴ ج ۱۵

سورہ بقرہ میں توحید کے عقلی دلائل اس طرح بیان ہوئے ہیں :

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَ تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ. (البقرہ ١٦٤)

”بے شک آسمانوں اور زمینوں کے بنانے میں' رات اور دن کے اختلاف میں' کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع پہنچانی والی چیزیں اٹھا کر دریاؤں میں چلتی ہیں' بارش کے پانی میں جسے اللہ نے بادل سے اتارا ہے پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے ہیں' ہواؤں کے بدلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید ہیں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں یعنی دلائل ہیں۔“

اس آیت میں ۱۱ چیزوں کو توحید کے دلائل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جن میں جمادات' نباتات اور حیوانات کی مثالیں بھی دی گئی ہیں' علوی جوی' سفلی یعنی بالائی' درمیانی اور تحتانی چیزوں کا ذکر بھی ہوا ہے اور بری و بحری اشیاء کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے اور ان سب میں عقل سے کام لینے والوں یعنی غور و فکر کرنے والوں کے لئے دلائل موجود ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیات ۹۵ تا ۱۰۰ میں ۱۷ چیزوں کو عقلی دلائل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ان میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ چیزیں اللہ کی ہستی اور یکتائی پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح سورۃ النحل کی آیات ۳ تا ۱۴ میں ۱۳ نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو وحدت خالق' قدرت خالق اور علم و حکمت رکھنے والے قیوم کے وجود کی کھلی دلیلیں ہیں۔ اس قسم کی آیات قرآن میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو بڑے عام فہم اور دلنشین انداز میں کائنات کے خالق' مدبر اور قیوم کی وحدت اور یکتائی کو عقلی اور قطعی طور پر ثابت کرتی ہیں اس لئے کہ آثار مؤثر کے وجود پر عقلاً دلالت کرتے ہیں اور پوری کائنات کا توازن اور تسلسل کے ساتھ چلنا

اس کے منتظم کی وحدت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی ایک طبیعت اور نیچر ہے اور پوری کائنات کا نظم ایک قانون فطرت اور نیچر لزم کے مطابق چلتا ہے لیکن اس قانون فطرت کی یکسانیت اور تسلسل عقلاً اس بات کی دلیل ہے کہ اس قانون فطرت اور نیچر کا بنانے والا موجود ہے اور وہ یکتا و تنہا اور لا مثال اور لاشریک ہے۔ انفس و آفاق میں غور و فکر کے ذریعے اور سائنسی تجربات کے ذریعے بہت سے قدیم و جدید فلسفی اور سائنس دان دہریت سے توبہ کرنے اور خالق کے وجود کو ماننے پر مجبور ہوئے ہیں۔ تفصیل کے لئے مطالعہ کیجئے میری کتاب "حقیقت توحید و سنت" کے صفحات ۵۱ تا ۹۲۔

سعدی شیرازیؒ نے درست فرمایا ہے کہ:

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

علامہ اقبال نے فلسفے میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی تھی وہ انہی آیات کونیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

اے انفس و آفاق میں پیدا تیرے آیات حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تیری ذات

محروم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

(۲) دلیل عقلی مع اعتراف الخصوم:

قرآن کریم کا ایک طرز استدلال یہ بھی ہے کہ وہ ایسے دلائل بیان کرتا ہے جن کو خصوم یعنی مخالفین بھی تسلیم کرتے ہوں اور ان کے اپنے اعتراف و اقرار کو ان کے سامنے بطور حجت پیش کرتا ہے تاکہ وہ لاجواب ہو کر ایمان لے آئیں یا خاموش ہو جائیں مثلاً۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ○ (یونس ۳۱۔۳۲ پارہ ۱۱)

"ان کو کہو کہ کون رزق دیتا ہے تم کو آسمان اور زمین سے ؟ یا کون اختیار رکھتا ہے کانوں اور آنکھوں پر ؟ اور کون نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے ؟ اور کون ہے جو ہر کام کا انتظام کرتا ہے ؟ پس وہ ضرور کہیں گے کہ یہ سب کچھ تو اللہ کرتا ہے۔ پس کہو کہ پھر کیوں نہیں بچتے ہو تم شرک سے ؟ پس یہی ہے تمہارا حقیقی رب تو کیا رہ جاتا ہے حق کے بعد سوائے گمراہی کے ؟ تو پھر تم کدھر پلٹائے جارہے ہو ؟"

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ٥ (العنكبوت ٦١)

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ اور سورج چاند کو کس نے تابع بنایا ہے ؟ تو یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پس کدھر الٹائے جارہے ہو۔"

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ٥ (العنكبوت ٦٣)

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے اتارا ہے بادلوں سے پانی پس زندہ کیا ہے اس کے ذریعے زمین کو اس کی موت کے بعد ؟ تو یہ لوگ یقیناً کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔ کہدو کہ ساری تعریفیں تو اللہ ہی کے لئے ہیں لیکن ان میں سے اکثر سوچتے نہیں ہیں۔"

اس مضمون کی آیات سورہ مؤمنون' سورہ لقمان' سورۃ زمر اور سورت زخرف میں بھی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ اللہ کو خالق' رازق' بارش برسانے والا' زندگی اور موت کا مالک اور ہر چیز کا مدبر تسلیم کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے اسی اعتراف و اقرار کو شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ یہ تو پرلے درجے کی بے عقلی ہے کہ تکوینی نظام کا مدبر و منتظم تو اللہ کو تسلیم کیا جائے اور عبادت میں اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا جائے۔ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کی تدبیر و تنظیم میں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو تم شریک نہیں مانتے مگر عبادت

میں اس کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ اس دورنگی اور تضاد کا جواب وہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ :

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْمَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (الزمر ۳)

"ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ قریب کر دیں اللہ کے پاس ہمارا مرتبہ۔ یقیناً اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دیں گے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں بے شک اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹے اور ناشکرے ہوں۔"

اس آیت میں اللہ نے ان کے اس جواب کو جھوٹ اور کفران نعمت قرار دیا ہے اس لئے کہ اللہ کا قرب تو اس کی مخلصانہ عبادت سے ملتا ہے۔ مشرکانہ عبادت سے نہیں مل سکتا یہ تو بہت بڑی ناشکری ہے کہ سب کچھ اللہ نے دیا ہے اور پرستش و پوجا غیر اللہ کی کی جارہی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

"انہوں نے اپنے خیال میں مقرب فرشتوں کی شکل پر بت بنا لئے تھے اور ان کی عبادت اس خیال سے کرتے تھے کہ بتوں کی یہ پرستش دراصل فرشتوں کی پرستش ہے تاکہ یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری مدد، رزق اور دنیوی حاجتوں کے لئے سفارش کریں۔ باقی رہی آخرت تو اس سے تو یہ لوگ منکر تھے۔ قتادہؒ، سدیؒ اور مالکؒ نے زید بن اسلم اور ابن زید سے نقل کیا ہے کہ لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے شفاعت کریں اور اللہ کے ہاں ہم کو مرتبے میں قریب کر دیں۔ اسی وجہ سے یہ اپنے حج کے تلبیہ میں کہتے تھے کہ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ۔ "ہم عبادت کے لئے حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں ہے سوائے اس شریک کے جو تیری ملکیت ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور ان اختیارات کا بھی مالک ہے جو اس کے پاس ہیں۔" یہی وہ شبہ ہے جس پر قدیم دور کے مشرکین بھی اعتماد کرتے تھے اور جدید دور کے مشرکین بھی اعتماد کرتے ہیں لیکن تمام

رسول اس شبہے کی تردید کے لئے آئے تھے اور انہوں نے خالص اللہ کی عبادت کے لئے لوگوں کو دعوت دی تھی۔ یہ چیز (یعنی قرب خداوندی کے لئے فرشتوں اور اولیاء کی عبادت کرنا) مشرکین نے اپنی طرف سے ایجاد کی ہے۔ اللہ نے نہ تو اس کی اجازت دی ہے اور نہ اسے پسند کیا ہے بلکہ اسے ناپسند کیا ہے اور اس سے منع کیا ہے۔"(۱)

ودّ، سُواع، یغوث، یَعُوق اور نَصر عربوں کے پانچ مشہور بت تھے ان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ابن عباسؓ اور محمد بن قیسؒ نے فرمایا ہے کہ یہ اصل میں صالحین یعنی اللہ کے نیک بندوں کے نام تھے جن کے نام پر بت بنائے گئے تھے اور بعد میں لوگوں نے ان کی پرستش شروع کر دی تھی۔(۲)

بخاری اور ابن جریر کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ بت پرستی اصل میں اکابر پرستی اور اولیاء پرستی تھی۔ بت تو صرف قبلہ توجہ تھے اصل مقصد وہ اولیاء اور بزرگ تھے جن کی پرستش کو مشرکین نے وسیلہ قرب الٰہی سمجھ لیا تھا جس طرح قبر پرستوں کا مقصد اصحاب القبور کی تعظیم ہوتی ہے اور قبور صرف قبلہ توجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ امام رازی نے کہا ہے کہ :

اس زمانے میں لوگ بزرگوں کی قبروں کی تعظیم اس عقیدے کی بنیاد پر کرتے ہیں کہ جب ہم ان قبروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں اور یہ بت پرستی کی نظیر ہے۔"(۳)

(۳) دلیل نقلی :

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس بات کی تصدیق و توثیق مختلف علاقوں، مختلف

---

(۱) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر سورۃ زمر ۳

(۲) صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ نوح اور تفسیر ابن جریر سورۃ نوح

(۳) تفسیر کبیر سورہ یونس ص ۶۰ ج ۱۷

زمانوں اور مختلف زبانوں کے راستباز اور دیانت دار لوگوں نے کی ہو وہ سچی بات سمجھی جاتی ہے اور کوئی بھی حق پسند اور منصف مزاج شخص اسے تسلیم کرنے میں اور اس کی تائید کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا قرآن کریم نے اس حقیقت کے پیش نظر توحید کے اثبات کے لئے انفس و آفاق کی آیات کونیہ اور دلائل عقلیہ کے علاوہ تاریخی اور نقلی دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ ان نقلی اور تاریخی دلائل کی کل سات قسمیں ہیں۔

(۱) کل انبیاء کی شہادت :

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ.

(الانبیاء ۲۵)

"تجھ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا تھا اس کے پاس ہم نے یہی وحی بھیجی تھی کہ سوائے میرے اور کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے پس تم سب میری عبادت کرو۔"

اس آیت میں بغیر استثناء کے تمام گذشتہ رسولوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت توحید ہی کی دعوت تھی اور یہی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت ہے تو تاریخ انبیاء کی یہ اجماعی شہادت اس دعوت کے مبنی بر حق ہونے کی نقلی دلیل ہے اس لئے کہ ضد و عناد اور بغض و حسد سے خالی الذہن انسان جب تلاش حق کی نیت سے سوچتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش انبیاء الگ الگ علاقوں میں، جدا جدا زمانوں میں اور الگ الگ زبانوں میں ایک ہی بات کہتے چلے آئے تھے کہ لوگو اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ تو وہ اس بات کی صداقت میں کبھی بھی شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اتنی بڑی عظیم اور معصوم جماعت جب ایک بات پر متفق تھی تو اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ سورۃ النحل میں بھی توحید پر تمام رسولوں کی شہادت نقل ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ.

"اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔"

امام عامر شعبیؒ اور حضرت مجاہدؒ نے کہا ہے کہ طاغوت ضلالت کے امام اور رئیس کو کہا جاتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر امت کے رسول کی دعوت یہی تھی کہ اللہ کی عبادت کرو اور ائمۃ الکفر والشرک کی بات نہ مانو خواہ یہ طواغیت قبائل کے سردار ہوں، ملوک وسلاطین ہوں، غیر شرعی عدالتوں کے جج ہوں، احبار ورھبان ہوں اور خواہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہوں یا جبہ ودستار زیب تن کئے ہوئے ہوں غرض یہ کہ جو بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں جب وہ لوگوں سے اپنی یا کسی کی بندگی کرواتے ہوں اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنا یا کسی اور کا حکم منواتے ہوں تو ان کی اطاعت نہ کرو صرف اللہ کی بندگی کرو اور اسی کے احکام کی پیروی کرو۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت بھی یہی ہے تو آخر تم لوگ اس دعوت کی مخالفت کیوں کرتے ہو جس پر انبیاء کا اجماع ہو چکا ہے۔

(۲) بعض مشاہیر انبیاء کی تقاریر:

قرآن کریم میں بعض مشاہیر انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر ان کی دعوتی تقاریر نقل کی گئی ہیں جن میں انہوں نے اپنی قوم کو اللہ ہی کی عبادت کرنے کی دعوت دی تھی تو یہ دعوتی تقاریر توحید کے اثبات کے لئے نقلی دلیل کی دوسری قسم ہے۔ مثلاً

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ.

(اعراف ۵۹)

"بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا تو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو۔ نہیں ہے تمہارے لئے کوئی بھی عبادت کے لائق سوائے اللہ کے۔"

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ.

(اعراف ۶۵)

"اور قوم عاد کی طرف بھیجا تھا ہم نے ان کا بھائی ھود' تو اس نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو۔ نہیں ہے تمہارے لئے عبادت کے لائق کوئی بھی سوائے اللہ کے۔"

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ۔ (اعراف ۷۳)

"اور بھیجا تھا ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کا بھائی صالح تو کہا تھا اس نے کہ اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو۔ نہیں ہے تمہارے لئے عبادت کے لائق کوئی بھی سوائے اللہ کے۔"

موسیٰ علیہ السلام کو پہلا حکم یہ دیا گیا تھا کہ:

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي۔ (طٰه ١٤)

"بے شک میں اللہ ہوں۔ نہیں ہے کوئی بھی عبادت کے لائق مگر میں ہی ہوں پس میری عبادت کرو۔"

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ۔ (اعراف ۸۵)

"اور قوم مدین کی طرف ہم نے بھیجا تھا ان کا بھائی شعیب تو کہا تھا اس نے اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو نہیں ہے تمہارے لئے کوئی بھی عبادت کے لائق سوائے اس کے۔"

وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ۔ (عنکبوت ١٦)

"اور بھیجا تھا ہم نے ابراہیم کو جب کہ کہا تھا اس نے اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔"

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ۔ (المائدہ ۷۲)

"اور کہا تھا مسیح نے کہ اے بنی اسرائیل اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور

تمہارا رب ہے۔"

ان آیات میں نوح علیہ السلام ' ہود علیہ السلام ' صالح علیہ السلام ' ابراہیم علیہ السلام ' موسیٰ علیہ السلام ' شعیب علیہ السلام اور مسیح یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت یکساں الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ پس اے لوگو! اللہ ہی کی عبادت کرو۔

مشاہیر انبیاء کی یہ دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس دعوت کی صداقت کے لئے نقلی دلیل اور بڑی وزنی شہادت ہے کہ :

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ.

"اے لوگو اللہ ہی کی عبادت کرتے رہو۔"

(۳) آسمانی کتابوں کی شہادت :

قرآن مجید نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے بطور نقلی و تاریخی دلیل کے آسمانی کتابوں کی حوالے بھی دیئے ہیں تاکہ ان کتابوں کے ماننے والوں پر حجت تمام ہو جائے مثلاً :

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَنْ لَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا. (بنی اسرائیل ۲)

"اور بے شک دی تھی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا تھا ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت اس بات کی کہ نہ بناؤ میرے سوا کسی اور کو کارساز۔"

یعنی قرآن کریم میں تکرار و اصرار کے ساتھ جو یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی کارساز ' فریادرس ' حاجت روا ' مشکل کشا اور مختار کل نہیں ہے۔ یہ بات تورات میں بھی کہی گئی تھی جو بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے موسیٰ کو دی گئی تھی۔

قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا

بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَo (آل عمران ٦٤)

"ان کو کہو کہ اے کتاب والو آجاؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کی سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے اور ہم ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب بھی نہیں بنائیں گے پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو اس حکم کو مانتے ہیں۔"

یعنی اللہ ہی کی عبادت کرنے' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے اور ایک دوسرے کو اپنا رب یعنی غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا مستحق نہ ٹھہرانے کے احکام قرآن میں بھی نازل ہوئے ہیں اور تمہاری کتاب میں بھی موجود ہیں جیسا کہ انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ :

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی عبادت کر۔"(۱)

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرَاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ . (اعراف ١٥٧)

"کامیاب وہی لوگ ہیں جو اس امی رسول و نبی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔"

تحریف کے باوجود جو تورات وانجیل ان کے پاس موجود ہے اس میں بھی رسالت محمدی کی شہادت وبشارت اب تک لکھی ہوئی موجود ہے۔ مثلاً :

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔"(۲)

"میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی ان سے کہے گا۔"(۳)

---

(۱)متی باب ٤ آیت ١٠ اور لوقا باب ٤ آیت٨

(۲)استثناء باب ١٨ آیت ١٥

(۳)استثناء باب ١٨ آیت١٨ طبع بائبل سوسائٹی لاہور ص ٨٤

ان دونوں آیتوں میں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ تمہارے بھائیوں میں سے ایک نبی تمہارے لئے آئے گا ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسماعیل ہیں اور انہی میں سے آخری نبی محمد ﷺ مبعوث ہوئے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں کہ اس بشارت موسوی کا مصداق یوشع بن نون علیہ السلام ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نزدیک یہ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی بشارت ہے لیکن علامہ شیخ رحمت اللہ کیرانویؒ المتوفی یکم مئی ۱۸۹۱ء نے دس دلائل سے ان پر رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ محمد ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت ہے اور بھائیوں سے مراد بنو اسماعیل ہیں۔ ان دلائل عشرہ میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ استثناء باب ۳۴ آیت ۱۰ میں ہے کہ :

"بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اٹھا۔"

اگر یہ بشارت یوشع یا عیسیٰ کے لئے تسلیم کی جائے تو پھر اس آیت کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ یہ دونوں بنی اسرائیل میں شامل تھے اور بنو مدین اور بنو عیسو اگرچہ بنی اسرائیل کے بھائی ہیں اس لئے کہ وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں لیکن ان میں سے کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تو متعین ہو گیا کہ بھائیوں سے مراد بنو اسماعیل ہیں اور ان میں محمد ﷺ کے علاوہ کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تھا اور نہ کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس لئے اس بشارت کا مصداق سوائے محمد ﷺ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ باقی نو دلائل کے لئے ملاحظہ کیجئے علامہ کیرانویؒ کی کتاب "اظہار الحق"۔(۱)

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے تورات کے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۴۴ء سے دوسری بشارت یہ نقل کی ہے کہ :

---

(۱)اظہار الحق طبع دولت قطر ص۳۶۲تا۳۷۵ج۲

وَ قَالَ جَاءَ الرَّبُّ مِنْ سِينَا وَاَشْرَقَ لَنَا مِنْ سَاعِيْرِ اِسْتَعْلَنَ مِنْ جَبَلِ فَارَانَ وَ مَعَهُ اُلُوْفُ الْاَطْهَارِ وَ فِيْ يَمِيْنِهِ سُنَّةٌ مِنَ النَّارِ.(۱)

"اور اس نے کہا رب سینا سے آیا اور ساعیر سے ہم پر جلوہ گر ہوا اور وہ کوہ فاران سے ظاہر ہوا اور اس کے ساتھ ہزاروں قدوسی تھے اور اس کے دائیں ہاتھ میں آتشی شریعت تھی۔"(۲)

سینا سے آنے میں اشارہ ہے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کی جانب، ساعیر سے جلوہ گر ہونے میں اشارہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دینے کی طرف اور فاران سے ظاہر ہونے میں اشارہ ہے محمد ﷺ پر نزول قرآن کی طرف۔ سینا تو مشہور ہے "ساعیر" شام و فلسطین کے ایک پہاڑ کا نام ہے جسے آج کل "جبل الخلیل" کہا جاتا ہے جس پر عیسیٰ علیہ السلام عبادت کرتے تھے اور "فاران" کے بارے میں یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ نے لکھا ہے کہ:

فَارَان بَعْدَ الْاَلفِ رَاءٌ وَ آخِرُهُ نُوْنٌ كَلِمَةٌ عِبْرَانِيٌّ مُعَرَّبَةٌ وَ هِيَ مِنْ اَسْمَاءِ مَكَّةَ ذَكَرَهَا فِي التَّوْرَاةِ قِيْلَ هُوَ اِسْمٌ لِجِبَالِ مَكَّةَ.(۳)

"فاران عبرانی لفظ ہے جو عربی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ مکہ مکرمہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیسا کہ تورات میں اس کا ذکر ہوا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مکہ کے پہاڑوں کا نام ہے۔"

حموی نے تورات کا جو حوالہ دیا ہے وہ اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

"اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔"(۴)

---

(۱)اظہار الحق ص۲۷۷ ج۲ (۲)استثناء باب۳۳=۲

(۳)معجم البلدان طبع بیروت ۱۹۷۹ء ص۲۲۵ ج٤

(٤)پیدائش باب ۲۱=۲۰۔۲۱

ظاہر ہے کہ فاران کے بیابان سے مکہ ہی کا بیابان مراد ہے اس لئے کہ اسماعیل مکہ میں رہتے تھے اور فتح مکہ کے وقت ہمارے ہی رسول دس ہزار صحابہ (قدوسیوں) کے ساتھ مکہ میں یعنی فاران میں داخل ہوئے تھے لہذا یہ محمد ﷺ کے آنے کی کھلی بشارت ہے۔ عربی تورات کے کیتھولک نسخے میں "الوف الاطہار" یعنی ہزاروں پاکیزہ لوگوں کا ذکر ہوا ہے اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے انگریزی ترجمے میں دس ہزار قدوسیوں کا لفظ نقل کیا ہے۔ اگرچہ بائیبل سوسائٹی لاہور کے شائع کردہ نسخے میں "لاکھوں قدوسیوں کا ذکر ہوا ہے لیکن فاران سے ظاہر ہوتے وقت دس ہزار قدوسیوں کا ساتھ ہونا" خاتم النبیین کی جانب کھلا اشارہ تھا اس لئے کسی محرف نے ہزاروں سے لاکھوں بنادیا ہوگا تاکہ آپ پر اس پیش گوئی کا انطباق نہ ہوسکے۔

یہ تو ہیں تورات کے حوالے باقی رہی انجیل تو اس کا ایک حوالہ تو مذکورہ آیت میں دیا گیا ہے اور دوسرا حوالہ سورۃ الصف میں اس طرح دیا گیا ہے :

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

(الصف آیت ٦ پارہ ٢٨)

"اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا رسول آیا ہوں تورات کی تصدیق کرنے والا جو مجھ سے پہلے اتری تھی اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے اور جس کا نام احمد ہوگا۔"

اسی بشارت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ :

اَنَا دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَ بِشَارَةُ عِيْسٰى عليه السلام.(١)

"میں اپنے باپ یعنی دادا ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔"

(١) مسند احمد ص ١٢٧-١٢٨ ج ٤۔ شرح السنہ للبغوی ص ٢٠٧ ج ١٣

سیرت وحدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں جب امام جعفر بن ابی طالب نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات بیان کیں تو اس نے کہا کہ :

اَشْهَدُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اَنَّهُ الَّذِیْ نَجِده' فِی الْاِنْجِیْلِ وَ اَنَّهُ الَّذِیْ بَشَّرَ بِهٖ عِیْسٰی بْنُ مَرْیَمَ.

"میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسٰی بن مریم نے دی تھی۔"

اس بشارت کا ذکر انجیل برناباس میں صریحی طور پر نام کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً اس کے باب ۱۳ میں لکھا ہوا ہے کہ :

"مگر جب محمد خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی۔"

اسی طرح باب ۹۷ میں ایک سوال کے جواب میں عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ :

"میرے بعد آنے والے مسیح کا مبارک نام محمد ہے۔"

چونکہ اسرائیلی اصطلاح میں لفظ مسیح مبارک اور مامور من اللہ کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا اس لئے انجیل میں جگہ جگہ آنے والے کو "مسیح" کہا گیا ہے انجیل میں بشارت عیسوی کی تفصیلی بحث اور برناباس کی انجیل کے تعارف کے لئے مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن سورۃ الصف کے حاشیہ ۸ کا ملاحظہ کیجئے۔

انجیل یوحنا کے عربی ترجمے میں یہ بشارت "فَارْقَلِیْط" کے نام سے منقول ہے :

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَنِیْ فَاحْفَظُوْا وَصَایَایَ وَ اَنَا اَطْلُبُ مِنَ الْاَبِ فَیُعْطِیْکُمْ فَارْقَلِیْطَ آخَرَ لِیَثْبُتَ مَعَکُمْ اِلَی الْاَبَدِ.(۱)

اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میری وصیتوں کی حفاظت کرو گے یعنی ان پر عمل کرو گے اور میں باپ سے یعنی اللہ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا فارقلیط دے گا

(۱) انجیل یوحنا باب ۱۴۔۱۵۔۱۶

گا تا کہ وہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔"

فَاَمَّا اِذَا جَاءَ الْفَارَقْلِيْطُ الَّذِيْ اُرْسِلُهٗ اَنَا اِلَيْكُمْ مِنَ الْاٰبِ رُوْحُ الْحَقِّ مِنَ الْاٰبِ يَنْبَثِقُ هُوَ يَشْهَدُ لِاَجْلِيْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ لِاَنَّكُمْ مَعِيَ مِنَ الْاِبْتِدَاءِ.(۱)

"لیکن جب وہ فارقلیط آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا اور تم بھی گواہی دیتے ہو اس لئے کہ تم تو شروع سے میرے ساتھ ہو۔"

لٰكِنِّيْ اَقُوْلُ لَكُمُ الْحَقَّ اِنَّهٗ خَيْرٌ لَّكُمْ اَنْ اَنْطَلِقَ لِاَنِّيْ اِنْ لَّمْ اَنْطَلِقْ لَمْ يَاْتِكُمُ الْفَارَقْلِيْطُ فَاَمَّا اِنْ اَنْطَلِقْ اَرْسَلْتُهٗ اِلَيْكُمْ.(۲)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں چلا گیا تو اسے تمہارے پاس بھیجوں گا۔"

یہ عبارات مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے انجیل کے عربی ترجمہ مطبوعہ لندن ۱۸۲۱ء '۱۸۳۱' ۱۸۴۴ء سے نقل کی ہیں اور تفصیلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ فارقلیط سے مراد محمد ﷺ ہیں اور مسیحی علماء کے شبہات و اعتراضات کے تحقیقی جوابات دیئے ہیں۔(۱)

بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور کی طبع کردہ انجیل میں فارقلیط کا ترجمہ مددگار یا وکیل یا شفیع کیا گیا ہے لیکن انجیل تو سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی' ۷۰ء کے بعد یونانی زبان میں مدون ہوئی' یونانی زبان سے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا اور اسی لاطینی ترجمے سے یورپ اور ایشیا کی دوسری زبانوں میں یہ کتاب منتقل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ در ترجمہ سے اصل

(۱) یوحنا باب ۱۵۔۲۶۔۲۷

(۲) انجیل یوحنا باب ۱۶'۷

(۳) اظہار الحق طبع قطر ص ۴۱۹ تا ۴۴۰ ج ۲

الفاظ میں ردوبدل کا وقوع پذیر ہونا بعید از قیاس نہیں ہے مگر ابن ہشام متوفی ۲۱۳ھ نے ابن اسحاق متوفی ۱۵۰ھ سے انجیل یوحنا کے عربی ترجمے میں فارقلیط کی جگہ "اَلْمُنْحَمَنَّا" کا لفظ نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سریانی زبان میں "مُنْحَمَنَّا" محمد یعنی ستودہ صفات کو کہا جاتا ہے اور رومی زبان میں اسے "بَرقلِیطس" کہتے ہیں۔(۱)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "مُنْحَمَنَّا" بمعنی محمدؐ کا ترجمہ رومی زبان میں "بَرقلِیطس" کیا گیا تھا جسے عربی میں فارقلیط بنادیا گیا مگر اس کا ترجمہ محمد یا ستودہ صفات کی جگہ مددگار یا وکیل یا شفیع کر کے تحریف و تلبیس کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی تائید انجیل برنباس سے بھی ہوتی ہے جس میں صریحی الفاظ میں خاتم الرسل والانبیاء کا اسم علمی محمد نقل ہوا ہے۔

(۴) علماء اہل کتاب کی شہادت :

قرآن کریم نے توحید ورسالت کو ثابت کرنے کے لئے نقلی دلیل کے طور پر آسمانی کتابوں کے حق پسند اور انصاف پسند علماء کی شہادت بھی پیش کی ہے مثلا :

اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ. (البقرہ ۱۲۱)

"وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی تھی جو اسے صحیح طور پر پڑھتے ہیں وہی لوگ ایمان لاتے ہیں حق پر اور جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

اس آیت سے پہلے آیت ۱۲۰ میں کہا گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ آپ سے کبھی بھی خوش نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ ہو جائیں مگر تم ان کو کہدو کہ اللہ کا بتلایا ہوا راستہ ہی حق ہے اور میں اسی راستے پر قائم رہوں گا اور اگر بالفرض تم نے علم آجانے کے باوجود ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو پھر تم کو اللہ کی گرفت سے بچانے والا نہ کوئی دوست

(۱) سیرت ابن ہشان طبع مصطفی البابی مصر ۱۹۵۵ء، ص ۲۳۲ ج ۱-۲

ہو گا اور نہ کوئی مددگار ہو گا۔ ضدی' عنادی اور قوم پرست اہل کتاب کی مذمت کے بعد مذکورہ بالا آیت میں حق پرست' انصاف پسند اور قوم پرستی' گروہ بندی اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر فیصلہ کرنے والے علماء اہل کتاب کی یہ صفات بیان ہوئی ہیں کہ یہ اپنی کتاب یعنی تورات کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں' نہ اس کی تلاوت و قراءت میں کج بیانی اور ہیر پھیر کرتے ہیں' نہ اس کے معانی و مفاہیم کو بدلتے ہیں اور نہ اسے لوگوں سے چھپاتے ہیں بلکہ خود بھی اس کتاب پر عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ان صفات سے موصوف علماء اہل کتاب اس حق پر ایمان لاتے ہیں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے آخری نبی محمد ﷺ کو بھیجا ہے اور وہ ہے اللہ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت ان کے ایمان لانے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تورات اور دوسری آسمانی کتابوں سے معلوم کر لیا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں جن کے تشریف لانے کی بشارت موسیٰ علیہ السلام نے بھی دی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دی تھی۔

ابن جریر اور ابن کثیر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں علماء اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے اور ابو حیان نے البحر المحیط میں لکھا ہے کہ اس آیت میں عبداللہ بن سلام' ابن صوریا اور ابن یامین کی طرف اشارہ ہے جو یہودیوں کے مذہبی پیشوا تھے اور تورات کے بڑے علماء میں شامل تھے اور سیاق کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے حق پرست علماء کا ذکر خیر ہوا ہے اور ان کی اس "شہادت حق" کو توحید الٰہی اور رسالت محمدی کی نقلی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ساتویں پارے کے آغاز میں نصاریٰ کے حق پسند لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اس حق کی وجہ سے جسے انہوں نے پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں،

کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے ہیں پس ہم کو حق کی شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لیجئے اور کیا رکاوٹ ہے ہمارے لئے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس آچکا ہے؟ اور حال یہ ہے کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا۔ پس اللہ نے ان کو اس قول کے بدلے میں ایسے باغ دیئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی ہے بدلہ نیکوکاروں کا۔"

(المائدہ ۸۳ تا ۸۵ پارہ ۷)

ان آیات سے قبل آیت نمبر ۸۲ میں کہا گیا ہے کہ ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں تم ان لوگوں کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اور اس قرب کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایسے علماء اور خداترس لوگ موجود ہیں جو تکبر نہیں کرتے۔ ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ یہ آیت عام عیسائیوں کے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ :

أُنَاسٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ كَانُوْا عَلَى شَرِيْعَةٍ مِنَ الْحَقِّ مِمَّا جَاءَ بِهِ عِيْسَى عليه السلام.

"یہ اہل کتاب کے کچھ لوگ تھے جو عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی سچی شریعت پر قائم تھے۔"

یعنی یہ وہ نصاریٰ تھے جو عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت اور الوہیت کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کی عبدیت اور نبوت کے قائل تھے اور ان کی اصلی اور سچی شریعت پر قائم تھے۔ انہی لوگوں کے بارے میں وَإِذَا سَمِعُوْا سے لے کر وَذَالِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِيْنَ تک تین آیتیں نازل ہوئی تھیں کہ جب انہوں نے قرآن کی آیتیں سنیں تو وہ پہچان گئے کہ یہ قرآن حق ہے اور اس پر ایمان لے آئے۔ ان آیات کے شان نزول میں ابن کثیر نے متعدد روایات نقل کی ہیں۔

ایک روایت وہ ہے جسے علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ

آیات نجاشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جن کے سامنے جب جعفر بن ابی طالب نے قرآن کی تلاوت کی (سورہ مریم کی) تو وہ رونے لگے یہاں تک کہ انہوں نے آنسوں سے اپنی داڑھیاں تر کر دیں۔ ابن کثیر نے اگرچہ اس روایت کو محل نظر قرار دیا ہے اس لئے کہ نجاشی اور جعفر کا واقعہ ہجرت سے قبل پیش آیا تھا اور سورہ مائدہ کی یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن یہ کوئی اتنا بڑا لاینحل اشکال نہیں ہے اس لئے کہ شان نزول کی بحث میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ صحابہ و تابعین کی عادت یہ تھی کہ نَزَلَت کا لفظ ہر اس شخص یا واقعے کے بارے میں استعمال کرتے تھے جس پر آیت کا مفہوم صادق آتا ہو خواہ وہ آیت کے نزول سے پہلے پیش آیا ہو یا بعد میں پیش آیا ہو۔ ابن کثیر نے سنن نسائی کے حوالے سے عبداللہ بن زبیر سے بھی نقل کیا ہے کہ:

نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ فِي النَّجَاشِي وَاَصْحَابِه.

"یہ آیت نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

دوسری روایت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ یہ آیت اس وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نجاشی نے مدینہ بھیجا تھا تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنیں اور آپ کی سیرت کا مشاہدہ کر کے اس کو مطلع کریں۔ اس وفد کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ نے قرآن پڑھا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور جذبات کی شدت سے رونے لگے اور واپس حبشہ جا کر نجاشی کو رپورٹ پیش کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ وفد ۱۲ افراد پر مشتمل تھا ۷ علماء اور ۵ راہب، بعض کے نزدیک وفد کی تعداد ۵۰ تھی، بعض کے نزدیک ۶۰ سے اوپر تھی اور بعض کے نزدیک ان کی تعداد ۷۰ تھی۔

تیسری روایت طبرانی نے ابن عباس سے نقل کی ہے کہ یہ آیت ان زراعت پیشہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حبشہ سے جعفر بن ابی طالب کے ساتھ مدینہ آئے تھے جب رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پڑھا تو وہ ایمان لے آئے اور ان کی

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تم لوگ اپنے وطن جاکر اس دین کو تبدیل کر دو گے ؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے دین کو کبھی بھی تبدیل نہیں کریں گے۔

چوتھی روایت عطاء بن ابی رباح کی ہے کہ اس آیت میں حبشہ کے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جب مہاجرین حبشہ آئے اور انہوں نے ان کے اخلاق و اعمال کو دیکھا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ چاروں روایات صحیح ہیں اور ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ آیت کا مفہوم ان سب پر صادق آتا ہے اور متقدمین کی اصطلاح میں ان سب لوگوں کو اس کا شان نزول کہا جاسکتا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں :

اِنَّ هٰذِهٖ نَزَلَتْ فِيْ صِفَةِ اَقْوَامٍ بِهٰذِهِ الْمَثَابَةِ سَوَاءٌ كَانُوْا مِنَ الْحَبْشَةِ اَوْ غَيْرِهَا.(۱)

”یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو ان صفات سے متصف ہوں چاہے حبشہ سے ہوں یا غیر حبشہ سے ہوں۔“

بہر حال ان آیات میں نصاریٰ کے ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہوں نے قرآن سن کر اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کے اس ایمان و اعتراف کو اللہ نے نقلی دلیل کے طور پر پیش کیا۔

اسی مضمون کی آیت سورۂ قصص میں اس طرح آئی ہے :

اَلَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْا آمَنَّا بِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ. (القصص ۵۲۔۵۳)

”جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کو مانتے ہیں یہ ہمارے رب کی جانب سے حق ہے اور ہم تو اس سے پہلے بھی مسلمان تھے۔“

امام بغوی نے معالم التنزیل میں عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ :

(۱) تفسیر ابن کثیر سورہ مائدہ ۸۳ ص ۱۰۷ تا ۱۰۹ ج ۲ طبع الشعب

نَزَلَتْ فِي ثَمَانِيْنَ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اَرْبَعُوْنَ مِنْ نَجْرَانَ وَ اثْنَانِ وَ ثَلَاثُوْنَ مِنَ الْحَبْشَةِ وَ ثَمَانِيَةٌ مِنَ الشَّامِ۔

"یہ آیت اہل کتاب کے ۸۰ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے ۴۰ نجران کے تھے ۳۲ حبشہ کے تھے اور ۸ شام کے رہنے والے تھے۔"

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نصاریٰ کے ایک وفد کے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے کہ آپ کی نبوت کی خبر حبشہ پہنچی تو حبشہ کے نصاریٰ کے ۲۰ یا ۳۰ کے قریب افراد مکہ آئے اور آپ کو مسجد حرام میں پالیا۔ یہ لوگ آپ کے پاس بیٹھے' آپ کے ساتھ گفتگو کی اور آپ سے سوالات کئے۔ اس موقع پر قریش کے کچھ لوگ کعبہ کے اردگرد اپنی مجالس قائم کئے ہوئے بیٹھے تھے' نصاریٰ کا یہ وفد جب اپنے سوالات سے فارغ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پڑھا اور ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے جب قرآن سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کے بارے میں ان کی کتاب میں جو کچھ بیان ہوا تھا وہ انہوں نے معلوم کر لیا۔ یہ وفد جب اٹھ کر جانے لگا تو ابو جہل قریش کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ اے قافلے والو! اللہ تم کو تباہ کرے تم کو تمہارے اہل مذہب نے اس لئے بھیجا تھا کہ تم تحقیق کر کے ان کو اس شخص کے بارے میں اطلاع دو گے لیکن اطمینان کے ساتھ تمہاری اس کے ساتھ کچھ زیادہ نشستیں بھی نہیں ہوئی تھیں کہ تم اپنے مذہب سے الگ ہو گئے اور اس شخص کی بات پر ایمان لے آئے۔ تم سے بڑا بے وقوف قافلہ ہم کو معلوم نہیں ہے۔ ان نو مسلموں نے کہا ہم تمہاری جاہلانہ باتوں کا جواب نہیں دیتے ہمارا دین وہ ہے جس پر ہم قائم ہیں اور تمہارا دین وہ ہے جس پر تم قائم ہو۔ ہم نے اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو خیر اور نفع پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ کہا گیا ہے کہ نصاریٰ کے یہ لوگ اہل نجران میں سے تھے۔

واللہ اعلم اور کہا گیا ہے کہ یہ آیات ان کے بارے میں نازل ہوئی تھیں کہ اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ سے لے کر لَا نَبْتَغِیْ الْجَاهِلِیْنَ تک (القصص ۵۲ تا ۵۵) ابن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب زہری سے پوچھا تھا کہ یہ آیتیں کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں تو اس نے مجھے جواب دیا تھا کہ میں نے اپنے علماء سے جو بات سنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیتیں بھی نجاشی اور اس کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی تھیں اور سورہ مائدہ کی آیات ذَالِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَ رُهْبَانًا سے لے کر فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِیْنَ تک (المائدہ ۸۲۔ ۸۳) بھی انہی کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔"(۱)

کیا یہ وفد حبشہ سے آیا تھا یا نجران سے آیا تھا؟ یا اس میں نجران' حبشہ اور شام تینوں کی افراد شامل تھے؟ اور کیا یہ وفد ۸۰ افراد پر مشتمل تھا؟ یا ۲۰ افراد پر مشتمل تھا؟ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ مختلف اوقات میں اور مختلف علاقوں سے متعدد افراد پر مشتمل اہل کتاب کے وفود رسول اللہ ﷺ سے ملنے آئے تھے اور متقدمین کی اصطلاح کے مطابق یہ سب ان آیات کا شان نزول ہیں اس لئے کہ سب پر ان آیات کا انطباق ہوتا ہے اور ان سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ :

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ آيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِيْلَ (الشعراء ۱۹۷)

"اور کیا ان کے لئے یہ کافی دلیل نہیں ہے کہ اس قرآن کو بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔"

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ان انصاف پسند اور عدل پر قائم رہنے والے علماء اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جو اعتراف کرتے تھے کہ ہماری کتابوں میں محمد ﷺ کی صفات' ان کی بعثت اور ان کی امت کے بارے میں پیش گوئیاں موجود ہیں۔(۲)

(۱) سیرت ابن ھشام ص۳۹۱۔۳۹۲ اَمْرُ وَفْدِ النَّصَارٰی الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا طبع مصطفی البابی قطر ۱۹۵۵ء

(۲) تفسیر ابن کثیر الشعراء، آیت ۱۹۷

مذکورہ آیات میں اہل کتاب کے مختلف وفود کے ایمان لانے کو اور حق کی شہادت دینے کو اللہ نے توحید ورسالت کے ثبوت کے لئے نقلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

(۵) اولیاء اللہ اور رجال اللہ کی شہادت:

قرآن کریم نے مختلف ادوار کے اولیاء اللہ کے قصے بھی بیان کئے ہیں جو توحید پر قائم تھے اور توحید پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کو ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر انہوں نے صبر واستقامت کی شاندار مثالیں پیش کی تھیں جو تاقیامت موحدین کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اولیاء اللہ اور رجال اللہ کے قصص وحکایات قرآن کریم نے توحید کے نقلی دلائل کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بزرگ اگرچہ انبیاء ورسل تو نہیں تھے لیکن خداترس اور خدا پرست تھے' فہم ودانش کے حامل تھے' ان کے دل اللہ کی محبت سے سرشار تھے اور توحید کے نور سے منور تھے اور یہ اللہ کے محبوب بندے تھے اس لئے ان کا کردار بھی توحید کی صداقت وحقانیت کی تاریخی دلیل ہے۔ اولیاء اللہ' عباد اللہ اور رجال اللہ کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔ جن کو قرآن کریم نے نقلی اور تاریخی دلائل کے طور پر غور و فکر کے لئے پیش کیا ہے۔

(الف) اصحاب الکہف

یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے عقیدۂ توحید کے تحفظ کے لئے ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے اس لئے ان کو اصحاب الکہف یعنی غار والے کہا گیا ہے ان کی قوم بھی مشرک تھی اور ان کا بادشاہ بھی مشرک تھا لیکن یہ نوجوان پاکیزہ فطرت' عقل سلیم اور فہم ودانش کے حامل تھے۔ انہوں نے مشرکانہ مذہب سے براءت کا فیصلہ کیا اور توحید خالص کا عقیدہ اختیار کر لیا اور جب ان کے لئے اپنے عقیدے کے مطابق اللہ کی عبادت کرنا مشکل ہو گیا اور ناقابل برداشت اذیتوں کا خطرہ سر پر آگیا تو انہوں نے باہمی مشاورت سے اپنی قوم' اپنے ملک اور اپنے گھروں کی آسائشوں کو توحید پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہجرت کی نیت سے ایک

پہاڑ کے وسیع و عریض غار میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔ لیکن اللہ نے اپنی قدرت کا نمونہ اور بعث بعد الموت کی ایک نظیر دکھانے کے لئے ان کو غار میں ۳۰۹ سال تک سلائے رکھا اور جب نیند سے بیدار ہوئے تو حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ لوگوں نے توحید کا عقیدہ قبول کر لیا تھا اور مشرک بادشاہ کی جگہ موحد بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔ جب لوگ اس عبرت انگیز اور سبق آموز واقعے سے باخبر ہو گئے اور اللہ کی قدرت کا نمونہ اور قیامت کی نظیر انہوں نے دیکھ لی تو اس کے بعد اللہ نے اسی غار کے اندر ان کی روحیں قبض کر لیں اور ان کو اسی غار کے اندر موت کی نیند سلا دیا۔ اصحاب کہف کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے :

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًىo وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُوْنِهِ إِلٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًاo هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهِ آلِهَةً لَوْ لَا يَأْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍo فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًاo (الكهف ۱۳ . ۱۴ . ۱۵)

"ہم بیان کرتے ہیں تیرے سامنے اصحاب کہف کی خبر سچائی کے ساتھ۔ یقیناً یہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے بڑھا دیا تھا ان کا ایمان اور باندھ لیا تھا ہم نے ایمان ان کے دلوں پر (یعنی ان کے دلوں کو مضبوط کر لیا تھا) جب وہ کھڑے ہو گئے (مستعد ہو گئے) تو کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم تو اس کے علاوہ کسی معبود کو مدد کے لئے کبھی بھی نہیں پکاریں گے۔ ہم جب ایسا کریں گے تو حد سے نکلی ہوئی بے جا باتیں کہیں گے۔ یہ ہماری قوم ہے جس نے اپنے لئے اللہ کے علاوہ دوسرے معبود بنا لئے ہیں۔ یہ لوگ ان کی الوہیت اور معبودیت پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے ؟ پس کون ہے بڑا ظالم اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہو۔"

اولیاء اللہ کی یہ خبر اللہ نے اس لئے دی ہے کہ سمجھ لیں کہ اولیاء اللہ نہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور نہ غیر اللہ کو غیبی مدد کے لئے پکارتے ہیں تو جو لوگ اولیاء کی قبروں یا

ان کے مجسموں کو سجدہ کرتے ہیں یا مختار کل سمجھ کر غیبی مدد کے لئے ان کو پکارتے ہیں وہ اللہ سے بھی باغی ہیں اور اولیاء کرام کے بھی نافرمان ہیں۔باقی رہی یہ بات کہ یہ نوجوان کون تھے؟ کس زمانے میں گزرے تھے؟ اور کس شہر میں رہتے تھے؟ تو اس بارے میں حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کا قول قول فیصل اور قول زرین ہے:

وَ قَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِذَالِكَ وَ اَرَادَ مِنَّا فَهْمَهٗ وَ تَدَبُّرَهٗ وَ لَمْ يُخْبِرْنَا بِمَكَانِ هٰذَ الْكَهْفِ فِي اَيِّ الْبِلَادِ مِنَ الْاَرْضِ اِذْ لَا فَائِدَةَ لَنَا فِيْهِ وَلَا قَصْدٌ شَرْعِيٌّ. وَ قَدْ تَكَلَّفَ بَعْضُ الْمُفَسِّرِيْنَ فَذَكَرُوْا فِيْهِ اَقْوَالًا فَتَقَدَّمَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَالَ هُوَ قَرِيْبٌ مِنْ اَيْلَةَ. وَ قَالَ ابْنُ اِسْحٰقَ هُوَ عِنْدَ نِيْنَوٰى وَ قِيْلَ بِبِلَادِ الرُّوْمِ وَ قِيْلَ بِبِلَادِ الْبُلْقَاءِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَيِّ بِلَادٍ هُوَ وَلَوْ كَانَ فِيْهِ مَصْلَحَةٌ دِيْنِيَّةٌ لَاَرْشَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَيْهِ.(۱)

"اللہ نے ہم کو اصحاب کہف کے اس قصے کی خبر دی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس واقعے کو سمجھیں اور اس پر غور کریں۔ مگر ہم کو اللہ نے یہ خبر نہیں دی کہ یہ غار کہاں ہے اور کس علاقے میں ہے؟ اس لئے کہ ہمارے لئے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مقصد ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے تکلف سے کام لے کر کچھ اقوال ذکر کئے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ جگہ ایلہ کے قریب ہے' ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ جگہ نینوٰی کے پاس ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بلقاء کے علاقے میں ہے مگر اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کس علاقے میں ہے؟ اگر اس کے تعین میں کوئی دینی مصلحت ہوتی تو اللہ اور اس کا رسول اس جگہ کی طرف ہماری راہنمائی ضرور کرتے۔"

عام طور پر مفسرین اور مورخین کی رائے یہ ہے کہ یہ جگہ شہر افسس یا اِفسُوس کے پاس تھی جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا بڑا شہر تھا جس کے کھنڈرات اب بھی ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰۔۲۵ میل جانب جنوب پائے جاتے ہیں اور یہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر طبع الشعب قاہرہ ص۱۳۹ ج۵ الکہف ۱۳ تا ۱۵

زمانہ دقیانوس بادشاہ کا تھا۔ یعنی ۲۴۹ء یا ۲۵۰ء۔ تفسیر حقانی میں ہے کہ یہ نوجوان ۲۵۰ء میں غار میں داخل ہوئے تھے اور ۵۵۰ء میں بیدار ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی تھی اس حساب سے ان کی بیداری کا واقعہ ولادت نبوی سے ۲۰ سال پہلے پیش آیا تھا۔

(ب) ﴿اصحاب الاخدود کے مظالم اور اصحاب التوحید کی استقامت﴾

قرآن کریم نے اولیاء الرحمٰن اور عباد الرحمٰن کی توحید پر ثابت قدم رہنے کی ایک اور مثال سورہ بروج میں بیان کی ہے۔ جنہوں نے اصحاب الاخدود کے وحشیانہ اور سفاکانہ مظالم کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کیا تھا' اور اپنی جانوں کی قربانی دے کر عقیدۂ توحید کی شہادت دی تھی اور یہ توحید کی ایک اور نقلی اور تاریخی دلیل ہے۔ اس واقعے کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے:

قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِo النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِo اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌo وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌo وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِo الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌo (البروج ٤ تا ٩)

"تباہ کر دیئے گئے خندقوں والے جن میں ایندھن والی آگ جل رہی تھی۔ جب کہ یہ لوگ ان خندقوں کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ایمان والوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے ان موحدین میں اور کوئی عیب نہیں پایا تھا سوائے اس کے کہ وہ لوگ اللہ کی توحید پر ایمان لائے تھے جو غالب ہے اور حمد و تعریف کے لائق ہے جس کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔"

ان آیات میں تو اصحاب الاخدود اور اصحاب التوحید کا تعین نہیں کیا گیا کہ یہ کون لوگ تھے اور کس زمانے میں گزرے تھے اور کس علاقے کے رہنے والے تھے؟ قرآن کریم تاریخی واقعات بیان کرتے وقت تفصیلات بیان نہیں کرتا بلکہ اصل مقصد کے بیان پر اکتفا کرتا ہے۔ باقی رہی تاریخ تو اس میں موحدین کو آگ کی خندقوں میں ڈالنے کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے یمن' قسطنطینیہ' عراق' شام اور فارس میں بھی اس قسم کی آگ کی خندقوں کا ذکر کیا ہے جس میں اہل حق کو ڈالا گیا تھا لیکن مذکورہ آیات میں ان مظالم کی طرف اشارہ ہے جو ۵۲۳ء میں یمن کے حمیری بادشاہ ذونواس نے موحدین پر ڈھائے تھے۔ اس واقعہ فاجعہ کی تفصیل صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں بیان ہوئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

"صہیب رومیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں ان میں ایک بادشاہ تھا اور اس کا ایک جادوگر تھا جب وہ جادوگر بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے تم میرے پاس ایک لڑکا بھیج دو تاکہ میں اس کو جادو سکھا دوں۔ بادشاہ نے اس کے پاس ایک لڑکا بھیج دیا تاکہ وہ اسے جادو سکھا دے۔ جب یہ لڑکا ساحر کے پاس جاتا تو راستے میں ایک راہب بھی بیٹھا ہوتا۔ یہ لڑکا جاتے اور آتے وقت اس راہب کے پاس بھی بیٹھتا اور اس کی باتیں سنتا اور اس کی باتیں اسے اچھی لگتیں۔ یہ لڑکا جب جادوگر کے پاس جاتا تو وہ دیر سے آنے پر اسے مارتا۔ اس نے جب راہب سے اس مار پڑنے کی شکایت کی تو اس نے کہا کہ جب تم کو جادوگر سے خوف ہو تو کہہ دینا کہ آج گھر والوں نے روک لیا تھا۔ یہ لڑکا اسی طرح آتا جاتا تھا کہ ایک دن اچانک ایک درندے کے پاس آ پہنچا جس نے لوگوں کو گزرنے سے روک لیا تھا۔ لڑکے نے دل میں کہا کہ آج میں معلوم کر لوں گا کہ ساحر بہتر ہے یا راہب بہتر ہے۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہا کہ اے اللہ اگر راہب کے کام تجھے ساحر سے زیادہ پسند ہیں تو میرے اس پتھر سے درندے کو مار ڈالئے تاکہ لوگ گزر سکیں۔ اس نے پتھر مارا اور درندے کو قتل کر دیا اور لوگ گزرنے

لگے۔ جب اس نے راہب کے پاس آکر اس واقعے کی خبر دی تو راہب نے کہا اے بیٹے آج تو مجھ سے بہتر ہو گیا ہے' تیرا مرتبہ وہاں تک پہنچ گیا ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ تم عنقریب آزمائش سے دوچار ہو گے۔ اگر تم آزمائش میں پڑ گئے تو کسی کو میرا نام اور پتہ نہ بتانا۔ یہ لڑکا پیدائشی اندھے اور برص والے کو اپنی دعا سے ٹھیک کر دیتا تھا اور لوگوں کی دوسری بیماریوں کا علاج بھی کرتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری ہم نشین اندھا تھا اس نے جب یہ خبر سنی تو اس لڑکے کے پاس بہت سے تحائف لے کر آیا اور کہا کہ یہ سارے تحفے تیرے لئے ہیں اگر تم نے مجھے شفا دیدی۔ لڑکے نے کہا کہ میں تو کسی کو بھی شفا نہیں دے سکتا شفا دینے والا تو اللہ ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لے آؤ تو میں اللہ سے دعا کروں گا اور وہ تم کو شفا دیدے گا چنانچہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا اور اللہ نے اسے شفا دے دی۔ شفایاب ہونے کے بعد جب وہ بادشاہ کے پاس جا کر بیٹھا جیسا کہ پہلے بیٹھا کرتا تھا تو بادشاہ نے پوچھا تیری بینائی کس نے لوٹائی ہے؟ اس نے کہا کہ میرے رب نے لوٹائی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے سوا تیرا کوئی دوسرا رب ہے؟ اس نے کہا میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ بادشاہ نے اسے پکڑا اور اذیتیں دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے لڑکے کا پتہ بتا دیا۔ لڑکا جب لایا گیا تو بادشاہ نے اسے کہا۔ اے بیٹے! تیرا جادو یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ تم مادر زادہ اندھوں اور برص والوں کو ٹھیک کرتے ہو اور تم بہت سے اور کام بھی کرتے ہو۔ لڑکے نے کہا کہ میں تو شفا نہیں دے سکتا شفا تو اللہ دیتا ہے۔ بادشاہ نے اسے پکڑا اور اذیتیں دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے راہب کا پتہ بتا دیا۔ راہب کو جب لایا گیا تو بادشاہ نے اسے کہا کہ اپنے دین سے پھر جاؤ۔ اس نے انکار کیا تو بادشاہ نے آرا منگوایا اور اس کے سر کے درمیان یہ آرا رکھ کر چیرا یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعد بادشاہ کا مصاحب درباری لایا گیا اور اسے بھی بادشاہ نے کہا کہ اپنے دین سے پھر جاؤ اس نے بھی انکار کیا تو بادشاہ نے آرا منگوایا اور اس کے سر کے درمیان رکھ کر چیرا' یہاں تک کہ اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعد لڑکا لایا گیا اور اسے کہا کہ اپنے دین سے پھر جاؤ۔ اس نے انکار کیا

توبادشاہ نے اس کو اپنے چند ساتھیوں کے حوالے کیااور کہا کہ اسے فلاں فلاں پہاڑ کے پاس لے جاؤاور اسے لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھو۔جب چوٹی پر پہنچ جاؤتواگر یہ اپنے دین سے پلٹ گیا تو چھوڑدو ورنہ اسے چوٹی سے نیچے گرادو۔وہ لوگ اسے لے کر گئے اور پہاڑی پر چڑھ گئے تو لڑکے نے کہااے اللہ تو جیسے چاہتا ہے مجھے ان سے بچالے۔پس پہاڑان پر لرزنے اور ہلنے لگا اور یہ سب لوگ پہاڑ سے نیچے گر گئے اور لڑکا بادشاہ کے پاس واپس چلا آیا۔بادشاہ نے کہا تمہارے ساتھی کیا کر رہے ہیں ؟اس نے کہا کہ اللہ نے مجھے ان سے بچالیا ہے۔بادشاہ نے اسے اپنے دوسرے ساتھیوں کے حوالے کیااور کہا کہ اسے لے جاؤاور ایک چھوٹی کشتی میں سوار کرواور جب سمندر کے وسط تک پہنچ جاؤتواگر یہ اپنے دین سے پھر گیا تو بہت اچھاورنہ اسے سمندر میں پھینک دو۔بادشاہ کے ساتھی اسے لے گئے اور اس نے کہااے اللہ تو جس طرح چاہتا ہے مجھے ان سے بچالے۔چنانچہ کشتی الٹ گئی اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا بادشاہ کے پاس واپس چلا آیا۔بادشاہ سے کہا کہ تو مجھے قتل نہیں کر سکتا یہاں تک کہ تووہ کام کرے جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں۔بادشاہ نے کہاوہ کام کیا ہے ؟لڑکے نے کہاوہ کام یہ ہے کہ لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کرو' مجھے ایک درخت پر لٹکادو' میرے ترکش سے ایک تیر نکالو'اس تیر کو کمان کے چلہ میں رکھواور کہو کہ اللہ کے نام سے جو لڑکے کا رب ہے' پھر مجھے یہ تیر مارواگر تم نے ایسا کر لیا تو مجھے قتل کر لو گے۔چنانچہ بادشاہ نے لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کیا' لڑکے کو درخت پر لٹکایا'اس کے ترکش سے ایک تیر لیا'اسے کمان کے چلے میں رکھااور کہا کہ اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا رب ہے۔پھر لڑکے کو تیر مارااور تیر اس کی کنپٹی پر پڑا۔لڑکے نے اپنی کنپٹی میں تیر کی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھااور مر گیا۔اس پر تمام لوگوں نے کہا کہ ہم اس لڑکے کے رب کو مانتے ہیں' ہم اس لڑکے کے رب کو مانتے ہیں' ہم اس لڑکے کے رب کو مانتے ہیں۔بادشاہ کے پاس جب یہ خبر آئی تو کسی نے کہا کیا تم نے دیکھ لی وہی چیز جس سے تم ڈر رہے تھے ؟اللہ کی قسم تیرے ساتھ وہی کچھ ہوا جس سے تم ڈر رہے تھے۔اس

پر بادشاہ نے گلیوں کے دھانوں پر خندقیں کھودنے کا حکم دیا' خندقیں کھودی گئیں' ان میں آگ جلائی گئی اور بادشاہ نے حکم دیا کہ جو اپنے دین سے پلٹتا نہیں ہے اسے اس خندق میں ڈال دو یا ایمان والے کو کہا گیا کہ اس میں داخل ہو جاؤ۔ پس لوگ آگ کی خندق میں تو داخل ہو گئے مگر اپنے دین کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ آخر میں ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ آئی وہ اس آگ میں گرنے سے تھوڑی سی جھجکی مگر اس کے بچے نے کہا اے میری ماں صبر کر و تم حق پر ہو۔"(۱)

ترمذی کی روایت کے آخر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ :

"راوی کہتے ہیں کہ سورۂ بروج کی آیات قُتِلَ اَصْحَابُ الْأُخْدُوْدِ سے لے کر اَلْعَزِيْزُ الْحَمِيْدُ تک (۴ تا ۸) اسی قصے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ لڑکا دفن کیا گیا تھا اور نقل ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس لڑکے کا جسم قبر سے نکالا گیا تھا اور اس کی انگلی اس کی کنپٹی پر اسی طرح رکھی ہوئی تھی جس طرح کہ قتل ہوتے وقت اس نے رکھی تھی۔"

امام سیرت و مغازی محمد بن اسحاق نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن اس کی روایت اور مسلم کی روایت کے درمیان کافی فرق ہے۔ ابن اسحاق نے لڑکے کا نام عبداللہ بن ثامر لکھا ہے' راہب کا نام فَیمُیُوْن نقل کیا ہے اور بادشاہ کا نام ذونواس بتایا ہے اور لڑکے کی لاش کے بارے میں عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں نجران کے ایک شخص نے اپنی کسی ضرورت کے لئے نجران کی بنجر اور غیر آباد زمین کے ایک ٹکڑے کی کھدائی کی تو مٹی کے نیچے عبداللہ بن ثامر کو بیٹھا ہوا پایا جو ہاتھ سے اپنے زخم کو پکڑے ہوئے تھے جب ہاتھ الگ کیا جاتا تو خون بہنے لگتا اور جب ہاتھ کو چھوڑ دیا جاتا تو

(۱) صحیح مسلم کتاب الزھد والرقاق باب قصة اصحاب الاخدود والساحر والراہب و... م۔ ترمذی کتاب التفسیر سورۃ بروج مسند احمد طبع دار صادر بیروت ج ۶ ص ۱۶ تا ۱۸

زخم پر واپس لوٹ آتا اور خون بند ہو جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا کہ رَبِّیَ اللّٰہُ۔ خط کے ذریعے جب اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دو اور جو مٹی ہٹائی گئی تھی اسے واپس اس پر ڈال دو۔"(۱)

بہر حال اس قصے میں اولیاء کی کرامت کی دلیل بھی موجود ہے اور یہ توحید کی نقلی دلیل بھی ہے کہ اولیاء کرام غیبی مدد کے لئے اللہ ہی کو پکارتے تھے اور اسی کی عبادت کرتے تھے اور قرآن کریم میں اور مسلم کی حدیث صحیح میں اس عجیب و غریب اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں سے بھرا ہوا یہ قصہ توحید کے ثبوت کے لئے نقلی دلیل کے طور پر نقل ہوا ہے۔

(ج) لقمان حکیم کی وصیت

توحید کی نقلی دلیل کے طور پر قرآن کریم نے لقمان حکیم کی وہ وصیت بھی نقل کی ہے جو اس نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔ یہ وصیت سورہ لقمان کی دوسری رکوع میں بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ٥ وَاِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ٥ (لقمان ۱۲۔۱۳)

"اور یقیناً ہم نے لقمان کو دانائی دی تھی اور اسے حکم دیا تھا کہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اور جو کوئی بھی شکر ادا کرے گا اپنے فائدے ہی کے لئے کرے گا اور جو کوئی ناشکری کرے گا تو اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا اس لئے کہ اللہ تو غنی ہے اور حمد و تعریف کے لائق ہے۔ اور اس وقت کا ذکر کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا کہ اے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے لقمان کے تعارف میں نہ اس کا نسب بیان کیا ہے نہ اس کا وطن بتایا ہے اور

(۱) سیرت ابن ہشام ص ۳۴ تا ۳۷ ج ۱۔۲

نہ اس زمانے کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے زندگی گزاری تھی بلکہ صرف اتنا کہا ہے کہ یہ ایک دانشمند انسان تھے اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے اللہ نے اس کا اور اس کی وصیت کا ذکر کیا ہے وہ ہے توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال اور اس مقصد کے لئے نسب، وطن اور زمانے کا ذکر کوئی افادیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی دانائی اور دانشمندی کا ذکر اہمیت و افادیت رکھتا ہے۔ قرآن یہ بات سمجھانا اور بتانا چاہتا ہے کہ حکماء و عقلاء اور دانشمند و دانشور لوگوں نے ہر دور میں توحید کو پسند کیا ہے اور شرک کو پسند نہیں کیا اور اس پسند و ناپسند میں ان لوگوں کی حکمت و دانائی کا دخل تو ہے مگر ان کے نسب، وطن اور زمانے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ باقی رہی تاریخ تو اس میں لقمان نام کے کئی لوگ گزرے ہیں اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان آیات میں کونسے لقمان کا ذکر ہوا ہے؟ اور اس کا تعین فہم قرآن کے لئے ضروری بھی نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں ہمارے اسلاف کے کچھ اقوال حافظ ابن کثیر نے اس طرح نقل کئے ہیں:

"لقمان ایک نیک اور صالح شخص تھا، عبادت کرنے والا تھا، اچھے الفاظ میں بات کرنے والا تھا اور بڑی حکمت و دانش کا حامل تھا۔ عکرمہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ کَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا نَجَّارًا یہ ایک حبشی غلام تھا جو بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ قتادہ نے عبداللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا کہ لقمان کے بارے میں تم کو کیا خبر پہنچی ہے؟ قَالَ كَانَ قَصِيْرًا اَفْطَسَ مِنَ النُّوْبَةِ یہ ایک پستہ قد چپٹے ناک والا نوبی شخص تھا۔

سعید بن مسیب نے کہا ہے کہ لقمان سوڈان مصر کا رہنے والا تھا اس کے ہونٹ موٹے تھے اور اللہ نے اس کو حکمت و دانائی تو دی تھی مگر نبوت نہیں دی تھی۔ سعید بن مسیب کے پاس ایک سیاہ فام شخص کچھ پوچھنے آیا تو سعید نے اسے کہا کہ تو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے غم نہ کر اس لئے کہ تین سوڈانی سیاہ فام بہترین لوگوں میں شامل تھے۔ ایک بلال دوسرا مہجع عمر کا مولیٰ اور تیسرا لقمان حکیم جو سیاہ فام اور موٹے ہونٹوں والا نوبی تھا۔ مجاہد اور عمر بن قیس نے

بھی کہا ہے کہ لقمان ایک سیاہ فام غلام تھا جس کے ہونٹ موٹے تھے اور پاؤں پھٹے ہوئے تھے..... وَالْمَشْهُوْرُ اَنَّهٗ كَانَ حَكِيْمًا وَلِيًّا وَلَمْ يَكُنْ نَبِيًّا جمہور علماء کا قول مشہور یہ ہے کہ یہ حکیم اور ولی اللہ تھے مگر نبی نہیں تھے۔"(۱)

دو صحابہؓ اور تین تابعین کے ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لقمان سوڈانی تھے اس لئے کہ نوبہ سوڈان ہی کا ایک علاقہ ہے اور اسے حبشی سیاہ فام ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے اس لئے کہ عرب ہر سیاہ فام کو حبشی کہتے ہیں خواہ حبشہ کا رہنے والا ہو یا کسی دوسرے علاقے سے تعلق رکھتا ہو مگر عبدالرحمان سہیلی نے لکھا ہے وَلُقْمَانُ كَانَ نُوبِيًّا مِنْ اَهْلِ اَيْلَةَ یعنی لقمان نوبی تھا اور ایلہ (عقبہ) کا رہنے والا تھا۔(۲)

لیکن اس قول اور دوسرے اقوال کے درمیان مطابقت کی توجیہ یہ ہے کہ اصل میں سوڈانی اور نوبی تھے مگر رہتے ایلہ میں تھے اسی وجہ سے اس کے حکیمانہ اقوال کی اشاعت عربوں میں ہوئی تھی اور وہ اس کے نام سے واقف تھے۔ لقمان کے والد کا نام تو سب نے عنقاء لکھا ہے لیکن اس کے دادا کا نام سہیلی نے سبرور لکھا ہے اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ دونوں میں اس کا نام سدون نقل کیا ہے مگر ان کی شہرت باپ کی نسبت سے بھی نہیں ہوئی اور دادا کی نسبت سے بھی نہیں ہوئی بلکہ حکمت کی نسبت سے لقمان حکیم کے نام سے ہوئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ارض القرآن میں لکھا ہے کہ لقمان قوم عاد میں سے تھا اور یمن کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا لیکن صحابہ و تابعین کے مذکورہ اقوال اس کے خلاف ہیں اور اسی وجہ سے سہیلی نے لکھا ہے کہ وَلَيْسَ بِلُقْمَانَ بْنِ عَادِ الْحِمْيَرِيْ یہ بنو حمیر کے لقمان بن عاد نہیں تھے۔(۳)

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر طبع مکتبۃ المعارف بیروت ۱۹۶۶ء، ص۱۲۳ تا ۱۲۵ ج۲

(۲) الروض الانف شرح سیرت ابن ھشام طبع داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۹۹۲ء، ص۶۷ ج۴

(۳) الروض الانف ص۶۷ ج۴

مشہور قول یہی ہے کہ یہ داؤد علیہ السلام کے ہم عصر تھے۔ ابن اسحاق نے "مجلّہ لقمان" کے نام سے اور ابن کثیر نے "حکمت لقمان" کے نام سے لقمان حکیم کی ایک کتاب کا ذکر بھی کیا ہے۔

ابن ہشام متوفی ۲۱۸ھ نے ابن اسحاق متوفی ۱۵۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"بنو عمرو بن عوف کا ایک شخص سوید بن صامت مدینہ منورہ سے حج یا عمرے کے لئے مکہ مکرمہ آیا۔ یہ شخص اپنی قوم میں "الکامل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس کے مکہ آنے کی خبر سنی تو اس سے ملاقات کی اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ سوید نے کہا شاید جو کتاب آپ کے پاس ہے یہ اس کتاب کی طرح ہے جو میرے پاس ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے پاس کونسی کتاب ہے؟ اس نے کہا میرے پاس مجلّہ لقمان یا حکمت لقمان ہے۔ آپ نے فرمایا اس کی کچھ باتیں میرے سامنے پیش کرو اور اس نے اس کی کچھ باتیں پیش کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اچھا کلام ہے لیکن میرے پاس جو کلام ہے وہ اس سے بہتر ہے اور وہ قرآن ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے اور اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اس کے بعد جب آپ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا تو وہ اس سے کچھ دور نہ رہے یعنی بیزاری کا اظہار نہ کیا اور کہا کہ یہ اچھا کلام ہے۔ یہ شخص جب اپنی قوم کے پاس مدینہ واپس گیا تو تھوڑی مدت کے بعد اسے بنو خزرج نے قتل کر دیا۔ اس کی قوم کے کچھ لوگ کہتے تھے کہ ہمارا گمان ہے کہ یہ قتل ہونے کے وقت مسلمان تھے اور اس کا قتل جنگ بعاث سے پہلے ہوا تھا۔"(۱)

علامہ عبدالرحمان سہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح الروض الانف میں سوید بن صامت کا نسبی تعارف اس طرح بیان کیا ہے:

"سوید بن صامت بن صلت بن حوط بن حبیب بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن

---

(۱) سیرت ابن ہشام ص ۴۲۵ تا ۴۲۷ ج ۲

اوس۔ سوید کی ماں لیلیٰ بنت عمرو النجاریہ سلمیٰ بنت عمرو النجاریہ کی بہن تھیں جو عبدالمطلب بن ہاشم کی ماں تھیں۔ پس یہ سوید رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے خالہ زاد بھائی ہوئے۔"(۱)

(۶) جنات کی شہادت

چھٹی دلیل جنات کی شہادت ہے جسے قرآن نے توحید کے اثبات کے لئے نقلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ جنات آگ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں سرکشی اور طغیانی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود بعض جنات نے توحید خداوندی اور رسالت محمدی کو نہ صرف یہ کہ قبول کر لیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی قوم کو بھی ایمان لانے کی دعوت دی تھی اور وہ توحید کے داعی بن گئے تھے۔

جنات کی اس شہادت حق اور دعوت حق کو قرآن کریم نے اس طرح پیش کیا ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُنْذِرِيْنَ قَالُوْا يَا قَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُسْتَقِيْمٍ يَاقَوْمَنَا اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ آمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءُ اُولٰئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ. (الاحقاف ۲۹۔۳۲)

"اور اس وقت کا ذکر کرو جب کہ ہم نے جنات کے ایک گروہ کو تیری جانب لوٹایا تھا (متوجہ کیا تھا) جو قرآن کو کان لگا کر سن رہے تھے' جب وہ قرآن کی قراءت کے موقع پر پہنچے تو کہنے لگے خاموش رہو' پس جب قرآن کی قراءت پوری ہو گئی تو وہ اپنی قوم کے پاس واپس

(۱) الروض الانف ص ۶۵۔۶۶ ج ۴

گئے ان کو خبر دار کرنے کے لئے' انہوں نے واپس جا کر کہا اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور جو حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات مان لو اور اس پر ایمان لے آؤ تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو دردناک عذاب سے بچالے گا۔ اور جس نے اللہ کی طرف بلانے والے کی بات نہ مانی تو وہ اللہ کو زمین میں کہیں بھی عاجز نہیں کر سکتا اور نہیں ہوں گے اس کے لئے سوائے اللہ کے کوئی حامی اور مددگار۔"

جنات کی اسی شہادت حق اور دعوت حق کی مناسبت سے قرآن کی ایک سورت کا نام سورۃ الجن رکھا گیا ہے جس کی کل آیات ۲۸ ہیں اور ان میں سے ۱۵ آیات میں جنات کے دعوتی اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ۱۵ آیات کا ترجمہ نقل کر دیا جائے تاکہ جنات کی شہادت حق پوری طرح سامنے آجائے۔

"کہدو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے جب توجہ کے ساتھ قرآن سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے تو ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے پس ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم مانتے ہیں کہ ہمارے رب کی شان بڑی اونچی ہے جس نے نہ کسی کو بیوی بنایا ہے اور نہ کسی کو اولاد بنایا ہے--- اور ہم میں سے بے وقوف لوگ اللہ پر باندھتے ہیں حد سے بڑھی ہوئی باتیں--- اور ہم نے تو یہ گمان کیا تھا کہ انسان اور جنات اللہ پر ہرگز جھوٹ نہیں باندھیں گے--- اور انسانوں کے کچھ لوگ جنات کے کچھ لوگوں کی پناہ مانگتے تھے تو انہوں نے ان جنات کی نخوت اور سرکشی اور بڑھادی--- اور انسانوں نے بھی یہ گمان کر رکھا تھا جیسا کہ تم جنات، گمان کرتے ہو کہ اللہ ہرگز کسی کو بھی قبر سے نہیں اٹھائے گا--- اور ہم نے جب آسمانوں کو (یعنی فضاء آسمانی کو) ٹٹولا تو اسے سخت قسم کے چوکیداروں اور شعلوں سے بھرا ہوا

پایا---اور ہم آسمان کے مختلف مقامات پر باتیں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے مگر اب جو بھی سننے کے لئے کان لگاتا ہے تو اپنی تاک میں پالیتا ہے ایک شعلہ تیار---اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے لئے کسی مصیبت کا ارادہ کیا گیا ہے یا ارادہ کیا ہے ان کے رب نے ان کے بارے میں بھلائی اور ہدایت کا---اور ہم میں سے بعض تو نیکوکار ہیں اور بعض ان کے علاوہ ہیں' ہم مختلف طریقوں کے لوگ ہیں---اور ہم یقین کرتے ہیں کہ ہم اللہ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اسے بھاگ کر ہرا سکتے ہیں---اور ہم نے جب ہدایت کی بات سنی تو اس پر ایمان لے آئے اور جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا تو اسے نہ کسی کمی کا خوف ہوگا اور نہ کسی زیادتی کا---اور ہم میں سے بعض تو مسلمان ہیں اور بعض ظالم ہیں پس جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے انہوں نے حق کا ارادہ کیا ہے---اور جو ظالم ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔" (سورۃ الجن آیات ۱ تا ۱۵)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کا یہ گروہ موسیٰ علیہ السلام کو جانتا تھا۔ جب انہوں نے قرآن سنا تو ان کے دل و دماغ میں فوراً تبدیلی آگئی اور اس انقلابی کتاب نے ان کے اندر انقلاب برپا کر دیا' فوراً ایمان لے آئے اور عہد کر لیا کہ ہم کبھی بھی شرک نہیں کریں گے اور کسی کو بھی اللہ کی بیوی اور اولاد کا درجہ نہیں دیں گے۔ مشرکین عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ جنات کو غیب کا علم حاصل ہے اور وہ دور سے بھی کسی کی فریاد سن سکتے ہیں اور مدد بھی کر سکتے ہیں۔ اسی وہم کی بنیاد پر جب وہ کسی بیابان یا صحرا یا جنگل میں قیام کرتے تو جنات کے سردار کی پناہ مانگتے اور کہتے کہ:

نَعُوْذُ بِسَیِّدِ هٰذِهِ الْوَادِیْ مِنْ شَرِّ سُفَهَاءِ قَوْمِهٖ.

"ہم اس وادی کے سردار کی پناہ مانگتے ہیں اس کی قوم کے بے وقوفوں کے شر سے۔"

اس وہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایمان لانے والے جنات نے کہا تھا کہ انسانوں کے اس استعاذے اور استغاثے کو جب جنات نے قریب سے سنا تو ان میں تکبر و نخوت اور

طغیانی و سرکشی مزید بڑھ گئی ورنہ پہلے تو جنات انسانوں سے ڈرتے تھے انہوں نے کہا کہ انسانوں کی طرح ہم بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن مؤمن اللہ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور مشرک و ظالم جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ سورہ احقاف کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے پاس جاکر توحید کی دعوت کا کام شروع کر دیا اور کہا کہ اے ہماری قوم اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو تاکہ اللہ تم کو بخش دے ورنہ اللہ کے عذاب سے تم کو کوئی بھی بچا نہیں سکے گا۔

جنات نے قرآن کس سے سنا تھا؟ کب سنا تھا؟ اور کہاں سنا تھا؟ ان سوالات کا جواب بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں موجود ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ عکاظ کے بازار میں جانے کی نیت سے روانہ ہوئے جب کہ شیاطین اور آسمان کی خبر سننے کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی تھی اور ان پر شعلے پھینکے جارہے تھے تو شیاطین اپنی قوم کے پاس جب کسی خبر کے بغیر واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ کیا رکاوٹ پیش آگئی ہے کہ تم کسی خبر کے بغیر لوٹ آئے ہو؟

شیاطین نے کہا کہ ہمارے اور آسمان کی خبر کی درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور ہم پر آگ کے شعلے پھینکے جارہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے اور آسمان کی خبر کے درمیان کسی نئی چیز نے رکاوٹ ڈالی ہے پس تم زمین کے مشرقی و مغربی اطراف میں چل پھر کر دیکھو کہ وہ کونسی چیز ظاہر ہوئی ہے جس نے تمہارے اور آسمان کی خبر سننے کے درمیان رکاوٹ ڈالی ہے؟ چنانچہ ان میں سے جو جنات تھامہ کی طرف نکلے تھے وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آپہنچے۔ آپ اس وقت نخلہ مقام پر تھے' عکاظ کے بازار کو جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ جب ان جنات نے قرآن سنا تو ادھر کان لگا دیئے اور کہنے لگے کہ اللہ کی قسم یہی وہ چیز ہے جس نے تمہارے اور آسمان کی خبر کے درمیان رکاوٹ ڈالی ہے۔ پس

اسی جگہ سے وہ اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور کہنے لگے۔ اے ہماری قوم! ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو سیدھا راستہ دکھاتا ہے' ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم اپنے رب کے ساتھ کبھی بھی کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔ اس پر اللہ نے اپنے نبی پر یہ سورت نازل فرمائی کہ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اور جنات نے جو باتیں اپنی قوم کے سامنے کہی تھیں وہ وحی کے ذریعے آپ کو بتادی گئیں۔"(۱)

"شہب ثاقبہ" کا نظام تو ابتداء سے موجود تھا اور اب بھی موجود ہے۔ ان چمکتے اور بھڑکتے شعلوں کے نکلنے اور گھومنے میں اللہ تعالی کی بہت سی حکمتیں ہیں اور وہ ان سے مختلف کام لیتا ہے لیکن بعثت نبوی اور نزول قرآن کے آغاز پر ان سے شیاطین کو مار بھگانے کا کام بھی لیا جارہا تھا اور ان کی وجہ سے وہ اوپر جاکر فرشتوں کی باتیں سننے سے روک دیئے گئے تھے۔ جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ :

"جنات اوپر فضائے آسمانی میں جاکر وحی سنتے تھے (فرشتوں کے مکالمے سے) اور جب کوئی ایک بات سن لیتے تو اس کے ساتھ ۹ باتیں اپنی طرف سے ملا لیتے تھے' وہ ایک بات تو سچی ہوتی لیکن جو زائد باتیں اپنی طرف سے ملائی گئی ہوتیں وہ جھوٹی ہوتی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو یہ اوپر اپنی جگھوں پر جانے سے روک دیئے گئے۔ اس سے پہلے ان پر آگ کے شعلوں کی مار نہیں پڑتی تھی۔ جنات نے اس صورت حال کا ذکر ابلیس سے کیا تو اس نے کہا کہ یہ رکاوٹ کسی واقعے کی وجہ سے پیش آرہی ہے جو زمین میں ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے لشکر یعنی کارندے بھیجے تو ان میں سے بعض نے مکہ کے پاس نخلہ کے دو پہاڑوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے پالیا اور

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاذان باب الجهر بقراءة صلوة الصبح ۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر سورة الجن۔ صحیح مسلم کتا الصلوة باب الجهر بالقراءة فی صلوة الصبح والقراءة علی الحن۔ سنن ترمذی کتاب التفسیر سورة الجن۔ مسند احمد ص۲۵۲ ج۱ طبع دار صادر بیروت

انہوں نے جب ابلیس سے مل کر اسے اس کی خبر پہنچائی تو اس نے کہا کہ یہی وہ واقعہ ہے جو زمین میں رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے تم اوپر جانے سے روک دیئے گئے ہو یعنی بعثت نبوی اور نزول قرآن۔"(۱)

ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ شعلوں کی مار پہلے بھی پڑتی تھی لیکن اتنی زیادہ شدید نہیں تھی اور یہ لوگ بعض حالات میں چوری چھپے کچھ نہ کچھ سن لیا کرتے تھے مگر جب آپ مبعوث ہوئے تو یہ اوپر جانے سے بالکل روک دیئے گئے۔ اس کے قول کے مطابق جنات کا زمین پر چل پھر کر سبب معلوم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب ان پر مار زیادہ پڑتی تھی اور وہ چوری چھپے بات سننے سے بالکل روک دیئے گئے تھے مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ شہابیئے اور شعلے پہلے بھی دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کو معلوم تھے لیکن ان سے شیاطین کو مارنے اور جلانے کا کام پہلے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ بعثت نبوی کے بعد ان سے یہ کام بھی لیا جانے لگا تھا۔(۲)

باقی رہا یہ سوال کہ "شہب ثاقبہ" کی حقیقت کیا ہے؟ تو یہ قرآن کے اصل موضوع سے متعلق سوال نہیں ہے کیونکہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے اور اشیاء کے حقائق بیان کرنا اس کا موضوع نہیں ہے مگر قرآن سائنس کا مخالف بھی نہیں ہے بلکہ سائنسی تحقیقات اور تجربات کے ذریعے اشیاء کے حقائق و فوائد معلوم کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا اور ترغیب دلاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سورہ ملک کے حاشیہ نمبر ۱۱ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایڈیشن ۱۹۶۷ء کی جلد ۱۵ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیئے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آکر ادھر کا رخ کرتے ہیں۔

(۱) سنن ترمذی کتاب التفسیر سورۃ الجن۔ مسند احمد ص ۲۷۴۔۳۲۳ ج ۱

(۲) تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی کتاب التفسیر سورۃ جن طبع بیروت ۱۹۹۸ء ص ۲۲۵ ج ۹

مذکورہ آیات اور حدیث میں جنات کے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے ان کی تعداد سات یا نو تھی اور یہ شام کے ایک شہر نصیبین کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔(۱)

ابن ہشامؒ نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جنات نے قرآن اس وقت سنا تھا جب کہ آپ طائف کے سفر سے واپسی پر نخلہ کے مقام پر رات کے وقت نماز پڑھ رہے تھے اور طائف کا سفر آپ نے ۱۰ نبوی میں ابو طالب اور خدیجہ کے انتقال کے بعد کیا تھا۔(۲)

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ :

"ایک دوسرے کی تائید کرنے والی احادیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جنات پر شعلوں کی مار پڑنے کا واقعہ بعثت نبوی کے اوائل میں ظاہر ہوا تھا اور یہ واقعہ سفر طائف اور سفر عکاظ کے دونوں قصوں کے وقت کے تغائر پر دلالت کرتا ہے اور یہ واقعہ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ قرآن سننے کے لئے جنات کا آنا طائف کے سفر سے پہلے ہوا تھا۔ اس بات پر اور تو کوئی اعتراض نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس حدیث میں آیا ہے کہ جنات نے آپ کو اپنے اصحاب کے ساتھ صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا (اور پانچ نمازیں شب معراج میں فرض ہوئی تھیں اور سفر معراج مکی دور کے آواخر میں ہوا تھا) مگر ممکن ہے کہ یہ واقعہ سفر معراج سے بہت پہلے کا ہو اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب معراج سے پہلے بھی نماز پڑھتے تھے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کیا ۵ نمازوں سے قبل کوئی نماز فرض تھی یا نہیں تھی ؟ اس سے ان لوگوں کا قول صحیح ثابت ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ ابتداء میں طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے قبل نماز فرض تھی یعنی صبح کی نماز اور عصر کی نماز اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ :

---

(۱) الروض الانف از سہیلی ص۷۵ ج۴

(۲) سیرت ابن ہشام ص۱۹ ٤ تا ۲۲ ٤ ج۱۔۲

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا.

یعنی ”اللہ کی پاکی بیان کرو اس کی حمد کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے۔“

تو اس حدیث میں صلوۃ فجر کا اطلاق وقت کے اعتبار سے ہوا ہے اس وجہ سے نہیں ہوا کہ یہ ان ۵ نمازوں میں سے ایک نماز تھی جو شب معراج میں فرض کی گئی تھیں۔ پس جنات کا یہ قصہ بعثت نبوی کے اوائل میں طائف کے سفر سے پہلے پیش آیا تھا۔ جن شارحین کے کلام سے مجھے واقفیت حاصل ہے ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث کی شرح میں اس بات پر تنبیہ نہیں کی جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اس کے بعد متعدد روایات نقل کرنے کے بعد ابن حجر لکھتے ہیں کہ :

فَهٰذِهِ الْاَخْبَارُ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْقِصَّةَ وَقَعَتْ اَوَّلَ الْبَعْثَةِ وَ هُوَ الْمُعْتَمَدُ.

”یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ قصہ بعثت کے ابتدائی زمانوں میں پیش آیا تھا اور یہی قول معتمد ہے۔“(۱)

بخاری و مسلم کی جس روایت کا ذکر پہلے ہوا ہے اس میں طائف کے سفر کا کہیں اشارہ تک موجود نہیں ہے بلکہ اس میں سوق عکاظ کے سفر کی تصریح موجود ہے اس کے علاوہ طائف کے سفر میں آپ اکیلے تھے یا بقول بعض زید بن حارثہؓ ہمراہ تھے لیکن مذکورہ حدیث میں انطلق رسول الله فِيْ طَائِفَةٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ عَامِدِيْنَ اِلٰى سُوْقِ عُكَاظٍ کے الفاظ آئے ہیں جن میں تصریح کی گئی ہے کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عکاظ کے میلے میں جانے کی نیت سے روانہ ہوئے تھے۔ عکاظ مکے اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے اس میلے کا آغاز اصحاب الفیل کے واقعے سے ۱۵ سال پہلے ہوا تھا اور ۱۲۹ سال تک یہ میلہ ہر سال لگتا تھا مگر خوارج نے ایک مرتبہ اس میلے پر ڈاکہ ڈال کر اسے لوٹ لیا تھا تو اس کے بعد یہ ختم ہو گیا۔

---

(۱) فتح الباری کتاب التفسیر سورة قل أوحی طبع مصطفى البابی مصر ۱۹۵۶ء ص ۲۹۷-۲۹۸ ج ۱۰

شوال کا پورا مہینہ یہ لوگ عکاظ میں قیام کرتے تھے۔ خرید و فروخت بھی کرتے تھے' ایک دوسرے کے مقابلے میں فخریہ مکالمے اور مشاعرے بھی ہوتے تھے اور ان کے شعراء اپنے تازہ ترین اشعار بھی سناتے تھے۔ وادی عکاظ کے جس مقام پر یہ لوگ جمع ہوتے تھے اس کو "ابتداء" کہا جاتا تھا۔ یہاں پر بڑے بڑے پتھر تھے جن کے ارد گرد یہ لوگ طواف بھی کرتے تھے۔ شوال کے بعد یہ لوگ "مَجنّة" منتقل ہو جاتے اور ذوالقعدہ کے ۲۰ دن یہاں گزارتے اور اس کے بعد عرفات کے پیچھے "ذوالمجاز" چلے جاتے اور حج کے ایام تک یہیں پر قیام کرتے تھے۔(۱)

نخلہ کے مقام پر تو جنات صرف قرآن سن کر ایمان لائے تھے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات نہیں کی تھی لیکن اس کے بعد مختلف اوقات میں آپ کے ساتھ جنات کے چھ خصوصی اجتماعات ہوئے تھے جن میں آپ نے ان کو قرآن سنایا تھا اور ہدایات دی تھیں ان اجتماعات کا ذکر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں متعدد اسانید کے ساتھ ہوا ہے اور عام مجالس نبویہ میں بھی جنات شریک ہوتے تھے اور آپ کے ارشادات و تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے۔

(۱) فتح الباری ص۲۹۷ ج۱۰

سواد بن قارب ؓ کے اسلام لانے کا واقعہ

جنات میں سے ایمان لانے والوں نے عجیب و غریب طریقوں پر توحید و رسالت کی دعوت و تبلیغ جاری رکھی تھی اور انسانوں میں سے بھی بعض لوگ ان کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لائے تھے۔ اس بارے میں ایک واقعہ بخاری میں اس طرح نقل ہوا ہے :

"عبداللہ بن عمرؓ نے کہا ہے کہ میں نے جب بھی حضرت عمرؓ کو کسی چیز کے بارے میں یہ کہتے سنا ہے کہ میں اس کے بارے میں یہ گمان کرتا ہوں تو وہ چیز اسی طرح نکلی ہے جس طرح کہ اس نے گمان کیا تھا (یعنی وہ صاحب فراست اور صاحب الہام تھے اور ان کا اندازہ صحیح نکلتا تھا) ایک بار حضرت عمرؓ بیٹھے تھے کہ ان کے سامنے ایک خوبصورت شخص گزرا۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو میرا گمان غلط ہے لیکن اگر غلط نہیں ہے تو پھر یہ شخص یا تو ابھی تک اپنے جاہلیت کے دین پر قائم ہے اور یا یہ اپنی قوم کا کاہن رہا ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔ جب وہ ان کے سامنے بلایا گیا تو انہوں نے اس کے سامنے بھی وہی بات کہی جو پہلے اپنی مجلس میں کہی تھی۔ اس نے کہا کہ میں نے تو آج کے دن جیسا دن کبھی نہیں دیکھا جس کا سامنا کسی مسلمان شخص نے کیا ہو (کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مجھ پر کافر کا گمان کیا جاتا ہے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تم کو تاکیدی حکم دیتا ہوں اور تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ اس نے کہا کہ میں جاہلیت کے دور میں اپنی قوم کا کاہن تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر وہ کونسی عجیب ترین بات ہے جو تیری جنیہ تیرے پاس لے کر آئی تھی؟ اس نے کہا کہ میں ایک دن بازار میں تھا کہ وہ جنیہ میرے پاس اس حال میں آئی کہ مجھے اس کے اندر کچھ پریشانی اور گھبراہٹ معلوم ہو رہی تھی اور مجھے کہنے لگی کہ کیا تو جنات کو اور ان کی ناامیدی کو نہیں دیکھتا؟ اوندھے منہ واپس لوٹنے کے بعد ان کی مایوسی کو نہیں دیکھتا؟ اور ان کا اونٹیوں

اور ان کے کجاووں کے نیچے بچھے ہوئے کمبلوں سے چمٹے رہنے کو نہیں دیکھتا؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ایک واقعہ دیکھا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ان کے بتوں کے پاس موجود تھا کہ ایک شخص گائے کا بچھڑا لے کر آیا اور اسے ذبح کیا تو اس کے اندر سے اتنی تیز آواز نکلی کہ اتنی تیز آواز میں نے کبھی نہیں سنی تھی اور وہ آواز یہ تھی کہ :

اے بے شرم! کامیابی دلانے والا ایک واقعہ پیش آیا ہے اور وہ یہ کہ ایک فصیح اور خوش بیان شخص کہتا ہے کہ عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ یہ سن کر لوگ تو کود کر چل پڑے مگر میں نے کہا کہ میں تو اپنی جگہ نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ معلوم نہ کرلوں کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ آواز دوبارہ آئی کہ اے بے شرم! کامیابی دلانے والا ایک واقعہ پیش آیا ہے اور وہ یہ کہ ایک فصیح اور خوش بیان شخص کہتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے کچھ زیادہ مدت نہیں گزاری تھی کہ لوگ کہنے لگے کہ محمد ﷺ اللہ کے نبی ہیں۔"(۱)

جس شخص سے حضرت عمرؓ نے اس کی کہانت کے زمانے کا عجیب و غریب واقعہ سنا تھا اس کا نام تو صحیح بخاری میں نہیں بتایا گیا لیکن امام بخاری نے اپنی دوسری کتاب "التاریخ الکبیر" میں ذکر کیا ہے کہ اس کا نام سواد بن قارب دوسی تھا جسے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف بھی حاصل تھا۔ ابن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ نے اپنے والد ابو حاتم رازیؒ سے نقل کیا ہے کہ :

سَوَادُ بْنُ قَارِبِ الْاَزْدِیُّ لَہٗ صُحْبَۃٌ رَوٰی عَنْہُ اَبُوْجَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیٍّ وَ سَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ.(۲)

"سواد بن قارب ازدی کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل ہے اور ان سے ابو جعفر محمد

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المناقب باب اسلام عمر بن خطابؓ

(۲) کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم حیدر آباد دکن ۱۹۵۲، ص۳۰۳ ج۴

بن علی نے اور سعید بن جبیر نے روایات نقل کی ہیں۔" سواد کی جنیہ نے اس کو جنات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اب اوپر جا کر باتیں سننے سے ناامید اور مایوس ہو گئے ہیں جب اوپر جاتے ہیں تو اوندھے منہ گرتے ہیں اور اونٹنیوں اور ان کے کمبلوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ یعنی گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں اوپر نہیں جا سکتے اور حضرت عمرؓ نے بچھڑے کے اندر سے جو آواز سنی تھی وہ بھی کسی مؤمن جن کی آواز تھی جو بتوں کے لئے نذر ونیاز پیش کرنے والوں کو بتا رہا تھا کہ اے بے شرم لوگو تمہاری کامیابی اور کامرانی اس میں ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی دعوت قبول کر لو اور شرک سے باز آجاؤ۔ لفظ جلیح کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ یہ نام ہے لیکن ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہیں اَلْوَقِحُ الْمُكَافِحُ بِالْعَدَاوَةِ یعنی "بے حیا دشمن جو کھل کر دشمنی کرتا ہے۔"

امام بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے سواد بن قاربؓ کے ایمان لانے کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

"بیہقی نے اپنے سند متصل کے ساتھ براء بن عازبؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ منبر رسول پر خطبہ دے رہے تھے کہ انہوں نے پوچھا اے لوگو کیا تمہارے درمیان سواد بن قارب موجود ہے؟ اس موقع پر تو کسی نے جواب نہ دیا لیکن آئندہ سال جب حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ اے لوگو کیا تمہارے درمیان سواد بن قارب موجود ہے؟ تو براء بن عازب نے کہا۔ اے امیر المؤمنین! یہ سواد بن قارب کون ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ سواد بن قارب کے اسلام لانے کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ اس موقع پر اتفاقاً سواد خود سامنے آگیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے سواد! اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرو کہ وہ کس طرح پیش آیا تھا؟ سواد نے کہا اے امیر المؤمنین میں ہند میں تھا اور ایک جن میرا تابع تھا۔ ایک بار میں رات کو سو رہا تھا کہ وہ خواب میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ اٹھو میری بات سمجھو اور عقل سے کام لو اگر تو عقل رکھتا ہے قَدْ بُعِثَ رَسُوْلٌ مِّنْ لُؤَيٍّ بْنِ غَالِبٍ۔ لوی بن غالب

قبیلے سے رسول مبعوث ہوا ہے۔اس کے بعد کچھ اشعار سنائے اور پھر مجھے بیدار کر کے کہا :

يَا سَوَادُ بْنَ قَارِب إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ بَعَثَ نَبِيًّا فَانْهَضْ إِلَيْهِ تَهْتَدْ وَتَرْشُدْ.

''اے سواد بن قارب بے شک اللہ عزوجل نے اپنا نبی بھیجا ہے پس اٹھو اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچو ہدایت اور رشد پالو گے۔''

تین رات تک یہ جن مجھے بیدار کر کے یہی بات کہتا رہا کہ اٹھو اور اس نبی کے پاس جا کر ایمان لاؤ سواد کہتے ہیں کہ اس جن کے تین رات تک مسلسل یہ بات کہنے سے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہو گئی اور میں نے جا کر اونٹنی پر کجاوہ باندھا پس میں نے نہ اس کی رسی کھولی اور نہ دوسری باندھی یعنی مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ نبی ﷺ کے پاس پہنچ گیا میں نے دیکھا کہ آپ اس وقت مدینہ میں تھے یعنی شہر میں تھے اور لوگ آپ کے ارد گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے (ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ مدینہ سے شہر مکہ مراد ہے واللہ اعلم) جب نبی ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا :

مَرْحَبًا بِكَ يَا سَوَادُ بْنَ قَارِب قَدْ عَلِمْنَا مَا جَاءَ بِكَ.

''اے سواد بن قارب خوش آمدید ! ہم جانتے ہیں کہ تم کو کیا چیز میرے پاس لے کر آئی ہے۔''

سواد کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں نے کچھ اشعار کہے ہیں وہ مجھ سے سن لیجئے۔جب آپ نے اجازت دی تو میں نے یہ اشعار سنائے :

١. اَتَانِیْ رَئِیٌّ بَعْدَ لَيْلَةٍ وَّ هَجْعَةٍ وَلَمْ يَكُ فِيْمَا بَلَوْتُ بِكَاذِبِ
٢. ثَلَاثَ لَيَالٍ قَوْلُهُ كُلَّ لَيْلَةٍ اَتَاكَ رَسُوْلٌ مِّنْ لُّؤَىِّ بْنِ غَالِبِ
٣. فَشَمَّرْتُ عَنْ سَاقِي الْاِزَارَ وَوَسَّطَتْ بِيَ الذِّعْلَبُ الْوَجْنَاءُ عِنْدَ السَّبَاسِبِ
٤. فَاَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ لَا شَيْءَ غَيْرُهُ وَ اَنَّكَ مَاْمُوْنٌ عَلٰى كُلِّ غَائِبِ

۵۔ وَ اَنَّكَ اَدْنَى الْمُرْسَلِيْنَ شَفَاعَةً   اِلَى اللّٰهِ يَابْنَ الْاَكْرَمِيْنَ الْاَطَائِبِ

٦۔ فَمُرْنَا بِمَا يَاْتِيْكَ يَا خَيْرَ مَنْ مَّشٰى   وَ اِنْ كَانَ فِيْمَا جَاءَ شَيْبُ الذَّوَائِبِ

٧۔ وَ كُنْ لِّيْ شَفِيْعًا يَّوْمَ لَا ذُوْ شَفَاعَةٍ   سِوَاكَ بِمُغْنٍ عَنْ سَوَادِ بْنِ قَارِبِ

ترجمہ:

ا۔ "میرے پاس میرا ساتھی جن آیا تھا تھوڑی سی رات اور تھوڑی سی نیند کے بعد اور میری آزمائش کے مطابق وہ جھوٹا نہیں تھا۔"

۲۔ "تین راتوں میں آیا تھا اور ہر رات آکر یہی بات کہتا تھا کہ لوی بن غالب میں سے تیرے پاس رسول آیا ہے۔"

۳۔ "پس میں نے اپنی پنڈلی سے چادر اٹھائی یعنی تیار ہو گیا اور بڑے رخساروں والی تیز رفتار اونٹنی مجھے بیابانوں میں دوڑا رہی تھیں۔"

۴۔ "پس میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی چیز عبادت کے لائق نہیں ہے اور آپ ہر قسم کی غیب کی خبریں پہنچانے میں اللہ کے امین ہیں۔"

۵۔ "اور آپ شفاعت میں تمام رسولوں سے اللہ کے زیادہ قریب ہیں اے معزز اور پاکباز لوگوں کے فرزند۔"

٦۔ پس اے زمین پر چلنے والوں کے سردار آپ کے پاس جو وحی آتی ہے اس کا ہمیں حکم دیجئے اگرچہ اس کی تعمیل میں ہمارے سروں کے بال سفید ہو جائیں۔" (یعنی اگرچہ اس پر عمل کرنا بڑا مشکل ہو)

۷۔ اور اس دن میری شفاعت کیجئے جس دن کسی کی شفاعت سواد بن قارب کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔"

سواد کہتے ہیں کہ یہ اشعار سن کر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے اور مجھے کہا کہ اَفْلَحْتَ يَا سَوَادُ اے سواد تم کامیاب ہو گئے ہو۔

حضرت عمرؓ نے یہ قصہ سننے کے بعد اس سے پوچھا کیا وہ جن اب بھی تمہارے پاس آتا ہے؟ اس نے کہا جب سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے اس وقت سے وہ پھر نہیں آیا وَنِعْمَ الْعِوَضُ كِتَابُ اللّٰهِ مِنَ الْجِنِّ اور قرآن بہترین عوض ہے جو مجھے جن کے بدلے میں ملا ہے۔"(۱)

جنات کی حقیقت

قرآن وحدیث کی نصوص اور دور صحابہ و تابعین میں ان نصوص کی اجماعی تعبیر سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات نوعِ انسانی اور نوعِ ملکی کے علاوہ ایک الگ مخلوق ہے جو آگ کے شعلے سے پیدا کی گئی ہے' کھاتی پیتی ہے' ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہے' عقل و شعور رکھتی ہے' احکامِ شرعیہ کی مکلف ہے' ان میں مؤمنین اور صالحین بھی ہیں اور مشرکین و فاسقین بھی ہیں' مختلف اشکال میں ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن اپنے مادہ تخلیق کی لطافت کی وجہ سے عادتاً دکھائی نہیں دیتے الا یہ کہ خرقِ عادت کے طور پر اللہ کسی کو دکھادے یا وہ کوئی جسمانی شکل اختیار کر کے کسی کے سامنے آجائے۔ قرآن کریم کے ۳۲ مقامات پر جن کا ذکر الگ نوع کے طور پر ہوا ہے مثلاً وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یا مثلاً يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یا مثلاً مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ان آیات میں جن کا ذکر انس کے مقابلے میں الگ نوع کے طور پر ہوا ہے۔ قرآن کریم نے نہ صرف یہ کہ انس و جن کو باہم متقابل نوعین قرار دیا ہے بلکہ ان کا مادہ تخلیق بھی الگ الگ بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ. (الحجر ۲۶.۲۷)

(۱) دلائل النبوۃ للبیہقی طبع مکتبہ اثریہ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور ص۲۴۹ تا ۲۵۱ ج۲

"بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے کھنکھناتی ہوئی خشک مٹی سے جو کہ بدبودار اور لس دار گارے کی تھی اور اس سے پہلے ہم نے جن کو گرم آگ سے پیدا کیا تھا۔"

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ۔ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَّارٍ۔

(الرحمان ۱۴۔۱۵)

"اللہ نے انسان کو کھنکھناتی ہوئی خشک مٹی سے پیدا کیا ہے جو ٹھیکری کی طرح تھی اور اس نے جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے۔"

ان آیات میں اللہ نے بغیر کسی ابہام کے صاف صاف الفاظ میں بتادیا ہے کہ اللہ نے انسان اول کا جسم لس دار اور سڑے ہوئے بدبودار گارے سے بنایا تھا جو خشک ہو کر ٹھیکری کی طرح کھنکھنا رہا تھا اور اس نے جب اس جسم میں روح پھونکی تو مٹی کے اس پتلے نے ایک زندہ انسان کی شکل اختیار کر لی اور اس کی نسل پھر نطفے سے چلائی گئی۔ اگرچہ نوع انسانی کے افراد میں بظاہر مٹی نظر نہیں آتی لیکن ان کا اصل مادہ تخلیق مٹی ہے۔ مگر اس کے برعکس جنات کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان کا پہلا فرد ابوالجن دھوئیں اور دوسرے اجزاء کی آمیزش سے خالی آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی ذات میں اگرچہ بظاہر آگ نظر نہیں آتی مگر ان کا اصل مادہ تخلیق آگ ہے۔ صحیح مسلم میں عائشہؓ سے مروی ہے کہ :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خُلِقَتِ الْمَلٰئِكَةُ مِنْ نُوْرٍ وَ خُلِقَ الْجَانُّ مِنْ نَّارٍ وَ خُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ.(۱)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں، جن آگ کے شعلے سے پیدا کئے گئے ہیں اور آدم علیہ السلام اس چیز سے پیدا کیا گیا ہے جس کا بیان اس نے تمہارے لئے قرآن میں کیا ہے یعنی مٹی سے۔"

(۱)صحیح مسلم کتاب الزھد باب فی احادیث متفرقہ

قرآن کی آیات میں اور صحیح الاسناد احادیث میں جب انس و جن کا مادہ تخلیق الگ الگ بیان ہوا ہے تو یہ دونوں کی نوعیت اور ماہیت کے تغایر کی کھلی دلیل ہے۔ اسی طرح سورہ احقاف اور سورہ جن کی مذکورہ آیات اور ان کی تشریح میں بخاری و مسلم کی مذکورہ حدیث رسول سے صراحت و وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جنات اوپر فضائے آسمانی میں جاکر فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ انسان تو اوپر نہیں جاسکتے الا یہ کہ خرق عادت اور معجزے کے طور پر اللہ کسی کو لے جائے جیسا کہ شب معراج میں اللہ اپنے رسول کو اوپر لے گئے تھے۔ مذکورہ قطعی نصوص کی تصریحات کے باوجود جو لوگ کہتے ہیں کہ جنات سے مراد انسانوں ہی کی ایک قسم ہے جو جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے ہیں۔ ان کا یہ قول قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ قرآن کی تحریف ہے بلکہ کھلا انحراف ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآنی آیات کی تصریحات' احادیث رسول کی تشریحات اور صحابہ و تابعین کی اجماعی تعبیر و تفسیر کے خلاف تعبیر و تشریح کرنا تحریف وانحراف نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

امام بخاریؒ نے کتاب بدء الخلق میں باب ذکر الجن وثوابہم وعقابہم کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں قرآنی آیات اور حدیث رسول سے جنات کا وجود اور ان کا مکلف ہونا ثابت کیا ہے۔ اس باب کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں :

وَ اَمَّا اِثْبَاتُ وُجُوْدِهِمْ فَقَدْ نَقَلَ اِمَامُ الْحَرَمَیْنِ فِی الشَّامِلِ عَنْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْفَلَاسِفَةِ وَالزَّنَادِقَةِ وَالْقَدَرِیَّةِ اَنَّهُمْ اَنْکَرُوْا وُجُوْدَهُمْ رَاْسًا قَالَ وَلَا یُتَعَجَّبُ مِمَّنْ اَنْکَرُوْا ذَالِكَ مِنْ غَیْرِ الْمُشَرِّعِیْنَ اِنَّمَا الْعَجَبُ مِنَ الْمُشَرِّعِیْنَ مَعَ نُصُوْصِ الْقُرْآنِ وَالْاَخْبَارِ الْمُتَوَاتِرَةِ.(۱)

"جنات کے وجود کے بارے میں امام الحرمین نے اپنی کتاب الشامل میں بہت سے فلاسفہ' زنادقہ اور قدریہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ان کے وجود سے بالکل انکار کیا ہے۔

(۱)فتح الباری کتاب بدء الخلق باب ذکر الجن و ثوابهم و عقابهم

امام الحرمین نے کہا ہے کہ شریعت کو نہ ماننے والوں کے انکار پر تو تعجب نہیں ہے لیکن تعجب شریعت کے ماننے والوں کے انکار پر ہے جو قرآنی نصوص اور احادیث متواترہ کے باوجود انکار کرتے ہیں۔"

امام الحرمین کا مقصد یہ ہے کہ فلسفے کا منبع وماخذ عقل انسانی ہے اور عقل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود حقائق کے ادراک میں خود کفیل اور غلطیوں سے معصوم نہیں ہے اسی لئے تو اللہ نے رسالت و نبوت کا سلسلہ چلایا تھا تاکہ عقل کی راہنمائی کرے اللہ کے نبی ورسول کے علوم و معارف کا منبع وماخذ وحی ہوتی تھی جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں تھا۔ فلسفی چونکہ وحی اور شریعت سے آزاد ہو کر سوچتے تھے اس لئے ان کا جنات کے وجود سے انکار کرنا قابل تعجب نہیں ہے لیکن جو لوگ قرآن وسنت اور شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اس کے باوجود جنات کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو ان کا انکار قابل تعجب ہے۔

جنات کے بارے میں فرقہ باطنیہ اور دور جدید کے متجددین کی تاویلات فاسدہ

باطنیہ کے نام سے ملحدین کا ایک فرقہ گزرا ہے جن کی دعوت کا سارا زور اس پر تھا کہ قرآن وسنت کے کچھ ظاہری معانی ہیں جن کی حیثیت چھلکے اور پوست کی ہے۔ جہلاء صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں صرف چھلکا اور پوست آیا ہے۔ حقائق کو یہ نہیں جانتے بلکہ ان الفاظ کے اصل معانی و مفاہیم اور حقائق کو صرف عقلاء جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے الفاظ دراصل رموز واشارات ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو حاصل ہوتا ہے عوام اور اہل ظواہر جو سمجھتے ہیں وہ مراد نہیں ہوتا۔ سلیمان علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ سورۃ سبا میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ.

یعنی ''بعض جنات سلیمان علیہ السلام کے سامنے اس کے رب کے حکم سے کام کرتے تھے۔''

اس آیت میں وَمِنَ الْجِنِّ کی تفسیر میں ابوحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے فرقہ باطنیہ کا قول نقل کر کے اسے تاویل فاسد کہا ہے:

وَمِنَ الْجِنِّ هُمْ نَاسٌ مِنْ بَنِيْ آدَمَ اَقْوِيَاءُ شَبَّهُوْا فِيْ قُوَاهُمْ بِالْجِنِّ وَ هٰذَا تَاوِيْلٌ فَاسِدٌ وَ خُرُوْجٌ بِالْجُمْلَةِ عَمَّا يَقُوْلُهٗ اَهْلُ التَّفْسِيْرِ فِي الْآيَةِ وَ تَعْجِيْزٌ لِلْقُدْرَةِ الْاِلٰهِيَّةِ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ.(۱)

''بعض باطنیہ کہتے ہیں کہ جن سے اولاد آدم ہی کے کچھ طاقتور لوگ مراد ہیں جن کو انہوں نے ان کی قوتوں کی وجہ سے جنات کے ساتھ تشبیہ دی ہے مگر یہ ایک فاسد تاویل ہے' اہل تفسیر نے آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے اس سے کلی طور پر خروج ہے اور اللہ کی قدرت کو کمزور سمجھنا ہے۔ نعوذباللہ۔''

قرآن و سنت کے الفاظ اور دینی اصطلاحات کے حقیقی معانی کو چھوڑ کر بغیر کسی قرینے اور دلیل کے اور بغیر کسی ضرورت کے مجازی معانی اختیار کرنا اور رموزواشارات پر محمول کرنا تحریف دین کا وہ دروازہ ہے جسے اگر چوپٹ کھول دیا جائے تو دینی عقائد اور شرعی احکام تبدیل ہو جائیں گے۔ یہی وہ سازش ہے جسے ہر دور کے محرفین اور متجددین نے اختیار کیا ہے مثلا قادیانیوں نے ختم نبوت' نزول مسیح اور دجال وغیرہ الفاظ کو تو بحال رکھا ہے اور ان دینی اصطلاحات کو تسلیم بھی کیا ہے لیکن ان الفاظ کے معانی متواترہ اور مفاہیم متوارثہ سے انکار کر کے نئے اور من گھڑت مفاہیم بیان کر کے اسلام کے نام پر کفر والحاد کا راستہ اپنایا ہے۔ لعنہم اللہ۔

(۱) البحر المحيط طبع دار الفكر بيروت ۱۹۸۳، ص ۲۶۵ ج ۷ سوره سبا ۱۲

یا مثلاً بہائیوں نے شرعی اصطلاحات کو بحال رکھ کر ان کے خود ساختہ معانی بیان کیئے ہیں اور یک ایسی نئی شریعت وضع کی ہے جس کا اسلامی شریعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

یا مثلاً سر سید احمد خان' مولوی چراغ علی' اسلم جیراجپوری اور مشہور منکر حدیث غلام احمد پرویز نے نبوت' وحی' ملائکہ' جنات وغیرہ دینی اصطلاحات کو الفاظ کی حد تک تو تسلیم کیا ہے لیکن ان کے جو معانی و مفاہیم اور حقائق دور نبوی سے لے کر آج تک امت میں تواتر و توارث کے ساتھ منقول چلے آرہے ہیں اور جو عربی مبین میں مروج بھی ہیں ان سے انکار کر کے اور ان کو مفسرین کی غلطی پر محمول کر کے نئے معانی بیان کیئے ہیں جو دراصل ان کے اپنے "خیالات فاسدہ" اور "افکار زائغہ" ہیں جن کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان زائغین اور متجددین کا زیغ اور تجدد یہ ہے کہ انہوں نے یورپ کے فلاسفہ کی تقلید جامد کرتے ہوئے ان کا یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ جو چیز دکھائی نہ دیتی ہو اور جس کا تجربہ نہ کیا جا سکتا ہو وہ موجود ہی نہیں ہے اور ایسی چیز کے وجود کو وہمی لوگ ہی تسلیم کرتے ہیں۔ عقلاء اسے تسلیم نہیں کرتے یعنی جو چیز نیچرلزم اور قانون فطرت کے خلاف ہو وہ ناقابل قبول ہے۔ بر صغیر میں نیچریت کا بڑا داعی سر سید احمد خان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قادیانیت' بہائیت' نیچریت اور پرویزیت کی تاویلات و تحریفات باطنیت ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ سر سید احمد خان بانی علی گڑھ یونیورسٹی متوفی ۱۸۹۸ء نے اپنی تفسیر القرآن کے حصہ سوم کے ص ۵۷ تا ۷۲ پر جنات کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"حضرت سلیمان کے قصہ کو مولوی چراغ علی نے جو عربی اور عبری زبان سے بخوبی واقف ہیں ایک رسالہ میں نہایت عمدگی سے لکھا ہے جس کو ہم حضرت سلیمان کے قصہ میں بہ تفصیل لکھیں گے اس مقام پر صرف اتنا بتانا مقصود تھا کہ ان آیات میں جو جن کا لفظ آیا ہے اس سے وہ پہاڑی اور جنگلی آدمی مراد ہیں جو حضرت سلیمان کے ہاں بیت المقدس بنانے میں

کام کرتے تھے۔اور جن پر بہ سبب وحشی و جنگلی ہونے کے جو انسانوں سے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے رہتے ہیں اور نیز بہ سبب قوی' طاقتور اور محنتی ہونے کے جن کا اطلاق ہوا ہے۔پس ان سے وہ جن مراد نہیں ہیں جن کو مشرکین نے اپنے خیالات میں ایک مخلوق معہ ان اوصاف کے جو ان کے ساتھ منسوب کئے ہیں مانا ہے اور جن پر مسلمان بھی یقین کرتے ہیں۔"(۱)

جب قرآن عربی میں نازل ہوا ہے اور عرب جن کو انسانوں سے الگ مخلوق سمجھتے تھے۔ قرآن نے جنات کے بارے میں ان کے مشرکانہ عقائد کی تردید تو کی ہے لیکن جنات کے وجود کے بارے میں ان کے قول کی تردید نہیں کی بلکہ رسول اللہ ﷺ' صحابہ و تابعین اور امت مسلمہ نے جنات کے وجود کو تسلیم کیا جیسا کہ قرآنی آیات اور اخبار متواترہ سے ثابت ہے اور خود آپ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ "مسلمان بھی یقین کرتے ہیں" تو آخر آپ کو کونسی مجبوری پیش آگئی تھی کہ مسلمانوں کے خلاف رائے قائم کی اور جنات کو وحشی اور جنگلی انسان قرار دیا؟ آخر آپ کے پاس قرآن و سنت کی نصوص کی اجماعی تعبیر کے خلاف اس بات کی دلیل کیا ہے کہ جنات سے جنگلی انسان مراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ یورپ کے فلاسفہ کے اندھی تقلید تو شرعی اور عقلی دلیل نہیں ہے بلکہ غلامانہ ذہنیت ہے جس میں آپ نے اپنے آپ کو اور اپنے اتباع کو مبتلا کر رکھا ہے۔

سرسید نے امت مسلمہ کے خلاف اپنے دعوے کی ایک دلیل یہ پیش کی ہے کہ بائبل کی کتاب سلاطین اول کے باب پنجم میں پایا جاتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے "حیرام" "صور" کے بادشاہ سے جنگلوں سے لکڑی کاٹنے کے لئے آدمی مانگے تھے اور کتاب تواریخ دوم میں پایا جاتا ہے کہ صور کے بادشاہ نے ایک کاریگر سلیمان کے ہاں کام کرنے کے لئے بھیجا تھا

---

(۱)تفسیر القرآن از سرسید احمد خان طبع دوست ایسوسی ایٹس الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ص٦٧-٦٨ ج٣

اور سلیمان علیہ السلام نے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے غیر اسرائیلی لوگوں میں سے ۷۰ ہزار آدمیوں کو حمالی پر اور ۸۰ ہزار کو درخت کاٹنے اور پتھر تراشنے پر متعین کیا تھا۔ اور یہی جنگلی لوگ اور صور کے بادشاہ کے بھیجے ہوئے آدمی اور کاریگر جنات ہیں اور انہی کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے کہ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ۔(۱)

اگرچہ بائیبل کا حوالہ دلیل نہیں بن سکتا اس لئے کہ یہ ایک تحریف شدہ کتاب ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی جو بات قرآن وسنت کے خلاف ہو اس کی تصدیق نہ کرو بلکہ اس کی تکذیب کرو۔ لیکن اس کے باوجود میں نے جب بائیبل سوسائٹی انارکلی کی ۱۹۸۷ء میں طبع کردہ بائیبل کی طرف رجوع کیا اور اس کی کتاب سلاطین اول کے باب پنجم کی پوری ۱۸ آیات کا توجہ کی ساتھ مطالعہ کیا اور تواریخ دوم کے باب دوم کو بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بات کسی مقام پر بھی نہیں آئی کہ انہی انسانوں کو جنات کہا جاتا تھا اور نہ کسی جگہ تسخیر جن کی نفی کی گئی ہے۔ قرآن وسنت نے تو صرف یہ کہا ہے کہ بعض جن بھی اللہ کے حکم سے سلیمان علیہ السلام کے سامنے کام کرتے تھے۔ آخر انسانوں کے کام کرنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ جنات کام نہیں کرتے تھے بلکہ یہی انسان جنات تھے؟ جنگلی انسانوں کو نہ تورات نے جن کہا ہے اور نہ قرآن نے جن کہا ہے بلکہ یہ سرسید کا اپنا تصور ہے۔

سرسید نے دوسری دلیل یہ پیش کی ہے کہ عربوں میں ایک مثال مشہور ہے کہ :

أَجَنَّ اللّٰهُ جِبَالَه' أَىْ أَكْثَرَ اللّٰهُ فِيْهِ الْجِنَّ أَىْ أَوْحَشَهَا .

"اللہ نے اس کے پہاڑوں میں بڑے وحشی جن زیادہ کر دیئے ہیں۔"

لیکن آخر پہاڑوں میں بڑے سرکش اور وحشی جنات کی کثرت سے یہ کیسے ثابت کیا جا رہا ہے کہ جنات سے وحشی انسان مراد ہیں؟ جنات تو اکثر پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے ہیں اور

(۱) تفسیر القرآن از سرسید طبع مذکور ص ۶۷ ج ۳

ان میں وحشی اور سرکش بھی ہوتے ہیں اور غیر وحشی بھی ہوتے ہیں۔ اس مثال میں تو اس بات کا اشارہ تک موجود نہیں ہے کہ پہاڑی جنات سے پہاڑی انسان مراد ہیں۔ اسی طرح سرسید نے جاہلی شعراء نابغہ ذبیانی اور زہیر بن ابی سلمیٰ کے چار اشعار پیش کئے ہیں جن میں طاقتور اور جوشیلے انسانوں کو جنات سے تشبیہ دی گئی ہے جیسے بہادر اور دلیر انسان کو استعارتاً شیر کہا جاتا ہے لیکن تعجب ہے کہ سرسید نے اتنا نہیں سوچا کہ تشبیہ کا تو تقاضیٰ ہی یہ ہوتا ہے کہ مشبہ الگ چیز ہو اور مشبہ بہ الگ چیز ہو اور دونوں کے درمیان ایک صفت میں اشتراک ہو۔ اگر شیر کے ساتھ انسان کی تشبیہ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیر انسان ہی کی ایک قسم ہے توانسان کو قوت اور وحشت میں جنات کے ساتھ تشبیہ دینے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ جن انسان ہی کی ایک قسم ہے ؟ انسانوں کو استعارتاً جن کہنا یا اسد کہنا یا ملک کہنا عربی ہی میں نہیں دنیا کی ہر زبان میں مروج ہے مگر اس استعارے سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ سب انسانوں ہی کی قسمیں ہیں۔ سورہ نمل میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا آتِيْكَ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (النمل ۳۹)

"اور کہا ایک شریر اور سرکش جن نے کہ میں لے آؤں گا اس تخت کو آپ کے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے۔"

سرسید کہتے ہیں کہ اس جگہ عفریت سے ایک "قوی اور مضبوط پہاڑی آدمی مراد ہے" اس لئے کہ قاموس میں لکھا ہے کہ عِفْرِیت کہتے ہیں رَجُلٌ کَامِلٌ ضَابِطٌ قَوِیٌّ ۔ یعنی "موٹے مسٹنڈے مضبوط آدمی کو عفریت کہتے ہیں۔"(۱)

افسوس ہے کہ اتنا بڑا سکالر اتنی گری ہوئی طفلانہ باتیں کرتا ہے۔ قاموس میں تو عفریت کو خَبِیْثٌ مُنْکَرٌ بھی کہا گیا ہے اور مفردات راغب میں اس کے معنے کئے گئے ہیں عَارِمٌ خَبِیْثٌ یعنی "سرکش اور شریر و خبیث جن" البتہ اس لفظ کا اطلاق چونکہ قوی اور

---

(۱) تفسیر القرآن از سرسید ص۶۹ ج۳

مضبوط آدمی پر بھی ہو سکتا ہے اس لئے من الجن کا اضافہ کیا گیا تا کہ اسے کوئی شخص انسان نہ سمجھ لے۔

جیسا کہ ابو حیان نے البحر المحیط میں کہا ہے :

وَلَمَّا كَانَ يُوصَفُ بِهِ الْإِنْسُ خُصَّ بِقَوْلِهِ مِنَ الْجِنِّ.

"جب عفریت سے انسان کو بھی متصف کیا جا سکتا ہے اس لئے من الجن کی تخصیص کی گئی۔" (تا کہ کوئی اس سے انسان مراد نہ لے سکے)

سورۃ الاحقاف اور سورۃ الجن میں جن جنات کا ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے قرآن سن کر اسلام قبول کر لیا تھا اور شرک سے توبہ کر لی تھی۔ سر سید ان کے بارے میں کہتا ہے کہ :

"عرب کے مشرکین کی عادت یہ تھی کہ وہ چھپ چھپ کر آنحضرت ﷺ کی باتیں سنا کرتے تھے بھید لینے اور غمازی کرنے کو انہی لوگوں میں سے چند آدمیوں نے جب آنحضرت ﷺ کو قرآن پڑھتے سنا تو ان کے دل پر اثر ہوا اور انہوں نے اس کو سچ اور منزل من اللہ جانا انہی کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔"

اس دعوے کے ثبوت میں انگریزوں کے اس "سر" نے دلیل یہ دی ہے کہ :

"اسی سورہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے بعض عیسائی تھے بعض عرب کے بت پرست تھے، بعض یہودی تھے اور بعض آتش پرست تھے اور تفسیر کبیر میں حسن بصری کا قول نقل ہوا ہے کہ اِنَّ فِيهِمْ يَهُوْدًا وَ نَصَارىٰ و مَجُوْسًا وَ مُشْرِكِيْنَ کہ ان میں یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین سب موجود تھے۔ اس قول سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سننے والے انسان تھے نہ جن بمعنی متعارف اور یہ کہنا کہ جنوں میں بھی یہودی اور عیسائی اور آتش پرست اور مشرکین ہوئے ہیں۔ ایک ایسی بات ہے کہ جس کو کوئی ذی عقل تو نہیں کہہ سکتا۔" (۱)

---

(۱) تفسیر القرآن ص ۶۹ تا ۷۱ ج ۳

سورہ جن کی آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے اس کا ذکر تو حسن بصریؒ نے بجا طور پر کیا ہے کہ جنات میں یہودی' نصرانی' آتش پرست اور مشرکین سب موجود ہیں لیکن آپ نے یہ بات کہاں سے معلوم کر لی کہ یہ لوگ جن بمعنی متعارف نہیں تھے بلکہ انسان تھے ؟ اور آپ کی یہ بات کہ جنات میں یہودی' نصاریٰ' مجوسی اور مشرکین تسلیم کرنا ایسی بات ہے کہ جس کو کوئی ذی عقل نہیں کہہ سکتا جائے خود بہت بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ آخر جس بات کو قرآن نے تسلیم کیا ہو' رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کیا ہو' صحابہ و تابعین نے تسلیم کیا ہو اور پوری امت نے تسلیم کیا ہو اسے بے عقلی کی بات کہنا بہت بڑی بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے ؟

سورہ جن کی آیت ۸۔۹ میں کہا گیا ہے کہ :

"ہم نے جب آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت چوکیداروں اور آگ کے شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔ حالانکہ اس سے پہلے ہم آسمان کے مختلف مقامات پر باتیں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو کوئی سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے آگ کا ایک شعلہ تیار پاتا ہے۔"

اس کے بارے میں سر سید کہتا ہے کہ :

"اس بات کے کہنے والے مجوسی آتش پرست تھے۔ اس فرقہ کے پیشوا نجوم پر یقین رکھتے تھے اور ستاروں کے مقامات سے غیب کی خبریں دیتے تھے۔"(۱)

محرفین کی عادت یہ ہے کہ اپنے ذہن میں ایک بات بنا لیتے ہیں اور پھر اسی بات کو قرآن کی تفسیر قرار دے دیتے ہیں خواہ قرآن کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ اس جگہ بھی سر سید نے اپنی ایک خیالی اور تصوراتی بات کو قرآن کی تفسیر قرار دیا ہے اور سوچا تک نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ میری اس توجیہ پر منطبق ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ سورہ جن کی مذکورہ بالا آیات میں آسمان کو ٹٹولنے اور آسمان کے مختلف مقامات پر جا کر بیٹھنے کا ذکر ہوا ہے۔ اگر یہ بات کہنے والے آتش پرست اور نجومی انسان تھے تو وہ آسمانوں کو کیسے جاتے تھے ؟ کیا وہ

(۱) تفسیر القرآن ص ۷۰ ج ۳

ہوائی جہاز یا خلائی جہاز میں بیٹھ کر اوپر جاتے تھے؟ علم نجوم کے ذریعے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا ذکر تو ان آیات میں ہوا ہی نہیں ہے بلکہ ان میں اوپر جا کر چوری چھپے خبریں سننے کا ذکر ہوا ہے۔ اور "شہب ثاقبہ" کی مار پڑنے کا ذکر ہوا ہے۔ آیات کے سیاق و سباق، نظم و تالیف کلام اور احادیث صحیحہ میں بیان کردہ تفسیر کو یکسر نظر انداز کر کے من مانی اور من گھڑت تفسیر کرنا اور غیر متعلقہ چیز کو آیات کے مفہوم میں زبردستی داخل کرنا آخر تفسیر کا کونسا طریقہ ہے؟ ایسی تفسیر تو کوئی معقول انسان نہیں کر سکتا۔ درحقیقت یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔

قرآن کریم کی ۱۴ آیات میں جن و انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں اور ایک دوسرے پر عطف ہوئے ہیں یہ آیات درج ذیل ہیں:

الانعام ۱۱۲۔۱۳۰	الاعراف ۳۸۔۱۷۹
بنی اسرائیل ۸۸	النمل ۱۷
فصلت ۲۵۔۲۹	الاحقاف ۱۸
الرحمان ۳۳۔۳۹۔۵۶۔۷۴	الذاریات ۱۸

عطف کا تقاضیٰ یہ ہوتا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ متغائرین ہوں مگر ان کے درمیان کوئی مناسبت بھی ہو اور قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جن کا مادہ تخلیق آگ ہے اور یہ دونوں الگ الگ نوعیت رکھتے ہیں مگر مخلوق اور مکلف ہونے میں دونوں مشترک ہیں لیکن سر سید عرلی کے اس معروف و معلوم قاعدے کے بالکل برعکس الٹی گنگا بہانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"دونوں لفظوں کے ساتھ لانے سے ہر قسم کے اور ہر درجہ کے آدمیوں کا حصر مقصود ہے خدا پر اور اس کے احکام پر ایمان لانے اور اعمال بد کی سزا پانے میں۔ کیونکہ شہری و دیہاتی، وحشی و انسی، تربیت یافتہ اور ناتربیت یافتہ اور مہذب و نامہذب سب کے سب اس پر مکلف

ہیں۔"(۱)

عطف الخاص علی العام اور تخصیص بعد التعمیم کا قاعدہ بھی اگرچہ موجود ہے لیکن یہ قاعدہ اس وقت جاری ہوتا ہے جب کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ معطوف معطوف علیہ کی ایک قسم ہے لیکن جب یہ ثابت نہ ہو تو عطف کا تقاضیٰ یہی ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ الگ الگ نوعیتیں رکھتے ہیں اور ان کی ماہتیں بھی الگ الگ ہیں مگر یہاں پر تو انس و جن کا تغائر اور ان کی ماہیتوں کا تنوع قرآنی آیات سے ثابت ہے تو ان آیات میں تخصیص بعد التعمیم کا قاعدہ کس طرح جاری ہو سکتا ہے ؟

مشہور منکر حجیت حدیث غلام احمد پرویز دین اسلام کی آزادانہ تعبیر و تحریف میں اور تجدد فی الدین میں سرسید سے بھی دو قدم آگے تھے۔ جنات کی حقیقت کے بارے میں اس کی رائے بھی وہی ہے جو سرسید کے مکتب فکر کی ہے چنانچہ پرویز لکھتے ہیں :

"انسانی آبادیاں قدیم الایام سے دو حصوں میں منقسم چلی آرہی ہیں۔ ایک آبادی وہ جو شہری اور تمدنی زندگی بسر کرتی ہے اور دوسری وہ جو جنگلوں اور صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتی ہے اب تو اس ثانی الذکر آبادی کی تعداد گھٹتی چلی جارہی ہے۔ اور ذرائع مواصلات کے عام ہو جانے سے ان میں باہمی میل جول بھی بڑھ رہا ہے لیکن یہ آبادی بڑی کثیر التعداد ہوتی تھی اور رسوم ورواج اور بود وباش کے طور طریقوں میں شہری آبادی سے بالکل مختلف تھی۔ عربوں کے ہاں خصوصیت سے یہ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے متمیز تھیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے' رسوم وعادات' معاشرتی ومعاشی انداز بالکل جداگانہ۔ ان کے ہاں الانس اس قبیلے کو کہتے تھے جو ایک جگہ مقیم ہو یعنی شہری آبادی اور الجن ان لوگوں کو جو ان شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل صحرا نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ دونوں گروہ انسانوں پر مشتمل تھے اور انھی کو قرآن نے انس وجن کہہ کر پکارا ہے۔"(۱)

---

(۱) تفسیر القرآن ص ۷۱۔۷۲ ج ۳

(۱) مطالب القرآن از پرویز طبع ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۴۱۔۴۲ ج ۲

ضلالت و جہالت کے اس نظریئے کا ابطال ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں لیکن اس پر اتنا اضافہ کیا جاتا ہے کہ یہ پرویزی نظریہ بالکل خود ساختہ اور من گھڑت ہے کہ عرب شہری آبادی کو الانس اور صحرائی آبادی کو الجن کہتے تھے۔ اس کے برعکس الجن کو انسانوں سے ماہیت و حقیقت میں الگ مخلوق سمجھتے تھے۔ قرآن نے جنات کے متعلق ان کے مشرکانہ اور توہم پرستانہ عقائد و اوہام کی تو تردید کی ہے لیکن جنات کے انسانوں سے الگ مخلوق ہونے کی تردید نہیں کی بلکہ تائید کی ہے جیسا کہ تفصیلی مباحث اور دلائل پہلے بیان کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ سر سید' غلام احمد پرویز اور دوسرے متجددین و منحرفین کا جنات کو صحرائی اور جنگلی انسان قرار دینا قرآن و سنت کی نصوص قطعیہ اور امت مسلمہ کے اجماعی نظریہ کے خلاف ہے اور ضلالت ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا.

(۷) فرشتوں کی شہادت :

ساتویں نقلی دلیل ملائکہ کی شہادت ہے جسے قرآن کریم نے توحید کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اور اللہ کے معزز و مکرم اور معصوم بندے ہیں اس لئے ان کی شہادت بڑی قوی دلیل ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے :

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلَآئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمِ. (آل عمران ۱۸)

"اللہ نے گواہی دی ہے کہ نہیں ہے کوئی بھی عبادت کے لائق مگر وہی ہے اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی اسی بات کی گواہی دی ہے اور وہ (اللہ) انصاف کو قائم رکھنے والا ہے۔ نہیں ہے کوئی بھی عبادت کے لائق مگر وہی ہے جو غالب ہے اور حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں توحید کے اثبات کے لئے تین شہادتیں پیش کی گئی ہیں ایک تو خود اللہ کی شہادت ہے' دوسری ملائکہ کی شہادت ہے اور تیسری اہل علم کی شہادت۔

اللہ کی گواہی یہ ہے :

بَيَّنَ وَحْدَانِيَّتَه' بِنَصْبِ الدَّلَائِلِ الدَّالَّةِ عَلَيْهَا وَ اِنْزَالِ الْآيَاتِ الْقَاطِعَةِ بِهَا۔(۱)

"اس نے اپنی وحدانیت واضح کی ہے عقلی دلائل قائم کرنے کے ذریعے جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔ (آیات کونیہ) اور آیات نازل کرنے کے ذریعے جو توحید پر قطعی الدلالت ہیں۔"

اور فرشتوں اور اہل علم کی گواہی یہ ہے کہ وہ توحید پر ایمان رکھتے ہیں' اس کا اقرار کرتے ہیں اور اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ مسند احمد میں زبیر بن عوامؓ سے مروی ہے کہ :

"میں نے عرفات میں رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّه' لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ الآية جب آیت ختم ہوئی تو آپ نے فرمایا وَ اَنَا اَشْهَدُ اَىِ رَبِّ "اے میرے رب میں بھی اسی بات کی گواہی دیتا ہوں۔"(۲)

دوسری آیت میں اللہ اور فرشتوں کی شہادت کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ :

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَه بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا. (النساء ۱۶۶)

(یہود تو گواہی نہیں دیتے) "لیکن اللہ خود گواہی دیتا ہے اس کتاب کے بارے میں جو اس نے تیرے پاس اتاری ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے علم سے اتاری ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں (کہ یہ کتاب اللہ کے علم سے اتری ہے) اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔"

اللہ کی گواہی تو یہ ہے کہ اس نے اس کتاب کو اپنے علم سے معجزہ بنا کر نازل کیا ہے جس کی مثال پیش کرنے سے تمام جن وانس عاجز ہیں اور فرشتوں کی گواہی یہ ہے کہ وہ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا مرکزی مضمون توحید ہے اس لئے اس کتاب کے نزول کی شہادت دینا دراصل توحید کی شہادت دینا ہے۔ تیسری آیت میں ملائکہ کے ایمان بالتوحید کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے :

(۱) تفسیر بیضاوی سورۃ آل عمران ۱۸

(۲) مسند احمد ص۱۶۶ ج۱

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا. (النساء ۱۷۲)

"ہرگز عار نہیں کرتے مسیح علیہ السلام اللہ کا بندہ ہونے سے اور نہ اللہ کے مقرب فرشتے' اور جو لوگ بھی اللہ کی عبادت سے عار کریں گے اور تکبر کریں گے تو اللہ ان سب کو عنقریب اپنے پاس جمع کر دے گا۔"

یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ مقربین توحید کو اور اللہ کی عبادت کو اپنے لئے بہت بڑا شرف اور اعزاز سمجھتے ہیں اس لئے کہ کرامت و شرافت کے مراتب میں سے سب سے بڑا مرتبہ اللہ کی عبدیت ہے۔

ملائکہ کی حقیقت

ملائکہ انس و جن سے الگ ایک مخلوق ہے جو نور سے پیدا ہوئی ہے' یہ اللہ کے معزز و مکرم بندے ہیں' اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے' اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور گناہوں سے معصوم ہیں' ان کے دو۔ دو' تین۔ تین یا چار۔ چار پر ہیں اور بعض کے اس سے بھی زیادہ پر ہیں لیکن ان پروں کی حقیقت ہم کو معلوم نہیں ہے۔ ان کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ انسانی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے' حضرت مریم کے سامنے فرشتہ ایک صحت مند انسان کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام اکثر دحیۃ الکلبی کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ فرشتوں کی متعین تعداد تو قرآن و حدیث میں بیان نہیں ہوئی لیکن یہ مختلف کاموں پر مامور ہیں۔ بعض پیغام رسانی پر مامور ہیں جیسے روح الامین یعنی جبریل امین' بعض آب رسانی یعنی بارش کے انتظام پر مامور ہیں' بعض "صور" کو منہ میں لئے حکم کے انتظار میں کھڑے ہیں' بعض ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں' بعض انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں' بعض

عمل نامے لکھنے اور انسانی اعمال کا ریکارڈ تیار کرنے پر مامور ہیں' بعض جنت کے چوکیدار ہیں' بعض دوزخ کے پہرہ دار ہیں' بعض ایمان والوں کو موت کے وقت اور قیامت کے دن بشارت دینے پر مقرر ہیں اور بعض دوسرے کاموں پر مقرر ہیں۔ صحیح مسلم میں عائشہؓ سے مروی ہے کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ترمذی' ابن ماجہ اور مسند بزار میں ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

"آسمان چرچرا رہا ہے اور اسے چاہئے کہ چرچرائے اس لئے کہ اس پر چار انگلی کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی فرشتہ سجدے میں نہ پڑا ہو۔"

طبرانی میں جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

"آسمان میں ایک قدم' ایک بالشت اور ایک ہتھیلی کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی فرشتہ' قیام' رکوع یا سجود میں مصروف نہ ہو۔"

حدیث معراج میں آیا ہے کہ "بیت المعمور" میں روزانہ ۷۰ ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ انہی دلائل کی بنیاد پر حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ :

قَالَ جُمْهُوْرُ اَهْلِ الْكَلَامِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَلْمَلَائِكَةُ اَجْسَامٌ لَطِيْفَةٌ اُعْطِيَتْ قُدْرَةً عَلَى التَّشَكُّلِ بِاَشْكَالٍ مُخْتَلِفَةٍ وَ مَسْكَنُهَا السَّمٰوٰتُ وَ اَبْطَلَ مَنْ قَالَ اِنَّهَا الْكَوَاكِبُ اَوْ اِنَّهَا الْاَنْفُسُ الْخَيِّرَةُ الَّتِيْ فَارَقَتْ اَجْسَادَهَا وَغَيْرَ ذَالِكَ مِنَ الْاَقْوَالِ الَّتِيْ لَا يُوْجَدُ فِي الْاَدِلَّةِ السَّمْعِيَّةِ شَيْءٌ مِنْهَا.... وَ فِيْ هٰذَا وَ مَا وَرَدَ مِنَ الْقُرْآنِ رَدٌّ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ وُجُوْدَ الْمَلَائِكَةِ مِنَ الْمُلَاحِدَةِ.(۱)

"مسلمانوں کے جمہور علماء اہل کلام نے کہا ہے کہ فرشتے لطیف نورانی اجسام ہیں جن کو مختلف اشکال اختیار کرنے کی طاقت دی گئی ہے اور ان کا ٹھکانا آسمانوں میں ہے اور جھوٹ بولا ہے جس نے کہا ہے کہ فرشتوں سے مراد ستارے ہیں (جو ان کے نزدیک قوۃ عاقلہ رکھتے

---

(۱) فتح الباری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکة ص ۱۱۱-۱۱۲ ج ۷

ہیں) یا ان سے مراد وہ نیک ارواح ہیں جو اپنے اجسام سے جدا ہو گئے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے وہ اقوال بھی باطل ہیں جو نقلی اور سمعی دلائل میں یعنی قرآن و سنت میں نہیں پائے جاتے.... ان احادیث سے اور اس موضوع پر نازل شدہ قرآنی آیات سے ان ملحدین کے قول کی تردید ہوتی ہے جو ملائکہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔"

ملائکہ کے بارے میں متجددین کے اقوال باطلہ

ملائکہ کے بارے میں قرآن و سنت کی نصوص کی روشنی میں امت مسلمہ نے جو نظریہ اور عقیدہ قائم کیا ہے اس کا ذکر تو سابقہ عنوان کے تحت کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں متجددین کے افکار زائغہ اور اقوال باطلہ کا ذکر اور ان پر تبصرہ بھی ضروری ہے تاکہ علوم القرآن کے قارئین حق کے مقابلے میں باطل کو بھی پہچان سکیں اور اس کی تردید کر سکیں۔ علماء دین کا "علوم دینیہ" کے ساتھ "فتن عصریہ" سے آگاہ اور باخبر رہنا بھی ضروری ہے اس لئے کہ باطل کی تردید کے لئے اس سے آگاہ ہونا لازمی شرط ہے۔

شیخ محمد عبدہ اور اس کے تلامذہ کا تجدد

مصر کے شیخ محمد عبدہ کا ذہن چونکہ تجدد کے جراثیم سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا اس لئے اس نے پہلے تو ملائکہ کے بارے میں "سلف صالحین" اور "ائمۃ المسلمین" کے عقیدے کی صحیح ترجمانی کی ہے لیکن بعد میں ان کے قول کے مقابلے میں دوسرا قول نقل کر کے کہا ہے کہ اس کو اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دوسرا قول قرآن و سنت کی نصوص سے متصادم ہے۔ مگر مصر کے یہ شیخ فرماتے ہیں کہ مادہ پرستوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور ملائکہ کے تصور کو ان کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے اس قول کو بھی اختیار کیا

جاسکتا ہے۔ مادہ پرستوں کے اطمینان کے لئے اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کو مروجہ اصطلاحات میں اور جدید طرز استدلال میں بیان کرنا تو ضروری اور دعوت حق کا تقاضیٰ ہے لیکن باطل کو حق کا لباس پہنا کر پیش کرنا اور باطل کے ساتھ مفاہمت کے لئے حق کو اپنی اصل شکل میں پیش نہ کرنا علماء ربانیین کا طریقہ نہیں ہے۔

شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں سید رشید رضا اور احمد مصطفیٰ المراغی نے ان کے قول ثانی کو جس طرح نقل کیا ہے اس کا خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ:

"اشیاء عالم کی طبعی اور فطری قوتیں جو قانون فطرت (نیچر لزم) کے مطابق تخلیق کے وقت ان میں پیدا کی گئی تھیں جو آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتیں یہی مخفی طبعی اور فطری قوتیں ملائکہ ہیں جنہوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا یعنی ان کے لئے تابع اور مسخر ہو گئی تھیں۔ ملائکہ کے بارے میں دوسری احتمالی توجیہ شیخ محمد عبدہ نے یہ بھی تسلیم کی ہے کہ انسان کے اندر جو قوائے ملکیہ یعنی خیر کی قوتیں رکھی گئی ہیں وہ ملائکہ ہیں اور جو قوہ بہیمیہ یعنی شر کی قوت رکھی گئی ہے وہ شیطان اور ابلیس ہے۔ آدم کو ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ قوۃ ملکی آدم کی تابع ہو گئی اور ابلیس کے انکار سے مراد یہ ہے کہ بہیمی اور شیطانی قوت نے سرکشی اختیار کر لی۔"(۱)

علامہ رشید رضا نے اپنے شیخ کی تائید میں امام غزالیؒ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ انہوں نے بھی داعی الی الخیر کو ملک کہا ہے اور داعی الی الشر کو شیطان کہا ہے۔ لیکن یہ حوالہ تَوْجِیْهُ الْقَوْلِ بِمَا لَا یَرْضٰی بِهٖ صَاحِبُه' پر مبنی ہے یعنی کسی قول کی وہ توجیہ و تشریح کرنا جو اس کے قائل کی مراد نہ ہو اور وہ اسے پسند نہ کرتا ہو۔ امام غزالیؒ نے جس عنوان کے تحت یہ بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ:

بَیَانُ تَسَلُّطِ الشَّیْطَانِ عَلَی الْقَلْبِ بِالْوَسَاوِسِ.

(۱) المنار از سید رشید رضا ص۲۶۷۔۲۶۸ ج۱ المراغی ص۸۶۔۸۷ ج۱ ملخصا

اس عنوان کے تحت امام غزالی نے مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ :

"دل کی مثال ایسے گنبد کی ہے جس کے کئی دروازے ہوں جن کی وجہ سے اسے مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہو' یا جس کی مثال ایک نشانے اور ہدف کی ہے جس پر چاروں طرف سے تیر اندازی ہو رہی ہو' یا جس کی مثال ایک آئینے کی ہے جس میں قسم قسم کی تصویریں آتی جاتی ہوں' یا جس کی مثال ایک تالاب کی ہے جس میں مختلف نہروں سے پانی ڈالا جا رہا ہو۔ قلب کی تغیرات و تاثرات کے اسباب حواس خمسہ بھی ہیں اور خواطر القلوب بھی ہیں۔ خواطر سے میری مراد مختلف خیالات و افکار ہیں جو قلوب میں آتے جاتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ اچھے خیالات وافکار کو "الہام" کہا جاتا ہے اور برے خیالات وافکار کو "وسواس" کہا جاتا ہے۔

یہ بات تو تم کو معلوم ہی ہے کہ ان خیالات وافکار کے کچھ اسباب ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی حادث محدث کے بغیر اور کوئی بھی مسبب سبب کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ جب حوادث اور واقعات مختلف ہوں گے تو ان کے اسباب بھی مختلف ہوں گے۔ مثلاً جب آگ کی روشنی سے گھر کی دیواریں روشن ہو جائیں اور اس کی چھت دھوئیں سے سیاہ ہو جائے تو تم سمجھ لوگے کہ سیاہی کا سبب الگ ہے اور روشنی کا سبب الگ ہے۔ "داعی الی الخیر" یعنی دل میں اچھے خیالات ڈالنے والا ملک ہے اور "داعی الی الشر" یعنی دل میں برے خیالات ڈالنے والا شیطان ہے' دل کے اندر قوۃ ملکی بھی ہے جو خیر کو قبول کرتی ہے اور اس کے قبول کرنے کو توفیق کہتے ہیں اور اس کے اندر شیطانی قوۃ بھی ہے جو شر کو قبول کرتی ہے اور اس کے قبول کرنے کو خذلان کہتے ہیں۔"(۱)

میں نے غزالیؒ کی اس بحث کا خلاصہ مفہوم نقل کر دیا ہے اور حوالہ بھی دیدیا ہے تاکہ

---

(۱)احیاء العلوم کتاب شرح عجائب القلب و بیان تسلط الشیطان علی القلب بالوسائس طبع بیروت ۱۹۸۶ء ص۲۹ ج۳

کتاب میں اصل عبارت نکال کر تحقیق کرنے والے خود بھی تحقیق کر سکیں کہ آخر اس عنوان کے تحت کہاں لکھا ہوا ہے کہ اشیاء عالم کے قوائے طبیعیہ یعنی نیچر یا انسان کی قوائے ملکیہ یعنی خیر کی قوتیں ہی ملائکہ ہیں اور قوائے بہیمیہ یعنی شر کی قوتوں ہی کا نام شیطان ہے۔

اس عبارت میں تو صراحت و وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ خیر کا الہام فرشتے کی جانب سے ہوتا ہے اور شر کا وسوسہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔ یہی بات ایک حدیث میں بھی آئی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ بھی لگا ہوا ہے جو اسے خیر پر آمادہ کرتا ہے اور ایک شیطان بھی لگا ہوا ہے جو اسے شر پر آمادہ کرتا ہے۔ ملَک باہر سے خیر کا الہام کرتا ہے اور قوت ملکیہ اسے قبول کرتی ہے اور شیطان باہر سے وسوسے ڈالتا ہے اور قوۃ بہیمیہ اسے قبول کرتی ہے۔ ملک اور شیطان کا الگ وجود ہے اور قوۃ ملکیہ اور قوۃ بہیمیہ کا الگ وجود ہے۔ حیرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بہت بڑی علمی خیانت اور تلبیس ہے جس کا ارتکاب علامہ رشید رضا نے اپنے شیخ کی غلطیات کو ثابت کرنے کے لئے کیا ہے۔ لیکن جدت پسندوں کی ہر دور میں یہ عادت رہی ہے کہ قرآن و سنت کی صریح الدلالت نصوص کو دور دراز کی تاویلات واستعارات اور رموز واشارات پر محمول کر کے اپنے اھواء نفس کے تابع بناتے ہیں اور بعض مشاہیر اسلام کے نام بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے تو ملائکہ کے بارے صحیح عقیدے کا ذکر بھی کیا ہے اور مادہ پرستوں کے باطل نظریے کو بھی قابل تسلیم قرار دیا ہے۔ لیکن سر سید احمد خان متوفی ۱۸۹۸ء نے سورۃ بقرہ میں قصہ آدم وابلیس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہوا ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کی پیدا کی ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے۔ جن میں سے ایک شیطان اور ابلیس بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوہ نمو، برق کی قوۃ جذب ودفع غرض یہ کہ تمام قویٰ جن سے مخلوقات

موجود ہوئی ہیں اور وہ مخلوقات میں ہیں وہ ملائک اور ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں جو ہر قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہی انسان کے فرشتے اور ان کی ذریات' اور وہی انسان کے شیطان اور اس کی ذریات ہیں۔"(۱)

سر سید کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات اور اشیاء عالم کی پوشیدہ قوتوں کا نام ملائکہ ہے اور انسان کی قوائے ملکیہ ملائکہ ہیں اور قوائے بہیمیہ شیاطین ہیں اور آدم و ابلیس کا قصہ دو اشخاص کا قصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے۔ ملائکہ کے سجدے سے مراد یہ ہے کہ نیکی کی قوتوں نے نوع انسانی کی اطاعت اختیار کی ہے اور ابلیس کے انکار سے مراد یہ ہے کہ بدی کی قوتوں نے نوع انسانی سے بغاوت کی ہے۔ سر سید نے لکھا ہے کہ بعض اکابر اہل اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں اور امام محی الدین ابن عربی نے "فصوص الحکم" میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔(۲)

اس بے بنیاد دعوے کا جواب ابو محمد عبدالحق حقانی نے تفسیر حقانی میں خود سر سید کی نقل کردہ عبارات کی روشنی میں دیا ہے جو درج ذیل ہے :

"قولہ قَالَ الشَّيْخُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ فُصُوْصِ الحِكَمِ" وَ كَانَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ بَعْضِ قُوَىٰ تِلْكَ الصُّوْرَةِ الَّتِيْ هِيَ صُوْرَةُ الْعَالَمِ الْمُعَبَّرِ عَنْهُ فِيْ إِصْطِلَاحِ الْقَوْمِ بِالْاِنْسَانِ الْكَبِيْرِ اَقُوْلُ.

یعنی علامہ حقانی فرماتے ہیں :

"حضرت شیخ کا یہ قول آپ کی سند ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ یہ سند آپ کے مدعی کو ثابت کرتی ہے یا منافی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ صورۃ عالم جس کو صوفیائے کرام کی

---

(۱) تفسیر القرآن از سرسید ص۵۶ ج۳ البقرہ آیت ۲۸

(۲) تفسیر القرآن از سرسید ص۵۶ ج۳

اصطلاح میں انسان کبیر کہتے ہیں اس کے لئے ملائکہ مجموعہ قویٰ میں داخل ہیں۔ یعنی عالم کے تمام کاروبار ملائکہ کے بغیر نہیں ہو سکتے جس طرح کہ انسان کے کاروبار اس کی قویٰ کے بغیر نہیں انجام پاتے۔ پس ملائکہ عالم کے لئے بمنزلہ قویٰ کے ہیں۔ چنانچہ اس قول میں اس کی تصریح ہے:

قَوْلُه قَالَ الشَّيْخُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَكَانَتِ الْمَلَائِكَةُ كَالْقُوَى الرُّوْحَانِيَّةِ وَالْحِسِيَّةِ الَّتِيْ فِي نَشْأَةِ الْإِنْسَانِ الخ.

یعنی شیخ فرماتے ہیں کہ ملائکہ عالم کبیر کے لئے ایسے ہیں کہ جس طرح قوائے روحانیہ و حسیہ ہیں انسان کے لئے جس طرح انسان کے لئے قوائے روحانیہ وحسیہ مدبر و متصرف ہیں اسی طرح ملائکہ عالم کے لئے جس قدر قول حضرت شیخ کا آپ نے اس بارہ میں نقل کیا ہے وہ یہی دو جملے ہیں۔ باقی تو انسان کے قویٰ کی تشریح ہے۔

ان دو جملوں کا مطلب آپ نے جو لکھا ہے اس میں آپ نے تصرف بھی کیا مگر پھر بھی آپ کا مدعی ثابت نہ ہوا کیونکہ کاف تشبیہ جس کا ترجمہ آپ نے بھی یوں لکھا ہے قولہ شیخ ارقام فرماتے ہیں کہ "وہ قویٰ جن کو ملائکہ کہتے ہیں انسان کبیر یعنی عالم کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے قویٰ انتہی" صاف کہہ رہا ہے کہ ملائکہ عالم کے لئے بمنزلہ قویٰ کے ہیں نہ یہ کہ دراصل ملائکہ کا کوئی وجود جداگانہ نہیں خود عالم کے قوائے جاذبہ و نامیہ وغیرھا ہی ملائکہ ہیں۔

سید بہادر! یہ قول شیخ کا اس دلیل ثبوت ملائکہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ہم نے شروع فصل میں ذکر کیا تھا۔"(۱)

علامہ حقانی کے جواب کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ صوفیاء کرام پورے عالم کو اپنی اصطلاح میں انسان کبیر کہتے ہیں اور ملائکہ جو پورے عالم میں مختلف کاموں پر مامور ہیں اور

---

(۱) تفسیر حقانی مقدمہ طبع کراچی ص ۶۰۔۶۱ ج ۱

مختلف امور سرانجام دیتے ہیں اس "انسان کبیر" کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان صغیر کے لئے اس کے قوائے روحانیہ اور حسیہ یعنی جس طرح انسان صغیر اپنی روحانی اور حسی قوتوں کے ذریعے کام کرتا ہے اور متحرک رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کبیر یعنی پورا عالم فرشتوں کے ذریعے چل رہا ہے جیسا کہ سورہ النازعات کی آیت وَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا سے معلوم ہوتا ہے۔ حقیقی مدبر و منتظم تو ہر چیز کا خود اللہ تعالیٰ ہے لیکن جو کام وہ اپنے فرشتوں کے ذریعے انجام دینا چاہتا ہے ان کی انجام دہی کے لئے فرشتے بھی تدبیر کرتے ہیں۔ کائنات کے نظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے قوانین فطرت بھی بنائے ہیں اور ہر چیز کے لئے اس نے ایک طبیعت اور نیچر بھی پیدا کیا ہے جسے اگر اللہ خود بدلنا چاہے تو بدل دیتا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی بھی قانون فطرت کو نہیں بدل سکتا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا کے معنے یہ ہیں کہ "تو اللہ کی سنت کے لئے کوئی بدلنے والا نہیں پائے گا۔" اس کے معنے یہ نہیں ہے کہ اللہ اپنے قوانین فطرت کو کبھی بھی تبدیل نہیں کرتا اس لئے کہ معجزات، کرامات اور استدراجات کا ظہور قوانین فطرت اور نیچر لزم کے خلاف ہوتا ہے۔ بہر حال اشیاء عالم کی قوائے طبیعیہ اور ان کے نیچر کے وجود سے کسی نے انکار نہیں کیا اور اس سے انکار کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن پورے عالم میں مختلف کاموں کے لئے اللہ نے فرشتے بھی مقرر کیے ہیں جو قوائے طبیعیہ کی طرح کام کرتے ہیں۔ محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم میں یا اپنی کسی دوسری کتاب میں کسی جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ ملائکہ کا الگ کوئی وجود نہیں ہے بلکہ اس نے تو اپنی دوسری کتاب "فتوحات مکیہ" میں اس کے برعکس تصریح کی ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ الگ نوع کی مستقل مخلوق ہیں جو مختلف کاموں پر من جانب اللہ مامور ہیں۔ تفسیر حقانی میں فتوحات کی عبارت اس طرح نقل کی گئی ہے:

وَالْمَلَائِكَةُ رُسُلٌ مِنَ اللّٰهِ إِلَى الْإِنْسَانِ مُوَكَّلُوْنَ بِهٖ حَافِظُوْنَ كَاتِبُوْنَ [illegible] وَالشَّيَاطِيْنُ مُسَلَّطُوْنَ عَلَى الْإِنْسَانِ بِأَمْرِ اللّٰهِ .... فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ أَصْلُ أَجْسَامِهَا نُوْرٌ

وَالْجَانُّ نَارٌ مَارِجٌ وَالْاِنْسِ مَاءٌ وَ تُرَابٌ وَلٰكِنْ كَمَا اِسْتَحَالَ الْاِنْسُ عَنْ اَصْلِ مَا خُلِقَ مِنْهُ كَذَالِكَ الْمَلَكُ وَالْجَانُّ اِسْتَحَالَا عَنْ اَصْلِ مَا خُلِقَا مِنْهُ اِلٰى مَا هُمَا عَلَيْهِ مِنَ الصُّوَرِ اِعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ مَا جَعَلَ لِلْاَرْوَاحِ اَجْنِحَةً اِلَّا لِلْمَلَائِكَةِ مِنْهُمْ لِاَنَّهُمُ السُّفَرَاءُ مِنْ حَضْرَتِ الْاَمْرِ اِلٰى خَلْقِهٖ فَلَا بُدَّ لَهُمْ مِنْ اَسْبَابٍ يَكُوْنُ لَهُمْ بِهَا النُّزُوْلُ وَالْعُرُوْجُ فَاِنَّ مَوْضِعَ الْحِكْمَةِ يَقْتَضِي هٰذَا فَجَعَلَ لَهُمْ اَجْنِحَةً عَلٰى قَدْرِ مَرَاتِبِهِمْ فِي الَّذِيْ يَسِيْرُوْنَ بِهٖ مِنْ حَضْرَةِ الْاَمْرِ اَوْ يَعْرُجُوْنَ اِلَيْهِ مِنْ حَضْرَتِ الْخَلْقِ فَهُمْ بَيْنَ الْخَلْقِ وَالْاَمْرِ يَنْزِلُوْنَ وَلِذَالِكَ قَالُوْا وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ.(۱)

”اور ملائکہ اللہ کی جانب سے بندوں کے لئے پیغام رساں ہیں‘ انسانوں پر ان کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں‘ وہ ہمارے اعمال لکھتے ہیں‘ اور شیطان بھی اللہ کے حکم سے انسان پر مسلط ہیں‘ ملائکہ کے اجسام کا اصل مادہ تخلیق نور ہے‘ جن کا مادہ تخلیق آگ کا شعلہ ہے اور انسان کا مادہ تخلیق مٹی اور پانی ہے۔ لیکن جس طرح انسان اپنے اصل سے بدل کر موجودہ صورت میں آگیا ہے اسی طرح مَلَک اور جن بھی اپنی اصل سے بدل کر موجودہ صورت میں منتقل ہوگئے ہیں جس پر اب ہیں۔ جان لو! کہ اللہ نے ارواح میں سے کسی کو بازو اور پر نہیں دیئے سوائے ملائکہ کے اس لئے کہ یہ امر و خلق کے درمیان سفیر ہیں پس ان کے لئے ایسے اسباب ضروری ہیں جن کے ذریعے وہ اتر سکیں اور چڑھ سکیں کیونکہ حکمت کا تقاضٰی یہی ہے۔ پس اللہ نے ان کے لئے ان کے مراتب کے مطابق پر اور بازو بنادیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ امر الٰہی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں یا مخلوق کی جانب سے اس کی طرف چڑھتے ہیں۔ فرشتے انہی پروں کے ذریعے خلق اور امر کے درمیان اترتے اور چڑھتے ہیں اسی لئے تو فرشتے کہتے ہیں کہ ”ہم نہیں اتر سکتے مگر اللہ کے حکم ہی سے اترتے ہیں۔“

ابن عربی کی مذکورہ بالا عبارت کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے بلکہ بغیر کسی ابہام کے صراحت و وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ ان کے نزدیک ملائکہ نور سے پیدا شدہ

---

(۱) فتوحات مکیہ جلد سوم ۴۸۲۔۴۸۳ اور ۵۰۶ بحوالہ تفسیر حقانی مقدمہ ص۴۹۔۵۰ ج۱

الگ نوع کی مخلوق ہے جن کے پر ہیں اور وہ اترتے ہیں اور اوپر چڑھتے ہیں اور یہی امت مسلمہ کا عقیدہ ہے جو قرآنی آیات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ فصوص الحکم میں اس نے ملائکہ کو قوائے طبیعیہ کے ساتھ مشابہ تو قرار دیا ہے لیکن فتوحات مکیہ میں اس نے ملائکہ کو نور سے پیدا شدہ الگ نوع اور مستقل مخلوق بھی تسلیم کیا ہے۔ ان تصریحات کے باوجود سرسید نے اتنی بڑی علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے کہ صوفیاء کے شیخ اکبر ابن عربی کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے اس کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ وہ قوائے طبیعیہ اور قوائے ملکیہ ہی کو ملائکہ کہتے تھے فَسُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ وَ ضَلَالٌ كَبِيْرٌ. مشہور متجدد اور منکر حجیت حدیث غلام احمد پرویز کا نظریہ بھی یہی تھا کہ ملائکہ سے مراد قوائے طبیعیہ اور قوائے ملکیہ ہیں ان کے نزدیک ایمان بالملائکہ سے مراد یہ ہے کہ :

"قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان اسلام لانے کے لئے شرط قرار دیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ ملائکہ کو دیوی دیوتا ماننے کی جائے فطرت کی وہ قوتیں تسلیم کیا جائے جنہیں اللہ نے انسان کے تابع تسخیر کر دیا ہے۔"(۱)

پرویز کے اس نظریے کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے اس کی کتاب مطالب القرآن جلد دوم کا دوسرا باب "سرگزشت آدم" اور اس موضوع پر اس کی مستقل کتاب "آدم و ابلیس" مگر ملائکہ کے بارے میں متجددین کا یہ نظریہ کھلی ضلالت پر مبنی ہے اور یہ ایمان بالملائکہ نہیں ہے بلکہ کفر بالملائکہ ہے۔ جن ملائکہ پر ایمان لانا ارکان ایمان میں شامل ہے ان سے مراد نور سے پیدا شدہ الگ نوع ہے جس کے افراد گناہوں سے پاک ہیں اور اللہ کے فرمانبردار اور معزز و مکرم بندے ہیں۔

(۴) چوتھی دلیل امر الٰہی یا حکم خداوندی :

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل و دماغ میں اپنی توحید کا عقیدہ بٹھانے کے لئے اپنی کتاب میں عقلی و نقلی دلائل بھی ذکر کئے ہیں جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں بیان

(۱) مطالب القرآن از پرویز ص ۷۰ ج ۲

ہو چکی ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے اور شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ عقلی اور نقلی دلائل سے قطع نظر غلام کے لئے اس کے مالک وحاکم کا حکم بھی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے اور ہر اجتماعی نظام میں مقتدر اعلیٰ کا حکم واجب الاطاعت قانون ہوتا ہے خواہ اس کی مصلحتیں رعایا کی سمجھ میں آتی ہوں یا نہ آتی ہوں۔ اس لئے قرآن کریم میں وحی خداوندی یعنی امر بالتوحید اور نہی عن الشرک کو بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ تم لوگوں کو بتادو اور اچھی طرح سمجھادو کہ میں توحید کی اشاعت اور شرک کی تردید کا جو کام کر رہا ہوں اس کے لئے منجملہ دوسرے دلائل کے میری سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے رب نے مجھے توحید کا حکم دیا ہے اور شرک سے روک دیا ہے۔ مثلاً:

قُلْ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰب (الرعد ۳۶)

”کہو کہ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کروں، میں اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ (الزمر ۱۱.۱۲)

”کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں اس حال میں کہ اپنی عبادت کو اسی کے لئے خالص کرلوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان (حکم ماننے والا) بن جاؤں۔“

ان دونوں آیات میں اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ تم اس بات کا اعلان کرلو کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں اور مجھے توحید پر قائم رہنے اور اس کی اشاعت کا حکم دیا گیا ہے اور یہ امر الٰہی، حکم خداوندی اور وحی ربانی میرے لئے سب سے بڑی دلیل ہے اس لئے کہ غلام اور عبد کے لئے اس کے مالک کا حکم بڑی قوی دلیل ہوتی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ. (الانعام ۵۶)

"کہہ دو کہ میں روک دیا گیا ہوں اس سے کہ عبادت کروں ان کی جن کو تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیبی مدد کے لئے پکارتے ہو۔ اور یہ بھی کہہ دو کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں تو میں راہ راست سے بھٹک جاؤں گا اور راہ راست پر چلنے والوں میں شامل نہ رہوں گا۔"

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (المؤمنون ٦٦)

"کہہ دو کہ میں روک دیا گیا ہوں اس سے کہ عبادت کروں ان کی جن کو تم غیبی مدد کے لئے پکارتے ہو جب کہ آگئی ہیں میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح اور کھلی دلیلیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سارے جہانوں کے رب کا حکم مانوں۔"

ان دونوں آیات میں اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ تم علی الاعلان کہہ دو کہ مجھے میرے رب نے شرک سے منع کر دیا ہے اور یہ نہی عن الشرک ہی میرے لئے بہت بڑی دلیل ہے اور اسی دلیل کی وجہ سے میں نے شرک کی تردید اور توحید کی اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن بنا دیا ہے۔

حروف مقطعات

قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوا ہے۔ ان حروف کو چونکہ الگ الگ پڑھا جاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جوڑ کر کوئی کلمہ اور لفظ نہیں بنایا جاتا اس لئے ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے یعنی ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ الگ پڑھے جانے والے حروف مثلاً الف' لام' میم یا صاد یا کاف' ہاء' یا' عین' صاد۔ یہ دراصل ان حروف کے اسماء یعنی نام ہیں لیکن مراد ان کے مسمیات ہیں مثلاً الف' لام' میم۔ ا'ل'م کے نام ہیں۔ ان حروف مقطعات کی کل تعداد ۱۴ ہے جن سے ۲۹ سورتوں کا آغاز ہوا ہے جو کل حروف ہجاء یا حروف تہجی کا نصف ہے۔ یہ چودہ حروف درج ذیل ہیں۔

ا'ل'م'ص'ر'ک'ھ'ی'ع'ط'س'ح'ق'ن۔

جن کو کسی نے آسانی کے لئے اس جملے میں جمع کر لیا ہے کہ :

نَصٌّ حَکِیْمٌ قَاطِعٌ لَہٗ سِرٌّ۔

یعنی "دانشمند کی عبارت قطعی ہوتی ہے اور اس میں کوئی نہ کوئی راز ضرور ہوتا ہے۔"

جن ۲۹ سورتوں کا افتتاح ان ۱۴ حروف سے ہوا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

نمبر شمار	نام سورۃ	مکی یا مدنی	حروف	تعداد حروف
۱	البقرہ	مدنی	الٓمّٓ	تین حروف
۲	آل عمران	مدنی	الٓمّٓ	تین حروف
۳	اعراف	مکی	الٓمّٓصٓ	چار حروف
۴	یونس	مکی	الٓرا	تین حروف
۵	ھود	مکی	الٓرا	تین حروف

۶	یوسف	مدنی	الرا	تین حروف
۷	الرعد	مکی یا مدنی سہ اختلاف	المرا	چار حروف
۸	ابراہیم	مکی	الرا	تین حروف
۹	الحجر	مکی	الرا	تین حروف
۱۰	مریم	مکی	کھیعص	پانچ حروف
۱۱	طٰہٰ	مکی	طٰہٰ	دو حروف
۱۲	الشعراء	مکی	طسم	تین حروف
۱۳	النمل	مکی	طس	دو حروف
۱۴	القصص	مکی	الم	تین حروف
۱۵	العنکبوت	مکی	الم	تین حروف
۱۶	الروم	مکی	الم	تین حروف
۱۷	لقمان	مکی	الم	تین حروف
۱۸	السجدہ	مکی	الم	تین حروف
۱۹	یٰس	مکی	یس	دو حروف
۲۰	ص	مکی	ص	ایک حرف
۲۱	المؤمن	مکی	حم	دو حروف
۲۲	حم السجدہ	مکی	حم	دو حروف
۲۳	الشوریٰ	مکی	حم عسق	پانچ حروف
۲۴	الزخرف	مکی	حم	دو حروف

۲۵	الدخان	مکی	حٰمٓ	دو حروف
۲۶	الجاثیہ	مکی	حٰمٓ	دو حروف
۲۷	الاحقاف	مکی	حٰمٓ	دو حروف
۲۸	قٓ	مکی	قٓ	ایک حرف
۲۹	القلم	مکی	نٓ	ایک حرف

فراء نحوی متوفی ۲۰۷ھ نے اپنی کتاب "معانی القرآن" میں اور ابو جعفر النحاسؒ متوفی ۳۳۸ھ نے اپنی کتاب اعراب القرآن میں امام سیبویہ اور ان کے استاد خلیل نحوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کی ۲۹ سورتوں کے آغاز میں جو "حروف مقطعات" ذکر ہوئے ہیں یہ اگرچہ اسماء معربہ ہیں مگر جب تک ان پر کوئی عامل داخل نہ ہوا ہو اور انہیں کسی جملے کا حصہ نہ بنایا گیا ہو اس وقت تک یہ جزم و سکون کے ساتھ پڑھے جائیں گے اور ہر حرف پر وقف کیا جائے گا۔ جار اللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ' قاضی بیضاوی متوفی ۷۹۱ھ' قاضی ابوالسعود متوفی ۹۵۱ھ اور دوسرے محققین نے بھی فراء' سیبویہ اور خلیل کے قول ہی کو ترجیح دی ہے اور یہی صحیح قول ہے۔(۱)

---

(۱) معانی القرآن للفراء طبع انتشارات ناصر خسرو طهران ص۹ ج۱۔ اعراب القرآن للنحاس ص۱۷۷ ج۱۔ تفسیر کشاف' تفسیر بیضاوی' تفسیر ابوالسعود سورۃ بقرہ آیت ۱

خلفاء راشدین کے نزدیک حروف مقطعات کا یقینی علم اللہ کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے اور یہ قرآن میں اللہ کا ایک راز ہے

یہ بات تواتر امت سے یقینی طور پر ثابت ہے کہ حروف مقطعات قرآن کا حصہ ہیں اور مصحف عثمانی میں شامل ہیں اس لئے ان کے منزل من اللہ ہونے پر اور ان کی قرآنیت پر ایمان لانا تو اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ باقی قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اگر ان میں کسی مخصوص اعتقادی یا عملی حکم کی طرف اشارہ ہوتا جس پر اعتقاد اور یقین کئے بغیر یا اس پر عمل کئے بغیر مؤمن کا ایمان کامل نہ رہتا بلکہ ناقص اور ادھورا رہ جاتا تو پھر ان حروف کی تفسیر واضح الفاظ میں اللہ خود اپنی کتاب میں کرتا یا پھر اپنے مقرر کردہ معلم قرآن یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان کی تفسیر و تشریح اور تبیین و توضیح کروالیتا مگر ان کی تفسیر نہ قرآن میں کی گئی ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ سے سند صحیح کے ساتھ مروی ہے یعنی ان حروف کے اسرار و رموز کو نہ قرآن نے کھولا ہے اور نہ معلم قرآن نے کھولا ہے اس لئے خلفاء راشدین اور متعدد صحابہ و تابعین سے مروی ہے کہ ھِیَ سِرُّ اللّٰہِ فِی الْقُرْآنِ یہ قرآن میں اللہ کا راز ہے مشہور محدث اور مفسر امام بغویؒ ۵۱۶ھ نے لکھا ہے کہ:

"امام شعبی اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ الٓمٓ اور بعض سورتوں کے اوائل میں باقی حروف ہجاء متشابہات میں سے ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے وَ ھِیَ سِرُّ الْقُرْآنِ اور یہ قرآن کا ایک راز ہے' ہم ان کے ظاہر پر ایمان لاتے ہیں (یعنی ان کے قرآن ہونے پر یقین رکھتے ہیں) اور ان کی حقیقت کا علم اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور ان حروف کے ذکر کا مقصد ان پر ایمان لانے کا مطالبہ کرنا ہے۔ ابو بکر صدیق اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا

ہے کہ ہر کتاب میں ایک راز ہوتا ہے اور قرآن میں اللہ کا راز بعض سورتوں کے اوائل میں یہ حروف مقطعات ہیں۔ داؤد بن ابی ہندؒ کہتے ہیں کہ میں ان حروف کے بارے میں شعبی سے پوچھا کرتا تھا تو اس نے کہا کہ اے داؤد ہر کتاب میں ایک راز بھی ہوتا ہے اور قرآن کا راز یہ حروف ہیں اس لئے ان کو چھوڑو اور ان کے علاوہ جو چاہو پوچھو۔"(۱)

مشہور حنفی فقیہ ابو اللیث سمرقندی متوفی ۳۷۵ھ فرماتے ہیں کہ :

وَ رُوِیَ عَنِ الشَّعْبِی اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ لِلّٰہِ سِرًّا جَعَلَہٗ فِی کُتُبِہٖ وَ اِنَّ سِرَّہٗ فِی الْقُرْآنِ ھُوَ الْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَۃُ وَ رُوِیَ عَنْ عُمَرَ وَعُثْمَانَ وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّھُمْ قَالُوْا اَلْحُرُوْفُ الْمُقَطَّعَۃُ مِنَ الْمَکْتُوْمِ الَّذِیْ لَا یُفَسَّرُ.(۲)

"امام شعبی (تابعی کبیر) سے مروی ہے کہ اللہ نے اپنی کتابوں میں کوئی نہ کوئی راز رکھا ہے اور قرآن میں اس کا راز حروف مقطعہ ہیں۔ اور حضرت عمرؓ عثمانؓ اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حروف مقطعہ وہ پوشیدہ راز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔"

مشہور و معروف مفسر قرآن ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری القرطبی متوفی ۶۷۱ھ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ :

"عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ حروف قرآن میں اللہ کا راز ہیں اور اللہ کی ہر کتاب میں اس کا ایک راز ہوتا ہے۔ تو یہ حروف ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ کو حاصل ہے اور ہم پر شرعاً واجب اور لازم نہیں ہے کہ ان میں کلام کریں لیکن ہم ان پر ایمان لائیں گے اور جس طرح آئے ہیں اسی طرح ان کی قراءت کریں گے۔ یہ قول ابو بکر صدیقؓ اور علی بن ابی طالبؓ سے مروی ہے اور ابو اللیث سمرقندی نے حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور ابن مسعودؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ

(۱) معالم التنزیل طبع دار الطیبہ ریاض ۱۴۰۹ھ ص۵۸ ج۱

(۲) تفسیر سمرقندی المسمّٰی بحر العلوم طبع دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۳ء ص۸۷ ج۱

حروف مقطعہ وہ پوشیدہ راز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ ابو حاتم رازی نے کہا ہے کہ قرآن میں ہم کو حروف مقطعہ سوائے بعض سورتوں کے اوائل کے کسی اور جگہ نہیں ملتے اور ہم نہیں جانتے کہ ان حروف سے اللہ عزو جل کی مراد کیا ہے؟ اسی طرح کا قول ابو بکر الانباری نے سند کے ساتھ ربیع بن خثیم سے بھی نقل کیا کہ اللہ نے قرآن نازل کیا ہے اور اس میں سے بعض چیزوں کا علم اس نے اپنے لئے خاص کر لیا ہے کسی اور کو نہیں بتایا اور جن چیزوں کا علم تم کو دینا چاہا وہ تم کو دیدیا ہے پس جن چیزوں کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے انہیں تم نہیں پاسکتے اس لئے ان کے بارے میں سوال نہ کیا کرو۔ اور جن چیزوں پر اس نے تم کو مطلع کیا ہے یہی وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں تم ایک دوسرے سے پوچھ بھی سکتے ہو اور ایک دوسرے کو ان کی خبر بھی دے سکتے ہو۔ تم سارے قرآن کا علم بھی نہیں رکھتے ہو اور اپنے سارے علم پر عمل بھی نہیں کرتے ہو' ابو بکر انباری کہتے ہیں کہ اس سے واضح ہوا کہ قرآن کے بعض حروف کا علم سارے عالم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور یہ اللہ کی جانب سے اختیار اور امتحان ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا؟ جو ایمان لاتا ہے اسے ثواب اور سعادت نصیب ہوگی اور جو انکار اور شک کرتا ہے وہ گنہگار ہے اور رحمت خداوندی سے دور ہے۔ حریث بن ظہیر نے عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے افضل ایمان وہ ہے جو غیب پر ایمان ہو' اور پھر اس نے یہ آیت پڑھی کہ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ' قرطبی کہتے ہیں کہ ربیع بن خثیم کا یہ قول متشابہ اور اس کے حکم کے بارے میں صحیح ہے جیسا کہ انشاء اللہ سورہ آل عمران کی تفسیر میں اس کا بیان آرہا ہے۔"(۱)

امام ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ حروف مقطعہ پر بحث کے دوران بڑی اچھی بات کہی ہے:

"اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ نے یہ حروف عبث اور بے معنی و مہمل نازل نہیں کئے اور جاہلوں میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن میں ایسے کلمات بھی ہیں

(۱) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی طبع دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۸۸ء ص ۱۰۸۔۱۰۹ ج ۱۔۲

جن کو تعبداً ماننا ضروری ہے ورنہ نفس الامر میں ان کا کوئی معنی نہیں ہے تو انہوں نے بڑی غلط بات کہی ہے۔ اس سے یہ بات تو متعین ہو گئی کہ ان حروف کے نفس الامر میں معنے موجود ہیں اور یہ بے معنی اور بے مقصد حروف نہیں ہیں۔ پس اگر نبی معصوم سے ان میں سے کسی کے معنے صحیح سند کی ساتھ ہم کو معلوم ہو جائیں تو ہم ان کا ذکر کریں گے ورنہ توقف کریں گے اور کہیں گے کہ ہم ان پر ایمان لاتے ہیں پورا قرآن ہمارے رب کی جانب سے ہے مگر علماء نے ان حروف کے بارے میں کسی متعین معنی پر اجماع نہیں کیا بلکہ اختلاف کیا ہے اور ان کے بارے میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ پس جس کے سامنے بعض اقوال دلیل سے ظاہر ہو جائیں تو ان کو اختیار کر لے ورنہ توقف کرے یہاں تک کہ اصل معنے کھل کر اس کے سامنے آجائیں۔"(۱)

ممتاز اور مستند مفسرین کی مذکورہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ خلفاء راشدین اور اکابر صحابہ و تابعین کے نزدیک حروف مقطعہ متشابہات میں سے ہیں اور ان کے اسرار و رموز کا یقینی علم اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے مگر ابن کثیر نے ان کے راز ہونے کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ ان کا قول زرین ہے کہ "سِرُّ اللّٰهِ فِي الْقُرْآن" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ مہمل' عبث اور بے معنی' حروف ہیں' جس نے بھی ایسی بات کہی ہے اس نے "خطاء کبیر" کا ارتکاب کیا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت اور نفس الامر میں ان کے معانی موجود ہیں اور یہ معنویت سے بالکل خالی نہیں ہیں لیکن چونکہ ان کو جاننے کا کوئی قطعی ذریعہ علم ہمارے پاس موجود نہیں ہے اس لئے ان کا قطعی اور یقینی علم ہم کو حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی کو کسی دلیل سے ان کی کوئی تاویل و توجیہ راجح نظر آئے تو وہ اس کا ذکر کر سکتا ہے مگر اس کو ان حروف کی یقینی تفسیر قرار نہیں دے سکتا بلکہ صرف ایک امکانی' احتمالی اور ظنی تاویل کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔ ابن کثیر کے اس قول زرین سے اس اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ جب خلفاء راشدینؓ

---

(۱) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر طبع الشعب قاہرہ ص۵۹ ج۱ سورہ بقرہ آیت ۱

نے ان حروف کو قرآن میں اللہ کا راز قرار دیا ہے تو پھر بعض اکابر صحابہ و تابعین اور بعض ممتاز مفسرین و محدثین نے ان کی تاویلات کیوں کی ہیں؟ اور ان کے اسرار و رموز کیوں بیان کئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تاویلات ظن واحتمال کے درجے کی ہیں قطعی نہیں ہیں۔

حروف مقطعات کے حکم ورموز اور ان کی تاویلات

علماء تفسیر کی ایک بڑی جماعت نے کہا ہے کہ ان حروف میں غور و فکر کر کے ان کے حکم ورموز اور ان کی ممکنہ تاویلات معلوم کرنے کی کوشش کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ ہم ان میں کلام کریں' ان کے فوائد کی تلاش کریں اور ان کے معانی سے پردہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اس بارے میں تین اقوال مروی ہیں۔

(۱) اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ حروف ان سورتوں کے نام ہیں جن کے آغاز میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول زید بن اسلم' قتادہ اور مجاہد سے نقل کیا ہے اور ابن کثیر نے کہا ہے کہ اس کی تائید صحیحین میں ابوہریرہ سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں رسول اللہ ﷺ الٓمّٓ السجدہ اور ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ پڑھا کرتے تھے کیونکہ اس حدیث میں الٓمّٓ کو سورہ السجدہ کے نام کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور بعض سورتیں ان حروف کے اسماء سے معروف بھی ہیں مثلاً سورۃ ص' سورۃ ق سورۃ یٰسٓ اور حٰمٓ والی سات سورتیں۔ خلیل بن احمد بصری متوفی ۱۷۰ھ کے شاگرد امام سیبویہ متوفی ۱۸۰ھ نے اپنی "الکتاب" میں "باب اسماء السور" کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے جس کے تحت حامیم' طاسین' یاسین' کٓھٰیٰعٓصٓ' الٓمّٓرٰ' طٰسٓمّٓ اور صٓ وغیرہ کو سورتوں کے اسماء قرار دیا گیا ہے۔(۱)

دوسرے مشہور نحوی عالم ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ متوفی ۲۱۰ھ نے بھی کہا ہے کہ الٓمّٓ

(۱) الكتاب للسيبويه باب اسماء السور طبع ثالث عالم الكتب ۱۹۸۳، ص۲۵۶ تا۲۵۹ ج۳

شِعَارٌ لِلسُّوْرَةِ "یعنی الم سورۃ کی علامت (نام) ہے۔"(۱)

عربیت کے مشہور امام جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ نے اس قول کے بارے میں کہا ہے کہ وَعَلَيْهِ اِطْبَاقُ الْاَكْثَرِ کہ اکثر کا اتفاق اسی پر ہے اور اس کے بعد اس کی توجیہات کی ہیں اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔(۲)

علامہ رشید رضا کے شیخ محمد عبدہ کی رائے بھی یہی ہے کہ هُوَ وَ اَمْثَالُهٗ اَسْمَاءٌ لِلسُّوَرِ الْمُبْتَدَأَةِ بِهٖ "الم اور اس طرح کے دوسرے حروف ان سورتوں کے نام ہیں جن کا آغاز ان سے ہوا ہے۔"(۳)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے بھی حسب عادت طویل بحث اور طویل قیل و قال کے بعد فرمایا ہے کہ وَالْمُخْتَارُ عِنْدَ اَكْثَرِ الْمُحَقِّقِيْنَ مِنْ هٰذِهِ الْاَقْوَالِ اَنَّهَا اَسْمَاءُ السُّوَرِ. "اکثر محققین کے نزدیک ان اقوال میں سے "قول مختار" یہ ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔"(۴)

اس قول پر ایک اعتراض تو یہ آتا ہے کہ الٓمٓ چھ سورتوں کے آغاز میں آیا ہے، الرا ۵ سورتوں کی ابتداء میں آیا ہے، حٰمٓ ۷ سورتوں کے اول میں آیا ہے اور طٰسٓمٓ ۲ سورتوں کے افتتاح میں آیا ہے اور ناموں کا مقصد تو امتیاز ہوتا ہے تو اشتراک فی الاسماء کی صورت میں سورتوں کا باہمی امتیاز کیسے کیا جائے گا؟ جواب یہ ہے کہ سورتوں کے دوسرے نام بھی ہیں ان کو ساتھ ملانے سے فرق و امتیاز بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے مثلاً الم بقرہ، الم آل عمران، الٓمٓ قصص، الم عنکبوت، الم الروم، الٓمٓ لقمان اور الم السجدہ، اسی طرح حٰمٓ والی سات سورتوں کے

---

(۱) مجاز القرآن طبع بیروت ۱۹۸۱ء ص۲۸ ج۱

(۲) الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل للزمخشری طبع دارالفکر بیروت ۱۹۷۷ء ص۸۳ ج۱

(۳) المنار ص۱۲۲ ج۱

(٤) تفسیر کبیر طبع مطبعہ بہیہ مصر ص۸ ج۱

ساتھ جب ان کے دوسرے نام ملا دیئے جائیں تو اشتراک وابہام ختم ہو جائے گا۔ مثلاً حٰمٓ مؤمن، حٰمٓ السجدہ، حٰمٓ شوریٰ، حم زخرف، حٰمٓ الدخان، حٰمٓ الجاثیہ اور حٰمٓ احقاف۔

دوسرا اعتراض اس قول پر یہ وارد ہوا ہے کہ کلام عرب میں کسی چیز کے دو سے زائد نام نہیں ہوتے اور کٓھٰیٰعٓصٓ حٰمٓ عٓسٓقٓ پانچ اسماء حروف پر مشتمل ہیں تو ان کو کیسے سورتوں کے نام کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب زمخشری نے "کشاف" میں، امام رازی نے "کبیر" میں اور بیضاوی نے یہ دیا ہے کہ یہ حکم اس صورت کے بارے میں ہے کہ دو سے زائد ناموں کو جمع کر کے ایک مرکب امتزاجی نام بنایا جائے تو یہ دو تک پایا جاتا ہے جیسے بعلبک اور حضرموت مگر دو سے زائد اسماء پر مشتمل کوئی نام نہیں پایا جاتا۔ لیکن جب ترکیب امتزاجی بنائے بغیر الگ الگ نام ہوں تو وہ دو سے زائد بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ یَرْوِیْ قِفَانَبْكِ وَ عَفَتِ الدِّیَارُ یعنی فلاں شخص اس قصیدے کا راوی ہے جس کے اول میں یہ فقرے آئے ہیں یا مثلاً جب کوئی شخص اپنے ساتھی سے پوچھے کہ مَا قَرَأْتَ تم نے کیا پڑھا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ قَرَأْتُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ۔ "میں نے الحمد للہ اور براءۃ من اللہ ورسولہ پڑھا ہے یعنی میں نے وہ سورتیں پڑھی ہیں جن کے اول میں یہ کلمات آئے ہیں۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اس کے جواز کی کافی دلیل یہ ہے کہ امام سیبویہ نے کسی کلام کے ایک فقرے کو اس کا نام قرار دینا، کسی قصیدے اور نظم کے ایک شعر یا ایک بیت کو پورے قصیدے کے نام کے طور پر استعمال کرنا اور حروف معجم کے اسماء کو بعض سورتوں کے نام قرار دینے کو یکساں طور پر جائز کہا ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ ان حروف کے اسماء کو سورتوں کے اسماء قرار دینے میں معنویت اور حکمت کیا ہے؟ تو زمخشری نے کشاف میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

كَاَنَّ الْمَعْنٰى فِیْ ذٰلِكَ الْاِشْعَارُ بِاَنَّ الْفُرْقَانَ لَیْسَ اِلَّا كَلِمًا عَرَبِیًّا مَعْرُوْفَةَ التَّرْكِیْبِ مِنْ مُسَمَّیَاتِ هٰذِهِ الْاَلْفَاظِ كَمَا قَالَ عَزَّ مِنْ قَائِلٍ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا۔

"شاید اس میں معنویت اور حکمت لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ یہ قرآن عربی کلمات پر مشتمل ہے جو ان الفاظ کے مسمیات یعنی عربی حروف سے ترکیب کے معروف طریقے پر بنائے گئے ہیں جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔"

یعنی حروف مقطعات چونکہ عربی الفاظ کے عناصر ترکیبی ہیں اس لئے بعض سورتوں کو ان کے ناموں سے مسمی کرنے میں قرآن کی عربیت کی طرف اشارہ ہے۔ اس پر کشاف میں ایک اور سوال قائم کیا گیا ہے کہ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مصحف میں یہ حروف لکھے جاتے ہیں ان کے اسماء نہیں لکھتے جاتے ؟ یعنی الٓم لکھا جاتا ہے 'الف' لام' میم نہیں لکھا جاتا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کلمات اور الفاظ حروف سے بنائے گئے ہیں اور عادت یہی ہے کہ جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ حروف تہجی پڑھو تو ان کا ذکر ان کے ناموں سے کیا جاتا ہے اور جب کسی کاتب کو کہا جاتا ہے کہ یہ یہ حروف لکھو تو ان کے نام لئے جاتے ہیں مگر کاتب حروف لکھتا ہے ان کے نام نہیں لکھتا۔(۱)

ایک سوال یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب ان حروف کے ناموں کو سورتوں کے اسماء قرار دینے میں قرآن کی عربیت کی طرف اشارہ ہے تو پھر صرف ۲۹ سورتوں کے یہ نام کیوں رکھے گئے ہیں جب کہ صرف یہی سورتیں عربی نہیں ہیں بلکہ پورا قرآن عربی ہے ؟ اس کا جواب تو واضح ہے کہ کسی چیز پر متنبہ کرنے اور اس کی تعلیم دینے کے لئے دو تین مثالیں اور نمونے بھی کافی ہوتے ہیں اور یہاں تو دو تین نہیں بلکہ پوری ۲۹ مثالیں دی گئی ہیں۔

بعض صحابہؓ و تابعینؒ سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ حروف مقطعات دراصل اسماء الٰہیہ کے مُخَفَّفَات ہیں یعنی ان میں سے ہر حرف میں اللہ کے نام کی طرف اشارہ ہے مثلاً الٓمٓ ممکن ہے تخفیف اور اختصار ہو اللہ لطیف مجید کی طرف یعنی یہ قرآن یا یہ سورۃ اللہ کا کلام ہے جو باریک بین یا مہربان ہے اور بڑی شان والا ہے۔ یا الٓرا میں اشارہ ہو اَللّٰهُ لَطِيْفٌ رَؤُوْفٌ کی

(۱) کشاف ص ۹۳۔۹۴ ج ۱

طرف یا مثلاً الٓمٓصٓ میں اشارہ ہو اللہ لطیف مجید صادق کی طرف یا اسماء افعال کی طرف اشارہ ہو مثلاً انا اللّٰہ اَعْلَمُ اُفَصِّلُ یا مثلاً کٓھٰیٰعٓصٓ میں اشارہ ہو کافٍ لخلقہ ھادٍ لِعِبَادِہٖ یَدُہٗ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ عَالِمٌ بِھِمْ صَادِقٌ فِی وَعْدِہٖ یعنی اللہ اپنی مخلوق کے لئے کافی ہے' اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے' اس کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے' وہ ان کے حالات پر عالم ہے اور وہ اپنے وعدے میں سچا ہے۔ اس قسم کی توجیہات و تاویلات ابن جریر' ابن کثیر' قرطبی اور دوسرے اکابر مفسرین نے اکابر صحابہ و تابعین سے نقل کی ہیں اور کلام عرب میں اس قسم کے رموز کی مثالیں بھی موجود ہیں اس لئے اس قول کو بھی ان حروف کی ممکنہ تاویل کے طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

(۳) تیسرا قول امام سیبویہ کے شاگرد ابن المستنیر متوفی ۲۰۶ھ کا ہے جو عام طور پر قطرب کے نام سے مشہور ہیں ان کا قول مشہور نحوی امام ابواسحاق زجاج متوفی ۳۱۱ھ نے اپنی کتاب "معانی القرآن" میں اس طرح نقل کیا ہے :

وَزَعَمَ قُطْرُبٌ اَنَّ الٓمٓ وَالٓمٓصٓ وَ الٓمٓرٰ و کٓھٰیٰعٓصٓ و قٓ و یٰسٓ وَ نٓوْن حُرُوْفُ الْمُعْجَمِ ذُکِرَتْ لِتَدُلَّ اَنَّ ھٰذَا لْقُرآنَ مُؤَلَّفٌ مِنْ ھٰذِہِ الْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَۃِ الَّتِیْ ھِیَ حُرُوْفُ ا'ب' ت' ث فَجَاءَ بَعْضُھَا مُقَطَّعًا وَ جَاءَ تَمَامُھَا مُؤَلَّفًا لِیَدُلَّ الْقَوْمَ الَّذِیْنَ نَزَلَ عَلَیْھِمُ الْقُرْآنُ اَنَّہٗ بِحُرُوْفِھِمُ الَّتِیْ یَعْقِلُوْنَھَا لَا رَیْبَ.(۱)

"قطرب نے دعویٰ کیا ہے کہ الٓمٓ' الٓمٓصٓ' الٓمٓرٰ' کٓھٰیٰعٓصٓ' قٓ' یٰسٓ اور نون حروف معجم ہیں جن کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ اس بات پر دلالت کریں کہ قرآن کی تالیف و ترکیب ان حروف مقطعہ سے ہوئی ہے یعنی ا' ب' ت' ث وغیرھا سے۔ ان میں سے بعض الگ الگ آئے ہیں اور باقی مرکب جملوں میں آئے ہیں تاکہ ان لوگوں کو بتادیا جائے جن پر قرآن نازل ہوا ہے کہ یہ قرآن انہی حروف میں نازل ہوا ہے جن کو وہ بلاشک وشبہ جانتے

(۱) معانی القرآن طبع عالم الکتب بیروت ۱۹۸۸ء ص ۵۵۔۵۶ ج ۱

ہیں۔"

یعنی ان حروف سے بعض سورتوں کا افتتاح کرنے میں قرآن کے اعجاز کی جانب اشارہ ہے اس لئے کہ عربی کلام کے حروف اصلیہ اور عناصر ترکیبیہ یہی حروف ہیں جن سے عرب اچھی طرح واقف تھے اور ان کے بلغاء وفصحاء اور ادیب وشاعر انہی حروف سے قصیدے اور اشعار بناتے تھے اور یہ قرآن بھی انہی حروف سے بنایا گیا ہے تو آخر تم اس کی ایک سورہ کی مثال پیش کرنے سے بھی کیوں عاجز آگئے ہو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ کلام اللہ ہے کلام البشر نہیں ہے اور اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے ترجیح تو اس قول کو دی ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں لیکن قطرب کے اس قول کو بھی اس طرح نقل کیا ہے:

اَلْعَاشِرِ مَا قَالَهُ الْمُبَرِّدُ وَاخْتَارَهُ جَمْعٌ عَظِيْمٌ مِنَ الْمُحَقِّقِيْنَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِنَّمَا ذَكَرَهَا احْتِجَاجًا عَلَى الْكُفَّارِ وَذَالِكَ اَنَّ الرَّسُوْلَ ﷺ لَمَّا تَحَدَّاهُمْ اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ الْقُرْآنِ اَوْ بِعَشْرِ سُوَرٍ اَوْ بِسُوْرَةٍ وَاحِدَةٍ فَعَجَزُوْا عَنْهُ اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْحُرُوْفُ تَنْبِيْهًا عَلٰى اَنَّ الْقُرْآنَ لَيْسَ اِلَّا مِنْ هٰذِهِ الْحُرُوْفِ وَاَنْتُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا وَعَارِفُوْنَ بِقَوَانِيْنِ الْفَصَاحَةِ فَكَانَ يَجِبُ اَنْ تَاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ فَلَمَّا عَجَزْتُمْ عَنْهُ دَلَّ ذَالِكَ عَلٰى اَنَّهُ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ لَا مِنَ الْبَشَرِ.(۱)

"دسواں قول مبرد کا ہے جس کو محققین کے ایک بڑے گروہ نے پسند کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے ان حروف کا ذکر کفار پر حجت قائم کرنے کے لئے کیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ نے جب کفار سے مطالبہ کیا (چیلنج دیا) کہ تم اس قرآن کی مثال بنا کر لاؤ اس کی دس سورتوں کی مثال پیش کرو یا کم از کم اس کی ایک سورہ کی مثال بنا کر تو سامنے لاؤ تو وہ سب اس سے عاجز آگئے اس پر ان کو متنبہ کرنے کے لئے یہ حروف نازل کئے گئے کہ یہ قرآن انہی

---

(۱) تفسیر کبیر ص ۶ ج ۱

حروف سے بنایا گیا ہے اور تم ان پر قدرت رکھتے ہو اور فصاحت کے قوانین کو جانتے ہو تو ضروری ہے کہ تم چیلنج قبول کرو اور اس قرآن کی مثال بنا کر سامنے لے آؤ مگر تم تو اس سے عاجز آگئے ہو تو یہ عاجز آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے آیا ہے کسی بشر نے اپنی طرف سے بنایا نہیں ہے۔"

قرطبی نے اس قول کو قطرب کے علاوہ مشہور نحوی عالم فراء کی طرف بھی منسوب کیا ہے:

وَ قَالَ قُطْرُبٌ وَالْفَرَّاءُ وَ غَيْرُهُمَا هِيَ اِشَارَةٌ اِلٰى حُرُوْفِ الْهِجَاءِ اَعْلَمَ اللّٰهُ بِهَا الْعَرَبَ حِيْنَ تَحَدَّاهُمْ بِالْقُرْآنِ اَنَّهُ مُؤْتَلَفٌ مِنْ حُرُوْفٍ هِيَ الَّتِيْ مِنْهَا بِنَاءُ كَلَامِهِمْ لِيَكُوْنَ عِجْزُهُمْ عَنْهُ اَبْلَغَ فِي الْحُجَّةِ عَلَيْهِمْ اِذْ لَمْ يَخْرُجْ عَنْ كَلَامِهِمْ.(۱)

"قطرب اور فراء وغیر ہما نے کہا ہے کہ حروف مقطعات میں حروف ہجاء کی طرف اشارہ ہے اللہ نے جب کفار کو قرآن کی مثال پیش کرنے کا چیلنج دیا تو ان کو ان حروف کے ذریعے بتادیا کہ یہ قرآن انہی حروف سے مرکب ہے جن سے ان کا کلام بنایا جاتا ہے تاکہ ان کا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز آجانا اس پر کامل اور مؤثر ترین حجت بن جائے اس لئے کہ یہ قرآن ان کے کلام کے حروف سے باہر نہیں ہے۔"

اہل عربیت کے اس قول کو کشاف اور بیضاوی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بڑے دقیق نکات کی نشان دہی کی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اگر الف اور ہمزہ کو الگ الگ حروف شمار کیا جائے تو حروف تہجی کی تعداد ۲۹ ہے۔ اور اسی تعداد کے مطابق حروف مقطعات کو نمونے کے طور پر ۲۹ سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) اگر الف کو ہمزہ سے الگ مستقل حرف شمار نہ کیا جائے (یاد رہے کہ الف اور ہمزہ

---

(۱) تفسیر قرطبی ص ۱۰۹ ج ۱

کے درمیان حرکت اور سکون کا فرق ہے) تو کل حروف تہجی کی تعداد ۲۸ بنتی ہے جن کا نصف ۱۴ ہے اور نمونے کے طور پر یہی ۱۴ حروف ذکر کئے گئے ہیں۔

(۳) کل حروف تہجی دو قسم کے ہیں "مہموسہ" جو ذرا نرم آواز سے ادا ہوتے ہیں اور "مجہورہ" جو ذرا تیز آواز سے ادا ہوتے ہیں۔ مہموسہ ۱۰ حروف ہیں۔ س' ت' ش' ح' ث' ک' خ' ص' ف' ھ۔ ان کا نصف ۵ حروف ہیں اور یہی ۵ حروف مقطعات میں موجود ہیں جو یہ ہیں۔ ح' ہ' ص' س اور ک۔ اور مجہورہ ۱۸ حروف ہیں اور ان کا نصف یعنی ۹ حروف مقطعات میں مذکور ہیں جو یہ ہیں۔ ل' ن' ی' ق' ط' ع' ء' م' ر۔

اسی طرح صفات کے اعتبار سے حروف کی جتنی قسمیں ہیں مثلاً شدیدہ اور رِخوۃ' مطبقَة اور مُنفَتِحہ' مُستَعلِیَہ اور مُنحَفِضَہ' حروف قَلقلہ اور حروف لِین. ان سب میں سے نصف نصف کا ذکر مقطعات میں ہوا ہے تفصیل کے لئے کشاف اور بیضاوی کی طرف مراجعت کیجئے۔ اس تیسرے قول کے بارے میں حافظ ابن کثیر کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے جو یہ ہے کہ:

"ان حروف کو بعض سورتوں کے اوائل میں ذکر کرنے میں حکمت کیا ہے؟ قطع نظر اس کے کہ نفس الامر میں ان کے معنے کیا ہیں؟...... تو اس بارے میں بعض علماء نے کہا ہے کہ ان کا ذکر قرآن کا اعجاز بیان کرنے کے لئے ہوا ہے یعنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ لوگ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں باوجود اس کے کہ یہ قرآن انہی حروف مقطعہ سے مرکب ہے جن میں لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ مسلک امام رازی نے اپنی تفسیر میں مبرد اور محققین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے' قرطبی نے اس قول کو قطرب اور فراء سے نقل کیا ہے اور زمخشری نے کشاف میں اس کی تقریر و توجیہ کی ہے اور اس کی بڑی تائید کی ہے' اسی رائے کو شیخ الاسلام علامہ ابو العباس ابن تیمیہ نے پسند کیا ہے اور ہمارے شیخ حافظ' مجتہد' ابو الحجاج مزی نے یہ قول میرے سامنے ابن تیمیہ سے نقل کیا

تھا اور اسے پسند کیا تھا۔ علامہ زمخشری نے کہا ہے کہ ان تمام حروف کو یکجا طور پر قرآن کے آغاز میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ مختلف سورتوں کے آغاز میں دہرایا گیا ہے تاکہ بار بار چیلنج دیا جائے اور لاجواب کیا جائے۔ زمخشری نے یہ بھی کہا ہے کہ ان میں سے بعض ایک حرف ہیں مثلاً ص' ن' ق' بعض دو حروف ہیں جیسے حٰمٓ' بعض تین حروف ہیں جیسے الٓمٓ' بعض چار حروف ہیں جیسے الٓمٓرٰا اور الٓمٓصٓ اور بعض پانچ حروف ہیں جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ اور حٰمٓ عٓسٓقٓ اس لئے کہ عربوں کا اسلوب کلام اسی طرح ہے کہ بعض کلمات حرف واحد پر مشتمل ہوتے ہیں' بعض دو حرفوں کے ہوتے ہیں' بعض تین حرفوں کے ہوتے ہیں' بعض چار حرفوں کے ہوتے ہیں اور بعض پانچ حروف پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ جس سورۃ کا آغاز ان حروف سے ہوا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں ان حروف کے بعد قرآن کا اعجاز اور اس کی عظمت بیان ہوئی ہو اور استقراء سے ایسا ہی معلوم ہوا ہے۔ جن ۲۹ سورتوں میں ان حروف کا ذکر ہوا ہے ان میں ان حروف کے بعد قرآن کی عظمت اور صداقت بیان ہوئی ہے۔"(۱)

حروف مقطعات کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ان حروف کے یقینی اور قطعی معانی تو قرآن میں اللہ کا راز ہیں لیکن قرآن کی ۲۹ سورتوں کے آغاز میں ان کے ذکر کرنے کی حکمت اور ان کی ممکنہ تاویل کے بارے میں سلف و خلف سے تین اقوال منقول ہیں جن میں سے تیسرا قول اگرچہ اہل عربیت کا ہے مگر بعض اہل تفسیر نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم

(۱) تفسیر ابن کثیر طبع دار الاندلس بیروت لبنان ص ۶۷۔۶۸ ج ۱

محکم اور متشابہ

مضامین القرآن کی بحوث میں سے ایک بحث محکم اور متشابہہ کی بحث بھی ہے جس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا قرآن کے طالب علموں کے لئے ضروری ہے۔ محکم کے ایک معنے تو ہیں مضبوط اور پکی بات جو ہر قسم کے خلل اور نقص و عیب سے محفوظ ہو۔ اَحکَمَ الشَّيْءَ وَالْاَمْرَ کے معنے ہیں اَتْقَنَه' یعنی اس نے اس چیز کو یا اس کام کو مضبوط اور مستحکم کر لیا ہے اور اسے ہر قسم کے خلل اور نقصان سے محفوظ کر لیا ہے۔ اَلْمُحْكَمُ کے معنے ہیں اَلْمُتقَن یعنی مضبوط اور محفوظ۔(۱)

پورا قرآن محکم ہے

اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن محکم ہے اور اس کی ساری آیات محکمات ہیں اس لئے کہ نظم اور تالیف کے اعتبار سے' دلائل و شواہد کے اعتبار سے' فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اور صداقت کے اعتبار سے قرآن کی ہر آیت مضبوط و مستحکم ہے' پکی اور سچی ہے اور لفظی و معنوی عیوب سے پاک اور محفوظ ہے اور اس کا ہر حکم حکمت و مصلحت سے لبریز ہے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو حکیم و خبیر ہے اور متکلم کی حکمت اور اس کے علم و باخبری کا مظہر اس کا کلام ہوتا ہے۔ سورہ ہود کی ابتداء میں اسی مفہوم کے اعتبار سے قرآن کی ساری آیات کو محکمات کہا گیا ہے:

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ آيَاتُه' ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ. (ھود ۱)

"یہ قرآن ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط کر دی گئی ہیں پھر ان کی تفصیل اور وضاحت بھی کر دی گئی ہے حکمت والے باخبر خدا کی طرف سے۔"

---

(۱) المعجم الوسيط مادہ حکم ص ۱۹۰

ثُمَّ کا لفظ اس جگہ "تراخی فی الزمان" کے معنوں میں نہیں آیا یعنی مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے آیتیں مضبوط کی گئیں اور اس کے بعد ان کی وضاحت کی گئی بلکہ صفت ثانیہ کے طور پر آیا ہے یعنی اس قرآن کی آیتیں بیک وقت پختگی اور قوت و استحکام سے بھی متصف ہیں اور تفصیل و وضاحت سے بھی متصف ہیں۔ عربیت کے مشہور امام علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

لَيسَ مَعْنَاهَا التَّرَاخِي فِي الْوَقْتِ وَلٰكِنْ فِي الْحَالِ كَمَا تَقُوْلُ هِيَ مُحْكَمَةٌ اَحْسَنَ الْاِحْكَامِ وَ مُفَصَّلَةٌ اَحْسَنَ التَّفْصِيْلِ. (کشاف)

"اس کے معنے وقت و زمانہ کے اعتبار سے تاخیر نہیں ہے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ دونوں صفتیں اس کے اندر بیک وقت موجود ہیں جیسا کہ تو کہے کہ یہ آیتیں مضبوط ہیں بڑی اچھی مضبوطی کے ساتھ اور یہ مفصل اور واضح ہیں بڑی اچھی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ۔"

امام بغویؒ پورے قرآن کے محکم ہونے کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حَيْثُ جَعَلَ الْكُلَّ مُحْكَمًا اَرَادَ اَنَّ الْكُلَّ حَقٌّ لَيْسَ فِيْهِ عَبَثٌ وَ لَا هَزْلٌ.

"جس جگہ پورے قرآن کو محکم قرار دیا گیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ سارا قرآن حق ہے اس میں عبث اور مذاق کی کوئی بات موجود نہیں ہے۔"(۱)

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ:

اَحْكَمَ اللّٰهُ مِنَ الْبَاطِلِ ثُمَّ فَصَّلَهَا بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ.

یعنی "اللہ نے قرآن کی آیات کو باطل کی آمیزش سے محفوظ کر دیا ہے اور پھر ان کے حلال و حرام کی تفصیل اور وضاحت کر دی ہے۔"

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اے هِيَ مُحْكَمَةٌ فِيْ لَفْظِهَا مُفَصَّلَةٌ فِيْ مَعْنَاهَا كَامِلٌ صُوْرَتًا وَ مَعْنًا هٰذَا: مَدْنِی

(۱) معالم التنزیل

مَا رُوِیَ عَنْ مُجَاهِدٍ وَ قَتَادَةَ وَاخْتَارَهُ ابْنُ جَرِیْرٍ .(۱)

"یعنی یہ آیات اپنے لفظ میں محکم اور مضبوط ہیں اور اپنے معنی میں مفصل اور واضح ہیں۔ پس یہ قرآن صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے کامل ہے یہ مجاہد اور قتادہ سے مروی قول کا مفہوم ہے اور ابن جریر نے اسی کو پسند کیا ہے۔"

پورے قرآن کے محکم ہونے اور اس کی ساری آیات کے محکمات ہونے کی درج بالا تشریح خود قرآن کی ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ قرآن میں لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے کوئی کجی' ٹیڑھ اور عیب نہیں ہے بلکہ یہ سیدھی اور معتدل کتاب ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا. قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِنْ لَّدُنْهُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا. (الکهف ۱. ۲)

"ساری تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں کچھ بھی کجی نہیں رکھی' جو سیدھی اور معتدل کتاب ہے' تا کہ اللہ کی جانب سے آنے والے شدید عذاب سے مشرکین کو ڈرائے اور ان ایمان والوں کو خوشخبری سنائے جو نیک کام کرتے ہیں کہ ان کے لئے بڑا اچھا اجر ہے۔"

امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ عَوَجٌ عین اور واو کی زبر کے ساتھ اس کجی اور ٹیڑھ کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہو جیسے لکڑی یا لاٹھی کی کجی اور عِوَجٌ عین کی زیر اور واو کی زبر کے ساتھ اس کجی کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے دکھائی نہ دیتی ہو بلکہ فکر اور بصیرت سے معلوم کی جاتی ہو جیسے کسی دین کی کجی اور کسی کتاب کی کجی۔ قرآن میں کجی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں' تدبر کرتے ہیں اور بصیرت سے کام لیتے ہیں وہ سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ٹیڑھ' کجی اور عیب نہیں ہے بلکہ یہ ہر لحاظ سے کامل اور محکم کتاب ہے۔

---

(۱) ابن کثیر هود ۱

اور قَیِّمًا کے معنے ابن جریر نے مُعْتَدِلًا وَ مُسْتَقِیْمًا کئے ہیں یعنی سیدھی اور معتدل کتاب جس میں افراط و تفریط اور غلو وانتہا پسندی کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ اس کی ہر بات اعتدال و توازن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

اسی طرح قاضی بیضاویؒ نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ:

"یہ کتاب بندوں کے مصالح کو اعتدال پر قائم رکھتی ہے۔ سورۃ زمر میں اس کتاب کو قُرآنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ کہا گیا ہے یعنی ہر قسم کی کجی اور عیب سے پاک عربی قرآن۔ اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن محکم ہے۔

پورا قرآن متشابہ بھی ہے

متشابہ کا لفظ تشابہ سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں ایک دوسرے سے "مشابہت" اور "مماثلت" اور متشابہ کے معنے ہیں ایک دوسرے سے مشابہ، مماثل اور ملتی جلتی چیزیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے یعنی اس کی تمام آیات فصاحت وبلاغت، صداقت و حقانیت، اعجاز اور منزل من اللہ ہونے میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، ایک دوسرے سے مشابہ اور مماثل ہیں اور ان صفات میں ان کے درمیان مکمل یکسانیت اور یک رنگی ہے اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت تنزیل ہے کسی کی تصنیف نہیں ہے اور کلام اللہ ہے کلام البشر نہیں ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے سورۃ الزمر میں پورے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ. (الزمر ٢٣)

"اللہ نے بڑا خوبصورت کلام نازل کیا ہے جو ایک کتاب ہے باہم ملتی جلتی جس کے مضامین بار بار دھرائے جاتے ہیں۔"

اس آیت میں پوری کتاب کو متشابہ کہا گیا ہے اس لئے کہ اس کی تمام آیات اپنی معجزانہ صفات میں اول سے آخر تک یک رنگ اور آپس میں ہم رنگ ہیں۔ اور مثانی کا مطلب یہ ہے کہ

اس کے احکام و مضامین اور قصص و اخبار اسالیب متنوعہ کے ساتھ بار بار دہرائے گئے ہیں اور تکرار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں تاکہ اس کی تفہیم میں کوئی کمی باقی نہ رہے اور لوگوں کے لئے عدم فہم کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اس آیت میں متشابہ کے وہی معنے ہیں جو سورۃ انعام کی آیت ۱۴۱ میں لفظ متشابہ کے ہیں:

وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ (الانعام ۹۹ اور ۱۴۱)

"اور اس نے زیتون اور انار پیدا کئے ہیں باہم متشابہ بھی اور غیر متشابہ بھی۔"

یعنی بعض زیتون اور انار رنگ' ذائقہ اور جسامت وغیرہ صفات میں باہم مشابہت اور مماثلت رکھتے ہیں اور بعض مشابہت اور مماثلت نہیں رکھتے۔ اس آیت میں متشابہ سے مشکل اور مشتبہ مراد نہیں ہے بلکہ باہم مشابہ اور ہم رنگ مراد ہے۔ اس یک رنگی اور مشابہت کا تقاضیٰ یہ ہے کہ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تکذیب و تردید نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسرے تصدیق و تائید اور تشریح و تفسیر کرتی ہے جیسا کہ سورہ النساء میں فرمایا گیا ہے کہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِاللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء ۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔"

یعنی اس میں پوری اور مکمل یکسانیت اور یک رنگی ہے اور اس کی آیات میں کسی قسم کا تناقض' تضاد اور اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ اس کو سمجھنے کے لئے تدبر اور تفکر سے کام لیا جائے۔

ام الکتاب محکمات ہیں اور کچھ دوسری آیات متشابہات ہیں

مذکورہ معانی کے اعتبار سے تو پورا قرآن محکم بھی ہے اور متشابہ بھی ہے لیکن سورہ آل عمران میں قرآنی آیات کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ام الکتاب تو محکمات ہیں لیکن کچھ دوسری آیات متشابہات بھی ہیں۔ راسخین فی العلم یعنی پختہ گہرا اور صحیح علم رکھنے والے عقائد اور احکام محکمات سے معلوم کرتے ہیں اور متشابہات کی تاویل و توجیہ محکمات کی روشنی میں کرتے ہیں اور اگر کوئی تاویل سمجھ میں نہ آئے تو ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کو اللہ کی جانب سے نازل شدہ مانتے ہیں مگر ان کی تاویل اور حقیقت کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور زائغین یعنی ٹیڑھی سوچ رکھنے والے اور غلط افکار و خیالات کا ثبوت قرآن میں تلاش کرنے والے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور محکمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس لئے کہ محکمات کے معانی واضح ہوتے ہیں جن سے ٹیڑھی اور غلط باتیں نہیں نکالی جاسکتیں اور متشابہات میں چونکہ کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ان سے ٹیڑھی اور غلط باتیں بھی نکالی جاسکتی ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران ۷)

"اللہ وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس میں محکم اور واضح آیتیں ہیں جو اس کتاب کا اصل ہیں اور کچھ دوسری آیتیں متشابہ اور غیر واضح ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہے وہ کتاب کے اس حصے کے تابع ہو جاتے ہیں جو متشابہ اور غیر واضح ہے۔ گمراہی کی تلاش میں اور اس کی غلط تاویل کی تلاش میں۔ حالانکہ اس کی صحیح حقیقت کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔ اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس کتاب پر ایمان لائے ہیں اس کا ہر حصہ ہمارے رب کی جانب سے ہے اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر عقل سلیم والے

ہی قبول کرتے۔"

امام بغویؒ نے اس آیت میں محکمات کے معنے کئے ہیں مُبَيِّنَاتٌ مُفَصَّلَاتٌ یعنی واضح اور مفصل اور ہم الکتاب کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے۔ اَیْ اَصْلُهٗ الَّذِیْ يُعْمَلُ عَلَيْهِ فِی الْاَحْكَامِ یعنی اصل جس پر احکام میں عمل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لئے محمد بن جعفر بن زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ:

اَلْمُحْكَمُ مَا لَا يَحْتَمِلُ مِنَ التَّاوِيْلِ غَيْرَ وَجْهٍ وَاحِدٍ وَالْمُتَشَابِهُ مَا احْتَمَلَ اَوْجُهًا ۔

"محکم وہ ہے جس میں ایک توجیہ و تاویل سے زائد تاویلات کا احتمال نہ ہو اور متشابہ وہ ہے جس میں متعدد وجوہ اور تاویلات کا احتمال ہو۔"(۱)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر بڑے اچھے اور دلنشین انداز میں اس طرح کی ہے:

يُخْبِرُ تَعَالٰى اَنَّ فِی الْقُرْآنِ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ اَیْ بَيِّنَاتٌ وَاضِحَاتُ الدَّلَالَةِ لَا الْتِبَاسَ فِيْهَا عَلٰى اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ وَ مِنْهُ آيَاتٌ اُخَرُ فِيْهَا اِشْتِبَاهٌ فِی الدَّلَالَةِ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنَ النَّاسِ اَوْ بَعْضِهِمْ فَمَنْ رَدَّ مَا اشْتَبَهَ عَلَيْهِ اِلَى الْوَاضِحِ مِنْهُ وَ حَكَّمَ مُحْكَمَهٗ عَلٰى مُتَشَابِهِهٖ عِنْدَهٗ فَقَدِ اهْتَدٰى وَ مَنْ عَكَسَ اِنْعَكَسَ وَ لِهٰذَا قَالَ تَعَالٰى هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ اَیْ اَصْلُهٗ الَّذِیْ يُرْجَعُ اِلَيْهِ عِنْدَ الْاِشْتِبَاهِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ اَیْ تَحْتَمِلُ دَلَالَتُهَا مُوَافَقَةَ الْمُحْكَمِ وَ قَدْ تَحْتَمِلُ شَيْئًا آخَرَ مِنْ حَيْثُ اللَّفْظِ وَالتَّرْكِيْبِ لَا مِنْ حَيْثُ الْمُرَادِ.(۲)

"اللہ تعالیٰ اس آیت میں ہم کو خبر دیتا ہے کہ قرآن میں کچھ آیات محکمات ہیں جو اصل کتاب ہیں یعنی جن کی دلالت اپنے معانی پر واضح ہے اور جن کو سمجھنے میں کسی کو بھی التباس و

(۱) معالم التنزیل طبع دار طیبہ ریاض ۱۹۸۹، ص۸ ج۲ آل عمران آیت۷

(۲) تفسیر ابن کثیر سورہ آل عمران آیت۷

اشتباہ پیش نہیں آتا۔ اور اس کی بعض دوسری آیات ایسی ہیں جن کی دلالت واضح نہیں ہے اور ان کو سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو یا بعض لوگوں کو اشکال و اشتباہ پیش آتا ہے۔ پس جو شخص مشتبہ (جس میں اسے اشکال پیش آیا ہو) آیت کو واضح آیت کی طرف لوٹاتا ہے اور محکم کو متشابہ پر حکم اور فیصلہ کن بناتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے اور جو اس کے برعکس متشابہ کو اصل اور محکم کو اس کا تابع بناتا ہے تو وہ الٹ جاتا ہے (یعنی ضلالت کے راستے پر چل پڑتا ہے) اسی وجہ سے اللہ نے فرمایا ہے کہ

"اللہ وہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس کی بعض آیات محکمات ہیں جو اصل کتاب ہیں یعنی کتاب کا وہ اصل حصہ ہیں جس کی طرف اشتباہ کے وقت رفع اشتباہ کے لئے رجوع کیا جاتا ہے اور کچھ دوسری آیات متشابہات ہیں جو لفظ اور ترکیب کے اعتبار سے اس معنی کا احتمال بھی رکھتی ہیں جو محکم کے موافق و مطابق ہو اور دوسرے معنی کا احتمال بھی رکھتی ہیں مگر مراد و مقصد کے اعتبار سے محکم سے متضاد معانی کا احتمال نہیں رکھتیں۔

یعنی نفس الامر میں متشابہات سے اللہ کی جو مراد ہے اس کا تو محکمات کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ کلام اللہ میں اختلاف و تناقض موجود نہیں ہے لیکن چونکہ "معنی مراد" کا قطعی علم اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اور الفاظ میں محکمات کے موافق معانی کی گنجائش بھی ہوتی ہے اور ان کے مخالف و متضاد معانی کی گنجائش بھی نکالی جا سکتی ہے اس لئے زائغین اپنے زیغ اور ضلالت کا ثبوت قرآن میں تلاش کرنے اور لوگوں کو ضلالت کے راستے پر چلانے کے لئے متشابہات کے تابع بن جاتے ہیں اور محکمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تاکہ ان سے محکمات سے متضاد معنیٰ نکال کر لوگوں کو گمراہ کر سکیں اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

فَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ سَمَّى اللَّهُ فَاحْذَرُوهُمْ.

"جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیات کے پیچھے لگے ہوتے ہیں بس یہی وہ لوگ

جن کو اللہ نے زائغین کا نام دیا ہے۔ پس تم ان سے بچ کر رہو اور محتاط رہو۔"(۱)

متشابہ سے زائغین کے استدلال کی مثال اس آیت کے شان نزول میں بیان کی گئی ہے جس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ امام ابن جریرؒ نے سند کے ساتھ ربیع سے نقل کیا ہے کہ :

عَمَدُوْا یَعْنِی الْوَفْدَ الَّذِیْنَ قَدِمُوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ مِنْ نَصَارٰی نَجْرَانَ فَخَاصَمُوْا النَّبِیَّ ﷺ قَالُوْا اَلَسْتَ تَزْعُمُ اَنَّہٗ کَلِمَۃُ اللّٰہِ وَ رُوْحٌ مِنْہُ قَالَ بَلٰی قَالُوْا فَحَسْبُنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَۃِ.(۲)

"نجران سے نصاریٰ کا جو وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تھا انھوں نے آپ سے مباحثہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم یہ نہیں کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ میں کہتا ہوں انہوں نے کہا کہ ہمارے عقیدے کے لئے یہی کافی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو متشابہ ہوں اور تحریفات کی تفسیر اور تاویل کرتے ہیں اپنی گمراہی اور کجی کی تلاش میں۔"

قرآن مجید میں عیسیٰ علیہ السلام کا اپنا اقرار و اعتراف نقل ہوا ہے کہ :

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ (مریم ۳۰)

اور سورۃ زخرف میں فرمایا گیا ہے کہ :

اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ وَ جَعَلْنَاہُ مَثَلًا لِّبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ. (الزخرف ۵۹)

"نہیں تھے عیسیٰ مگر ہمارے بندے تھے جس پر ہم نے اپنا انعام و احسان کیا تھا اور ہم

---

(۱) تفسیر ابن جریر سورۃ آل عمران آیت ۷

(۲) بخاری کتاب التفسیر آل عمران مسلم کتاب العلم

نے اس کو بنی اسرائیل کے لئے نمونہ بنایا تھا۔"

لیکن ان محکم اور واضح آیات کو نظر انداز کر کے نصاریٰ نے کلمة الله و روحٌ مِنهُ کو اپنا ازلغ ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا کیونکہ انہوں نے پہلے سے اپنے دلوں میں یہ ٹیڑھا اور جھوٹا عقیدہ بٹھا رکھا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام دراصل اللہ کا کلام اور اس کی روح ہے جس نے مریم کے پیٹ میں انسانی شکل و صورت اختیار کی ہے اس لئے وہ انسانی پیکر میں اللہ کے بیٹے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹیڑھے اور مشرکانہ معنے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اور اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ کے محکم اور واضح الفاظ سے تو کسی طرح بھی نہیں نکالے جا سکتے اور کلمۃ اللہ اور رُوحٌ مِنہُ سے ان کے نکالنے کی گنجائش موجود ہے مگر کلمۃ اللہ کا صحیح مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے بندے اور اس کے مقدس رسول ازدواجی عمل کے بغیر صرف اللہ کے تکوینی اور کن فیکونی حکم سے پیدا ہوئے تھے اور اللہ نے اس میں اپنی پیدا کردہ روح ڈالی تھی جو مقدس روح تھی یعنی کلمۃ اللہ کے معنے ہیں اللہ کا حکم اور روح اللہ کے معنے ہیں مقدس روح۔ اس تشریح کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام "عبداللہ" بھی ہیں "کلمۃ اللہ" بھی ہیں اور "روح اللہ" بھی ہیں اور ان تینوں ناموں میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن نصاریٰ نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے جو مشرکانہ معنے لئے تھے وہ عبداللہ کے واضح مفہوم سے ٹکراتے ہیں۔

محکمات کو نظر انداز کر کے متشابہات سے غلط معنے نکالنے کی یہ ایک مثال ہے۔ اس کی دوسری مثال خوارج ہیں جن کے مسلک کی بنیاد ہی تاویلات فاسدہ پر قائم ہے اور محکمات و بینات یعنی واضح اور غیر مشتبہ آیات اور صریح الدلالت نصوص کو نظر انداز کر کے متشبہات سے ٹیڑھے معنے نکالنا نصاریٰ کی طرح ان کی بھی عادت رہی ہے اور روافض و سبئیہ نے بھی اسی سنت سیئہ کو اختیار کیا ہے بلکہ ہر دور کے مبتدعین و متجددین نے اسی روش کو اپنایا ہے اور دور جدید کے متجددین بھی اسی طرز استدلال کو اپنا رہے ہیں۔ مسند احمد میں ابو امامہ کی ایک حدیث مرفوعاً نقل ہوئی ہے جس میں خوارج کو فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ کا

مصداق قرار دیا گیا ہے۔(۱)

مگر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ :

وَ هٰذَا الْحَدِيْثُ اَقَلُّ اَقْسَامِهِ اَنْ يَّكُوْنَ مَوْقُوْفًا مِنْ كَلَامِ الصَّحَابِيِّ وَ مَعْنَاهُ صَحِيْحٌ فَاِنَّ اَوَّلَ بِدْعَةٍ وَقَعَتْ فِى الْاِسْلَامِ فِتْنَةُ الْخَوَارِجِ.(۲)

"یہ حدیث اقسام حدیث میں سے کم از کم موقوف یعنی صحابی کا کلام تو ہے اور اس کے معنے بھی صحیح ہیں اس لئے کہ دور اسلام میں سب سے پہلی بدعت جو وقوع پذیر ہوئی تھی وہ خوارج کی بدعت تھی۔"

امام المفسرین محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے نجران کے نصاریٰ کے بارے میں مذکورہ روایت کے نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ :

وَ قَالَ آخَرُوْنَ بَلْ عَنَى اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ بِذَالِكَ كُلَّ مُبْتَدِعٍ فِىْ دِيْنِهٖ بِدْعَةً مُخَالِفَةً لِمَا ابْتَعَثَ بِهٖ رَسُوْلَهٗ مُحَمَّدًا ﷺ بِتَاوِيْلٍ يَتَاَوَّلُهٗ مِنْ بَعْضِ آىِ الْقُرْآنِ الْمُحْتَمِلَةِ التَّاوِيْلَاتِ وَ اِنْ كَانَ اللّٰهُ قَدْ اَحْكَمَ بَيَانَ ذَالِكَ اِمَّا فِىْ كِتَابِهٖ وَ اِمَّا عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ.

"اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں اللہ عزو جل کی مراد ہر وہ مبتدع ہے جس نے اس کے دین میں وہ بدعت ایجاد کی ہو جو اس دین کے خلاف ہو جس پر اس نے اپنے رسول محمد ﷺ کو بھیجا تھا۔ اور یہ بدعت وجدت فی الدین اس نے قرآن کی بعض آیات سے تاویل کے ذریعے نکالی ہو جن میں متعدد تاویلات کی گنجائش موجود ہو اگر چہ اللہ نے ان آیات کی وضاحت اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبان سے کر لی ہو۔"

اس کے بعد سند کے ساتھ مشہور تابعی قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ :

---

(۱) مسند احمد ص ۲۶۲ ج ۵

(۲) تفسیر ابن کثیر سورة آل عمران آیت ۷

اِنْ لَّمْ یَکُوْنُوْا الْحَرُوْرِیَّۃُ وَالسَّبَئِیَّۃُ فَلَا اَدْرِیْ مَنْ ھُمْ.

"اگر متشابہات کا اتباع کرنے والے زائغین خوارج اور روافض نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا کہ اور کون ہیں؟...... اللہ کی قسم یہودیت بھی بدعت ہے' نصرانیت بھی بدعت ہے' حروریت یعنی خارجیت بھی بدعت ہے اور سبئیت یعنی شیعیت بھی بدعت ہے اور یہ بدعات نہ قرآن میں نازل ہوئی ہیں اور نہ ان کو اللہ کے نبی نے جاری کیا ہے۔"(۱)

متشابہ کی قسمیں

اصولیین کی اصطلاح میں تو محکم اسے کہتے ہیں جس میں نسخ و تبدیل کا احتمال نہ ہو اور یہ معنے اس قول سے ماخوذ ہیں کہ بِنَاءٌ مُحْکَمٌ اَیْ مَامُوْنُ الْاِنْتِقَاضِ یعنی مضبوط عمارت جو ٹوٹنے اور گرنے سے محفوظ ہو۔(۲)

اور متشابہ ان کی اصطلاح میں اس کا نام ہے جس کی حقیقت اور مراد معلوم کرنے کی امید منقطع ہو چکی ہو' اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے حق اور منزل من اللہ ہونے پر اعتقاد و یقین رکھا جائے' اور اس کی حقیقت و مراد معلوم کرنے کی کوشش چھوڑ دی جائے۔(۳)

لیکن یہ محکم اور متشابہ کی ایک قسم کی تعریف ہے جو حنفی اصول فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئی ہے مگر قرآن ان کتابوں کی تصنیف سے پہلے "عربی مبین" میں نازل ہوا تھا اور عربی میں مُحکم وہ ہے جس کے معنے واضح ہوں اور جس کو سمجھنے میں کوئی خفاء نہ ہو' اس مفہوم کے اعتبار سے محکم کا اطلاق ظاہر' نص' مفسر اور اصطلاحی محکم سب پر ہوتا ہے اور متشابہ عربی میں اسے کہتے ہیں جس کے معنے واضح نہ ہوں اور جسے سمجھنے میں اشکال پیش آسکتا ہو' اس مفہوم

(۱) تفسیر ابن جریر سورۃ آل عمران آیت۷ جلد ۳ ص۱۷۷۔۱۷۸

(۲) اصول سرخسی ص۱۶۵ ج۱

(۳) اصول سرخسی ص۱۶۹ ج۱

کے اعتبار سے متشابہ کا اطلاق خفی' مشکل' مجمل اور اصطلاحی متشابہ سب پر ہوتا ہے۔ لیکن اصطلاحی متشابہ کے علاوہ باقی اقسام کے معانی و مفاہیم' سیاق و سباق اور نظائر و امثال میں غور و فکر کرنے سے یا لغت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے یا احادیث و آثار کے ذریعے معلوم کئے جا سکتے ہیں اور "راسخین فی العلم" یعنی پختہ علم والے ان کو جانتے ہیں مگر متشابہ کی جس قسم کی حقیقت اور مراد معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہ ہو اور اسے معلوم کرنے کی امید منقطع ہو چکی ہو تو اس کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا مثلاً اللہ کا استواء علی العرش' نزول الی سماء الدنیا' اس کا ید' اس کا وجہ' اس کے اصابع و انامل اور اس قسم کے دوسرے اسماء و صفات جن کا ذکر تو قرآن و حدیث میں ہوا ہے مگر ان کی حقیقت و ماہیت کا بیان اللہ نے اپنی کتاب میں بھی نہیں کیا اور اس کے رسول نے بھی ان کی وضاحت نہیں کی یا مثلاً حروف مقطعات اور امور غیبیہ جن کا علم سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ متشابہ کی اس تقسیم سے وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ پر وقف اور وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کے ساتھ اس کے وصل کے بارے میں سلف و خلف کے درمیان اختلاف کی توجیہ بھی ہو جاتی ہے اس لئے کہ اگر متشابہ سے مراد اس کی وہ قسم ہو جس کی معرفت کا کوئی ذریعہ موجود نہ ہو تو پھر الا اللہ پر وقف لازم ہوگا کیونکہ اس قسم کا علم سوائے اللہ کے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے نہ پختہ علم والوں کو اور نہ ناپختہ علم والوں کو' لیکن اگر متشابہ سے اس کی وہ قسمیں مراد ہوں جن کی معرفت کے اسباب و ذرائع موجود ہوں تو پھر الا اللہ کا والراسخون کے ساتھ وصل بھی جائز ہوگا کیونکہ ان کے معانی و مفاہیم کو غور و فکر اور تدبر کے ذریعے یا احادیث و آثار کے ذریعے راسخین فی العلم بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے متشابہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:

"تمام متشابہات تین قسموں میں منقسم ہیں ایک قسم وہ ہے جس کو جاننے کا کوئی ذریعہ

موجود نہیں ہے جیسے قیامت کے قیام کا وقت' دابۃ الارض کا خروج' اس دابے کی کیفیت اور اس طرح کی دوسری چیزیں' دوسری قسم وہ ہے جس کی معرفت کا ذریعہ انسان کے پاس موجود ہے جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مغلقہ اور تیسری قسم وہ ہے جو ان دونوں قسموں کے درمیان ہے' ہو سکتا ہے کہ بعض پختہ علم والوں کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے اور جو علم میں ان سے فروتر ہوں ان پر اس کی حقیقت مخفی رہ جائے۔ یہی وہ قسم ہے جس کی طرف حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یا اللہ اس کو دین میں فقاہت عطا فرما اور اس کو قرآن کی تاویل کا علم مرحمت فرما' ابن عباسؓ کے بارے میں بھی آپ نے اسی قسم کی دعا کی تھی' اور جب تم نے یہ سب اقسام جان لئے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَه' اِلَّا اللّٰهُ پر وقف کرنا اور اس کا والراسخون فی العلم کے ساتھ وصل کرنا دونوں جائز ہیں اور مذکورہ تفصیل کے مطابق ہر ایک کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔"(۱)

اصولیین کے اصطلاحی معنوں میں متشابہ آیات کی تعداد قرآن میں بڑی قلیل اور محدود ہے اس لئے کہ "ام الکتاب" یعنی قرآن کا اکثر حصہ (معظم القرآن) محکمات پر مشتمل ہے جن سے احکام معلوم کئے جاتے ہیں۔ مگر یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ متشابہات کے نزول میں حکمت کیا ہے؟ اور پورا قرآن محکمات اور مفصلات پر کیوں مشتمل نہیں ہے؟ تاکہ اشکال و اشتباہ پیش ہی نہ آسکے اس کے جواب میں امام رازی نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ امام موصوف نے "طول لاطائل" سے کام لیا ہے اور بعض کمزور قسم کی وجوہات کا ذکر بھی کیا ہے۔

صحیح جواب یہ ہے کہ جن آیات کا تعلق اعتقادی اور عملی احکام اور تذکیرات ثلاثہ سے ہے ان کو سمجھنے میں ایسا کوئی اشتباہ موجود نہیں ہے جس کا ازالہ ممکن نہ ہو بلکہ راسخین فی العلم عربیت میں مہارت اور تفسیر کے دوسرے ذرائع سے ان آیات کو سمجھ بھی سکتے ہیں اور سمجھا

---

(۱) المفردات فی غریب القرآن طبع نور محمد کراچی ۱۹۶۱، ص ۲۵۵ باب الشین

بھی سکتے ہیں باقی رہی متشابہ کی وہ قسم جس کی حقیقت کو جاننے کا کوئی ذریعہ موجود نہ ہو تو اس میں حکمت اہل ایمان کا امتحان ہے کہ کون صادق الایمان اور کامل الایمان ہے جو قرآن کی ہر بات پر ایمان لاتا ہے خواہ وہ اس کی حقیقت کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو ؟ اور کون ضعیف الایمان ہے جو قرآن کی صداقت اور رسول کی رسالت پر اعتماد کی بجائے اپنی عقل کو حق وباطل کا معیار بناتا ہے ؟ اور جب تک اس کی عقل بے مایہ کسی چیز کی حقیقت کو سمجھ نہ سکے اس وقت تک وہ اسے نہیں مانتا اگرچہ اس کا ذکر قرآن میں یا حدیث میں ہوا ہو۔

اقسام القرآن

قَسَم بمعنی حلف ویمین کلام عرب میں کثیر الاستعمال ہے اور اس کا مقصد کسی خبر کی تاکید یا اس کی اہمیت اور ضرورت واضح کرنا ہوتا ہے یعنی مخاطبین اگرچہ اس خبر پر یقین کرتے ہوں' اس کی صداقت کے بارے میں ان کے دلوں میں کسی قسم کا شک وشبہ موجود نہیں نہ ہو لیکن جب قسم کے ساتھ اس کا ذکر کیا جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ یہ بڑی اہم بات ہے جس کو یاد رکھنا اور اس کے تقاضے پورے کرنا ضروری ہے۔ عربی زبان میں جس طرح اِنَّ اَنَّ لَ اور قَدْ کلام کے مؤکدات ہیں جن کے ذریعے بات کی پختگی اور سچائی پر زور دینا مقصود ہوتا ہے اور سامعین کو اسے تسلیم کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی طرح حلف اور قَسَم بھی کلام کے مؤکدات میں شامل ہے جس سے سامعین کو متوجہ اور متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس بات کی خبر دی گئی ہے وہ پکی اور سچی ہے' جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پیدا کیا جائے گا اور جو وعید سنائی گئی ہے وہ صرف دھمکی نہیں ہے بلکہ اس کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہے۔

بندوں کے لئے غیر اللہ کی قسم ممنوع ہے

مشرکین عرب اپنے مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ کلچر کی بنا پر بہت سے مشرکانہ افعال و اقوال اور عادات ورسوم میں مبتلا تھے وہ اپنے آلھہ باطلہ' اپنے آباء واجداد اور اللہ کے نیک بندوں کے نام کی قسمیں بھی کھاتے تھے جس طرح آج کل مسلمانوں میں جہالت ولاعلمی اور اندھی عقیدت کی وجہ سے اولیاء کرام کے نام کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ یہ قسمیں اس نظریے اور فکر پر مبنی ہوتی ہیں کہ اگر میں نے جھوٹی بات پر ان کے نام کی قسم کھائی یا ان کے نام کی قسم کھا کر کوئی وعدہ کیا اور پھر پورا نہ کیا تو یہ بزرگ مجھے نقصان پہنچا دیں نے اس

لئے کہ اللہ نے ان کو نفع وضرر کے اختیارات دیئے ہیں اس عقیدے کی بنیاد پر تو بزرگوں اور اولیاء کرام کی قسم کھانا کفر اعتقادی اور شرک جلی ہے لیکن اگر عقیدہ یہ نہ ہو بلکہ صرف تعظیم کے لئے ان کے ناموں کی قسمیں کھائی جائیں تو پھر یہ شرک فعلی ہوگا اور گناہ کبیرہ ہوگا جیسا کہ کسی کو مختار کل اور غیبی قوۃ کا مالک سمجھ کر سجدہ کرنا اس کی عبادت ہے اور شرک جلی ہے اور اس عقیدے کے بغیر صرف تعظیم وادب کے لئے کسی کو سجدہ کرنا اس کی عبادت تو نہیں ہے مگر شرک فعلی ہے اور حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع کیا ہے اسی طرح غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے سے بھی منع کیا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ کیجئے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلْفِهٖ وَاللَّاتِ فَلْیَقُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.(۱)

”ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے حلف میں کہا ہو کہ قسم ہے لات کی تو وہ اس کے بعد کہے کہ لا الہ الا اللہ۔“

یعنی اس مشرکانہ کلمہ سے توبہ کرے اور تجدید ایمان کے لئے یا مشرکانہ قول سے استغفار کے لئے کلمہ طیبہ پڑھ لے۔ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ لات ایک شخص تھا جو حاجیوں کو ستو کھلاتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کو اس سے بڑی محبت وعقیدت تھی اور وہ اس کے نام پر بنائے گئے بت کی پرستش بھی کرتے تھے اور اس کے نام کی قسمیں بھی کھایا کرتے تھے۔

عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَدْرَکَهٗ وَ هُوَ فِیْ رَکْبٍ وَ هُوَ یَحْلِفُ بِاَبِیْهِ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ یَنْهَاکُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَاءِ کُمْ فَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰهِ اَوْ لِیَسْکُتْ.(۲)

(۱) بخاری کتاب الایمان باب لا یَحلِفُ باللات و مسلم فی الایمان مَنْ حَلَفَ اللات والعزیٰ

(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب لا تحلفوا بآباء کم صحیح مسلم کتاب الایمان باب النہی عن الحلف بغیر اللہ

"عمر فاروقؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس حال میں پالیا کہ میں ایک قافلے میں جاتے ہوئے کسی بات پر اپنے باپ کی قسم کھا رہا تھا آپ نے فرمایا بے شک اللہ نے تم کو اپنے باپوں کی قسم کھانے سے منع کر دیا ہے پس جو بھی قسم کھانا چاہے تو اللہ کی قسم کھائے یا پھر خاموش رہے۔"

"ابن عمرؓ نے ایک شخص سے سنا جو کہہ رہا تھا کہ نہیں! کعبے کی قسم اس پر ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی ہو تو اس نے شرک کیا ہے۔"(۱)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَحْلِفُوْا بِآبَاءِ كُمْ وَلَا بِاُمَّهَاتِكُمْ وَلَا بِالْاَنْدَادِ وَلَا تَحْلِفُوْا اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْلِفُوْا بِاللّٰهِ اِلَّا وَ اَنْتُمْ صَادِقُوْنَ.(۲)

"ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنے باپوں کی قسم نہ کھاؤ' اپنی ماؤں کی قسم بھی نہ کھاؤ اور اپنے ان معبودوں کی قسم بھی نہ کھاؤ جن کو تم نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا لیا ہے بلکہ اللہ ہی کی قسم کھاؤ اور اللہ کی قسم بھی اسی وقت کھاؤ جب کہ تم قسم کھانے میں سچے ہو۔"

ان احادیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ لات وعزیٰ' ماں باپ' کعبے اور اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کی قسم کھانا ممنوع ہے اور اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل بعض مسلمان اولیاء کے اسماء اور ان کے مزارات کی قسمیں کھاتے ہیں۔ جب کعبے کی قسم کھانا جائز نہیں ہے تو بزرگوں کی قبروں پر جا کر ان کی قسمیں کھانا کس طرح جائز ہو سکتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ بزرگوں کی قبروں کی عظمت و تقدس کعبے سے تو زیادہ نہیں ہے۔

(۱) ترمذی فی النذور باب کراھیة الحلف بغیر اللہ تعالی' ابوداؤد باب کراھیة الحلف بالآباء. کتاب الایمان

(۲) ابوداؤد کتاب الایمان باب کراھیة الحلف بالآباء.

افلح وابیہ کی توجیہ

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماں باپ کی قسم کھانے سے امت کو تو منع کیا ہے لیکن ایک اعرابی نے جب آپ کے سامنے اسلام کے فرائض واحکام کی پابندی کا عہد کیا تو آپ نے فرمایا اَفلَحَ وَ اَبِیہِ اِن صَدَقَ "اس کے باپ کی قسم یہ شخص کامیاب ہو گیا ہے اگر اپنے وعدے میں سچا ہو" ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہو سکتا اور آپ کے ارشادات میں تضاد و تناقض آپ کی شان سے مناسبت بھی نہیں رکھتا تو نہی اور اباحت کی احادیث میں جمع و تطبیق کی صورت کیا ہے؟ اور قول و فعل کے اس تضاد کو رفع کرنے کی توجیہ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے اور اس اشکال کے ازالے کے لئے پہلے تو حدیث کی تخریج ضروری ہے۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں چار مقامات پر نقل ہوئی ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی "وَ اَبِیہ" کا لفظ موجود نہیں ہے بلکہ چاروں مقامات پر صرف اَفلَحَ اِنْ صَدَقَ کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم کی ایک روایت میں بھی وَ اَبِیہِ کا قسمیہ لفظ مروی نہیں ہے۔ مؤطا امام مالک' نسائی اور ابو داؤد کی ایک روایت میں بھی وابیہ کا لفظ نقل نہیں ہوا۔

جن روایات میں یہ لفظ نقل نہیں ہوا ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان' باب الزکوۃ من الاسلام۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الصوم' باب وجوب صوم رمضان۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الشهادات' باب کیف یستحلف۔

(۴) صحیح بخاری کتاب الحیل' باب فی الزکوۃ۔

(۵) صحیح مسلم کتاب الایمان' باب بیان الصلوات عن قتیبۃ عن مالک۔

(۶) مؤطا امام مالک کتاب الصلوۃ باب جامع الترغیب فی الصلوۃ۔

(۷) سنن نسائی کتاب الصلوۃ باب کم فرضت الصلوۃ۔

بڑے بڑے حفاظ حدیث کے مذکورہ سات اسانید میں باپ پر قسم کھانے کا لفظ نقل ہی نہیں ہوا البتہ مسلم کی دوسری روایت یعنی یحی بن ایوب وقتیبہ عن اسماعیل بن جعفر کی روایت میں وابیہ کا لفظ نقل ہوا ہے۔ اس لئے اس احتمال کو بالکل رد نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم کی اس روایت میں کسی راوی سے یہ لفظ وہم و خطا کی وجہ سے نقل ہو گیا ہو اگرچہ مسلم کے راوی ثقات ہیں لیکن ثقہ راوی کا وہم و خطا میں مبتلا ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے۔

حدیث ابو داؤد کتاب الصلوۃ باب فرض الصلوۃ میں بھی دو سندوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے مگر عبداللہ بن مسلمہ عن مالک کی روایت میں وابیہ کا لفظ نقل نہیں ہوا۔ البتہ سلیمان بن داؤد عن اسماعیل بن جعفر کی روایت میں یہ لفظ موجود ہے۔ اسانید و طرق کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ حفاظ حدیث کے درمیان متفق علیہ نہیں ہے اس لئے اس کا ثبوت عن الرسول بھی یقینی نہیں ہے جب کہ حلف بالآباء سے نہی کی حدیث ائمہ حدیث کے درمیان متفق علیہ بھی ہے اور ممانعت پر صریح الدلالت بھی ہے اس بنا پر متفق علیہ حدیث کے مقابلے میں غیر متفق علیہ حدیث کو راوی کے وہم پر محمول کر کے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

لیکن محدثین کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ زِيَادَةُ الثِّقَةِ مَقْبُوْلَةٌ یعنی اگر اکثر راویوں نے ایک لفظ کا ذکر نہ کیا ہو مگر اس کی نفی بھی نہ کی ہو اور ایک ثقہ راوی نے اس کا ذکر کیا ہو تو اس کا یہ اضافہ اس بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ دوسرے راویوں نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ اضافہ مقبول ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا راوی ثقہ ہو اس لئے کہ دوسرے راویوں نے اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا مگر انہوں نے اس کی نفی بھی نہیں کی اور وَأَبِيْهِ کی زیادت اسماعیل بن جعفر کی روایت میں نقل ہوئی ہے جو ثقہ راوی ہیں ضعیف نہیں ہیں۔ اس قاعدے کی بنا پر حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ وَالْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ بِلَا مِرْيَةٍ یہ حدیث بلاشبہ صحیح ہے۔ جب حدیث صحیح

ہے تو اس کی کوئی ایسی تاویل و توجیہ کرنا لازمی ہے جو لَا تَحْلِفُوْا بِآبَاءِ کُمْ کے مطابق ہو جیسا کہ گذشتہ عنوان کے تحت محکم و متشابہ کے بارے میں قرآنی قاعدہ بیان ہوا ہے کہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا جائے گا اور اس کی تاویل محکم کی روشنی میں کی جائے گی اور زائغین کی طرح محکم کو نظر انداز کر کے متشابہ سے ٹیڑھے معنے نکالنے سے اجتناب کیا جائے گا لَا تَحْلِفُوْا بِآبَاءِ کُمْ اپنے مفہوم میں محکم اور واضح ہے اور وَأَبِيْهِ میں تاویل کی گنجائش موجود ہے اس لئے محکم کے مطابق اس کی صحیح تاویل و توجیہ کی ضرورت ہے۔

علامہ ابو سلیمان خطابیؒ' امام نوویؒ' حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے جس تاویل کو ترجیح دی ہے اس کا حاصل مفہوم یہ ہے :

"رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے باپ کی قسم نہیں کھائی تھی بلکہ یہ لفظ آپ کی زبان مبارک سے قسم کی نیت کے بغیر نکلا تھا جیسا کہ عربوں کی عادت ہے کہ وہ اپنے خطاب میں تاکید کے لئے اس لفظ کو اکثر استعمال کرتے تھے اور ان کا مقصد قسم کھانا نہیں ہوتا تھا اور ممانعت کی حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جس نے حقیقی معنوں میں باپ کی قسم کھائی ہو اس لئے کہ اس صورت میں جس کی قسم کھائی گئی ہو اس کی تعظیم مقصد ہوتی ہے اور اس کی اللہ سبحانہ و تعالی کے ساتھ مشابہت و مشارکت لازم آتی ہے۔ امام نوویؒ نے اس جواب کو پسندیدہ جواب اور ابن حجرؒ نے اس کو قوی تر جواب قرار دیا ہے۔"(۱)

(۱)معالم السنن از خطابی بر حاشیہ ابوداؤد طبع بیروت ۱۹۶۹ء ص۲۷۳ ج۱ کتاب الصلوۃ باب فرض الصلوۃ۔ شرح مسلم از نووی کتاب الایمان باب بیان الصلوۃ۔ فتح الباری از ابن حجر کتاب الایمان باب الزکوۃ من الاسلام۔ عمدۃ القاری از عینی کتاب الایمان باب الزکوۃ من الاسلام

اللہ کی قسموں کی حقیقت

اللہ کے بندے جب قسم کھاتے ہیں تو اس کا مقصد مَحْلُوفٌ بِہٖ کی تعظیم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اللہ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی کی قسم کھانا جائز نہیں ہے لیکن قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالی نے اپنی مخلوقات کی قسمیں بھی کھائی ہیں' اپنی ذات و صفات کی قسمیں بھی کھائی ہیں اور اپنی کتاب کی قسم بھی کھائی ہے 'اللہ سب سے بڑا ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں ہے تاکہ وہ اس کی تعظیم کرے تو آخر مخلوقات کی قسمیں کھانے کی حقیقت کیا ہے؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور اس کے خلف الرشید حافظ ابن قیمؒ دونوں نے لکھا ہے کہ:

وَ اِقْسَامُهٗ بِبَعْضِ الْمَخْلُوْقَاتِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهٗ مِنْ عَظِيْمِ آيَاتِهٖ .... وَ مَا اَقْسَمَ عَلَيْهِ الرَّبُّ فَهُوَ مِنْ آيَاتِهٖ فَيَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ مُقْسَمًا بِهٖ.(۱)

"اللہ کا اپنی مخلوقات میں سے کسی کی قسم کھانا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ اس کی قدرت کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے.... اور جن چیزوں کی رب العالمین نے قسم کھائی ہے وہ اس کی توحید اور عظمت و کبریائی کی نشانیاں ہیں اس لئے جائز ہے کہ ان کی قسم کھائی جائے۔"

یعنی اللہ اپنی مخلوقات میں سے جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان کی تعظیم کرتا ہے یا ان کی قسم اس لئے کھاتا ہے کہ اگر ان کے نام کی قسم پوری نہ کی گئی یا خلاف واقعہ بات پر ان کے نام کی قسم کھائی گئی تو وہ اسے نقصان پہنچادیں گے حاشا و کلّا۔ اللہ سبحانہ وتعالی کسی کی تعظیم کرنے سے اور کسی کے خوف سے منزہ ہے وہ اپنی حکمت کے مطابق جسے چاہے نفع پہنچاتا ہے اور جسے چاہے ضرر پہنچاتا ہے لیکن اسے نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اللہ کی قسموں کا مقصد کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے یا اسے

(۱)فتاوی ابن تیمیه ص۳۱۴،۳۱۵ ج۱۳۔ التبیان فی اقسام القرآن طبع بیروت ۱۶۹۸ء

لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے نشانیاں اور دلائل و شواہد پیش کرنا ہوتا ہے' ظاہر ہے کہ کائنات اور مخلوقات میں سے ہر چیز اللہ کے وجود و توحید اور اس کی قدرت و عظمت پر دلالت کرتی ہے اور اس کی شہادت دیتی ہے یعنی مُقسَمٌ بِه (جس چیز کی قسم اٹھائی گئی ہو) مُقسَمٌ علیہ پر (جس کو ثابت اور واضح کرنے کے لئے قسم اٹھائی گئی ہو) شہادت اور دلالت ہوتی ہے' یہ ہے اللہ کی قسموں کی حقیقت اور اس اعتبار سے خالق کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا جائز ہے اور قرآن سے ثابت ہے مگر مخلوق کا اپنے خالق کی ذات و صفات کے علاوہ کسی کی قسم کھانا جائز نہیں ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اسی طرح اللہ نے جہاں پر اپنی ذات و صفات کی قسم کھائی ہے یا قرآن مجید کی قسم کھائی ہے تو اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی ذات و صفات اور اس کی کتاب جواب قسم (مُقسَم علیہ) کی سب سے بڑی دلیل اور شہادت ہے۔ اللہ کی قسموں کی اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں "اقسام قرآنی" کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

اللہ کی قسموں کی مثالیں

اللہ کی قسموں کی حقیقت بیان کرنے کے بعد مزید وضاحت کے لئے ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے مُقسَم بہ کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور اس کے بعد مُقسَم علیہ کی مثالیں پیش کی جائیں گی' مُقسَم بہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہو اور مُقسَم علیہ سے مراد وہ امور ہیں جن کو ثابت کرنے اور واضح کرنے کے لئے قسم کھائی گئی ہو۔

اللہ نے قرآن میں چار چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں

ا۔ اللہ کی ذات و صفات کی قسم:

وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ. (النحل ۵۶)

"اور لگاتے ہیں یہ مشرک ان خداؤں کے لئے جن کی خدائی پر ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے حصہ ان چیزوں میں جو ہم نے ان کو دی ہیں' اللہ کی قسم ضرور پوچھا جائے گا تم سے ان باتوں کے بارے میں جنہیں تم گڑھتے رہتے ہو۔"

اس آیت میں قیامت کے دن مشرکین سے ان کے شرک کے بارے میں باز پرس کرنے اور محاسبہ کرنے پر اللہ نے اپنے اسم ذاتی کی قسم کھائی ہے جو یوم الحساب کی خبر کے یقینی ہونے کی بہت بڑی شہادت ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِیُّهُمُ الْیَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ. (النحل ۶۳)

"اللہ کی قسم! بے شک ہم نے اپنے رسول ان امتوں کی طرف بھی بھیجے تھے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں لیکن شیطان نے انہیں ان کے برے اعمال خوشنما کر دکھائے تھے پس وہ (یعنی شیطان) آج (دنیا میں) ان کا دوست ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اللہ نے اس آیت میں تین باتوں پر اپنے اسم ذاتی کی قسم کھائی ہے جو ان باتوں کے حق اور سچ ہونے کی بہت بڑی گواہی ہے۔ ایک یہ کہ گزشتہ امتوں کے پاس اس نے رسول بھیجے تھے' دوسری یہ کہ شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال خوشنما بنا دیئے تھے تاکہ وہ انبیاء کی دعوت سے متاثر نہ ہو سکیں اور کفریات ہی کو پسند کرتے رہیں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ آج اس دنیا میں ان کا دوست اور ساتھی یہی شیطان ہے لیکن

قیامت کے دن ان سب کے لئے دردناک عذاب ہے۔

فَوَ رَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (الحجر ۹۲)

"پس تیرے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے ان اعمال کے بارے میں جنہیں وہ کرتے رہے تھے۔"

رب اللہ کا اسم صفتی ہے جس کے معنے ہیں مالک' پروردگار اور حاکم اس آیت میں قیامت کے محاسبہ اور باز پرس کے حق اور سچ ہونے پر اللہ نے اپنی صفت ربوبیت پر قسم کھائی ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ. (الذاریات ۲۳)

"پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم! کہ قیامت کا آنا حق ہے جیسے کہ تم بات چیت کرتے ہو۔"

یعنی جیسے تم کو اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات کے بارے میں یہ شک نہیں ہوتا کہ یہ بات میری زبان سے نکلی ہے یا کسی اور کی زبان سے نکلی ہے اسی طرح قیامت کا قائم ہونا بھی یقینی ہے اور اس کے یقینی و قطعی ہونے پر آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار گواہ ہے۔ ان دونوں آیتوں میں قسم اور جواب قسم کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام ربوبیت جس کو بنانے اور چلانے والا اللہ ہے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جزاو سزا کا دن ضرور آئے گا۔ اگر یہ دن نہ ہوتا تو پھر انسان کا پیدا کرنا' اس کو احکام کا مکلف بنانا اور اس کی خدمت کے لئے ارض و سماء کا نظم قائم کرنا ایک لایعنی اور بے مقصد کام ہوتا جس سے حکیم و علیم رب منزہ ہے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ مشرکین دوبارہ زندگی کو اور قیام قیامت کو بعید از قیاس اور ناممکن سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا کہ زمین و آسمان کے بارے میں تو تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ ان کا خالق و مالک اللہ ہے اور اسی نے کائنات کا نظم بنایا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اور اسے تم بعید از قیاس اور ناممکن نہیں سمجھتے تو بعث بعد الموت کو آخر کس دلیل کی بنیاد پر ناممکن قرار دیتے ہو؟

۲۔ قرآن کی قسم :

وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (یٰس ۲۔۳۔۴)

"قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم رسولوں میں سے ہو اور سیدھے راستے پر ہو۔"

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کے راہ راست پر ہونے کے لئے قرآن حکیم کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے اس لئے کہ قرآنی تعلیمات کی صداقت اور حکمت و مصلحت' اس کی فصاحت وبلاغت اور اس کی مثال پیش کرنے سے انس و جن کا عاجز ہونا اس بات کی کھلی اور واضح دلیل ہے کہ اس قرآن کا پیش کرنے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا سچا رسول ہے اور صراط مستقیم پر گامزن ہے اور اس کی پیروی کرنے والے بھی سچے ہیں اور راہ راست پر ہیں۔

وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِo بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍo (ص ۱۔۲)

"قسم ہے قرآن نصیحت والے کی۔ بلکہ جنہوں نے انکار کیا ہے وہ شدید تعصب اور ضد میں مبتلا ہیں۔"

سلف صالحین سے ذی الذکر کے دو معنے منقول ہیں۔ ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ نے اس کے معنے کئے ہیں ذی الشرف یعنی عظمت و شرف اور بڑی شان والا۔ اور قتادہ سے اس کے معنے ذی التذکرۃ نقل ہوئے ہیں یعنی نصیحت والا۔

عربی لغت میں الذکر کا لفظ اگرچہ شرف و عظمت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے مشہور معنے ہیں نصیحت اور یاد دہانی اس لئے اکثر مفسرین نے اس کا ترجمہ کیا ہے "قسم ہے قرآن کی جو نصیحت والا ہے۔"

ابن جریر طبریؒ اور ابن عطیہ غرناطیؒ نے قتادہؒ کے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اس مقام پر جواب قسم مقدر ہے جو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَالْقُرْآنِ مَا الْاَمْرُ كَمَا تَزْعُمُوْنَ. "قسم ہے قرآن کی کہ بات وہ نہیں ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ قرآن اپنی طرف سے بنایا ہوا ہے

بلکہ اس کی تعلیمات اور ہدایات شہادت دیتی ہیں کہ یہ اللہ کی نازل کردہ سچی کتاب ہے مگر کفر کرنے والے ضد اور تعصب میں مبتلا ہیں۔" اور اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ نصیحت والے قرآن کی قسم کہ یقیناً تم اللہ کے رسول ہو اور قرآن کا اعجاز اس کی اپنی سچائی کی دلیل بھی ہے اور اس کے پیش کرنے والے رسول کی سچائی کی دلیل بھی ہے اس لئے دونوں تقدیرات صحیح ہیں۔

۳۔ رسول کی زندگی کی قسم:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ○ (الحجر ۷۲)

"تیری زندگی کی قسم! بے شک وہ لوگ اپنی مستی میں بہکے ہوئے تھے۔"

اس آیت میں جواب قسم تو قوم لوط کی مستی اور خلاف فطرت شہوت پرستی ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک لَعَمْرُكَ میں اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔ یعنی اے میرے حبیب! تیری زندگی کی صداقت وامانت اور طہارت و پاکیزگی شہادت دیتی ہے کہ قوم لوط اپنے خلاف فطرت جذبات سفلی کے نشے میں بہکے ہوئے آوارہ پھر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی پاکیزگی آپ کے دشمنوں کو بھی مسلّم تھی اس لئے اس کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَ مَا ذَرَءَ وَ مَا بَرَءَ نَفْسًا اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنْ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ مَا سَمِعْتُ اللّٰهَ اَقْسَمَ بِحَيٰوةِ اَحَدٍ غَيْرِہٖ.(۱)

"ابن عباسؓ نے کہا کہ اللہ نے محمد ﷺ سے زیادہ معزز و مکرم انسان پیدا نہیں کیا میں نے اللہ کی ایسی آیت نہیں سنی جس میں اللہ نے آپ کے علاوہ کسی شخص کی زندگی کی قسم کھائی ہو۔"

---

(۱) ابن جریر ص ٤٤ ج ١٤

۴۔ مظاہر قدرت کی قسم :

اشیاء عالم' آیات کونیہ اور مظاہر قدرت اللہ کے وجود و توحید کی نشانیاں ہیں اور قرآن کریم میں ان کی قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں جن میں سے ایک مثال یہ ہے :

وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا o وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَاo وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَاo وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَاo وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَاo وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰهَاo وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا o قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا o (الشمس ۱ تا ۱۰)

"قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ اور چاند کی جب کہ وہ سورج کے پیچھے آئے۔ اور دن کی جب کہ وہ سورج کو روشن کر دے۔ اور رات کی جب کہ وہ سورج کو چھپا لے۔ اور آسمان کی اور اس کے بنانے کی۔ اور زمین کی اور اس کے بچھانے کی۔ اور نفس کی اور اس کے درست کرنے کی۔ پس ڈال دی اس نے اس میں اس کی نافرمانی اور پرہیز گاری۔ (یعنی دونوں کی صلاحیت اور قوت اس میں پیدائشی طور پر رکھ دی) بے شک کامیاب ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کر دیا۔ اور ناکام ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کو خاک میں ملا دیا۔" (یعنی ذلیل و رسوا کر دیا)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند' دن اور رات' آسمان اور زمین' نفس انسانی اور اس کی متناسب اور متوازن بناوٹ اور نفس انسانی میں نافرمانی اور پرہیز گاری' نیکی اور بدی' بھلائی اور برائی کے الہام فطری کی قسمیں کھائی ہیں اور ان ساری قسموں کا جواب قسم یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا یعنی کامیاب وہ ہے جس نے اپنے نفس کو شرک و کفر' حرص و ہوئی اور مادہ پرستی و نفس پرستی کی آلائشوں سے پاک و صاف کر دیا ہو اور اس میں ایمان و تقویٰ' عبادت و اطاعت اور نیکی و بھلائی کے میلانات و رجحانات کو ابھارا ہو اور نشوونما دی ہو۔ اور ناکام و نامراد وہ ہے جس نے اپنے نفس کو کفر و شرک' فسق و فجور اور

بدی و برائی میں دبا کر خاک میں ملا دیا ہو۔ یعنی ذلیل ورسوا کر دیا ہو آفاقی اور انفسی شہادتیں فلاح وخسران اور کامیابی وناکامی کے اس قرآنی تصور پر کس طرح دلالت کرتی ہیں؟ اوران قسموں کی جواب قسم کے ساتھ مناسبت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قسموں میں بھی متضاد چیزوں کا ذکر ہوا ہے جن کے نتائج اور آثار یکساں نہیں ہیں بلکہ مختلف ہیں۔ سورج اور چاند کے اثرات کا تنوع روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے کہ سورج روشنی بہت زیادہ تیز بھی ہے اوراس میں حرارت اور گرمی بھی ہوتی ہے اس کے مقابلے میں چاند سورج کی موجودگی میں بے نور ہوتا ہے اور جب رات کو چمکتا ہے تو اس کی روشنی تیز بھی نہیں ہوتی اور اس میں گرمی بھی نہیں ہوتی۔ دن اوررات کا تضاد اوران کے اثرات ونتائج کا تنوع بھی روز روشن کی عیاں ہے اور محتاج بیان نہیں ہے اسی طرح آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی کے تضاد کو ایک اندھا شخص بھی محسوس کرسکتا ہے۔ باقی رہا نفس انسانی تو اس کے اندر الہام فطری طور پر اسے سمجھا دیا گیا ہے تو ان دونوں کا تضاد بھی عقل عام میں آنے والا ہے۔ ان آٹھ متضاد ومتنوع آیات کونیہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تزکیہ وتدسیہ کے اثرات ونتائج یکساں نہیں بلکہ متضاد ہیں ایک کا نتیجہ کامیابی ہیاور دوسرے کا نتیجہ ناکامی ہے یعنی جس طرح سورج اور چاند دن اور رات آسمان اور زمین فجور اور تقوی یکساں نہیں بلکہ ان کے اثرات ونتائج ایک دوسرے سے لازما مختلف ہے اسی طرح نفس کو پاک وصاف رکھنے اور اسے دبانے اور خاک میں ملانے کے اثرات ونتائج بھی یکساں نہیں ہو سکتے بلکہ ایک کا نتیجہ کامیابی وکامرانی اور مسرت وشادمانی کی صورت میں نمودار ہوگا اور دوسرے کا نتیجہ ناکامی ونامرادی اور ذلت ورسوائی کی شکل میں نکلے گا آفاق وانفس کی ان واقعاتی اور گردوپیش میں نظر آنے والی شہادتوں کے ذریعے دراصل انسان کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے

مستقبل کو سورج اور دن کی طرح روشن بنانا چاہتے ہو یا اپنے آپ کو آسمان کی طرح بلند وبالا منزل تک پہنچانا چاہتے ہو اور زمین کی طرح پستی اور ذلت سے بچانا چاہتے ہو تو تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے اپنے نفس کا تزکیہ کرو اور فجور کی روش کو چھوڑ کر اپنے نفس کو خاک میں دبانے سے اجتناب کرو۔ آیات قرآنیہ کے علاوہ آیات کونیہ کی شہادت سے بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ تزکیہ نفس کامیابی کا راستہ ہے اور تدسیہ نفس ناکامی کا راستہ ہے۔

اللہ نے قرآن میں اصول ایمان پر قسمیں کھائی ہیں

مذکورہ مثالیں تو ان چیزوں کی تھیں جن کی قسمیں کھائی گئی ہیں اب ان چیزوں کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن پر قسمیں کھائی گئی ہیں یعنی جن کو ثابت کرنے کے لئے اور ان پر زور دینے کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن میں قسمیں کھائی ہیں ان کی مثالیں سپرد قلم کی جارہی ہیں۔

۱۔ توحید پر قسم کھانے کی مثال:

وَالصَّافَّاتِ صَفًّاo فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًاo فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًاo إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌo (الصافات ۱۔ ٤)

"قسم ہے صف باندھنے والوں کی قطار بنا کر' پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر' پھر پڑھنے والوں کی ذکر کو کہ یقیناً تمہارا معبود ایک ہی ہے۔"

صف کے معنے ہیں ایک جماعت کو ایک خط مستقیم پر جمع کرنا یعنی اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی تعمیل میں صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں اور ہر وقت تیار اور مستعد رہنے والوں کی قسم "زجر" کے اصل معنے تو ہیں روکنا اور بندش لگانا لیکن اس لفظ کا استعمال ڈانٹنے اور جھڑکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ ڈانٹ اور جھڑک بھی روکنے اور

بندش لگانے کے لئے ہوتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ شیطانی قوتوں کو روکنے اور ڈانٹنے جھڑکنے والوں کی قسم' تلاوت کے معنے ہیں پڑھنا اور ذکر کے معنے ہیں اللہ کی یاد' مقصد یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کرنے والوں کی قسم کہ تمہارا معبود برحق ایک ہے۔ یعنی ان صفات ثلاثہ سے موصوفین اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ ہے اور اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ ان آیات میں صفات کا ذکر ہوا ہے لیکن موصوفین کا ذکر نہیں ہوا۔ قرآن و سنت کی دوسری نصوص سے جب ہم ان صفات کے حاملین معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ کے تین قسم کے بندے ہمیں ملتے ہیں جن میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ایک فرشتے جو اللہ کی عبادت واطاعت کے لئے قطار در قطار صف بستہ کھڑے رہتے ہیں' اللہ کی حمد و تسبیح اور اس کے ذکر میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں اور شیاطین کو اوپر جانے سے شہاب ثاقب پھینک کر روکتے ہیں۔

اسی سورۃ صافات میں فرشتوں کا قول نقل ہوا ہے :

وَ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ○ (الصافات ١٦٥. ١٦٦)

"اور بے شک ہم صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور بے شک ہم اللہ کی پاکی بیان کرنے والے ہیں۔"

فرشتوں کی دو صفات کا ذکر تو اسی سورت میں ہوا ہے اور شیاطن کو شہاب ثاقب کے ذریعے روکنے کا ذکر دوسری آیات اور احادیث میں ہوا ہے۔

اسی طرح مجاہدین فی سبیل اللہ کی صفات بھی صف بندی' ذکر الٰہی اور دشمنان اسلام کے حملے کو روکنا اور ان کو ڈانٹنا جھڑکنا بیان کی گئی ہیں :

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ.

"بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں جیسا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔"

ذکر الٰہی کی صفت اس طرح بیان ہوئی ہے کہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ.

"اے ایمان والو جب تم سامنا کرو کسی مخالف اسلام فوج کا تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

سنن ترمذی ابواب الدعوات میں حدیث قدسی آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "میرا بندہ تو وہ ہے جو دشمن سے لڑتے ہوئے بھی مجھے یاد کرتا ہو۔" اور روکنے 'ڈانٹنے' جھڑکنے کا ذکر وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ اور وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ میں ہوا ہے۔ یعنی دشمن کے مقابلے میں ہر مورچے میں بیٹھے رہو اور ان پر سخت حملہ کرو۔ تیسری قسم نمازیوں کی ہے جو صفیں باندھ کر ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں' نماز کے دوران شیطانی وساوس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور نماز کے دوران اللہ کی حمد و ثنا اور اس کے کلام کی قراءت میں مشغول رہتے ہیں۔ الفاظ کے عموم کی بنا پر مفسرین کے ایک گروہ نے فرمایا ہے کہ اس جگہ مذکورہ تینوں قسم کے بندگان خدا مراد ہیں۔

وَ قَالَتْ فِرْقَةٌ أَرَادَ كُلُّ مَنْ يَصُفُّ مِنْ بَنِي آدَمَ فِي قِتَالٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ فِي صَلٰوةٍ وَ طَاعَةٍ وَالتَّقْدِيرُ وَالْجَمَاعَاتُ الصَّافَّاتُ وَاللَّفْظُ يَحْتَمِلُ أَنْ يَعُمَّ جَمِيعَ هٰذِهِ الْمَذْكُورَاتِ. (۱)

"ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس جگہ اللہ کی مراد وہ سب انسان ہیں جو اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے صفیں بناتے ہیں یا نماز اور اطاعت کے دوسرے کاموں میں صف بندی کرتے ہیں۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے وَالْجَمَاعَاتُ الصَّافَّاتُ قسم ہے ان جماعتوں کی جو صفیں بناتی ہیں' لفظ عام ہے جس کا مذکورہ تمام بندگان خدا پر اطلاق ہو سکتا ہے۔"

لیکن امام المفسرین ابن جریر طبریؒ نے ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ اور اکثر تابعینؒ کے اس

(۱) المحرر الوجیز لابن عطیه غرناطی ص ۳۳۲-۳۳۳ ج ۱۲

قول کو ترجیح دی ہے کہ فرشتے مراد ہیں اور جمہور مفسرین نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے۔

فرشتوں کی صفوف کا ذکر احادیث میں بھی آیا ہے۔ جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا تُصَفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ؟ قُلْنَا وَ كَيْفَ تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ؟ قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْمُتَقَدِّمَةَ وَ يَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ.(۱)

"کیا تم صفیں نہیں بناتے ہو جس طرح کہ فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟ ہم نے کہا فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صفیں بناتے ہیں؟ فرمایا وہ پہلی صفوں کو پوری کرتے ہیں اور آپس میں خوب کندھے ملا کر صف بناتے ہیں۔"

شان نزول کی بحث میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ صحابہؓ و تابعینؒ کی عادت یہ تھی کہ آیت کا مضمون جس پر بھی صادق آتا ہو وہ اسے آیت کا شان نزول قرار دیدیا کرتے تھے اس لئے یہاں پر بھی ملائکہ کا مراد ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ مجاہدین اور نمازی بھی الفاظ کے عموم میں شامل سمجھ لئے جائیں کیونکہ یہ تینوں صفات تینوں موصوفین پر صادق آتی ہیں۔

۲۔ قرآن پر قسم کھانے کی مثال :

فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ o وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ o اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ o (الواقعہ ۷۵۔۷۷)

"پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے مقامات کی۔ اور یہ ایک بڑی قسم ہے اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ قرآن عزت والا ہے۔"

کفار مکہ قرآن کریم کو کبھی جادو کہتے تھے، کبھی شعر کہتے تھے، کبھی اسے جھوٹی کہانیوں کا نام دیتے تھے، کبھی کسی انسان یا جن کی پڑھائی ہوئی کتاب سمجھتے تھے اور کبھی اپنی طرف سے بنائی ہوئی کتاب قرار دیتے تھے۔ فَلَا کے حرف نفی کے ذریعے ان سب خیالات کی تردید کی

(۱) مسلم کتاب الصلوۃ باب الامر بالسکون فی الصلوۃ

گئی ہے یعنی لَیْسَ الْاَمْرُ کَمَا تَقُوْلُوْنَ حقیقت وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بڑا عزت اور شرف والا قرآن ہے اور اس تردید و نفی کے بعد مثبت طور پر مواقع النجوم کی قسم کھا کر قرآن کی عزت و شرف اور عظمت پر ایک بڑی شہادت پیش کی گئی ہے۔

مَوَاقِعُ مَوْقِعٌ کی جمع ہے اور مَوْقِعٌ ظرف مکان کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں وقوع کی جگہ لیکن وقوع کے معنے کیا ہیں؟ وقوع کے معنے گرنا بھی آتے ہیں اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ اَلْوُقُوْعُ ثُبُوتُ الشَّیْءِ وَ سُقُوْطُه یعنی وقوع ثبوت کو بھی کہتے ہیں اور سقوط کو بھی کہتے ہیں۔ وَقَعَ الشَّیْءُ مِنْ یَدِیْ کے معنے ہیں میرے ہاتھ سے چیز گر گئی اور وَقَعَ الْحَقُّ کے معنے ہیں حق ثابت ہو گیا تو مَوْقِعٌ کے معنے ہوئے گرنے کی جگہ اگر سقوط کے معنے لئے جائیں یا رہنے اور قرار پانے کی جگہ اگر ثبوت کی معنے لئے جائیں۔

نجوم کا اطلاق تشبیہا اور مجازا تو صحابہ کرام اور علماء دین پر بھی ہوا ہے اور قرآن کی آیات پر بھی ہوا ہے لیکن اس لفظ کے حقیقی معنے ستارے ہیں اور حقیقی معنوں کو چھوڑ کر مجازی معنے مراد لینا تفسیر کا احسن طریقہ نہیں ہے۔ اس لغوی تحقیق کی رو سے مَوَاقِعُ النُّجُوْمِ کے معنے ستاروں کے گرنے کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ ستارے اپنے مدار پر موجود رہتے ہیں اور ان کے ڈوبنے نکلنے سے ان کا افق پر نمودار ہونا اور چھپنا مراد ہوتا ہے اس لئے اس مفہوم کا حاصل ہوا مَشَارِقُ النُّجُوْمِ وَ مَغَارِبِهَا یعنی ایک افق پر ستاروں کے چمکنے کے مقامات اور دوسرے افق پر ان کے گرنے اور ڈوبنے کے مقامات۔ ابن جریر نے حسن بصری اور قتادہ سے یہ معنے نقل کئے ہیں اور اسے ترجیح بھی دی ہے اور وقوع بمعنے ثبوت کے اعتبار سے اس کے معنے ستاروں کے منازل ہیں اور قتادہ سے یہ معنے بھی مروی ہیں لیکن پہلے معنے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس قسم کو قَسَم عظیم یعنی بڑی دلیل اور بڑی شہادت قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ شمس و قمر اور نجوم و کواکب کے طلوع و غروب اور پورے عالم بالا کا یہ مستحکم و مضبوط اور مربوط و متوازن نظام بزبان حال شہادت دیتا ہے کہ جس خدا نے اپنے بندوں کی جسمانی ضروریات

پوری کرنے کے لئے یہ نظام بنایا ہے اسی خدا نے ان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور ان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کا نظام بتانے کے لئے محکم' معتدل و متوازن اور عادلانہ احکام پر مشتمل قرآن کریم بھی نازل کیا ہے تاکہ اس کے بندے شرک و کفر اور ظلم و جور کے اندھیروں سے نجات حاصل کر سکیں اور قرآن کے نور سے منور ہو سکیں۔ قرآن کو کریم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کریم اسے کہتے ہیں جس کے فوائد اور منافع بہت زیادہ ہوں اور قرآن کی تعلیمات کا کثیر المنافع ہونا محتاج بیان نہیں ہے اس لئے کہ یہ مکارم اخلاق' زندگی کے ارفع واعلیٰ مقصد اور کامل دستور حیات پر مشتمل ہیں۔ اس کے کریم ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ رب کریم کی جانب سے رسول کریم یعنی جبریل کے ذریعے اَکْرَمُ الْخَلْقِ یعنی محمد ﷺ کے قلب کریم پر نازل ہوا ہے۔

۳۔ رسولؐ پر قسم کھانے کی مثال :

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ○ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ○ (القلم ۱ ۔ ۲)

"قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے وہ لکھتے ہیں کہ نہیں ہو تم اپنے رب کے فضل سے مجنون۔"

کفار مکہ نے کہا تھا کہ :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ. (الحجر ٦)

"اے وہ شخص جس پر بقول تیرے قرآن نازل ہوا ہے بے شک تم تو دیوانے ہو۔"

اللہ نے اس کے جواب میں قلم اور اس سے لکھی گئی تحریروں کی قسم کھا کر فرمایا کہ اللہ کے فضل و احسان سے تم دیوانے نہیں ہو بلکہ حکمت و دانائی سے لبریز پیغام پہنچانے والے رسول ہو۔ قلم سے تقدیر لکھنے والی قلم بھی مراد ہے' عمل نامے لکھنے والی قلم بھی مراد ہے اور وحی لکھنے والی قلم بھی مراد ہے اور مَا يَسْطُرُوْنَ سے لوح محفوظ پر لکھی گئی تقدیر الاشیاء بھی مراد ہے کاتبان وحی کی لکھی گئی کتب الٰہیہ بھی مراد ہیں اور خود انسان کے اپنے عمل نامے بھی مراد

ہیں اور یہ سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جس خلق عظیم پر محمدؐ قائم ہیں اس خلق عظیم کا حامل شخص دیوانہ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جزا اور وعدو وعید پر قسم کی مثال :

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًاo فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًاo فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًاo فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًاo اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌo وَ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌo (الذاريات ۱.۶)

"قسم ہے بکھیرنے والیوں کی اڑا کر' پھر اٹھانے والیوں کی بوجھ کو' پھر چلنے والیوں کی نرمی کے ساتھ' پھر تقسیم کرنے والیوں کی حکم کو' کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچی خبر ہے اور بے شک حساب ہونے والا ہے۔"

حافظ ابن کثیر نے حافظ ابو بکر بزار کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ صَبِیغ تمیمی کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "ذاریات" سے ہوائیں مراد ہیں "جاریات" سے کشتیاں مراد ہیں اور "مقسمات" سے فرشتے مراد ہیں اور ہر سوال کا جواب دیتے وقت فرمایا تھا کہ وَلَوْلَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُہٗ 'مَاقُلْتُہٗ' اگر میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی نہ ہوتی تو میں یہ جواب نہ دیتا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر حدیث مرفوع سے ثابت ہے لیکن بزار نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس کی سند کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں ابو بکر بن ابی سبرہ ضعیف راوی ہے اور دوسرا راوی سعید بن سلام اصحاب حدیث یعنی حدیث کے قابل قبول راویوں میں شامل نہیں' راویوں کے ضعف کی وجہ سے ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع یعنی قول رسول ہونا ضعیف ہے اور اس کے بارے میں قریب ترین بات یہی کہی جا سکتی ہے کہ یہ حضرت عمرؓ پر موقوف ہے یعنی ان کا قول ہے۔(۱)

عربیت کے لحاظ سے تو یہ صفات اربعہ الگ الگ چیزوں کی صفات بھی ہو سکتی ہیں اور

---

(۱) تفسیر ابن کثیر الذاریات ۱۔۶

ایک ہی موصوف کی صفات بھی ہو سکتی ہیں اس لئے بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو اپنے عموم پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ بکھیرنے اور اڑانے والی ہوائیں' پانی کا بوجھ اٹھانے والے بادل' دریاؤں میں چلنے والی کشتیاں اور اللہ کے احکام اور تکوینی فیصلے تقسیم کرنے والے فرشتے یہ ساری چیزیں گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجے کا ایک حکیمانہ نظام ہے اور اس دنیا میں عقل و تمیز اور اختیار و ارادہ رکھنے والے نوع انسانی کو عبث اور لایعنی زندگی گزارنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اسے اللہ کی معرفت اور اس کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا تقاضیٰ یہ ہے کہ ایسا دن ضرور آئے جس میں باز پرس ہو' حساب ہو اور اعمال کی جزا یا سزا دی جائے۔ اس اعتبار سے یہ صفات الگ الگ چیزوں سے متعلق ہونے کے باوجود قیامت اور روز جزا کے صدق و وقوع کی دلیل اور شہادت بن سکتی ہیں۔ لیکن ذاریات کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد ہوائیں ہیں اور بالعموم حرف فا کے ساتھ معطوفات سے مراد وہی چیز ہوتی ہے جو سب سے پہلے ذکر ہوئی ہو اس لحاظ سے نظم کلام کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھنے والی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ چاروں صفات ہواؤں کی ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ قسم ہے گرد و غبار اور بخارات اڑاتے اور بکھیرنے والی ہواؤں کی جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں' پھر بادلوں کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں اور پھر بارش کی تقسیم کرنے والی ہیں کہ جس دن کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا وعدہ ہے اور حساب ضرور ہونے والا ہے۔ ہواؤں کی ان صفات کو قیامت کے آنے اور حساب کے ہونے کی شہادت اس طرح قرار دیا جا سکتا ہے کہ منکرین بعث بعد الموت کو تعجب و حیرت اس بات پر تھی کہ جسم کے منتشر اجزاء آخر دوبارہ کس طرح اکھٹے کر کے جوڑے جا سکتے ہیں؟ تو اللہ نے اس کی نظیر میں اپنے نظام آب رسانی اور آب پاشی کو پیش کیا ہے کہ جس طرح ہواؤں کے ذریعے پانی کے قطرے بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں اور پھر انہی ہواؤں کے ذریعے یہ قطرے اسی شکل میں جن میں وہ پہلے تھے زمین پر واپس آکر اپنے ذخیرہ آب میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی

طرح جسم انسانی کے منتشر اجزاء کو اپنی پرانی حالت میں جمع کر کے جوڑنا بھی ناممکن نہیں ہے۔

۶۔انسان کے احوال واعمال پر قسم کی مثال :

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىo وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰىo وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىo اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰىo (اللیل ۱۔۴)

"قسم ہے رات کی جب کہ وہ ڈھانپ لے اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو جائے' اور اس کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا' کہ بے شک تمہاری کوششیں (اعمال) مختلف ہیں۔"

یعنی جس طرح رات اور دن' اندھیر اور اجالا' نر اور مادہ اور کائنات کے سارے اضداد کے آثار مختلف اور متضاد ہیں اسی طرح تمہاری جدوجہد اور کوشش' محنت ومشقت بھی مختلف اور متضاد ہے اور اس کے آثار و نتائج بھی الگ الگ ہیں۔ دنیا تو دار العمل ہے اس لئے اس دنیا میں رہنے والا ہر انسان کام تو کرتا ہے بے کار اور بے عمل یہاں پر کوئی بھی نہیں ہے ظاہر ہے کہ جو سانس لیتا ہے اور زندہ ہے وہ حرکت ضرور کرے گا بے حس وبے حرکت تو بیٹھا نہیں رہے گا لیکن کچھ لوگ اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے کام کریں گے تو اللہ ان کے مستقبل کو دن کے اجالے کی طرح روشن بنا دے گا اور کچھ لوگ اپنے مستقبل کو تاریک بنانے کے لئے کام کریں گے تو اس کے نتیجے میں اس کے مستقبل پر بھی اندھیرا چھا جائے گا۔

یہی مضمون سورۃ انشقاق میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ :

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ. (الانشقاق ۶)

"اے انسان! یقیناً تو اپنے رب سے ملنے تک (موت تک) محنت کرتا ہے قسم قسم کی محنت پس تو اپنی محنت سے ملنے والا ہے۔"

کَدْحٌ کے معنے ہیں سَعْيُ الْاِنْسَانِ وَ جُهْدُهٗ فِي الْاَمْرِ یعنی انسان کی کسی کام میں کوشش کرنا اور محنت اٹھانا اس لحاظ سے اِنَّ سَعْيَكُمْ اور اِنَّكَ كَادِحٌ کا مفہوم ایک ہے کہ لوگوں کے کاموں میں یکسانیت نہیں ہے بلکہ اختلاف اور تضاد ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے

عدل اور حکمت سے یہ بات بعید ہے بلکہ اس کی شان سے مناسبت ہی نہیں رکھتی کہ کفرو ایمان' شرک و توحید' اطاعت و معصیت' ظلم و انصاف اور بھلائی و برائی سب کا نتیجہ یکساں نکالے' نہیں! بلکہ نیکی کا بدلہ جنت ہوگا اور بدی کا بدلہ دوزخ ہوگا۔

لا اُقْسِمُ کی تاویل

قرآن کریم کی آٹھ آیات میں اُقْسِمُ کے فعل قَسَم پر لا کا حرف داخل ہوا ہے جس کے حقیقی معنے نفی کے ہیں حالانکہ ان آیات میں قسم کی نفی نہیں کی گئی بلکہ مثبت طور پر قسم کھائی گئی ہے۔ یہ آیات درج ذیل سورتوں میں آئی ہیں۔

الواقعہ ۷۵	الحاقہ ۳۸	المعارج ۴۰	القیامۃ ۱
القیامۃ ۲	التکویر ۱۵	الانشقاق ۱۶	البلد ۱

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان آیات میں مثبت طور پر قسم اٹھانا مراد ہے تو پھر اُقسم کے فعل قسم پر حرف نفی کے داخل کرنے کی تاویل کیا ہے؟

اس کا مشہور جواب تو وہ ہے جو عربیت کے امام جاراللہ زمخشری نے کشاف میں دیا ہے کہ:

اِدْخَالُ لَا النَّافِيَةِ عَلٰى فِعْلِ الْقَسَمِ مُسْتَفِيْضٌ فِيْ كَلَامِهِمْ وَ اَشْعَارِهِمْ وَ فَائِدَتُهَا تَوْكِيْدُ الْقَسَمِ. (۱)

"لا نافیہ کا فعل قسم پر داخل کرنا کلام عرب اور اشعار عرب میں مشہور اور کثیر الاستعمال ہے اور اس کا فائدہ قسم کی تاکید ہے۔"

یعنی فعل قسم پر جو لا داخل ہوتا ہے اس کے معنے نفی نہیں ہوتے بلکہ عربی اسلوب کلام میں اس کے معنے قسم کی تاکید ہوتی ہے لہٰذا لَا اُقْسِمُ کے معنے ہیں میں یقیناً قسم کھاتا ہوں۔ عربی زبان میں لا کا حرف متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں ایک "تاکید قسم" ہے۔ زمخشری کا یہ قول مفسرین میں زیادہ مشہور ہے اس قول میں اس حرف کو زائد

(۱) کشاف ص ۱۸۹ ج ٤ القیامۃ ۱

اور بے معنی قرار نہیں دیا گیا اس لئے کہ قرآن کا ایک حرف بھی لایعنی اور بے معنی نہیں ہے بلکہ اسے لام تاکیدی اور دوسرے مؤکدات کی طرح حرف تاکید تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن ابن جریر طبریؒ نے اہل عربیت کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ :

وَ قَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْعَرَبِيَّةِ مَعْنٰى قَوْلِهٖ فَلَآ اُقْسِمُ فَلَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا تَقُوْلُوْنَ ثُمَّ اسْتَاْنَفَ الْقَسَمَ فَقِيْلَ اُقْسِمُ.(۱)

”عربیت کے بعض ماہرین نے کہا ہے کہ فَلَآ اُقْسِمُ کے معنے ہیں کہ بات وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو اور اس کے بعد قسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں۔“

حافظ ابن کثیرؒ نے فلا اقسم بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”لا“ اس جگہ زائد ہے (یعنی تاکید قسم کے لیے ہے) اور تقدیر کلام اس طرح ہے کہ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ میں قسم کھاتا ہوں۔ ستاروں کے گرنے کے مقامات کی اور اس کا جواب ہے اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ۔ ابن جریر نے یہ قول سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ”لا“ زائدہ اور بے معنی نہیں ہے بلکہ یہ حرف قسم سے پہلے اس وقت لایا جاتا ہے جب کہ کسی بات کی نفی پر قسم کھائی گئی ہو جیسے عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ لَا وَ اللّٰهِ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَدَ امْرَاَةٍ قَطُّ ”نہیں! اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی عورت کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

اور اس جگہ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ :

لَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ لَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا زَعَمْتُمْ اَنَّهٗ سِحْرٌ وَ كَهَانَةٌ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ كَرِيْمٌ .

”نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے مقامات کی کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ قرآن جادو اور کہانت ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عزت و شرف والا قرآن ہے۔“(۲)

یعنی جس طرح عائشہؓ کے قول میں ”لا“ بیعت کے وقت عورت کے ہاتھ کو ہاتھ

(۱) تفسیر ابن جریر الواقعہ ۷۵ (۲) تفسیر ابن کثیر ص ۲۰ ج ۸ الواقعہ ۷۵

لگانے کی نفی کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے اس منفی بات پر قسم کھائی ہے اسی طرح اس جگہ بھی "لا" قرآن کے سحر و کہانت ہونے کی نفی کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد اس کے قرآن کریم ہونے پر مواقع النجوم کی قسم کھائی گئی ہے۔ ابن جریرؒ نے بعض اہل عربیت سے اور ابن کثیرؒ نے بعض مفسرین سے جو توجیہ نقل کی ہے یہ دراصل مشہور نحوی امام فراءؒ متوفی ۲۰۷ھ نے بہت سے نحویین سے اس طرح نقل کی ہے کہ:

كَانَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّحْوِيِّيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا صِلَةَ وَلَا يُبْتَدَءُ بِجَحْدٍ ثُمَّ يُجْعَلُ صِلَةً يُرَادُ بِهِ الطَّرْحُ .... وَلٰكِنِ الْقُرْآنُ جَاءَ بِالرَّدِّ عَلَى الَّذِيْنَ اَنْكَرُوْا الْبَعْثَ وَالْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَجَاءَ الْاِقْسَامُ بِالرَّدِّ عَلَيْهِمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْكَلَامِ الْمُبْتَدَءِ مِنْهُ وَغَيْرِ الْمُبْتَدَءِ كَقَوْلِكَ لَا وَاللّٰهِ لَا اَفْعَلُ ذَالِكَ جَعَلُوْا لَا وَاِنْ رَّئَيْتَهَا مُبْتَدَءَةً رَدًّا لِكَلَامٍ قَدْ مَضٰى.(۱)

"بہت سے نحویین نے کہا ہے کہ قرآن میں زائد لفظ نہیں ہے' اور کلام کا آغاز نفی سے نہیں کیا جاسکتا جسے پھر زائد قرار دے کر ساقط کر دیا جائے بلکہ قرآن نے اس حرف کے ذریعے ان لوگوں پر رد کیا ہے جو دوبارہ زندہ ہونے سے اور جنت و دوزخ سے انکار کرتے تھے تو ان پر رد کرنے کے لئے بہت سے کلمات میں قسم کھائی گئی ہے خواہ ان کا آغاز لا سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو جیسے تیرا یہ کہنا کہ نہیں! واللہ میں یہ کام نہیں کروں گا' لا کے حرف کو اگرچہ تو آغاز کلام میں دیکھتا ہے لیکن حقیقت میں یہ گذشتہ بات کی نفی اور تردید کے لئے ہوتا ہے۔"

فراء عربیت کے بہت بڑے عالم تھے اور عربی اسلوب کلام کو سمجھنے کا بڑا تجربہ رکھتے تھے اس لئے اس نے لَا اُقْسِمُ کی جو تاویل کی ہے وہی راجح نظر آتی ہے کیونکہ لا کو تاکید کے معنوں میں لینے کے مقابلے میں مخالفین کی کسی بات کی نفی اور تردید کے معنوں میں لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مذکورہ آٹھ آیات کے سیاق و سباق میں غور کرنے سے وہ بات بآسانی معلوم کی جاسکتی

(۱) معانی القرآن طبع تہران ص۲۰۷ ج۳

ہے جس کی نفی اور تردید کے لئے فعل قسم سے پہلے "لا" کا حرف لایا گیا ہے۔ ان قسموں کی تھوڑی سی وضاحت ملاحظہ کیجئے جن میں "لا" فعل قسم پر داخل ہوا ہے۔

(۱) فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ کی تاویل تو ابھی ابھی ابن جریر اور ابن کثیر کے حوالے سے آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس جگہ "فلا" کے ذریعے کفار مکہ کے اس قول کی نفی کی گئی ہے کہ قرآن سحر یا کہانت ہے۔

(۲) فَلَا اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَo وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَo اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِيْمٍo وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَo وَلَا بِقَوْلِ کَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَo (الحاقة۳۸۔۴۲)

"پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو' اور ان کی جنہیں تم نہیں دیکھتے' کہ یقیناً یہ قرآن ایک عزت والے رسول کا بتایا ہوا کلام الٰہی ہے' اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے' مگر تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔"

شاعر کا قول ہونے اور کاہن کا قول ہونے کی نفی سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کفار محمد ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے اور قرآن کو شعر اور کہانت کہتے تھے اس لئے فلا کے معنے ہیں لَيْسَ الْاَمْرُ کَمَا تَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ قَوْلُ شَاعِرٍ اَوْ قَوْلُ کَاهِنٍ بَلْ هُوَ قَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِيْمٍ۔ "بات وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو کہ یہ شاعر کا قول ہے یا کاہن کا قول ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کریم کا بتایا ہوا کلام الٰہی ہے۔" اور پھر اس پر نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی چیزوں کی قسم کھا کر دلیل اور شہادت پیش کی ہے کہ جس طرح دکھائی دینے والی اور دکھائی نہ دینے والی یہ کائنات فعل الٰہی ہے جس کی مثال پیش کرنے سے تمام جن وانس عاجز ہیں اسی طرح رسول کریم کا پیش کردہ یہ قرآن کلام الٰہی ہے جس کی مثال کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔

۳۔ فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۔ (المعارج ۴۰۔۴۱)

"پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم اس پر یقیناً قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا۔"

ان دو آیتوں کے بعد تین آیتوں میں آخرت اور قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے اس لئے کلام کے اس سیاق میں فلا کے معنے ہیں :

فَلَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا تَزْعُمُوْنَ اَنْ لَا مَعَادَ وَلَا حِسَابَ وَلَا بَعْثَ وَلَا نُشُوْرَ بَلْ كُلُّ ذَالِكَ وَاقِعٌ وَ كَائِنٌ لَا مَحَالَةَ.

"پس حقیقت وہ نہیں ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ نہ آخرت ہے' نہ حساب ہے' نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ دوبارہ زندہ ہونا ہے بلکہ یہ سب کچھ لازماً ہونے والا ہے۔"

اور اس کے ممکن ہونے پر اللہ نے اپنی ربوبیت پر قسم کھائی ہے کہ میں نے مشارق و مغارب کا جو نظام شمسی بنایا ہے یہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ میں ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ پیدا کرنے پر بھی قادر ہوں اور ان کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہوں اور مجھ سے کوئی بھی آگے نکل کر بھاگ نہیں سکتا' جب مشرق' مغرب' شمال' جنوب' اوپر' نیچے' خشکی' دریا اور پوری کی پوری کائنات میری ملکیت ہے اور ان سب پر میری حکومت ہے تو آخر مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے ؟

٤ . لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ٥ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ٥ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ٥ بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ٥ (القيامة ١ . ٤)

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کی' اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز جمع نہیں کریں گے ؟ ہاں! ہم تو اس کی انگلیوں کے پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں۔"

اس قسم کے بعد منکر آخرت کا یہ گمان نقل کیا گیا ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور منتشر اعضاء

کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتے جس سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ "لا" کے حرف نفی کے ذریعے اس زعم کی تردید کی گئی ہے اور تقدیر کلام یوں ہے کہ لَيْسَ الْأَمْرُ كَمَا تَحْسَبُوْنَ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَه' بَلْ هُوَ وَاقِعٌ لَامَحَالَةَ. "حقیقت وہ نہیں ہے جس کا تم گمان کرتے ہو کہ ہم انسان کی ہڈیوں کو ہرگز جمع نہیں کریں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ہڈیوں کا اکٹھا کرنا یقینی ہے اور ہم اس پر قادر ہیں۔"

کفار کے اس زعم کی نفی کے بعد قسم کھا کر کہا گیا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے اور انسانی نفس کا برائی کرنے اور بھلائی نہ کرنے پر اسے ٹوکنا اور انسانی ضمیر میں برائی اور بھلائی کے احساس کا پایا جانا اس حقیقت کی علامت اور شہادت ہے کہ انسان کو کسی وقت اپنے اعمال کی جزا اور سزا کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسے اپنے رب کو جواب دینا پڑے گا۔ اگر "مکافات عمل" اور "یوم الحساب" انسان کے ضمیر کی آواز نہ ہوتی تو اس کے اندر برائی اور بھلائی کا احساس ہی موجود نہ ہوتا اور وہ اسے نہ ملامت کرتا اور نہ ٹوکتا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اس نکتے کو ان الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ :

فَفِيْ صِفَةِ اللَّوْمِ تَنْبِيْهٌ عَلٰى ضَرُوْرَتِهَا اِلَى التَّصْدِيْقِ بِالرِّسَالَةِ وَالْقُرْآنِ وَ اَنَّهَا لَا غِنٰى لَهَا عَنْ ذَالِكَ وَلَا صَلَاحَ وَلَا فَلَاحَ بِدُوْنِهِ اَلْبَتَّةَ وَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ مَعَادِهَا هُوَ مَحَلُّ ظُهُوْرِ هٰذَا اللَّوْمِ وَ تَرَتُّبِ اَثَرِهِ عَلَيْهِ قَرَنَ بَيْنَهُمَا فِي الذِّكْرِ. (۱)

"نفس انسانی کی ملامت کرنے اور ٹوکنے کی صفت میں اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ نفس انسانی کو رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت ہے اور یہ اس سے کسی طرح بھی مستغنی نہیں ہو سکتا اور اس کی صلاح و فلاح اس ایمان کے بغیر قطعی طور پر ممکن نہیں ہے اور چونکہ اسی ملامت کا ظہور اور اس کے اثرات و نتائج کے مرتب ہونے کا دن قیامت ہی کا دن ہے اس لئے قیامت اور ملامت نفس دونوں کا ذکر یکجا طور پر کیا گیا ہے۔"

ابن قیم کی اس عبارت کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ انسانی نفس اور ضمیر کے اندر نیکی اور

(۱) اقسام القرآن طبع بیروت ۱۹۹۸ء، ص ۳۷

بدی اور جزاوسزا کے احساس کا پایا جانا اور برائی کرنے یا بھلائی نہ کرنے پر اپنے آپ کو ٹوکنا اور ملامت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان خیر وشر کے درمیان فرق بتانے والے رہنما کا محتاج ہے جو اسے نیکی اور بدی کی تعلیم دے اور جو اس کے اندر نفع وضرر کے درمیان تمیز کرنے کی سوجھ بوجھ پیدا کرے ورنہ اسے ضمیر کی ملامت کے نتیجے میں سوائے کڑھنے اور پریشان ہونے کے اور کچھ نہیں سوجھے گا۔ چونکہ اس ملامت نفس کے نتائج کے ظہور کا دن جزاوسزا کا دن ہے اس لئے "یوم القیامہ" اور "نفس لوامہ" دونوں کو ملا کر قسم کھائی گئی ہے۔

○ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ○ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ○ وَاللَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ○ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ○ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ○ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ○ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ○ (سورة التكوير ١٥۔ ٢١)

"پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے ستاروں کی' چلنے والے چھپ جانے والے ستاروں کی' اور رات کی جب وہ جانے لگے' اور صبح کی جب وہ چمکنے لگے' یقیناً یہ ایک عزت والے فرشتے کا لایا ہوا کلام الٰہی ہے' جو قوت والا ہے' عرش والے کے نزدیک بڑے مرتبے والا ہے' جس کی وہاں پر (آسمانوں میں) بات مانی جاتی ہے اور جو اعتماد والا ہے۔" (یعنی پیغام رسانی میں اس پر اعتماد کیا گیا ہے)

کفار مکہ قرآن کو جادو اور شعر کہتے تھے ان کے اس قول کی نفی کے لئے اقسم سے پہلے "فلا" کا حرف لایا گیا ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے کہ فَلَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا تَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ سِحْرٌ اَوْ شِعْرٌ بَلْ هُوَ قَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ "حقیقت وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو کہ یہ قرآن جادو ہے یا شعر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا کلام الٰہی ہے۔" اس کے بعد اس حقیقت پر ستاروں کی' رات کی اور صبح کی قسم کھائی گئی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی پرورش کے لئے ستاروں اور لیل ونہار کا نظام بنایا ہے جو اللہ کی قدرت اور حکمت کا آئینہ دار ہے اسی طرح اس کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لئے اور اسے زندگی

گزارنے کا طریقہ (آئین) بتانے کے لئے اس نے اپنے معزز اور قوی وامین فرشتے کے ذریعے قرآن نازل کیا ہے اور جس محسن انسانیت کے قلب اطیب پر یہ قرآن اترا ہے وہ نہ ساحر ہے' نہ شاعر ہے اور نہ مجنون ہے بلکہ اللہ کا حبیب ہے اور سید عالم ہے۔

الخُنَّسِ الجَوَارِ الكُنَّسِ کی تفسیر میں ابن عطیہ غرناطی متوفی ۵۴۱ھ فرماتے ہیں :

"جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سات چمکنے والے ستارے ہیں یعنی سورج' چاند' زحل' عطارد' مریخ' زہرہ اور مشتری حضرت علی بن ابی طالب نے کہا ہے کہ ان سے سورج اور چاند کے علاوہ باقی پانچ ستارے مراد ہیں۔ وَذَالِكَ اَنَّ هٰذِهِ الْكَوَاكِبَ تَخْنِسُ فِيْ جَرْيِهَا اَیْ تَتَقَهْقَرُ فِيْمَا تَرَى الْعَيْنُ وَ هِيَ جَوَارٍ فِي السَّمَاءِ وَ هِيَ تَكْنِسُ فِي اَبْرَاجِهَا اَيِ تَسْتَتِرُ اور یہ اس لئے کہ یہ ستارے اپنی رفتار میں پیچھے ہٹنے اور پلٹنے والے دکھائی دیتے ہیں' یہ آسمان میں چلتے رہتے ہیں اور یہ اپنے برجوں میں چھپ جاتے ہیں۔"(۱)

حضرت علیؓ کا یہ قول مفسرین میں زیادہ مشہور ہے اور ان ستاروں کو "خمسہ متحیرہ" کہتے ہیں اس لئے کہ ان کی رفتار میں یکسانیت دکھائی نہیں دیتی بلکہ یہ چلتے چلتے اچانک پلٹ جاتے ہیں اور پیچھے چلتے چلتے چھپ جاتے ہیں۔ عَسْعَسَ کا لفظ اضداد میں سے ہے اس کے معنے آنا بھی ہیں اور جانا بھی اس جگہ جانا مراد ہے اس لئے کہ اس کے متصل بعد صبح کے چمکنے کا ذکر ہوا ہے اور صبح کی روشنی رات کے چلے جانے کے بعد ہی چمکتی ہے۔

٦۔ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (الانشقاق ١٦۔١٩)

"پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی' اور رات کی اور ان چیزوں کی جنہیں وہ سمیٹ لیتی ہے' اور چاند کی جب وہ پورا ابھر جائے' کہ تم ضرور پہنچو گے ایک حالت کو دوسری حالت کے بعد۔"

ان آیات سے قبل آخرت کے حساب اور جزاوسزا کا ذکر ہوا ہے جس پر کفار مکہ ایمان

(١) المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز لابن عطيه طبع دولت قطر ١٩٩١ء ص ٣٣٤ ج ١٥

نہیں لاتے تھے "فَلَا" کے لفظ میں ان کے اس کفر کی تردید اور نفی کی گئی ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے کہ فَلَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا تَزْعُمُوْنَ اَنَّكُمْ لَا تُبْعَثُوْنَ بَعْدَ الْمَوْتِ بَلْ تُبْعَثُوْنَ وَ تَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ "پس حقیقت وہ نہیں ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ موت کے بعد تم کو اٹھایا نہیں جائے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم کو اٹھایا جائے گا اور پھر تم کو ایک حالت کے بعد دوسری حالت سے یعنی مختلف حالات سے گزرنا ہوگا۔"

اور اس کے بعد شام کی سرخی' رات کی تاریکی' اس میں جمع ہونے اور سمٹنے والی چیزوں اور روشنی سے پوری طرح بھرے ہوئے بدر کامل کی قسم کھائی ہے کہ جس طرح سورج' چاند' رات اور رات کے وقت اپنے اپنے ٹھکانوں میں سمٹنے والی چیزوں کے حالات میں تغیر اور تنوع دکھائی دیتا ہے اسی طرح تم بھی مختلف حالات سے گزرے ہو اور مستقبل میں تم کو دوسرے قسم کے حالات سے گزرنا پڑے گا۔ ماں کے پیٹ میں تم پر مختلف مراحل گزرے ہیں' ولادت سے جوانی تک' جوانی سے بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے موت تک دوسری نوعیت کے حالات سے تم کو گزرنا پڑا ہے' موت سے حشر تک برزخ میں تم کو الگ نوعیت کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور حشر کے بعد اپنے مقررہ ٹھکانے کو پہنچنے تک تم کو یوم الحساب کے حالات سے گزرنا پڑے گا تو کیا تم پھر بھی ایمان نہیں لاتے؟

ابن جریرؒ نے کہا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک لفظ شَفَق اضداد میں سے ہے اور اس کا اطلاق سورج غروب ہونے کے بعد مغربی افق پر پھیلنے والی سرخی پر بھی ہوتا ہے اور اس کے بعد نمودار ہونے والی سفیدی پر بھی ہوتا ہے لیکن ابن کثیرؒ نے خلیل نحوی' علامہ جوہریؒ اور متعدد صحابہ و تابعین سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سرخی مراد ہے۔ یہی جمہور فقہاء کا مسلک ہے اور یہی صحیح ہے۔

ابن عباسؓ' مجاہدؒ' حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے وَمَا وَسَقَ کے معنے کئے ہیں وَمَا جَمَعَ یعنی جو کچھ رات نے سمیٹ لیا ہے' ابن عباسؓ اور حسن بصریؒ نے اِذَا اتَّسَقَ کے معنے کئے ہیں اذا

جْتَمَعَ وَاسْتَوٰی وَامْتَلَأَ یعنی جب چاند پورا ہو جائے اور بھر جائے۔(۱)

اور طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کی تفسیر ابن عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ سے حَالًا بَعْدَ حَالٍ نقل کی ہے یعنی ایک حالت کے بعد دوسری حالت۔(۲)

۷۔ لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِo وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِo وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَo لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍo (البلد ۱۔۴)

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی' اور تو مقیم ہے اس شہر میں' اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اولاد کی کہ بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔"

ان آیات کے بعد منکر آخرت اور کبر و غرور میں مبتلا انسان کا ذکر ہوا ہے کہ کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قدرت نہیں پاسکے گا؟ اس سیاق کلام کی روشنی میں تقدیر کلام اس طرح ہو سکتا ہے کہ لَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا يَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ۔ "حقیقت وہ نہیں ہے جس کا انسان گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قدرت نہیں پاسکے گا۔"

اس کے بعد شہر مکہ کی' اس میں رہنے والے رسول کی' ہر باپ کی اور اولاد کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو محنت و مشقت کی زندگی گزارنے کے لئے پیدا کیا ہے' عبث' مہمل اور بے کار بیٹھے رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اس شہر کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے بننے میں اور بَلَدِ اَمِیْن کی حیثیت اختیار کرنے میں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی محنتوں اور کاوشوں کا بہت بڑا دخل ہے۔ اسی طرح اس شہر میں قیام فرمانے والے رسول کریم اللہ کے دین کے لئے محنت و مشقت اٹھا رہے ہیں اور اپنے مخالفین کی طرف سے مظالم برداشت کر رہے ہیں بلکہ ہر باپ اور اس کی اولاد یعنی ہر انسان اس دنیا میں محنت کرتا رہا ہے' مشقت اٹھاتا رہا ہے' تکلیفیں برداشت کرتا رہا ہے اور آج ہر والد اور اس کی اولاد محنت و مشقت سے بھرپور زندگی گزار

---

(۱) ابن کثیر ص ۳۸۰۔۳۸۱ ج ۸' الانشقاق ۱۶۔۱۷

(۲) بخاری کتاب التفسیر سورۃ الانشقاق

رہے ہیں ان تینوں قسم کی شہادتوں کو اس حقیقت کے حق اور سچ ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ انسان محنت و مشقت' جدوجہد اور سعی و عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنے خالق و مالک کی اطاعت میں محنت کر کے اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اپنے مستقبل کو روشن بناتا ہے اور کوئی اس کی نافرمانی میں مشقتیں اور تکلیفیں اٹھا کر اپنے مستقبل کو تاریک بنا دیتا ہے۔

محنت و مشقت سے بھرپور یہ زندگی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ انسان کو اس کی محنتوں اور کاوشوں کا بدلہ دینے کے لئے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اس کا خالق اس کی نشاۃ ثانیہ پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔

هٰذَا الْبَلَد سے بالاتفاق مکہ معظمہ مراد ہے جسے سورہ تین میں "بلد امین" کہا گیا ہے' "حِلّ" کو اگر حلول سے ماخوذ قرار دیا جائے تو اس کے معنے ہیں حال نازل ساکن یعنی رہنے والا' قیام فرمانے والا اور سکونت اختیار کرنے والا۔

تفسیر مظہری' تفسیر قاسمی اور تفسیر مراغی نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں:

اَقْسَمَ اللّٰهُ بِمَكَّةَ مُقَيِّدًا بِحُلُوْلِهٖ ﷺ اِظْهَارًا لِمَزِيْدِ فَضَائِلِهَا بِشَرَفِ الْمُتَمَكِّنِ عَلٰى فَضْلٍ لَهَا.(۱)

"اللہ نے مکہ کی قسم اس قید کے ساتھ کھائی ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں تاکہ اس کے مکین کے فضل و شرف کی وجہ سے اس کے فضائل میں مزید اضافے کا اظہار کیا جائے۔"

ابن عطیہ غرناطیؒ' قرطبیؒ' مظہری اور دوسرے بہت سے مفسرین نے وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے دو معنے اور بھی بیان کئے ہیں ایک یہ کہ "تیرے لئے اس شہر میں لڑائی حلال

(۱) المظهری ص ٢٦٤ ج ١٠

ہونے والی ہے۔" اور اس میں اشارہ ہے فتح مکہ کی طرف جس میں ایک دن کے لئے صبح سے عصر تک رسول اللہ ﷺ کے لئے حرم مکہ میں لڑائی حلال کر دی گئی تھی۔ اس پیشن گوئی کا مقصد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ آج تو اس شہر میں آپ پر اور آپ کے رفقاء کار پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں 'بلد امین' کی یہ زمین آپ پر تنگ کی جا رہی ہے اور آزادی کے ساتھ دین حق پر عمل کرنا اور اس کی دعوت کو جاری رکھنا آپ کے لئے مشکل بنا دیا گیا ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ توحید کے اس مرکز کو اور اللہ کے اس گھر کو شرک کی غلاظت سے پاک کرنے کے لئے اور مشرکین کے تسلط سے آزاد کرنے کے لئے آپ کو لڑائی کی اجازت مل جائے گی اور اس مقدس شہر کے اختیارات آپ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ میں اگرچہ مستقبل کا صیغہ موجود نہیں ہے لیکن بلاغت کا ایک قاعدہ اور عربیت کا ایک اسلوب کلام یہ بھی ہے کہ جس چیز کا مستقبل میں وقوع پذیر ہونا یقینی ہو تو اس کی خبر دیتے وقت ماضی یا حال کا فقرہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ "تجھ پر بھی موت آنے والی ہے اور یہ بھی مرنے والے ہیں۔" اس جگہ بھی چونکہ اللہ کے علم میں فتح مکہ کے لئے لڑائی کا وقوع پذیر ہونا یقینی تھا اس لئے اس کی خبر اس طرح دی گئی ہے کہ گویا یہ واقعہ ہو رہا ہے تاکہ اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔

اور دوسرے معنے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ "تم کو اس شہر میں حلال سمجھ لیا گیا ہے" یعنی اس شہر میں آپ کے مخالفین کا طرز عمل بڑا حیرت ناک اور افسوس ناک ہے کہ یہ لوگ حرم مکہ میں جنگلی جانوروں کے مارنے 'درختوں کے کاٹنے اور اپنے باپ کے قاتل پر ہاتھ اٹھانے کو تو حرام سمجھتے ہیں لیکن تم کو اذیتیں دینا' اس شہر سے نکالنے یا قتل کرنے کی تدبیریں کرنا انہوں نے اپنے لئے حلال سمجھ لیا ہے۔

ان دو معنوں کو اختیار کرنے کی صورت میں "حل" کو حرمت کی ضد کے معنوں میں لیا جائے گا۔ اکثر مفسرین نے دوسرے معنے کو اختیار کیا ہے اور بعض نے تیسرے معنے کو پسند کیا

ہے لیکن نظم کلام اور الفاظ کے ساتھ پہلا معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے جسے مظہری اور قاسمی نے ترجیح دی ہے اور میں نے اسی مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے تشریح کی ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ کے بارے میں ابن جریرؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے ہر والد اور اس کی اولاد مراد ہے اور جواب قسم میں لفظ انسان کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی رائے صحیح ہے۔ لفظ کَبَد کی تشریح کرتے ہوئے جار اللہ زمخشری نے لکھا ہے کہ :

وَالْكَبَدُ اَصْلُه' مِنْ قَوْلِكَ كَبِدَ الرَّجُلُ كَبَدًا فَهُوَ اَكْبَدُ اِذَا وَجِعَتْ كَبِدُه' وَانْتَفَخَتْ فَاتُّسِعَ فِيْهِ حَتّٰى اسْتُعْمِلَ فِيْ كُلِّ تَعَبٍ وَ مَشَقَّةٍ وَ مِنْهُ اشْتُقَّتِ الْمُكَابَدَةُ.(۱)

"کبد کے اصل معنے اس قول سے ماخوذ ہیں کہ جب کسی شخص کے جگر میں درد پیدا ہو جائے اور اس میں ورم آجائے تو کہا جاتا ہے کہ كَبِدَ الرَّجُلُ كَبَدًا فَهُوَ اَكْبَدُ اس شخص کے جگر میں درد ہے اور یہ بڑے جگر والا ہے۔ پھر اس کے معنوں میں وسعت آگئی اور اس کا استعمال ہر محنت و مشقت کے معنوں میں ہونے لگا مُكَابَدَه یعنی تکلیف اٹھانا بھی اسی سے ماخوذ ہے۔

(۱) الکشاف ص۲۵۵ ج٤

امثال القرآن

کسی بات کو دل و دماغ میں بٹھانے' ذہن نشین کرانے' دقیق بات کو آسان الفاظ میں سمجھانے کا ایک اسلوب کلام تمثیل بھی ہے۔ معنوی چیز کو جب محسوس چیز کی شکل میں پیش کیا جائے تو وہ ذہن کے قریب ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے دکھائی دینے والی چیز کی طرح نظر آجاتی ہے جس کو سمجھنا بھی مشکل نہیں ہوتا اور جس سے انکار کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک حسین و جمیل چیز کے حسن و جمال میں خوبصورت لباس پہنانے سے مزید چمک دمک پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اعلیٰ ترین حقائق و معانی کو جب مثالوں کی قالب میں ڈھالا جائے اور استعارات و تشبیہات کے اسلوب میں بیان کیا جائے تو ان کی صداقت اور معنویت اذہان و افہام کے قریب ہو جاتی ہے اور وہ ایک حسین و جمیل صورت میں نظر و بصر کے سامنے آجاتی ہیں' تمثیل و مثال ہی وہ قالب ہے جس میں معانی و حقائق ایک زندہ صورت کی شکل اختیار کرتے ہیں اور آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزول کا مقصد چونکہ تعلیم و تفہیم ہے تاکہ اتمام حجت ہو جائے اس لئے اس نے وہ تمام اسالیب معجزانہ انداز میں اختیار کئے ہیں جو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے میں مفید اور مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اسلوب تمثیل اور امثال بھی ہے۔ علوم القرآن کی مباحث میں سے "امثال القرآن" بڑا دلچسپ مبحث ہے۔ علامہ ابوالحسن ماوردیؒ متوفی ۴۵۰ھ اور حافظ ابن قیمؒ متوفی ۷۵۱ھ نے امثال القرآن کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور علامہ بدرالدین زرکشیؒ "امثال" کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مثالیں معانی کو اشخاص کی صورت میں پیش کرتی ہیں اور اشخاص و اعیان اذہان میں جلدی بیٹھ جاتے ہیں اس لئے کہ ان کو سمجھنے میں ذہن حواس سے مدد لیتا ہے' معانی معقولہ

چونکہ محسوس نہیں ہوتے اس لئے ان کا سمجھنا دقیق ہوتا ہے مگر تشبیہ و تمثیل کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ مثال مجرب ہو اور سننے والوں کے نزدیک تسلیم شدہ ہو' ضرب الامثال میں مقصد کی تائید و تاکید ہوتی ہے اس لئے کہ مثال کی غرض خفی کو جلی کے ساتھ اور غائب کو شاہد کے ساتھ تشبیہ دینا ہوتی ہے' جب ایمان کی تشبیہ نور کے ساتھ دی جائے تو ایمان دل میں مضبوط ہو جاتا ہے اور جب کفر کی تشبیہ ظلمت و تاریکی سے دی جائے تو اس کی قباحت و شناعت دل میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے' تمثیل و تشبیہ سے مخالف لاجواب بھی ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اور دوسری آسمانی کتابوں میں مثالیں بکثرت بیان ہوئی ہیں۔ انجیل میں ایک سورۃ "الامثال" کے نام سے موسوم ہے۔ (شاید عہد نامہ عتیق میں امثال سلیمان کی طرف اشارہ ہے) زمخشریؒ متوفی ۵۳۸ھ نے کہا ہے کہ تمثیل کی طرف رجوع اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ معانی سے پردہ اٹھانا مقصد ہو اور متوھم و غیر محسوس چیز کو محسوس و مشاہد چیز کے قریب لانا غرض ہو' جس چیز کے لئے مثال پیش کی جا رہی ہو وہ اگر "عظیم" ہے تو اس کی تمثیل و تشبیہ بھی "عظیم" چیز کے ساتھ دی جاتی ہے اور اگر وہ "حقیر" ہے تو اس کی تشبیہ و تمثیل بھی "حقیر" چیز کے ساتھ دی جاتی ہے' مثال کی عظمت و حقارت اس چیز کی عظمت و حقارت پر مرتب ہوتی ہے جس کے لئے مثال پیش کی گئی ہو' مثلاً حق چونکہ واضح اور جلی ہوتا ہے تو اس کی مثال میں ضیاء اور نور کو پیش کیا گیا ہے اور باطل اس کی ضد ہے تو اس کی مثال میں ظلمت کو پیش کیا گیا ہے' اسی طرح ضعف اور کمزوری کی مثال میں "بیت العنکبوت" کو پیش کیا گیا ہے۔(۱)

امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ متوفی ۲۲۴ھ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں راشد بن سعد متوفی ۱۰۸ھ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ :

نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰى خَمْسَةِ اَحْرُفٍ حَلَالٍ وَ حَرَامٍ وَ مُحْكَمٍ وَ مُتَشَابِهٍ وَ ضَرْبُ

---

(۱) البرهان فی علوم القرآن النوع الحادی و العشرین ص۴۸۸ ج۱

الْأَمْثَالِ فَاحِلُّوْا حَلَالَهُ وَ حَرِّمُوْا حَرَامَهُ وَاعْمَلُوْا بِمُحْكَمِهِ وَ آمِنُوْا بِمُتَشَابِهِهِ وَاعْتَبِرُوْا بِاَمْثَالِهِ.(۲)

"قرآن پانچ قسموں پر نازل ہوا ہے' حلال' حرام' محکم' متشابہ اور ضرب الامثال پس حلال کو حلال سمجھو' حرام کو حرام سمجھو' محکم پر عمل کرو' متشابہ پر ایمان لاؤ اور اس کی مثالوں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرو۔"

یہ روایت تو مرسل ہے اس لئے کہ راشد بن سعد المقرائی الحمصی اگرچہ ثقہ تابعی تھے مگر صحابی نہیں تھے لیکن زرکشیؒ نے بیہقی کے حوالے سے اس حدیث کو ابو ہریرہؓ سے مرفوعا بھی نقل کیا ہے جس میں احرف کی جگہ اَوْجُهٍ کا لفظ آیا ہے۔(۲)

اس روایت میں بھی تمثیل و تشبیہ کے فوائد و حکم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مثالوں سے عبرت و نصیحت حاصل کی جاتی ہے اور وعظ' تذکیر اور ترغیب و ترہیب میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ انہی فوائد و حکم کی وجہ سے قرآن کریم' سنت رسول' کتب سماویہ اور حکماء و عقلاء کے کلام میں تمثیل و تشبیہ اور ضرب الامثال کا اسلوب بڑی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ نے سنن ترمذی کتاب الادب کے بعد اور کتاب فضائل القرآن سے پہلے "کتاب الامثال عن رسول اللہ ﷺ" کے نام سے مستقل عنوان قائم کیا ہے جس میں سات ابواب ہیں اور ان ابواب میں صراط مستقیم' ختم نبوت' نماز' روزہ' صدقہ' قرآن کی تلاوت کرنے والے مؤمن' اس کی تلاوت نہ کرنے والے مؤمن' پانچ نمازوں کی پابندی کرنے والے مؤمن' امت مسلمہ کی فضیلت اور انسان کی عمر اور اس کی حرص و آرزو سے تعلق رکھنے والی ۱۶ احادیث سند کے ساتھ نقل کی گئی ہیں جن میں تفہیم و تذکیر کے لئے ضرب الامثال کا اسلوب نبوی اختیار کیا گیا ہے۔

---

(۱) فضائل القرآن لابی عبید طبع دار ابن کثیر بیروت ۱۹۹۵ء ص ۱۰۰

(۲) البرهان ص ۴۸۶ ج ۱

مثل کے معانی

عربی لغت میں مَثَل' مِثْل اور مَثِیل تینوں الفاظ وزن اور معنی دونوں کے اعتبار سے شَبَہٌ شِبْہٌ اور شَبِیْہٌ کی طرح ہیں۔ یعنی مُمَاثِل' مشابہ اور نظیر۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں :

لِیْ مَثَلُہٗ' وَ مِثْلُہٗ' وَ مَثِیْلُہٗ' وَ مُمَاثِلُہٗ.

یعنی میری حالت اس کے مماثل اور مشابہ ہے۔(۱)

اس لغوی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابن قیم نے مَثَل کی تعریف اس طرح کی ہے :

تَشْبِیْہُ شَیْءٍ بِشَیْءٍ فِیْ حُکْمِہٖ وَ تَقْرِیْبُ الْمَعْقُوْلِ مِنَ الْمَحْسُوْسِ اَوْ اَحَدِ الْمَحْسُوْسَیْنِ مِنَ الْآخَرِ.(۲)

"کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس کے حکم میں تشبیہ دینا اور اس کے مماثل و مشابہ قرار دینا' اور کسی معنوی اور غیر محسوس چیز کو تشبیہ کے ذریعے محسوس چیز کے قریب لانا (تاکہ وہ محسوس چیز کی طرح اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے) یا ایک محسوس چیز کو دوسری محسوس چیز کے ساتھ تشبیہ دینا۔"

یہ تو اس لفظ کا کثیر الاستعمال معنی ہے لیکن اس لفظ کے دو معنے اور بھی ہیں ایک ہے "کہاوت" یعنی وہ قول جو کسی عجیب و غریب واقعے کے بارے میں کہا گیا ہو اور جسے اس سے ملتے جلتے واقعے کے بارے میں استعمال کیا جا رہا ہو مثلاً جو شخص رائے میں یا معاملات میں اکثر غلطی کرتا ہو مگر کبھی کبھی صحیح رائے دیتا ہو اور صحیح کام کرتا ہو اس کے بارے میں کہاوت ہے کہ رُبَّ رَمْیَۃٍ مِنْ غَیْرِ رَامٍ. "کبھی کبھی تیر تیر انداز کے بغیر نشانے پر بھی ٹھیک لگ جاتا ہے۔" یعنی جس شخص کا تیر اکثر خطا جاتا ہے وہ بعض اوقات نشانے پر صحیح بیٹھ جاتا ہے اور دوسرے معنے ہیں صِفت اور شان جیسے وَ لِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی یعنی "اللہ کی شان اور صفت سب سے اونچی

---

(۱) اساس البلاغۃ للزمخشری طبع بیروت ۱۹۹۸ء ص۱۹۳ ج۲

(۲) اعلام الموقعین ص۱۰۰ طبع ثانیہ دارالفکر ۱۹۷۷ء

ہے۔"اس جگہ تمثیل و تشبیہ کے معنے صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ اللہ کا مماثل، مشابہ اور نظیر کوئی بھی نہیں ہے بلکہ وہ لا مثال اور بے نظیر ہے،اسی طرح مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ میں مَثَل کے معنی حالت اور صفت ہیں نظیر اور مماثل نہیں ہیں۔اس لئے کہ جنت کی نعمتوں کی مثال دنیا میں موجود نہیں ہے اگرچہ ان کے نام وہی ہیں جو دنیا کی نعمتوں کے ہیں لیکن ان کے حقائق وہ نہیں ہیں جو دنیا کی نعمتوں کے ہیں بلکہ ان کی صفات اور کیفیات وہی ہیں جو اللہ نے یا اس کے رسول نے بیان کی ہیں قرآن کریم میں اگرچہ لفظ مَثَل حالت عجیبہ اور صفت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہ لفظ اکثر تشبیہ اور تمثیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ضرب الامثال کی حکمت قرآن نے خود بیان کی ہے

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ.
(الزمر ۲۷)

"اور بے شک ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کرتے رہیں۔"

اس آیت میں اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن میں میں نے مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے لئے بیان کی ہیں تاکہ وہ قرآنی اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر سکیں اور ان کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر سکیں لیکن قرآنی مثالوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور حق کے لئے انہی لوگوں کے دل ان کے ذریعے کھل سکتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہوں اور پختہ علم رکھتے ہوں جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں پہلے ایک مثال دی ہے کہ:

"جن لوگوں نے اللہ کے سوا اپنے لئے دوسرے کارساز اور مددگار بنا لئے ہیں ان کی مثال مکڑی کی ہے جس نے اپنے لئے ایک گھر بنالیا ہے (جالا تان لیا ہے) حالانکہ سب

گھروں میں مکڑی کا گھر زیادہ بودا اور کمزور ہوتا ہے اگر یہ لوگ اس مثال کو جانتے (اس میں غور کرتے) تو کبھی بھی اللہ کے سوا کسی کو کارساز نہ بناتے۔"

یعنی جس طرح مکڑی کو اس کا گھر ہوا کے معمولی سے جھونکے سے بھی نہیں بچا سکتا مگر وہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس پر بھروسہ کر کے اس سے چمٹا رہتا ہے اسی طرح یہ مشرکین اپنے بناوٹی اور جعلی کارسازوں پر بھروسہ کر کے ان کو پکارتے ہیں کہ شاید یہ ہماری مدد کو پہنچ جائیں حالانکہ وہ نہ سنتے ہیں اور نہ مدد کر سکتے ہیں مگر یہ لوگ اپنی کم عقلی اور نادانی کی وجہ سے ان کو پکارتے رہتے ہیں اور ان کے بتوں یا ان کی قبروں سے چمٹے رہتے ہیں۔ اس مثال کے بعد فرمایا گیا ہے کہ:

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ. (العنکبوت ۴۳)

"اور ان مثالوں کو ہم لوگوں کو سمجھانے کے لئے بیان کر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر علم والے ہی سمجھتے ہیں۔"

علم سے مراد توحید کے دلائل کا علم ہے جن پر غور و فکر کرنے سے انسان کو اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور راہ راست پر چلنے کی توفیق ملتی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

وَمَا يَفْهَمُهَا وَ يَتَدَبَّرُهَا اِلَّا الرَّاسِخُوْنَ فِيْ الْعِلْمِ الْمُتَضَلِّعُوْنَ مِنْه.(۱)

"اور ان مثالوں کو نہیں سمجھتے اور ان میں تدبر نہیں کرتے مگر وہی لوگ کرتے ہیں جو دین کا پختہ علم رکھتے ہوں اور علم سے پوری طرح سیراب ہو چکے ہوں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مثالوں کو سمجھتے ہوں ان کا علم پختہ ہوتا ہے۔

عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ:

عَقَلْتُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اَلْفَ مَثَلٍ.

---

(۱) تفسیر ابن کثیر العنکبوت ۴۳

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک ہزار مثالیں اچھی طرح سمجھ لی ہیں۔"(۱)

ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ اس میں عمرو بن عاصؓ کی بہت بڑی منقبت ہے کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ مثالوں کو نہیں سمجھتے مگر علماء ہی سمجھتے ہیں۔

انسان حقائق کو نہ جانتا ہو اور اپنے رب کی معرفت سے محروم ہو تو جھوٹی باتیں اس کے دل و دماغ پر تسلط جما لیتی ہیں اور وہ ان جھوٹی باتوں کے ذریعے حق کے مقابلے میں جدال اور جھگڑے کی روش اپنا لیتا ہے ایسے ضدی، ہٹ دھرم اور جھگڑالو طبیعت والے کو عقلی و نقلی دلائل بھی متاثر نہیں کر سکتے اور مثالیں بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لئے کہ اللہ تعالی جان بوجھ کر جھگڑنے والے شخص کے دل کو نہیں کھولتا اور اسے قبول حق کی توفیق نہیں دیتا۔

سورۃ کہف میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَ كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا. (الكهف ٥٤)

"اور بے شک ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کی ہیں ہر قسم کی مثالیں، اور انسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑالو ہے۔"

اس آیت میں انسان سے باطل کے لئے جھگڑنے والا کافر مراد ہے۔ جیسا کہ اسی سورہ میں آگے آیت نمبر ۵۶ میں اللہ نے فرمایا ہے کہ :

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْا آيَاتِيْ وَ مَا أُنْذِرُوْا هُزُوًا○

"اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشخبری دینے اور عذاب سے خبردار کرنے کے لئے بھیجتے ہیں اور جھگڑتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے حق کو نہیں مانا جھوٹی باتوں کے ذریعے تاکہ ان کے ذریعے حق کو ہٹا دیں اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس عذاب سے وہ ڈرائے گئے ہیں اسے مذاق بنا لیا ہے۔"

(۱) مسند احمد ص ۲۰۳ ج ۴

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جھگڑالو انسان وہی ہوتے ہیں جنہوں نے حق کو نہ مانا ہو اور باطل کو مان لیا ہو۔ ایسے لوگ باطل کے ذریعے حق کو جھٹلانے اور شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَا ذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَ مَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفَاسِقُوْنَ. (البقرة ۲۵)

”بے شک اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا مچھر کی یا اس سے بھی زیادہ ہلکی چیز کی' پس جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے اتری ہے' اور جو لوگ انکار کر چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے اس مثال سے ؟ گمراہ کرتا ہے اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہت سے لوگوں کو اور گمراہ نہیں کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو۔“

اسی سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷ تا ۲۰ میں منافقین کی حالت اور صفت کو ذہن نشین کرانے کے لئے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں ایک آگ کی مثال ہے اور دوسری مثال بارش کی ہے۔ اس پر منافقین اور دوسرے معاندین و مجادلین نے اعتراض کیا کہ اَللّٰهُ اَعْلٰى وَ اَجَلُّ مِنْ اَنْ يَّضْرِبَ هٰذِهِ الْاَمْثَالَ. ”اللہ کی ذات اس قسم کی مثالیں بیان کرنے سے بہت اونچی ہے۔“ یعنی اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں مثالوں کا ذکر نہ ہوتا' اسی طرح جب سورۂ حج میں مشرکین کے بناوٹی اور جعلی معبودوں کی کمزوری اور بے بسی سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے چھڑا نہیں سکتے' اور سورۂ عنکبوت میں جب ان کے جعلی اور تصوراتی کارسازوں کی کمزوری اور بے بسی کو مکڑی کے جالے کے ساتھ تشبیہ دی گئی تو مشرکین نے کہا مَا بَالُ الْعَنْكَبُوْتِ وَالذُّبَابِ يُذْكَرَانِ؟ اور مَا اَرَادَ اللّٰهُ مِنْ ذِكْرِ هٰذَا؟ ”مکڑی اور مکھی کا ذکر قرآن میں

کیوں ہوا ہے ؟" اور "ان چیزوں کے ذکر سے اللہ کا مقصد کیا ہے۔" یعنی اتنی حقیر، ہلکی اور کمزور چیزوں کا ذکر انسان کے کلام میں تو ہو سکتا ہے مگر اللہ عزوجل کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنے کلام میں ایسی چیزوں کا ذکر فرمائے ان سب معترضین کے جواب میں مذکورہ آیت نازل ہوئی تھی کہ مثالیں سمجھانے کے لئے بیان کی جاتی ہیں کسی حقیر و ضعیف اور کمزور و ناتوان چیز کی حقارت اور ضعف و کمزوری ذہن نشین کرانے کے لئے حقیر، ضعیف چیز ہی کی مثال مناسب ہوتی ہے اور عظیم چیز کی عظمت ذہن نشین کرانے کے لئے کسی عظیم چیز ہی کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے' ظاہر ہے کہ ایک معنوی چیز کو آنکھوں سے دکھائی جانے والی چیز کے ساتھ تشبیہ دینا تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو' کوئی عیب اور عار کی بات تو نہیں ہے کہ اس سے اللہ کو شرم آئے اور وہ اسے اپنی شان سے فروتر سمجھ کر ترک کر دے' پیش کرنے والے کی شان کے ساتھ مثال کی مناسبت ضروری نہیں ہوتی بلکہ جس کے لئے مثال پیش کی گئی ہو اس کے ساتھ مناسبت ضروری ہوتی ہے۔ اگر مُمَثَّل بِهٖ (یعنی جس چیز کو مثال میں پیش کیا گیا ہے) کی مناسبت مُمَثَّلٌ لَهٗ (یعنی جس کے لئے مثال پیش کی گئی ہے) کے ساتھ نہیں ہے تو یہ صورت یقیناً اعتراض کی ہے اور اللہ کی شان سے فروتر ہے مگر ایسی مثال قرآن میں موجود ہی نہیں ہے جو مطابق حال نہ ہو۔ یہ عیب انسان کے کلام میں تو ہو سکتا ہے مگر اللہ کا کلام اس قسم کی خامی سے پاک ہے' جو لوگ ایمان لا چکے ہیں' قرآن کی بلاغت' حلاوت اور صداقت کو جان چکے ہیں' ان کو اللہ کی معرفت مل چکی ہے اور وہ صحیح معنوں میں اصحاب علم ہیں۔ وہ جانتے اور مانتے ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے پیش کردہ یہ مثال حق ہے' سچ ہے اور مطابق حال ہے' یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا کا مطلب یہ ہے کہ یہ مثال ان کے علم و یقین اور ایمان و ایقان میں اضافے اور پختگی کا ذریعہ ثابت ہو جاتی ہے۔ اور یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ کفر کرتے ہیں اور جدال و شقاق یعنی جان بوجھ کر جھگڑنے اور ضد کرنے کی روش اپنائے ہوئے ہیں وہ بجائے اس کے کہ قرآنی مثالوں کے ذریعے بات کو سمجھنے کی کوشش

کرتے الٹاان کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بے مقصد قسم کی مثالیں ہیں۔ تو ان کا یہ مذاق اڑانا اور استھزاء و توہین کا رویہ اختیار کرنا ان کے کفر کی ظلمت میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور باطل پر یہ لوگ پہلے سے زیادہ ڈٹ جاتے ہیں۔

بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا کے دو معنے مفسرین نے بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ "مچھر کی یا اس چیز کی جو حقارت اور کمزوری میں مچھر سے بھی زیادہ ہو" جیسے مچھر کا پر اور بازو جس کی مثال سہل بن سعدؓ سے مروی ایک حدیث مرفوع میں اس طرح آئی ہے کہ:

لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ.

"اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔"

اکثر مفسرین نے اسی مفہوم کو پسند کیا ہے اور میں نے بھی ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔

اور دوسرے معنے یہ بیان ہوئے ہیں کہ مچھر کی یا اس چیز کی جو جسامت میں اس سے بڑی ہو جیسے مکھی جس کی مثال سورہ حج میں بیان کی گئی ہے۔

امثال القرآن کے چند نمونے

تمثیلات و تشبیہات سے تعلق رکھنے والی آیات مختلف سورتوں میں مختلف موضوعات پر کافی تعداد میں موجود ہیں جن کو سمجھنے کے لئے پورے قرآن کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن مختلف موضوعات پر امثال القرآن میں سے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ علوم القرآن کے طالب علم کے اندر قرآنی مثالوں کو سمجھنے کا ذوق و شوق پیدا ہو جائے۔

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِo تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَo وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍo (ابراهيم ٢٤۔ ٢٦)

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان کی ہے ؟ یہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہیں۔ جو اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل ہر وقت (ہر موسم میں) دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کرلیں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک گندے درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے زمین میں کچھ بھی مضبوطی حاصل نہ ہو۔''

كَلِمَةً طَيِّبَةً کے لفظی معنے ہیں پاکیزہ بات۔ پاکیزگی کی نسبت جب طعام یا مشروب کی طرف کی جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں حلال اور لذیذ طعام یا مشروب۔ مگر جب اس کی نسبت کلمہ یا کلام کی طرف کی جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے سچی اور پکی بات یا میٹھی اور خوش کن بات۔ ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ پکی' سچی اور میٹھی بات توحید کی بات ہے جو دین اسلام اور احکام شرعیہ کی اساس ہے اور تمام انبیاء کی دعوت کا نکتہ جامعہ ہے۔

ابن جریر نے علی ابن ابی طلحہؒ کی روایت سے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً سے مراد ہے شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ یعنی ''اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کی سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔'' كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ کے لفظی معنے ہیں صاف ستھرا اور پاکیزہ درخت' لیکن ہر چیز کی پاکیزگی اس کی حالت کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً زمین کی صفائی یہ

بھی ہے کہ وہ نجاست سے پاک ہو جیسا کہ فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا میں یہی معنے مراد ہیں اور اس کی پاکیزگی اور ستھرائی یہ بھی ہے کہ سیم و تھور سے پاک ہو اور اس کی مٹی پیداوار کے لئے زیادہ موزون ہو جیسے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ میں یہی معنے مراد ہیں نجاست سے پاکیزگی کے معنے تو یہاں مراد نہیں لئے جا سکتے اس لئے کہ نجاسات تو بطور کھاد استعمال ہوتی ہیں اور پیداوار کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ درخت کی پاکیزگی' صفائی' ستھرائی اور اچھائی یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی گئی ہوں' مضبوط اور خوب جمی ہوئی ہوں' ہوا کے معمولی جھونکے اور جھکڑ اسے زمین سے اکھاڑ نہ سکتے ہوں' جس کی شاخیں اور ٹہنیاں اونچائی میں دور تک چلی گئی ہوں' جس کے پتے جھڑتے نہ ہوں' جن کے پتے بے کار اور بے فائدے نہ ہوں بلکہ ان سے استعمال کی مختلف چیزیں بنائی جا سکتی ہوں جس کے پھل کاٹنے کے بعد خراب نہ ہوتے ہوں بلکہ ہر موسم میں سارا سال کھائے جاتے ہوں اور جس کا پھل بطور غذا بھی استعمال ہوتا ہو اور بطور پھل بھی کھایا جاتا ہو۔ غرض یہ کہ جو درخت مضبوط جڑوں پر کھڑا ہو اور اس کے فوائد زیادہ ہوں اس کو شجرہ طیبہ کہا جاتا ہے' اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کونسا درخت ہے جس کے ساتھ کلمہ طیبہ یعنی عقیدہ توحید اور مؤمن کے ایمان کو تشبیہ دی گئی ہے؟ اس کا جواب انس بن مالکؓ کی اس حدیث میں موجود ہے کہ :

اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِقِنَاعٍ عَلَیْهِ رُطَبٌ فَقَالَ "مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ تُؤْتِیْ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" قَالَ هِیَ النَّخْلَةُ "وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ" قَالَ هِیَ الْحَنْظَلُ.(۱)

"رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی نے ایک تھالی پیش کی جس پر تازہ کھجوریں سجی ہوئی تھیں آپ نے اسے دیکھ کر مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ الآیہ پڑھی اور فرمایا کہ

(۱) سنن ترمذی کتاب التفسیر سورۃ ابراھیم' سنن کبریٰ للنسائی کتاب التفسیر سورۃ ابراھیم

اس سے کھجور کا درخت مراد ہے اور پھر وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ پڑھی اور فرمایا کہ یہ حَنْظَل یعنی اندرائن کا درخت ہے۔ امام ترمذیؒ نے انسؓ کی اس حدیث کو تین سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں سے ایک سند میں یہ مرفوعا یعنی قول رسول کے طور پر نقل ہوئی ہے اور دو سندوں میں موقوفاً یعنی انسؓ کے قول کے طور پر نقل ہوئی ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ مجھے یہ حدیث مرفوعا سوائے حماد بن سلمہؒ کے کسی دوسرے راوی سے معلوم نہیں ہے لیکن یہ اس کے ضعف کی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ حماد بن سلمہؒ ثقہ راوی ہیں اور ثقہ کی زیادت مقبول ہوتی ہے اس کے علاوہ ابن عمرؓ سے مروی متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا درختوں میں سے ایک درخت ہے جو مؤمن کی طرح ہے بتاؤ کہ یہ کونسا درخت ہے؟ صحابہؓ کی توجہ صحرائی درختوں کی طرف مبذول ہو گئی' ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہوں یہ کھجور کا درخت ہے مگر مجلس میں ابو بکرؓ' عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ بیٹھے ہوئے تھے اس لئے میں نے حیاء کی وجہ سے جواب نہ دیا مگر صحابہ کے استفسار پر رسول اللہ ﷺ نے آخر میں فرمایا کہ هِيَ النَّخْلَةُ یہ کھجور کا درخت ہے۔ اس حدیث میں اگر چہ سورۃ ابراہیم کی مذکورہ آیت کا حوالہ موجود نہیں ہے اور اس میں ایمان کی تشبیہ درخت کے ساتھ دینے کی بجائے درخت کی تشبیہ مؤمن کے ساتھ دی گئی ہے لیکن قدر مشترک دونوں حدیثوں کا ایک ہے اور وہ ہے مؤمن کے ایمان اور کھجور کے درخت کے باہمی مماثلت اور مشابہت۔ "اصل" کے معنے ہیں مَا يَنْبَنِي عَلَيْهِ غَيْرُهُ "وہ بنیاد جس پر دوسری چیز مبنی ہو۔" مثلاً کسی عمارت کی وہ بنیاد جس پر عمارت اٹھائی اور بنائی گئی ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے درخت کا اصل اور بنیاد اس کی جڑیں ہیں جن پر وہ کھڑا ہے اور "فرع" سے مراد درخت کی وہ شاخیں اور ٹہنیاں ہیں جو اس کی جڑوں پر کھڑی ہوتی ہیں اور اونچائی میں دور تک چلی جاتی ہیں۔ کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور اتنی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کو اکھاڑنے کے لئے دور تک گہرائی میں زمین کھودنے کی ضرورت پڑتی ہے

اور بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ کا مفہوم یہ ہے کہ اس درخت کا پھل ہر موسم میں ملتا ہے اس لئے کہ اس کی پیداوار اگرچہ مخصوص موسم میں حاصل کی جاتی ہے مگر اس کا پھل موسم کی تبدیلی سے خراب نہیں ہوتا بلکہ ہر موسم میں قابل استعمال ہوتا ہے اور اس کا جمع کردہ ذخیرہ سال کے بارہ مہینے کھایا جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ یعنی ایمان کی تشبیہ کھجور کے درخت کے ساتھ اس وجہ سے دی گئی ہے کہ جس طرح اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں' شاخیں بلندی میں دور تک چلی گئی ہوتی ہیں اور اس کا پھل ہر موسم میں کھایا جاتا ہے اسی طرح توحید کا عقیدہ مؤمن کے دل میں جب مضبوط ہو جاتا ہے تو آزمائشوں اور حوادث کی وجہ سے اس میں تزلزل اور تذبذب پیدا نہیں ہو سکتا اور وساوس و خواطر یا بلایا و محن کے جھکڑ آکر گزر جاتے ہیں مگر توحید کے عقیدے کو دل سے نکال نہیں سکتے' شاخوں اور پھلوں سے مراد مؤمن کے اعمال صالحہ ہیں جو ہر وقت' ہر حالت اور ہر موسم میں آسمانوں میں اٹھائے جاتے ہیں اور دربار خداوندی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مؤمن کے اعمال میں رمضان میں یا بعض دوسرے اوقات و حالات میں اضافہ تو ہوتا رہتا ہے لیکن وہ بے عمل کسی موسم اور کسی حالت میں بھی نہیں رہتا بشرطیکہ اس کا ایمان و اسلام اسمی اور نسلی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو یہ تو ہوئی کلمہ طیبہ کی مثال اور کلمہ خبیثہ یعنی کفر و شرک کے کلمے کی مثال ایک کڑوے' گندے اور بدمزہ درخت کی طرح ہے جیسے اندرائن جس کی جڑیں زمین کے اندر نہیں ہوتیں بلکہ زمین کے اوپر ہی چپکی ہوتی ہیں جسے بڑی آسانی کے ساتھ زمین کھودے بغیر اوپر ہی سے اکھیڑا جا سکتا ہے' اس کی شاخیں بھی نہیں ہوتیں اور اس کا پھل بھی کڑوا' بدمزہ اور گندہ ہوتا ہے اسی طرح شرک و کفر کا نظریہ اور کلمہ بھی دلائل پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اوہام پر مبنی ہوتا ہے اور کافر و مشرک کے اعمال اوپر نہیں جا سکتے اس لئے کہ وہ گندے ہوتے ہیں اور اوپر وہی اعمال جاتے ہیں جو طیب اور پاک ہوں اور ایمان کی جڑوں سے نکلے ہوں۔ ان مثالوں کے ذریعے ایمان اور کفر اور توحید و شرک کو

آنکھوں سے دکھائی دینے والے درختوں اور ذائقہ سے محسوس کیے جانے والے پھلوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے تاکہ حق پرستی اور اوہام پرستی اور اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ کے درمیان فرق وامتیاز کھل کر سامنے آجائے۔

نور ایمان کی مثال

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ○ (النور ۳۵)

''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہے۔ چراغ قندیل میں ہے۔ قندیل گویا ایک چمکدار ستارہ ہے۔ چراغ جلایا گیا ہے زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے اگرچہ آگ نے اسے چھوا بھی نہ ہو۔ نور ہی نور ہے۔ اللہ توفیق دیتا ہے اپنے نور کی جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ بیان کرتا ہے مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے لئے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

یہ آیت ''آیت نور'' کے نام سے مشہور ہے اس لئے کہ اس میں نور ہدایت اور نور ایمان کا ذکر ہوا ہے اور اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام سورۃ نور ہے۔ نور کے معنے ہیں روشنی جو خود بھی چمکتی ہو اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی چیزوں کو بھی روشن کرتی ہو۔ اس کی ضد ظلمت ہے جس کے معنے ہیں اندھیرا اور تاریکی۔ نور کی دو قسمیں ہیں ایک ہے ''حسی نور'' اور دوسری ہے ''معنوی نور'' حسی نور وہ ہے جو قوت باصرہ یعنی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہو جیسے سورج' چاند' ستارہ' بجلی اور چراغ کا نور اس سے اشیاء اور اجسام کثیفہ روشن ہوتے ہیں اور معنوی نور وہ

ہے۔جس کا ادراک بصیرت اور قوت عاقلہ سے تو کیا جاتا ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا جیسے علم' ایمان' اعمال حسنہ اور اخلاق فاضلہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیدا کردہ چاند کو بھی نور کہا ہے وَالْقَمَرَ نُوْرًا. اپنی نازل کردہ کتاب ہدایت کو بھی نور کا نام دیا ہے وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا اور اپنے ارسال کردہ رسول پر بھی "سراج منیر" کا اطلاق کیا ہے وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا اس لئے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ دونوں سے ہدایت' ایمان' توحید' اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی روشنی حاصل کی جاتی ہے جس کی وجہ سے حق پرستی' انصاف پسندی' راستبازی' خیر خواہی اور ہمدردی کا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اللہ کی ذات پر نور کا جو اطلاق ہوا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نور سے مراد ہے نور ہدایت اور آسمان و زمین سے مراد ہے کل عالم اور مقصد یہ ہے کہ پورے عالم میں جس کو بھی روشنی ملی ہے اللہ ہی کی جانب سے ملی ہے۔ نور حسی دینے والا بھی وہی ہے اور نور معنوی دینے والا بھی وہی ہے یعنی سورج اور چاند کو روشن بنانے والا بھی وہی ہے اور مؤمن کو علم و یقین کی روشنی بخشنے والا بھی وہی ہے۔ یہ مفہوم عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَقُوْلُ ھَادِیْ اَھْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں رہنے والوں کو ہدایت دینے والا ہے۔"

انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ اِنَّ اِلٰھِیْ یَقُوْلُ نُوْرِیْ ھُدَایَ. یعنی "میرا معبود کہتا ہے کہ میرا نور میری ہدایت ہے۔"(۱)

صحابۂ کرام کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ نور سے مراد "نور ہدایت" ہے۔ اور مَثَلُ نُوْرِہٖ سے مراد مؤمن کے دل میں ہدایت اور ایمان کی وہ روشنی ہے جو اللہ کی عطا

(۱) تفسیر ابن جریر و تفسیر ابن کثیر النور آیت ۳۵

کردہ ہے۔ ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ دونوں نے ابی بن کعبؓ اور ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس نور سے ایمان اور قرآن کا وہ نور مراد ہے جو مؤمن کے سینے میں ڈالا گیا ہے۔ نُورِہٖ کی ضمیر کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ ہے یعنی اللہ کی ہدایت کا نور' اور دوسرا یہ کہ اس کا مرجع مؤمن ہے جو سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے یعنی مؤمن کے ایمان کا نور۔ ایمان و ہدایت کا نور ایک معنوی روشنی ہے جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی وضاحت کے لئے آنکھوں سے دکھائی دینے والی حسی روشنی کی مثال پیش کی گئی ہے تاکہ اس کا سمجھنا آسان ہو جائے اور یہ معنوی نور ایک محسوس نور کی طرح اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اس مثال کے اجزاء کی تشریح اس طرح ہے :

مِشکوٰۃ: اس سے مراد مؤمن کا سینہ ہے جو دل کے لئے ایک طاق کی طرح ہے۔

اَلْمِصبَاح: اس سے مراد مؤمن کا دل ہے جو ہدایت کے نور سے منور ہے۔

الزُّجاجَۃ :اس سے مراد فطری ہدایت اور قبول حق کی پیدائشی صلاحیت ہے جو مؤمن کے دل میں ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ جیسے زیتون کے ایسے درخت کے تیل کا چراغ جل رہا ہو جس پر سارا دن سورج کی شعائیں پڑتی ہوں اور وہ تیل اتنا زیادہ صاف اور شفاف ہو کہ قریب ہے کہ وہ خود بخود روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نے چھوا بھی نہ ہو۔ اور جب اسے آگ کا شعلہ چھولے تو پھر نور ہی نور یعنی تیز روشنی بن کر ارد گرد کی چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔

مؤمن کے قلب میں ڈالے گئے ہدایت اور ایمان کے نور کی تشبیہ طاق میں رکھے ہوئے چمکدار قندیل میں صاف و شفاف روغن زیتون سے جلتے ہوئے چراغ کے ساتھ اس لئے دی گئی ہے کہ جس طرح کہ یہ صاف و شفاف تیل آگ کے چھونے کے بغیر بھی چمکتا ہے مگر جب اسے آگ بھی چھولے تو پھر وہ نور ہی نور بن کر اپنے ماحول کو چمکا دیتا ہے اسی طرح مؤمن کی فطرت سلیمہ کی روشنی وحی خداوندی کی روشنی سے قبل بھی حق و باطل اور بھلائی

وبرائی میں تمیز کر سکتی ہے مگر جب وحی الٰہی کا نور ہدایت بھی اس کے ساتھ مل جائے تو پھر وہ تیز روشنی بن کر دوسروں کو بھی نور ہدایت سے منور کر دیتی ہے۔ اور نور ایمان کا حامل مؤمن جہاں بھی رہتا ہو اور جہاں بھی آتا جاتا ہو لوگوں کے لئے مشعل راہ ہوتا ہے۔

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ میں بتایا گیا ہے کہ نور ایمان اور نور ہدایت اللہ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے یہ روشنی دے دیتا ہے اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کے دل میں حق کی طرف انابت و رجوع ہوتی ہے اور وہ حق کا متلاشی اور طلبگار ہوتا ہے اسے یہ روشنی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور جس کے دل میں عناد و حسد اور استکبار کی بیماری ہو وہ اس نور سے محروم رہتا ہے۔

وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ میں فرمایا گیا ہے کہ مثالیں تفہیم و تعلیم کا ذریعہ ہیں اور اللہ کی کتاب میں یہ لوگوں کو سمجھانے کے لئے ذکر کی گئی ہیں۔ اور وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اس لئے اس کی ہدایت بھی مبنی بر حقیقت ہے اور اس کی بیان کردہ مثالیں بھی سچی اور بر محل ہیں۔

مؤمن کے قلب میں نور ہدایت کا ذکر سورۃ الزمر میں بھی ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (الزمر ۲۲)

"کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے پس وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہے (اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کا سینہ اسلام کے لئے بند ہو چکا ہے ؟) پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل سخت ہیں اور اللہ کے ذکر سے اثر نہیں لیتے' یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔"

اسلام کے لئے سینہ کھولنے کا مفہوم یہ ہے کہ توحید کے عقیدے کو بڑی فراخ دلی' طمینان' قلبی' ذوق و شوق کے ساتھ قبول کر لیا جائے' اس کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی

نہ رہے اور اس کے لئے ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ شرح صدر کی یہ کیفیت جب دل میں پیدا ہو جائے تو اس میں ایمان و ہدایت کا ایک معنوی نور ڈال دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب آجاتی ہے اور موت کے لئے تیاری کرنے کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ کی ''کتاب الزھد'' میں' عبدالرزاقؒ کی مصنف میں' ابن ابی شیبہؒ کی مصنف میں' تفسیر ابن جریرؒ میں اور بیہقی کی الاسماء والصفات میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا الشَّرْحُ؟ قَالَ نُوْرٌ یُقْذَفُ فِی الْقَلْبِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَھَلْ لِذَالِکَ مِنْ اَمَارَۃٍ؟ قَالَ نَعَمْ قَالُوْا وَ مَا ھِیَ؟ قَالَ الْاِنَابَۃُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ وَالتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ.(۱)

''صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ یہ شرح صدر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ ایک نور ہے جو دل میں ڈالا جاتا ہے' انہوں نے کہا کہ کیا اس کی کوئی نشانی بھی ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں اس کی نشانی موجود ہے' صحابہ نے کہا وہ کیا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نشانی یہ ہے کہ ہمیشہ رہنے کے گھر (جنت) کی طرف دل مائل ہو جائے' دھوکہ دینے والے گھر (دنیا) کی طرف دل مائل نہ ہو اور موت کے لئے اس کے آنے سے پہلے تیاری کی جائے۔''

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس نور کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد نور ایمان ہے اور اس کا مصداق مراتب کے فرق کے ساتھ ہر مؤمن ہے لیکن اَوَّلُ المؤمنین اور اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ محمد رسول اللہ ﷺ تھے اس لئے اس نور کا مصداق اول ''نور محمدی'' ہے۔ اور امت مسلمہ کو ایمان' عمل اور اخلاق کے جو انوار ملے ہیں وہ نور محمدی اور سیرت محمدی ہی سے ماخوذ ہیں۔ ابن جریر' معالم التنزیل اور مظہری نے روایت نقل کی ہے کہ:

''ابن عباسؓ نے کعب الاحبار سے پوچھا اَخْبِرْنِیْ عَنْ قَوْلِہٖ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ

(۱) ابن جریر و ابن کثیر الانعام ۱۲۶ پ ۸

مجھے اللہ کے اس قول کا مطلب بتاؤ کہ "اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ جل رہا ہو" کعب نے کہا کہ ھٰذَا مَثَلٌ ضَرَبَہُ اللّٰہُ لِنَبِیِّہٖ ﷺ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے متعلق بیان فرمائی ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد آپ کا سینہ مبارک ہے' زجاجہ سے مراد آپ کا قلب اطہر ہے اور مصباح سے مراد نور محمدی ہے یعنی آپ کی نبوت' پاکیزہ فطرت اور آپ کے قلب سلیم کا نور جو قریب ہے کہ لوگوں کے سامنے خود بخود نمایاں اور عیاں ہو جائے اگرچہ آپ نے ابھی نبوت کا اعلان بھی نہ کیا ہو جیسا کہ یہ تیل قریب ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو۔ تو آپ کا قلب انور نور ہی نور ہے۔"(۱)

ظُلمتِ کفر کی مثال

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰہُ حِسَابَہٗ وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىھَا وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (النور ۳۹۔۴۰)

"اور جن لوگوں نے انکار کیا ہے ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے سراب (چمکتا ہوا ریت) میدان میں جس پر پیاسا پانی کا گمان کرے' یہاں تک کہ جب پہنچے وہ اس کے پاس تو اسے کچھ بھی نہ پائے (کچھ بھی نہ دیکھے نہ پانی اور نہ ریت) اور اس کے پاس اللہ کو پالے (یعنی اللہ کے فیصلے کو) اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے اندھیرے ہوں گہرے دریا میں کہ چھا رہی ہو اس پر ایک لہر جس پر ایک اور لہر ہو اور اس پر بادل چھایا ہوا ہو اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک دوسرے کے اوپر کہ جب کوئی نکالے اپنا

(۱)تفسیر مظہری سورۃ نور آیت نمبر ۳۵

ہاتھ تو قریب نہ ہو کہ وہ اسے دیکھ سکے (یعنی اسے دیکھنے کا احتمال بھی نہ ہو) اور جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لئے کہیں بھی روشنی نہیں ہے۔"

توحید الٰہی اور رسالت محمدی سے انکار کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو آخرت کو مانتے ہیں اور آخرت کے لئے کچھ اچھے اعمال بھی کرتے ہیں جن کو وہ نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر توحید اور رسالت پر اور بحیثیت مجموعی دین اسلام کی صداقت پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کا ایمان بالآخرت بھی سراب کی طرح ہے اور ان کے اعمال بھی سراب کی طرح ہیں جس پر پیاسا پانی کا گمان کرتا ہے مگر وہاں پہنچ کر سوائے اللہ کے حکم کے یعنی اپنی موت کے فیصلے کے اور کچھ نہیں پاتا' اس کی ساری امیدیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ یاس و ناامیدی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ اسی طرح یہ منکرین توحید و رسالت جب قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے تو اپنے اعمال میں سے کچھ بھی نہیں پائیں گے' اپنی نجات سے مایوس ہو جائیں گے اور بے بسی کی حالت میں عذاب الٰہی کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ اس مثال میں قیامت کے روز کفار کی مایوسی' بے بسی اور ہلاکت کو سراب کی ایک محسوس صورت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تاکہ منکرین توحید و رسالت کے اعمال کا حبط و ضیاع اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اور دوسری قسم ان کفار کی ہے جو توحید' رسالت اور آخرت تینوں کو نہیں مانتے یہ ضلالت و جہالت کے شدید ترین اندھیروں میں مبتلا ہیں جن کی وجہ سے وہ خود اپنے نفس کو بھی پہچان نہیں سکتے ورنہ انسان کے اپنے نفس میں بھی نشانیاں موجود ہیں جن سے اللہ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ جہالت و ضلالت کے ان اندھیروں کو محسوس اندھیروں کے ساتھ اس طرح تشبیہ دی گئی ہے کہ فرض کیجئے ایک شخص گہرے سمندر کی تہہ میں پڑا ہے جس کے اوپر سمندر کی لہریں اوپر نیچے بہہ رہی ہیں اور ان لہروں کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے سورج کی روشنی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ شخص اوپر تلے اندھیروں ہی اندھیروں میں پڑا ہوا ہے تو اپنے ہاتھ کو کیسے

—— دیکھے گا اور اپنے آس پاس کی چیزوں کو کیسے دیکھے گا؟

مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال

یَا اَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ وَ اِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ٥ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ. (الحج ۷۳.۷٤)

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے پس اسے کان لگا کر سن لو' بے شک اللہ کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ سب کے سب جمع ہو جائیں' اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اسے اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے' طلب کرنے والا بھی کمزور ہے اور جس سے کچھ طلب کیا جا رہا ہے وہ بھی کمزور ہے۔ انہوں نے اللہ کی شان کا اندازہ نہیں لگایا جیسا کہ اس کی شان کا حق ہے۔ بے شک اللہ طاقت والا ہے اور غالب ہے۔"

علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ :

وَالْآیَۃُ وَ اِنْ کَانَتْ نَازِلَۃً فِی الْاَصْنَامِ .... اِلَّا اَنَّ الْحُکْمَ عَامٌّ لِسَائِرِ الْمَعْبُوْدَاتِ الْبَاطِلَۃِ.

یعنی "یہ آیت اگرچہ بتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا حکم سارے باطل معبودوں کو شامل ہے۔"

ہر دور کے مشرکین بت کسی کے نام پر بناتے رہے ہیں کسی نے سورج' چاند اور ستاروں کے نام پر بت اور ہیاکل بنا کر ان کی پوجا کی ہے' کسی نے فرشتوں کے نام پر بت بنا کر ان کی پرستش کی ہے اور کسی نے اولیاء اللہ کے نام پر بطور یادگار بت بنا کر ان کی عبادت کی ہے۔ بظاہر تو یہ بت پرستی تھی لیکن حقیقت میں یہ ستارہ پرستی یا فرشتہ پرستی یا اولیاء پرستی

تھی۔ اسی طرح جو لوگ اولیاء کی قبروں کی تعظیم کے لئے سجدہ کرتے ہیں' ان کے سامنے جھکتے ہیں' ان کا طواف کرتے ہیں یہ بظاہر قبر پرستی ہے اور حقیقت میں اولیاء پرستی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالی کے سوا تمہارے خود ساختہ معبود سب کے سب کمزور اور بے بس ہیں' سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور نہ مکھی سے کوئی چیز چھڑا سکتے ہیں خواہ یہ سورج چاند اور ستارے ہوں یا فرشتے ہوں یا اصحاب القبور ہوں۔ غیبی مدد کے لئے اللہ کو چھوڑ کر ان کمزور اور بے بس معبودوں کو پکارنا حماقت' سفاہت اور جہالت کی انتہا ہے۔ یہ تمثیل مشرکین کی بے وقوفی اور ان کے من گھڑت معبودوں کی بے بسی واضح کرنے کے لئے بیان ہوئی ہے۔ سورت عنکبوت کی آیت ۴۱ میں مشرکین کی تشبیہ مکڑی کے ساتھ اور ان کے معبودوں کی تشبیہ مکڑی کے جالے کے ساتھ دی گئی ہے کہ جس طرح مکڑی اپنی حماقت و سفاہت کی وجہ سے باریک اور کمزور تاروں سے بنے ہوئے جالے پر اعتماد کرتی ہے حالانکہ وہ جالا اس کو نہ سردی' گرمی سے بچا سکتا ہے اور نہ آندھی سے۔ اسی طرح یہ مشرکین اپنے خود ساختہ کارسازوں اور حمایتیوں پر اعتماد کرتے ہیں کہ یہ ہماری مشکلیں حل کر دیں گے اور حاجتیں پوری کر دیں گے حالانکہ وہ نہ مختار کل اور کارساز ہیں اور نہ غیبی اور تکوینی مدد کر سکتے ہیں بلکہ بے بس اور کمزور ہیں۔

منافقین کی مثال

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ○ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ○ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيْهِ ظُلُمَاتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَّجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكَافِرِيْنَ○ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (البقرۃ ۱۷ تا ۲۰)

"ان کی حالت ان لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے آگ جلائی ہو اور آگ نے جب ان کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان سے روشنی لے لی اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں گونگے ہیں اور اندھے ہیں پس وہ نہیں لوٹیں گے روشنی کی طرف یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش برس رہی ہو جس میں اندھیرے ہوں اور گرج چمک ہو' ڈالتے ہوں وہ انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو اپنی قدرت کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ اچک لے بجلی ان کی آنکھوں کی بینائی کو' جب بجلی چمکتی ہے ان پر تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے لے ان سے ان کی شنوائی اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

نفاق قلب و ضمیر کے خلاف بات کرنے اور عمل کرنے کا نام ہے یا دوسرے الفاظ میں ظاہر اور باطن کے تضاد اور دورنگی کو منافقت کہتے ہیں' منافق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اعتقادی منافق' اور دوسرا ہے عملی منافق۔ اگر دل میں کفر اور عداوت ہو مگر زبان و عمل سے اسلام اور محبت کا اظہار کر رہا ہو تو یہ اعتقادی منافق ہے اور کھلے کافر سے بھی بدتر ہے لیکن اگر دل میں تو ایمان و یقین موجود ہو مگر عمل ایمان کے تقاضے کے خلاف ہو تو یہ عملی منافق ہے۔ مثلاً عقیدہ تو یہ ہے کہ وعدہ خلافی کرنا' امانت میں خیانت کرنا' جھوٹ بولنا اور شرعی حدود سے تجاوز کرنا گناہ ہے' برائی ہے اور اللہ کی نافرمانی ہے مگر عملاً ان برائیوں کا ارتکاب کر رہا ہو تو ایسا شخص عقیدتاً تو مؤمن ہوتا ہے مگر عملاً منافق ہوتا ہے۔ اعتقادی منافق کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے معاند اور دوسرا ہے متردد۔ معاند وہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دین حق کی صداقت اور حقانیت واضح ہو چکی ہو مگر حسد و عناد اور استکبار کی وجہ سے دل میں کفر و عداوت رکھتا ہو اور خوف یا لالچ کی وجہ سے زبان و عمل سے اسلام کا مظاہرہ کر رہا ہو اور متردد وہ ہے جو عنادی اور متکبر تو نہ ہو مگر تذبذب' تحیر اور تردد میں مبتلا ہو جب اسلام کے برحق

ہونے کے دلائل سنتا ہے یا مسلمانوں کی فتوحات کی خبریں سنتا ہے یا مفادات کی چمک دیکھتا ہے تو ایمان لانے کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور جب مخالفین کی باتیں سنتا ہے یا مسلمانوں پر آنے والی مصیبتوں اور آزمائشوں کو دیکھتا ہے تو رک جاتا ہے' دراصل ایسا متلون المزاج' خود غرض' موقع پرست اور مفاد پرست شخص نہ ادھر ہوتا ہے اور نہ ادھر ہوتا ہے بلکہ درمیان میں مذبذب اور معلق ہوتا ہے جب مسلمانوں کو غالب دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تو تمہارے ساتھ تھا اور جب کفار کا غلبہ دیکھتا ہے تو ان کو کہتا ہے کہ ظاہر میں تو میں مسلمانوں کے ساتھ تھا لیکن میری دلی ہمدردیاں تمہارے ساتھ تھیں۔ منافق کی چونکہ دو قسمیں ہیں اس لئے مثالیں بھی دو بیان کی گئی ہیں۔ پہلی مثال معاندین کی ہے اور دوسری مثال مترددین کی ہے۔ یہ دونوں مثالیں تشبیہ مرکب کے اصول پر بیان کی گئی ہیں جس میں ایک ایک جز کے ساتھ تشبیہ دینا مقصد نہیں ہوتا کہ مشبّہ بہ کے اجزاء کے مقابلے میں مشبّہ کے اجزاء متعین کرنا ضروری ہو بلکہ اجزاء کے مجموعے سے جو صورت حال بنتی ہو اس کے ساتھ تشبیہ دینا مقصد ہوتا ہے یعنی مشبہ کی حالت کی تشبیہ مشبّہ بہ کی حالت کے ساتھ دی جاتی ہے۔ عنادی منافقین کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان پر حق واضح اور روشن ہو گیا ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہوتے ہیں کہ حق اور سچ تو یہی ہے مگر عناد و حسد اور استکبار کی وجہ سے ان کے دل ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور تسلیم و انقیاد پر وہ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق مہریں لگا دیتا ہے اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے یعنی ان سے متاثر ہونے اور تسلیم کرنے کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے اور ان کو توفیق نہیں دیتا' یہ توفیق نہ دینا اور تاثر و تسلیم کی صلاحیت کو سلب کر دینا جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ عناد و حسد اور استکبار کا نتیجہ ہے جو ظاہر ہو رہا ہے اور اس کی سزا ہے جو ان کو دی جاتی ہے۔ ان کی اس حالت کی وضاحت کے لئے اور اسے ایک محسوس شکل دینے کے لئے مثال ناری پیش کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ان کی حالت ان لوگوں کی حالت کے ساتھ

مشابہت رکھتی ہے جنہوں نے روشنی کے لئے آگ جلائی ہو اور جب یہ آگ اپنے ارد گرد اور آس پاس کو خوب روشن کر دے اور ان کو سب کچھ دکھائی دینے لگے تو اللہ تعالیٰ ان سے روشنی لے لے اور وہ اندھیروں میں حیران و سرگرداں رہ جائیں اور بہروں' گونگوں' اندھوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہوں۔ عنادی منافقین کی بھی یہی حالت ہے کہ حق کے واضح ہو جانے اور اچھی طرح سمجھ لینے کے باوجود حسد و عناد کے پردوں کی وجہ سے کفر کے اندھیروں میں بہروں' گونگوں اور اندھوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں اور حق کی جانب رجوع نہیں کرتے۔ اس مثال میں روشنی کے باوجود اسے قبول نہ کرنا مشبّہ ہے اور متردّدین کی مثال اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جیسے اندھیروں میں گرج چمک کے ساتھ بارش برس رہی ہو اور اس میں ایک شخص اپنی منزل کی طرف جارہا ہو' جب بادل گرجتے ہیں تو خوف زدہ ہو کر کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس دیتا ہے اور جب بجلی چمکتی ہے اور راستہ دکھائی دیتا ہے تو چل پڑتا ہے مگر جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا شخص تحیر و تذبذب کی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ آگے بھی نہیں جاسکتا اور پوری یکسوئی کے ساتھ واپس بھی نہیں ہو سکتا۔

تردد' تحیر اور تذبذب کی اسی صورت حال کے ساتھ متردد منافق کی تشبیہ دی گئی ہے جو نہ اسلام میں یکسوئی اور استقامت کے ساتھ رہ سکتا ہے اور نہ اطمینان کے ساتھ کفر میں رہ سکتا ہے بلکہ تذبذب اور اضطراب و تحیر کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس "مثال مائی" میں اندھیروں' گرج چمک اور موسلادھار بارش میں سفر کرنے والے شخص کی حالت مشبّہ بہ ہے اور متردد منافق کے تحیر و تذبذب کی حالت مشبّہ ہے۔ امثال القرآن کی یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں اور اس قسم کی متعدد مثالیں اور بھی قرآن مجید میں موجود ہیں جن پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تفہیم و تعلیم میں تمثیل کا بڑا مفید اور مؤثر کردار ہے اور اسی افادیت اور تاثیر کی بنا پر قرآن کریم نے اپنی بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے مثالوں کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

باب ہشتم

تفسیر
اور
اُصول تفسیر

باب ہشتم

تفسیر اور اصول تفسیر

گذشتہ سات ابواب میں قرآن کریم کے علوم و معارف سے متعلق ضروری مباحث ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں' اب آٹھویں باب میں تفسیر اور اصول تفسیر یا تفسیر اور منہج تفسیر سے متعلق مباحث و معارف مرتب صورت میں تحریر کئے جا رہے ہیں۔

تفسیر کے لغوی معنے

تفسیر باب تفعیل سے مصدر کا صیغہ ہے اور اس کا مأخذ فَسْرٌ ہے جو فَسَرَ يَفْسُرُ یا فَسَرَ يَفْسِرُ سے مصدر کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں کسی مبہم اور مجمل بات کی وضاحت کرنا یا کسی مخفی چیز سے پردہ اٹھانا۔

تفسیر کے بھی یہی معنے ہیں البتہ اس میں مبالغے کی خاصیت بھی ملحوظ رہتی ہے' پیشاب کے ٹیسٹ کو "تَفسِرَہ" کہتے ہیں اس لئے کہ اس سے مرض کی تشخیص ہوتی ہے۔

ابن منظور افریقیؒ لکھتے ہیں :

اَلْفَسْرُ كَشْفُ الْمُغَطّٰى وَا التَّفْسِيْرُ كَشْفُ الْمُرَادِعَنِ اللَّفْظِ الْمُشْكِلِ.(۱)

"فسر کے معنے ہیں کسی پوشیدہ چیز سے پردہ اٹھانا اور تفسیر کے معنے ہیں کسی مشکل لفظ کے مفہوم و مراد کو ظاہر کرنا۔"

(۱) لسان العرب مادہ فسر ص۳۶۱ج۶

مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ :

اَلْفَسْرُ اَلْاِبَانَةُ وَ کَشْفُ الْمُغَطّٰی کَالتَّفْسِیْرِ وَالْفِعْلُ کَضَرَبَ وَ نَصَرَ.(۱)

"فسر کے معنے ہیں ظاہر کرنا اور پردہ اٹھانا اور تفسیر کے بھی یہی معنے ہیں' اس کا فعل ضَرَبَ یَضْرِبُ اور نَصَرَ یَنْصُرُ کے باب پر آتا ہے۔"

لفظ تفسیر بیان اور وضاحت کے معنوں میں خود قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے :

وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا. (الفرقان ۳۳)

"اور نہیں لاتے یہ لوگ تیرے سامنے کوئی عجیب سوال مگر لے آتے ہیں ہم تیرے پاس اس کا سچا اور قطعی جواب اور بہترین وضاحت۔"

یعنی تیری نبوت اور دعوت پر منکرین جو عجیب و غریب قسم کے اعتراضات کرتے ہیں ہم ان کے سچے' قطعی اور واضح جوابات سمجھا دیتے ہیں جن کے سامنے یہ اعتراضات ٹھہر نہیں سکتے بلکہ ان کی لغویت اور بطلان کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ کسی جواب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایک تو وہ سوال کی جڑ کاٹنے والا ہو' صحیح اور درست ہو اور دوسری خوبی یہ کہ وہ صاف و شفاف اور واضح ہو جسے سمجھنا بڑا آسان ہو۔ اس آیت میں "بِالْحَقِّ" میں پہلی خوبی کی طرف اشارہ ہے اور "اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا" میں دوسری خوبی کی طرف اشارہ ہے۔

مذکورہ لغوی تحقیق سے معلوم ہوا کہ لغت کے اعتبار سے تفسیر کا لفظ ہر قسم کی وضاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ آسمانی کتاب کی وضاحت ہو یا انسانی کتاب کی وضاحت ہو' خواہ حق کی وضاحت ہو یا باطل کی وضاحت ہو اور خواہ محسوس مادی چیز کو ظاہر کرنا ہو یا الفاظ کے معانی و مفاہیم کو ظاہر کرنا ہو۔

(۱) القاموس المحیط مادہ فسر ص ۱۱۰ ج ۲

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم

لغوی مفہوم کے اعتبار سے تو تفسیر کا اطلاق ہر قسم کی وضاحت پر ہوتا ہے لیکن اہل اسلام کی اصطلاح میں یہ لفظ قرآن کی تشریح و توضیح کے ساتھ مخصوص ہے یہاں تک کہ حدیث رسول کی تشریح کو بھی تفسیر نہیں کہا جاتا بلکہ شرح الحدیث کہا جاتا ہے' قرآن کریم کی آیات کی وضاحت کرنے والے کو مفسر کہا جاتا ہے اور احادیث کی وضاحت کرنے والے کو شارح کہا جاتا ہے۔ اگرچہ شارحین حدیث پر مفسرین کا اطلاق اور مفسرین قرآن پر شارحین کا اطلاق شرعاً یا لغتاً ممنوع نہیں ہے لیکن امت مسلمہ میں بالعموم یہ اطلاق مروج نہیں رہا۔

تفسیر کی فنی اور اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں مختلف تعریفیں منقول ہیں لیکن سب سے زیادہ مختصر' صاف اور جامع ومانع تعریف وہ ہے جو زرقانیؒ نے ''مناھل العرفان'' میں ذکر کی ہے۔

وَالتَّفْسِيرُ فِي الْاِصْطِلَاحِ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيهِ عَنِ الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ مِنْ حَيْثُ دَلَالَتِه عَلٰى مُرَادِ اللّٰهِ تعالى بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ.(۱)

''تفسیر اصطلاح میں وہ علم ہے جس میں قرآن کے بارے میں بحث کی جاتی ہے اس حیثیت سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کرتا ہے بشری طاقت کے مطابق۔''

یعنی انسانی طاقت وصلاحیت کے مطابق قرآنی آیات سے اللہ کی مراد معلوم کرنے کو تفسیر قرآن کہا جاتا ہے۔ ''مراد پر دلالت کرنے'' کی قید سے علم القراءات خارج ہو گیا اس لئے کہ اس میں الفاظ وکلمات کے تلفظ اور قراءت کی کیفیت کے بارے میں بحث کی جاتی ہے معانی ومفاہیم کی وضاحت براہ راست پیش نظر نہیں ہوتی' اگرچہ فہم قرآن میں صحیح تلفظ کو بڑا دخل ہے مگر علم القراءات کا اصل موضوع تلفظ اور قراءت ہے معانی ومفاہیم اس کا

(۱) مناھل ص۳ ج۲

اصل موضوع نہیں ہے' اسی طرح اس قید سے کتابت اور رسم الخط کا علم بھی خارج ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس علم میں الفاظ کی کتابت اور رسم الخط کے بارے میں بحث کی جاتی ہے معانی و مفاہیم اس میں موضوع بحث نہیں ہوتے۔ "بشری طاقت کی مقدار" کا قید اس لئے لگایا گیا ہے کہ اللہ کی نفس الامری اور واقعی مراد کا قطعی علم مفسر کی استطاعت میں نہیں بلکہ وہ اپنے علم اور صلاحیت کے مطابق دلائل و قرائن کی روشنی میں اللہ تبارک و تعالی کی مراد اور منشا معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کا اسے اجر ملتا ہے بشرطیکہ اس کوشش میں خواہش نفس کے مطابق مفہوم نکالنا مقصد نہ ہو بلکہ حق معلوم کرنا پیش نظر ہو۔ تلاش حق کی نیت سے جب تفسیر کی جائے تو اگر نفس الامری مفہوم معلوم کرنے میں غلطی بھی ہو جائے پھر بھی مفسر ماخوذ نہیں ہوگا بلکہ ماجور ہوگا۔

میرے نزدیک تو یہی تعریف جامع و مانع اور صاف و شفاف ہے لیکن دوسرے نمبر پر علامہ زرکشیؒ متوفی ۷۹۴ھ کی تعریف بھی بہترین قرار دی جاسکتی ہے۔

اَلتَّفْسِيْرُ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ فَهْمُ كِتَابِ اللّٰهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيِّهِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ بَيَانُ مَعَانِيْهِ وَ اِسْتِخْرَاجُ اَحْكَامِهِ وَ حِكَمِهِ.(۱)

"تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ کی اس کتاب کا فہم حاصل ہوتا ہے جو اس کے نبی محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے' جس کے ذریعے اس کے معانی کی وضاحت ہوتی ہے اور جس کے ذریعے اس کے احکام اور حکمتیں معلوم کی جاتی ہیں۔"

اس تعریف کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ علم تفسیر کے ذریعے قرآن کے معانی و مفاہیم' احکام و قوانین اور ان احکام کے حکم و مصالح معلوم کئے جاتے ہیں' علم القراءت اور علم رسم الخط دونوں اس تعریف سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ مفہوم کے اعتبار سے زرکشی اور زرقانی دونوں کی تعریفیں یکساں ہیں اور دونوں کے درمیان اختلاف صرف الفاظ کا ہے مفہوم دونوں

(۱) البرہان ص۱۳ ج۱

کا ایک ہے۔

زرکشی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ علم تفسیر کے مدد و معاون علوم میں علم اللغۃ، علم الصرف، علم النحو، علم البیان، علم القراءت، علم اصول فقہ شامل ہیں اور تفسیر کرتے وقت اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ معلوم کرنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے علم تفسیر کی ایسی تعریف کی ہے جس میں اس علم کے مدد و معاون علوم بھی شامل ہو گئے ہیں:

اَلتَّفْسِيْرُ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ وَ مَدْلُوْلَاتِهَا وَ أَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيْبِيَّةِ وَ مَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْكِيْبِ وَ تَتِمَّاتٍ لِذَالِكَ.(۱)

"تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآنی الفاظ کے تلفظ کی کیفیت، ان کے معانی و مفاہیم، ان کے انفرادی اور ترکیبی احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جن پر یہ الفاظ ترکیبی اور تالیفی حالت میں محمول کئے جاتے ہیں اور جس میں ان کے تتموں کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

ابو حیانؒ نے اپنی اس تعریف کے الفاظ و قیود کا خود ہی تجزیہ اس طرح کیا ہے:

عِلْمٌ: یہ جنس ہے جو تمام علوم کو شامل ہے۔

كيفية النّطق: یہ علم القراءات ہے جس کی علم تفسیر میں ضرورت پڑتی ہے۔

مَدْلُوْلَاتِهَا: یہ علم لغت ہے جس کی اس علم میں ضرورت پڑتی ہے۔

احكامها الْإِفْرَادِيَّةِ والتَّرْكِيبِيَّة: یہ شامل ہے علم صرف، علم الاعراب (نحو) اور علم البیان و بدیع کو جن کی ضرورت پڑتی ہے۔

مَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْكِيب: اس میں الفاظ کے مجازی معانی بھی آجاتے ہیں اس لئے کہ ترکیبی حالت میں بعض اوقات کسی مانع کی وجہ سے حقیقی معانی کی بجائے

(۱) تفسیر البحر المحیط لابی حیان اندلسی ص۱۳-۴

مجازی معانی مراد ہوتے ہیں جو ظاہری معنوں کے خلاف ہوتے ہیں۔

تَتِمَّاتٍ لِذَالِكَ: اس میں ناسخ و منسوخ' شان نزول اور قرآن کے مبہمات کی وضاحت کے لئے قصوں اور حکایات کی تفصیلات شامل ہیں۔

☆ اس تعریف میں ان تمام امور کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تفصیلات قدیم مفسرین اپنی تفاسیر میں بالعموم بیان کرتے ہیں' مثلاً قراء توں کی تفصیلات اس لئے بیان کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے الفاظ کے معانی و مفاہیم پر روشنی پڑتی ہے اور قراءات کے اختلاف کی وجہ سے بعض اوقات معانی کے تعین پر بھی اثر پڑتا ہے۔

☆ الفاظ مفردہ کے لغوی معانی کا ذکر بھی مفسرین کرتے ہیں اس لئے کہ لغوی معانی کا فہم قرآنی آیات کا مقصد و مراد معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کیونکہ قرآن عربی لغت میں نازل ہوا ہے۔

☆ انفرادی احکام سے مراد الگ الگ الفاظ کا مادہ اشتقاق اور ان کے اوزان صرفی ہیں۔ مثلاً کیا یہ لفظ اسم ہے یا فعل ہے؟ اسم ہے تو مشتق ہے یا جامد ہے؟ فعل ہے تو ماضی ہے یا مضارع' معلوم یا مجہول؟ اور اس کا باب کونسا ہے؟ الفاظ کے معانی میں ابواب و اوزان کی خاصیات کو ملحوظ رکھنے کے لئے ان امور کو جاننے کی تفسیر میں ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے مفسرین علم صرف کے ان قواعد و ضوابط کا ذکر بھی بقدر ضرورت اپنی تفاسیر میں کرتے ہیں۔

☆ ترکیبی احکام سے مراد وہ معانی ہیں جو الفاظ کی ہیئات ترکیبیہ یعنی جملوں اور فقروں سے معلوم ہوتے ہیں مثلاً کیا یہ جملہ انشائیہ ہے یا خبریہ؟ فعلیہ ہے یا اسمیہ؟ اس پر مؤکدات داخل ہوئے ہیں یا نہیں؟ حصر و قصر پر دلالت کرتا ہے یا نہیں؟ اور اس قسم کے دوسرے امور کا ملحوظ رکھنا جملے اور فقرے کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے اس لئے مفسرین علم نحو اور علم البیان کے اصول و ضوابط کا بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت ذکر کرتے رہتے ہیں۔

☆ ترکیبی حالت سے مراد الفاظ و کلمات کی تالیف و ترکیب کا مجموعی نظم ہے' سیاق و سباق کیسا ہے اور فحوائے کلام کیا ہے؟ اور اس کے اعتبار سے کونسے معانی و مفاہیم مراد لئے جاسکتے ہیں۔

☆ تتمات سے مراد ہے قرآنی آیات کا پس منظر۔ یعنی شان نزول' مجمل باتوں کی تفصیل اور نسخ یا عدم نسخ معلوم کرنا۔

ان تمام امور کا ذکر چونکہ مفسرین کرتے رہتے ہیں اس لئے اس تعریف میں ان کی طرف اشارات کر دیئے گئے ہیں لیکن بہترین اور واضح تعریف وہی جو زرقانی نے کی ہے۔

تاویل کے لغوی معنے

قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کے لئے لفظ تفسیر کے علاوہ "تاویل" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تفسیر کا نام رکھا ہے "جامع البیان عن تاویل آی القرآن" اور آیات کی تفسیر بالماثور کے لئے بھی ابن جریر تفسیر کی جگہ تاویل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

قاضی بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر کا نام "انوار التنزیل و اسرار التاویل" رکھا ہے۔ چونکہ یہ لفظ تفسیر کی جگہ بکثرت استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

"تاویل" باب تفعیل سے مصدر کا صیغہ ہے جس کا ماخذ "اَوْل" ہے جو آلَ یَؤُلُ کے باب سے مصدر کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں رُجُوع یعنی لوٹنا اور باب تفعیل چونکہ متعدی ہے اس لئے "تاویل" کے لغوی معنے ہیں لوٹانا۔

امام راغب اصفہانیؒ متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں :

اَلتَّاوِيلُ مِنَ الْاَوْلِ اَیِ الرُّجُوْعُ اِلَی الْاَصْلِ وَ مِنْهُ الْمَوْئِلُ لِلْمَوْضِعِ الَّذِیْ يُرْجَعُ اِلَيْهِ وَ ذَالِكَ هُوَ رَدُّ الشَّیْءِ اِلَی الْغَايَةِ الْمُرَادَةِ مِنْه.(۱)

"تاویل" لفظ "اول" سے ماخوذ ہے یعنی اپنی اصل کی طرف لوٹنا۔ اسی بنا پر "مَوْئِل" اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو اور تاویل کا معنی بھی کسی چیز کو اس کی اصل غرض وغایہ اور مقصد ومراد کی طرف لوٹانا ہے۔"

قاموس المحیط اور لسان العرب میں بھی آلَ يَؤُلُ اَوْلًا وَ مآلًا کے معنے رجوع لکھے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم میں تاویل کا لفظ ۷ امقامات پر آیا ہے اور مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے جن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

تاویل بمعنے تحریف :

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاء تَاوِيْلِه. (آل عمران ۷)

" جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ قرآن کے اس حصہ کے تابع ہو جاتے ہیں جو متشابہ ہے۔ گمراہی کی تلاش میں اور اس کی تحریف کی تلاش میں۔"

غلط نظریات و افکار رکھنے والے زائغین محکمات کو نظر انداز کر کے متشابہات میں تحریف کر کے اپنے باطل نظریات اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے اس مقام پر تاویل تحریف کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی لفظ کو اس کے صحیح مفہوم کی بجائے غلط مفہوم کی طرف لوٹانا۔

حافظ ابن کثیر وَابْتِغَاءَ تَاوِيْلِه کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں اَیْ تحریفه علی ما

---

(۱) المفردات فی غریب القرآن طبع کراچی ۱۹۶۱ء ص ۳

یُرِیْدُوْنَ یعنی "اپنی مرضی اور پسند کے مطابق معنی نکالنے کے لئے تحریف کرتے ہیں۔"

علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ جو محکم اور واضح آیت کے موافق نہ ہو بلکہ ان کی خواہش نفس کے موافق ہو۔

تفسیر کبیر اور تفسیر مدارک میں بھی اس جگہ تاویل کے یہی معنے بیان کئے ہیں۔

تاویل بمعنے تفسیر :

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ. "اور حال یہ ہے کہ نہیں جانتا اس کا صحیح مطلب کوئی بھی سوائے اللہ کے۔"

اس مقام پر تاویل کا لفظ تفسیر اور تعیین مراد کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی متشابہ کا حقیقی، قطعی اور نفس الامری مفہوم سوائے اللہ کے کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔

تاویل بمعنے انجام و نتیجہ :

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا. (النساء ۵۹)

"پس اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کو فیصلے کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا کرو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہی طریقہ بہتر ہے اور خوب تر ہے نتیجے کے اعتبار سے۔"

اس آیت میں تاویل کا لفظ عاقبت 'انجام اور نتیجے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تفسیر و توجیہ اور تشریح و توضیح کے معنوں کی اس سیاق و سباق میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے تنازعات کا تصفیہ قرآن و سنت کے احکام کے مطابق کرانے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا میں امن و راحت کی زندگی ملے گی اور آخرت میں نجات و سعادت نصیب ہو گی جس سے بہتر اور خوب تر نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَ اَوْفُوْا الْكَيْلَ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذَالِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاوِيْلًا.

(بنی اسرائیل ۳۵)

"اور پورا کرو پیمانہ اور سیدھے ترازو سے تولا کرو یہی طریقہ بہتر ہے اور خوب تر ہے نتیجے کے اعتبار سے۔"

یعنی ناپ تول میں دیانت وامانت اور صداقت کی پابندی کرنے کا نتیجہ دنیا میں بھی اچھا نکلے گا کہ لوگ اعتماد کریں گے اور کاروبار چل پڑے گا اور آخرت میں بھی خوب تر نکلے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سچے تاجر کو اللہ کی رحمت کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔

تاویل بمعنے حقیقت :

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاوِيْلَه، يَوْمَ يَاتِيْ تَاوِيْلُه، يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَ تْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ. (اعراف ۵۳)

"انتظار نہیں کرتے یہ لوگ مگر اس کی حقیقت ہی کا انتظار کرتے ہیں، جس روز اس کی حقیقت سامنے آجائے گی تو کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اس سے پہلے قرآن کو چھوڑ دیا تھا کہ بے شک ہمارے رب کے رسول سچا پیغام لے کر آئے تھے۔"

اس سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کے پاس ایسی کتاب پہنچا دی ہے جو ہدایت اور رحمت ہے اور کفار نے ضد وعناد اور جہالت وسفاہت کی وجہ سے اس سے انکار کر لیا ہے مگر قیامت کے روز جب اس کتاب کی صداقت اور حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی اور اس کا بیان کردہ وعدہ اور وعید کھل کر سامنے آجائے گا تو اس وقت یہ کفار بھی حقیقت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ اللہ کے رسولوں نے تو واقعی حق پیش کیا تھا مگر ہم نے اسے چھوڑ دیا تھا تو کیا اب کوئی ہے کہ ہماری سفارش کرے یا کیا ہم واپس دنیا میں جا سکتے ہیں

تاکہ پہلے اعمال کے خلاف دوسرے اچھے اعمال کر سکیں ؟

یہاں پر اگرچہ تاویل کے معنے انجام اور نتیجہ بھی مراد لئے جا سکتے ہیں لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں حقیقت نفس الامری اور مخبر عنہ یعنی وعد اور وعید کے وقوع کے معنے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ سورۃ یوسف کی آیت وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ میں بھی تاویل کے معنے حقیقت مراد لئے جا سکتے ہیں جیسا کہ زمخشریؒ متوفی ۵۳۸ھ نے کشاف میں لکھا ہے :

وَ يَجُوْزُ اَنْ يُّرَادَ بِتَاوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ مَعَانِيْ كُتُبِ اللّٰهِ وَ سُنَنِ الْاَنْبِيَاءِ وَ مَا غَمَضَ وَاشْتَبَهَ عِلْمُ النَّاسِ فِيْ اَغْرَاضِهَا وَ مَقَاصِدِهَا يُفَسِّرُهَا لَهُمْ وَ يَشْرَحُهَا.(۱)

”جائز ہے کہ اس جگہ تاویل الاحادیث سے اللہ کی کتابوں اور انبیاء کے سنن کے معانی و مفاہیم مراد ہوں' اور ان چیزوں کے اغراض و مقاصد کی تفسیر و تشریح مراد ہو جن کے بارے میں لوگوں کو اشتباہ و ابہام پیش آتا ہو۔“

احادیث کا مفہوم بڑا وسیع ہے صرف خوابوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اس میں کتب الٰہیہ اور سنن انبیاء بھی شامل ہیں' مختلف قسم کے مسائل و نوازل بھی شامل ہیں اور خوابیں بھی اس میں داخل ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ ”اللہ سمجھا دے گا تمہیں بہت سی باتوں کی حقیقت“

سورۃ یوسف کی آیت وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ میں بھی احادیث سے صرف خوابیں مراد نہیں ہیں بلکہ مختلف امور میں یوسف علیہ السلام کی ”حقیقت شناسی“ اور ”سخن فہمی“ کی خداداد صلاحیت و فراست کی طرف اشارہ ہے جس میں خوابوں کی تعبیر بھی شامل ہے۔

(۱) الكشاف عن حقائق التنزيل و عيون الاقاويل فى وجوه التاويل يوسف۶

تاویل بمعنے خوابوں کی تعبیر :

سورۃ یوسف کی آیات نمبر ۳۶، ۷، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۱۰۰ میں لفظ تاویل سے مراد خوابوں کی تعبیر ہے جو دراصل خوابوں کے مآل اور نتیجے کی تشریح ہوتی ہے۔

تاویل بمعنے توجیہ :

موسیٰ وخضر کے قصے میں خضر علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے کہ :

سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا. (الکہف ۷۸)

"میں ابھی بتا دیتا ہوں تم کو ان کاموں کی توجیہ اور مصلحت جن پر تم صبر نہیں کر سکے تھے۔"

ذَالِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا. (الکہف ۸۲)

"یہ ہے توجیہ اور مصلحت ان کاموں کی جن پر تم صبر نہیں کر سکے تھے۔"

خضر علیہ السلام نے سفر کے دوران تین کام ایسے کیے تھے جن کی مصلحت اور توجیہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالی نے نہیں بتائی تھی مگر خضر علیہ السلام کو ان کاموں کا حکم بھی دیا تھا اور ان کی توجیہ و مصلحت بھی اسے بتادی تھی۔ ان دونوں آیتوں میں تاویل کا لفظ توجیہ و مصلحت اور باعث وسبب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ تاویل کے جو معانی بیان ہوئے ہیں ان سب میں اس لفظ کے اصل لغوی معنے ملحوظ رکھے گئے ہیں یعنی اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ تمام اطلاقات میں لوٹانے اور راجع کرنے کا مفہوم پیش نظر رکھا گیا ہے۔

تاویل کے اصطلاحی معنے

تفسیر کے لغوی معنے ہیں وضاحت کرنا اور پردہ اٹھانا اور تاویل کے لغوی معنے ہیں لوٹانا اور ظاہر ہے کہ کسی کلام کے مفہوم سے پردہ اٹھانے اور اسے اپنے اصل مقصد و مراد کی طرف لوٹانے کا مطلب ایک ہی نکلتا ہے یعنی اسے سمجھنا اور سمجھانا۔ قرآن کی تفسیر اور تاویل سے مراد بھی اس کا فہم اور تفہیم ہے 'اس اعتبار سے "فہم قرآن" اور "تفہیم قرآن" کو تفسیر قرآن بھی کہا جا سکتا ہے اور تاویل بھی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر یہ تفسیر و تاویل قطعی نصوص اور واضح دلائل پر مبنی ہو اور اس پر امت مسلمہ کے مفسرین کا اجماع بھی چلا آرہا ہو تو وہ قطعی تفسیر ہو گی اور اس سے متصادم تفسیر و تاویل کرنا ضلالت اور تحریف قرار دی جائے گی۔ اور جو تفسیر و تاویل اجتہادی اور استنباطی ہو اور اس پر امت مسلمہ کے فقہاء و مجتہدین کا اتفاق رائے بھی نہ ہو سکا ہو تو وہ ظنی تفسیر ہو گی اور اس سے اختلاف رائے کر کے دوسری توجیہ و تاویل کرنا نہ تحریف ہو گی اور نہ ضلالت و گمراہی ہو گی بشرطیکہ اس کا مقصد تلاش حق ہو نفسانی خواہشات اور شخصی اغراض کی تکمیل نہ ہو اور دونوں تاویلوں پر فہم و تفہیم اور تلاش حق کی کوشش کا اجر موعود ملے گا۔

مشہور مفسر معمر بن مثنی تیمیؒ متوفی ۲۱۰ھ کی رائے یہی ہے کہ تفسیر اور تاویل دونوں مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں :

اَلتَّاوِيْلُ التَّفْسِيْرُ وَالْمَرْجِعُ : مَصِيْرُهٗ (۱)

"تاویل کے معنے تفسیر اور مرجع ہیں یعنی وہ مفہوم جس کی طرف لفظ کو لوٹایا جاتا ہو۔"

سورۃ النساء کی آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ کی تشریح میں لکھتے ہیں :

اَیۡ بَيَانَهٗ وَمَعَانِيَهٗ وَتَفْسِيْرَهٗ .(۲)

(۱) مجاز القرآن لابی عبیدہ طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۱ ص۸۶ ج۱ آل عمران

(۲) مجاز القرآن ص۲۱۶ ج۱ النساء۵۳

"یعنی اس کے بیان، معنوں اور تفسیر کا انتظار کرتے ہیں۔"

متقدمین مفسرین بھی بالعموم تفسیر اور تاویل کو ہم معنے سمجھتے ہیں اور ان دونوں لفظوں کو الفاظ مترادفہ کے طور پر بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ امام المفسرین ابن جریر طبری کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ وہ آیات کی تفسیر میں احادیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین سند کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی وجہ سے "تفسیر بالماثور" کا بنیادی ماخذ ان کی تفسیر ہے جو "ام التفاسیر" کہلاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ آیات کی تشریح و توضیح کے لئے تاویل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تاویل بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، تاویل الرحمن الرحیم، تاویل فاتحۃ الکتاب، تاویل لفظ العالمین اور تاویل مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ وغیرہ عنوانات کے تحت امام موصوف نے لغات بھی بیان کی ہیں اور آثار بھی نقل کئے ہیں اور اس قسم کے عنوانات تفسیر ابن جریر کے تقریباً ہر صفحے پر موجود ہیں جن سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ امام المفسرین کے نزدیک تفسیر بالروایۃ پر بھی تاویل کا اطلاق جائز ہے۔ تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کرنے والوں کے متعدد اقوال کتابوں میں نقل ہوئے ہیں جن میں سے نسبتاً بہتر قول یہ ہے کہ روایات و آثار کی روشنی میں قرآن کی تشریح کرنے کو تفسیر کہتے ہیں اور درایت و تدبر کے ذریعے تشریح کرنے کو تاویل کہتے ہیں۔

یہ فرق بعض مفسرین نے بیان کیا ہے لیکن متقدمین کی اکثریت دونوں کو مترادف اور ہم معنی قرار دیتے ہیں۔

اہل سنت والجماعۃ کے اصول کے مطابق بہترین طریقہء تفسیر

اہل سنت والجماعت مسلمانوں کے اس سواد اعظم کا نام ہے جو عقیدے اور عمل دونوں میں قرآن و سنت کے منصوص احکام اور جماعت صحابہ کے اجماعی فیصلوں کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں خواہ عقل انسانی ان کا ادراک کر سکتی ہو یا نہ کر سکتی ہو۔ اگر چہ عقل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اللہ تعالی نے عقل سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ نیز عقل سلیم اور نقل صریح و صحیح کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ عقول میں تفاوت بھی ہے اور یہ غلطی اور سہو و خطا سے معصوم بھی نہیں ہیں۔ اس لئے اہل سنت والجماعت کے نزدیک حل و حرمت' حسن و قبح اور منفعت و مضرت کا معیار "عقل انسانی" نہیں ہے بلکہ "وحی خداوندی" ہے اور جو بات وحی سے یعنی قرآن و سنت سے ثابت ہو جائے اس پر عقل کی بنیاد پر تنقید کرنا جائز نہیں ہے۔ کسی بات کے ثُبُوت مِنَ الْكِتَابِ والسُّنَّة میں تو بحث و تحقیق ہو سکتی ہے اور اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے لیکن ثبوت کے بعد عقل کے عدم ادراک کی وجہ سے اسے تسلیم نہ کرنا در اصل اللہ کی حاکمیت سے انکار کرنا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ فرداً فرداً اگر چہ معصوم نہیں ہین اور ان میں سے کسی ایک کی رائے سے اختلاف کرنا اور دوسرے کی رائے سے اتفاق کرنا ممنوع نہیں ہے لیکن جس بات پر "جماعت صحابہ" کا اجماع ثابت ہو چکا ہو اس کی حقانیت اور صداقت کی شہادت خود قرآن و سنت نے دی ہے' اس لئے اہل سنت کے نزدیک جماعت صحابہ کے اجماع سے جو بات ثابت ہو جائے اس سے اختلاف کرنا جائز نہیں ہے اہل سنت کو رسول اللہ ﷺ نے جنتی گروہ قرار دیا ہے اور اس کی نشانی یہ بتائی ہے کہ وہ ہر معاملے میں سنت رسول اور سنت اصحاب رسول کا پابند ہوگا اور اس کے مقابلے میں اہل بدعت کو دوزخی فرقے کہا ہے جو سنت رسول اور جماعت صحابہ کے اجماعی

فیصلوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ آزاد اجتہاد آرائی اور عقل نمائی ان کا اصول ہے جیسے روافض، خوارج، معتزلہ، مرجئہ اور دور جدید کے نام نہاد "روشن خیال" متجددین و منحرفین جو قرآن کی تفسیر میں بھی اصول تفسیر کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے اور بحث و تحقیق میں بھی اصول اجتہاد کا التزام نہیں کرتے بلکہ اصول دین سے آزاد تفسیر اور اجتہاد کے قائل ہیں۔

اہل سنت اور اہل جدت کے درمیان جس طرح فکر و عمل کے دوسرے امور میں بہت بڑا تفاوت ہے اسی طرح قرآن کی تفسیر و تاویل کے اصول و منہج میں بھی بنیادی فرق ہے۔ ہم الحمد للہ اہل سنت والجماعت کے اصول کے پابند ہیں اور ان کے التزام کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور قرآن کی تفسیر میں بھی اہل سنت کے منہج کو "احسن المناہج" تسلیم کرتے ہیں اس لئے ان کے منہج کے مطابق طریقہ تفسیر اور اصول تفسیر کی تنقیح و توضیح پیش خدمت ہے۔

﴿تفسیر القرآن بالقرآن﴾

قرآن کریم کلام اللہ ہے اس لئے اس کی آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسرے کی تصدیق و تائید اور تفسیر و تشریح کرتی ہیں الا یہ کہ ایک آیت کا دوسری آیت کے لئے ناسخ ہونا ثابت ہو جائے۔ اور نسخ کی صورت میں بھی حقیقی تضاد نہیں ہوتا کیونکہ ناسخ دراصل منسوخ کی مدت عمل کے اختتام کا بیان اور اعلان ہوتا ہے جیسا کہ نسخ کے باب میں تفصیل کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے۔ نسخ کے علاوہ پورا قرآن ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتا ہے اور اس کی آیات ایک دوسرے کی تشریح و توضیح کرتی ہیں۔ اگر ایک جگہ ابہام ہو تو دوسری جگہ اس کی وضاحت ہوتی ہے اور اگر ایک جگہ اجمال ہو تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے، درس و تدریس اور فہم و تفہیم کے دوران اگر مضامین کے نظائر کو پیش نظر رکھا جائے تو فہم و تفہیم میں بہت کم اشکالات پیش آئیں گے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کی چند مثالیں

(۱) سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم بتانے اور اس پر چلانے کی دعا کا ذکر ہوا ہے' یہ سیدھا راستہ کونسا ہے؟ اس کی وضاحت درج ذیل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ○

(آل عمران ۵۱' مریم ۳۶)

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ○ (الزخرف ٦٤)

"اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اسی کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔"

یہ عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو اللہ نے نقل کیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم توحید کا راستہ ہے یعنی اللہ کی عبادت کا التزام اور غیر اللہ کی عبادت سے اجتناب سیدھا راستہ ہے اور مشرکین کے سارے راستے ٹیڑھے ہیں۔

سورۃ یٰس میں فرمایا گیا ہے کہ :

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰا بَنِیْ آدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ○ وَ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ○ (یٰس ٦٠۔ ٦١)

"اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمہارے پاس وصیت نہیں بھیجی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرو یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور میری ہی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔"

یعنی شیطان کی عبادت نہ کرنا اور اللہ ہی کی عبادت کرنا صراط مستقیم ہے۔

سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۶ میں اسلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ :

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِیْمًا○

"یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے۔"

اور اسی سورت کی آیت ۱۶۱ میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

قُلْ اِنَّنِیْ هَدَانِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ○

"کہو کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ بتا دیا ہے جو ایک معتدل دین ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے جو توحید پر قائم تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔"

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں قرآن کے راستے کو سب سے زیادہ سیدھا راستہ کہا گیا ہے :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ○ (بنی اسرائیل ۹)

"بے شک یہ عظیم الشان قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے۔"

سنن ترمذی میں حضرت علیؓ بن ابی طالب سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طریقوں سے مروی ہے کہ :

وَ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ وَ هُوَ الذِّكْرُ الْحَكِیْمُ وَ هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ.

"یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے' یہی حکمت والا ذکر ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔"

قرآن کی ان آیات سے صراط مستقیم کا مفہوم کھل کر بغیر کسی ابہام کے سامنے آجاتا ہے کہ یہ توحید کا راستہ ہے' اسلام کا راستہ ہے اور قرآن کا راستہ ہے اور ان تینوں کا مفہوم ایک ہے اس لئے کہ اسلام کی عمارت توحید پر اٹھائی گئی ہے اور قرآن کا مرکزی مضمون بھی توحید ہے۔

(۲) صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ○

"راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہے۔"

اس جگہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کون لوگ ہیں اور وہ نعمت کیا ہے جو ان پر کی گئی ہے ؟

اس کی وضاحت سورۃ النساء میں اس طرح کی گئی ہے کہ :

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًاo ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًاo (النساء ٦٩ . ٧٠)

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے جو انبیاء ہیں' سچے مومن ہیں' شہید ہیں اور صالحین ہیں اور یہ اچھے رفیق ہیں اور یہ رفاقت اللہ کا فضل ہے اور کافی ہے اللہ جاننے والا۔"

☆ انبیاء وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا تھا' قرب الٰہی میں یہ درجہ علیا پر فائز تھے اور ہر قسم کے گناہوں سے معصوم تھے' ان پر اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی انعام کیا تھا اس سے مراد ہے منصب رسالت' نور نبوت اور علم و ہدایت جو ان کو کسب و محنت اور سعی و جہد کے بغیر بخشی گئی تھی۔

☆ صدیقین وہ لوگ ہیں جو ایمان و عمل میں سچے اور کھرے مؤمن ہیں' صدق و تصدیق یعنی سچائی اور راستبازی اور حق پسندی میں مرتبہ کمال پر فائز ہیں' انبیاء علیہم السلام کے سچے تابعدار اور وفادار ہیں اور ہر قسم کی ابتلاء و آزمائش میں صبر و ثبات اور استقامت پر قائم رہتے ہیں۔ ان پر اللہ کا انعام یہ ہے کہ ان کو ایمان و عمل میں صدق و صفا اور ہدایت و استقامت کی بے بہا دولت مرحمت کی گئی ہے۔

☆ شہداء وہ لوگ ہیں جو اللہ و رسول کی اطاعت اور دین کے لئے قربانیوں سے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں دین کی محبت ہر چیز سے زیادہ ہے اور ان کو اپنا ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا بے حد عزیز ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کی محبت کا یہ مرتبہ و مقام ان پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔

☆ صالحین سے مراد دین و شریعت کے وہ پابند مسلمان ہیں جو اگرچہ صدیقین اور

شہداء کے مقام پر تو فائز نہیں ہوتے لیکن فسق و فجور میں بھی مبتلا نہیں ہوتے ان پر اللہ کا انعام یہ ہے کہ ان کو شریعت کے التزام اور معصیت سے اجتناب کی توفیق بخشی گئی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے اندر تو یہ چاروں صفات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں لیکن امت کے افراد میں صدیقیت' شہادت اور صالحیت کی صفات فرق مراتب کے ساتھ موجود ہوتی ہیں جن کی صحبت اور رفاقت کو اللہ نے اپنا فضل قرار دیا ہے اور ان کو اچھے رفقاء کا نام دیا ہے' یہی وہ انعام یافتہ (مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ) لوگ ہیں جن کے راستے کو سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ جنت میں ان کے منازل اور مساکن اگرچہ اپنے مراتب کے مطابق الگ الگ ہوں گے لیکن جنت کی راحت و آسائش سے سب کے سب مستفید ہوں گے اور باہمی ملاقاتوں کے مواقع بھی ان کو ملتے رہیں گے۔

(۳) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

"جن پر غضب نہیں ہوا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے بھی نہیں ہیں۔"

اللہ کا قہر و غضب ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جو حق کو جانتے تو ہوں مگر مانتے نہ ہوں اور حسد و عناد کی وجہ سے جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے ہوں ایسے لوگوں کو مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ کہتے ہیں اور ضَآلِّيْن وہ لوگ ہیں جو ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو چکے ہوں۔ یعنی دوسرے گمراہوں کی تقلید کی وجہ سے راہ راست سے بھٹک گئے ہوں۔ ایسے لوگ بھی اللہ کی لعنت اور عذاب کے مستحق ہوتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے عقل و فہم سے کام لینے یا انبیاء کا اتباع کرنے کی بجائے مشرکانہ تقلید کا راستہ اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ نہیں بتایا گیا کہ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ کون ہیں؟ اور ضَآلِّيْن کون ہیں؟ مگر دوسری آیات میں بتایا گیا ہے کہ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور ضَآلِّيْن سے مراد نصاریٰ ہیں۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۸۳ سے لے کر آیت ۸۹ تک یہود کی عہد شکنی' باہمی لڑائی' استکبار' نفس پرستی اور علم و عرفان کے باوجود نبوت محمدی اور کتاب الٰہی سے انکار کا ذکر کیا گیا ہے اور

اس کے بعد آیت ۹۰ میں فرمایا گیا ہے کہ :

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۝ (البقرة ۹۰)

"بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا ہے جو ان کا کفر ہے اس کتاب سے جسے اللہ نے نازل کیا ہے' صرف ضد و حسد کی وجہ سے اس پر کہ اللہ نے نازل کیا اپنا فضل (وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا۔ پس وہ گرفتار ہو گئے غضب پر غضب میں اور کافروں کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔"

اس آیت میں یہود کی مغضوبیت اور ذلت و رسوائی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے حسد و عناد اور نسلی عصبیت کی وجہ سے نبوت محمدی سے انکار کیا ہے ورنہ ان کو آپ کی رسالت اور صداقت کا علم و عرفان حاصل ہو چکا تھا اور ایسے ہی لوگوں پر اللہ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔

غضب بر غضب کی وجہ تفسیر بیضاوی اور روح المعانی میں یہ بیان ہوئی ہے کہ :

لِلْكُفْرِ وَالْحَسَدِ.

یعنی ایک غضب ان کے کفر پر ہے اور دوسرا ان کے حسد پر' اور دوسری توجیہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں یہ بیان کی ہے کہ :

اَلْمُرَادُ بِهٖ تَاكِيْدُ الْغَضَبِ وَ تَكْثِيْرُهٗ.

یعنی "غضب بالائے غضب سے مراد غضب شدید اور غضب کثیر ہے۔"

اس آیت سے اور اس مضمون کی متعدد دوسری آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں۔

اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیت ۷۲ سے لے کر آیت ۷۶ تک عیسیٰ علیہ السلام کے

بارے میں نصاریٰ کے عقیدہ الوہیت اور عقیدہ تثلیث کی تردید کی گئی ہے اور اسے کفر قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد آیت ۷۷ میں کہا گیا ہے کہ :

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ أَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ (المائدہ ۷۷)

"کہو اے کتاب والو! اپنے دین میں حق کے خلاف حد سے آگے نہ بڑھو' اور ان کی خواہشات پر نہ چلو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور جو سیدھی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔"

اس سیاق و سباق میں کتاب سے انجیل مراد ہے اور اہل کتاب سے نصاریٰ مراد ہیں جنہوں نے پولس "سینٹ پال" اور مصری یونانی اور رومی مشرکین کی اندھی تقلید کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو مسخ کر لیا ہے۔ الوہیت' ابنیت اور تثلیث کے عقائد کو اپنا لیا ہے' راہ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی تقلید میں گمراہ ہو چکے ہیں اور سیدھی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔

اس آیت سے وضاحت و صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ ضالّین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ مسند احمد و ترمذی میں عدی بن حاتمؓ کی ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ مَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور ضالّین سے مراد نصاریٰ ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مَغْضُوْبِيَّت اور ضلالت یہود و نصاریٰ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ کا مصداق اول یہود ہیں اور جو لوگ یہودیوں کی طرح جان بوجھ کر محض حسد و عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہوں وہ مَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ میں شامل ہیں اور جو لوگ نصاریٰ کی طرح گمراہوں کی تقلید کی وجہ سے انبیاء کے راستے سے بھٹک چکے ہوں وہ ضالین میں شامل ہیں اور جو لوگ حق کو جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں' کسی کے ساتھ حسد و عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت بھی نہیں کرتے اور

حق کے مقابلے میں کسی کی تقلید بھی نہیں وہ مُنۡعَمۡ عَلَيۡهِمۡ ہیں۔ جن کی چار قسمیں ہیں۔ انبیاء' صدیقین' شہدا اور صالحین جن پر نہ اللہ کا غضب ہوا ہے اور نہ وہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں بلکہ صراط مستقیم پر استقامت کے ساتھ گامزن ہیں اور یہی استقامت وہ مخصوص انعام ہے جو ان پر کیا گیا ہے۔

(٤) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَ عَلٰى سَمۡعِهِمۡ وَ عَلٰى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ۝ (البقرہ ۷)

"مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر' اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔"

اس آیت کے فہم و تفہیم میں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ کیا یہ مہر اور پردے ان کی فطرت میں شامل ہیں؟ اگر یہ دونوں فطری ہیں تو پھر اس آیت کا دوسری آیت سے تضاد لازم آتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا۝

"اللہ کے اس دین کو قبول کر لو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری طور پر ہر انسان کی اندر ایمان و اسلام کی صلاحیت و قابلیت موجود ہوتی ہے اور پیدائش کے وقت نہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگی ہوتی ہے اور نہ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔

صحیح حدیث میں بھی آیا ہے کہ ہر بچہ فطرت یعنی دین اسلام کی صلاحیت و قابلیت پر پیدا ہوتا ہے بعد میں اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسا کہ جانور کا بچہ پیدائش کے وقت سلیم الاعضاء ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی آیات میں باہمی اختلاف و تضاد نہیں ہو سکتا اور حدیث صحیح اور آیت میں بھی حقیقی تعارض نہیں ہو سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مہر اور پردے فطری اور پیدائشی نہیں ہیں تو پھر ان کا وقت کونسا ہے؟ اور ان کا سبب کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اور اس اشکال کا حل دوسری آیات میں موجود ہے کہ جب کفار نے حق واضح ہو جانے اور حق کا علم و عرفان حاصل ہو جانے کے باوجود حسد و عناد اور اتباع ھویٰ کی وجہ سے کفر کی روش اختیار کی اور جان بوجھ کر حق کی مخالفت اور نفس و ھویٰ کی پیروی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی سزا اور نتیجے کے طور پر ان کے دلوں اور کانوں پر مہریں لگا کر اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال کر ان کو بہرے گونگے اور اندھے بنا دیا جو نہ حق سنتے ہیں نہ حق بولتے ہیں اور نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں۔ جس طرح زہر کھانے یا آگ میں کودنے یا اپنے آپ کو گولی مارنے کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ جان لے لیتا ہے اور موت آجاتی ہے لیکن اس کا سبب چونکہ انسان کا اپنا عمل ہے اس لئے یہ خودکشی شمار ہوتی ہے اور خودکشی کرنے والا عذاب کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہ مضمون درج ذیل قسم کی آیات سے ماخوذ ہے:

(۱) بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ اِلَّا قَلِيْلًا٥

"بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگا دی ہے پس یہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا سا۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ مہر فطری اور پیدائشی نہیں ہے بلکہ کفر کی سزا اور نتیجے کے طور پر لگا دی گئی ہے اور ایمان قلیل سے مراد یہ ہے کہ بعض انبیاء کو مانتے ہیں اور بعض کو حسد و عناد کی وجہ سے نہیں مانتے اور ایسا ایمان مقبول نہیں ہے۔

(۲) كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ٥ (المطففين ١٤)

"سچی بات یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ چڑھ گیا ہے۔"

اس آیت سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ یہ زنگ اور مہر پیدائشی نہیں ہے بلکہ ان کے

اپنے اختیاری اعمال سیئہ کی سزا ہے۔ اگر یہ ان اعمال سے توبہ کر کے اعمال صالحہ شروع کر دیں تو زنگ ختم ہو جائے گا اور دل صاف و شفاف ہو جائیں گے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہو جاتا ہے اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو یہ داغ ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ اس گناہ پر اصرار کرتا ہے تو پورے کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔" امام نووی فرماتے ہیں کہ دل کی سیاہی اور تاریکی کی علامت یہ ہے کہ بھلائی اور نیکی کی جانب رغبت اور ذوق و شوق کم ہو جاتا ہے اور برائی کرنے کا ذوق و شوق بڑھ جاتا ہے۔

(۳) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۝ (الصف ۵)

"اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا اے میری قوم! تم مجھے کیوں اذیتیں پہنچاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، پس جب یہ لوگ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھے کر دیا اور اللہ فاسقوں کو توفیق نہیں دیتا۔"

اس آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ اللہ کا رسول ہے لیکن اس علم و عرفان کے باوجود انہوں نے اذیتیں پہنچائیں اور کج روی اختیار کی تو اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں کو ٹیڑھے کر دیا یعنی ان پر مہر لگا دی۔ اس لئے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر فسق و فجور کا راستہ اختیار کرنے والوں کو توفیق نہیں دیتا اور سیدھی راہ چلنے پر مجبور نہیں کرتا۔ یعنی ان کے قلوب کا یہ زیغ فطری اور پیدائشی نہیں تھا بلکہ ان کے اختیاری زیغ کا نتیجہ تھا اور دیدہ و دانستہ ایذاء رسانیوں اور نافرمانیوں کی سزا تھی۔

(٤) اَفَرَئَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝ (ال[illegible])

"پس کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور اللہ نے اسے اس کے علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے پس ایسے شخص کو اللہ کے سوا کون سیدھی راہ چلا سکتا ہے؟ تو کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟"

اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ علم و عرفان اور سمجھ بوجھ کے باوجود جو شخص بندہ حرص و ہوی بن جاتا ہے اور دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالی اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں جب ہم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پر غور و فکر اور تدبر کرتے ہیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ مہر اور پردہ فطری نہیں ہے بلکہ جان بوجھ کر حق سے انکار کی سزا ہے اور اس کا نتیجہ ہے۔

(۵) فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ٥ (البقرہ ۲۳)

اس جگہ مِثْلِهٖ کی ضمیر کا مرجع مَا نَزَّلْنَا بھی بن سکتا ہے اور عَبْدِنَا بھی بن سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ محمد ﷺ جیسے امی شخص کی بنائی ہوئی ایک سورت لے آؤ۔ لیکن سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۸۸ میں بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ کا لفظ آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی مثال پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا خواہ امی پیش کرے یا غیر امی پیش کرے۔ تو معلوم ہوا کہ سورہ بقرہ میں مثلہ کا مرجع مَا نَزَّلْنَا ہے اور عَبْدِنَا کو مرجع قرار دینا عربیت کے اعتبار سے جائز ہونے کے باوجود صحیح نہیں ہے اس لئے کہ دوسری آیت میں لفظ قرآن کی تصریح موجود ہے۔

(۶) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ٥ (البقرہ ۳۴)

"اور جب کہا تھا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کے سامنے تو سب نے سجدہ کر لیا تھا

مگر ابلیس نے نہیں کیا تھا۔"

اس آیت میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ کیا ابلیس فرشتہ تھا یا اصل میں جنی تھا مگر فرشتوں کی جماعت میں موجود تھا اور سجدے کا حکم اسے بھی دیا گیا تھا۔ مگر یہ ابہام سورہ کہف کی آیت ۵۰ نے ختم کر دیا ہے جس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ :

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ

"ابلیس جنات میں سے تھا اس لئے اس نے اپنے رب کے حکم سے نافرمانی کی تھی۔

اس جگہ پر فَفَسَقَ کی فاء سببیّت کے لئے ہے یعنی چونکہ یہ جنات میں سے تھا جو آگ سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے اس نے اپنے مادہ تخلیق پر فخر و غرور کی وجہ سے اللہ کی حکم کی نافرمانی کی تھی اگر یہ فرشتہ ہوتا تو نافرمانی نہ کرتا اس لئے کہ فرشتے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ

ابلیس نے خود کہا تھا کہ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۔

"تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔"

ان آیات سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا اور اختلاف جنس کے باوجود فرشتوں میں شامل تھا اور فرشتوں کو سجدے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کو بھی ہوا گیا تھا مگر اس نے بغاوت کر لی اور سجدہ نہ کیا۔

عبداللہ بن عباسؓ اور بعض تابعین سے جو روایات تفاسیر میں نقل ہوئی ہیں کہ ابلیس فرشتوں کے اس قبیلے میں سے تھا جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے ان کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ :

وَقَدْ رُوِىَ فِىْ هٰذَا آثَارٌ كَثِيْرَةٌ عَنِ السَّلَفِ وَ غَالِبُهَا مِنَ الْاِسْرَائِيْلِيَّاتِ الَّتِىْ تُنْقَلُ لِيُنْظَرَ فِيْهَا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَالِ كَثِيْرٍ مِّنْهَا وَ مِنْهَا مَا يُقْطَعُ بِكِذْبِهٖ لِمُخَالَفَتِهٖ الْحَقَّ الَّذِىْ بِاَيْدِيْنَا وَ فِى الْقُرْآنِ غُنْيَةٌ عَنْ كُلِّ مَا عَدَاهُ مِنَ الْاَخْبَارِ الْمُتَقَدِّمَةِ لِاَنَّهَا لَا تَكَادُ

تَخلُوْا مِنْ تَبْدِيْلِ زِيَادَةٍ وَ نُقْصَانٍ.(۱)

"اس بارے میں سلف سے بہت زیادہ آثار نقل ہوئے ہیں' جن میں سے اکثر ان اسرائیلی روایات میں سے ہیں جو غور و فکر کے لئے نقل کی جاتی ہیں۔ (استدلال کے لئے نقل نہیں کی جاتیں) ان میں سے بہت سی روایات کا حال اللہ ہی جانتا ہے' ان میں سے بعض وہ روایات بھی ہیں جن کا جھوٹ ہونا قطعی ہے اس لئے کہ یہ اس حق کی مخالفت کرتی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے (یعنی قرآن کی) قرآن میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ ہم کو گذشتہ سطور میں نقل کردہ ان روایات سے مستغنی کر دیتی ہے جو قرآن کے بیان کے علاوہ ہیں۔ (یعنی جنی ہونے کے علاوہ دوسری روایات) اس لئے کہ یہ روایات تحریف و تبدیل اور کمی بیشی سے خالی نہیں ہیں۔"

قرآن کے اسی واضح اور صریح بیان کی بنا پر حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ :

مَا کَانَ اِبْلِیْسُ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ طَرْفَۃَ عَیْنٍ قَطُّ وَ اِنَّہٗ لَاَصْلُ الْجِنِّ کَمَا اَنَّ آدَمَ اَصْلُ الْاِنْسِ.(۲)

"ابلیس آنکھ کی جھپک کی مقدار تک بھی کبھی فرشتہ نہ رہا بلکہ یہ جنات کا اصل ہے جس طرح کہ آدم علیہ السلام انسانوں کا اصل ہے۔"

(۱) تفسیر ابن کثیر الکہف ۵۰

(۲) تفسیر ابن جریر البقرہ ۳۴

﴿آدم علیہ السلام کی لغزش﴾

(۷)فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا فِیْهِ. (البقرہ۳٦)

"پس پھسلا دیا شیطان نے ان دونوں کو اور نکلوا دیا ان کو اس جنت سے جس میں وہ دونوں رہتے تھے۔"

اِزْلَالَ زَلَّة سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں :

اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَیْرِ قَصْدِهٖ. (راغب)

"یعنی بغیر ارادے کے پاؤں کا پھسل جانا۔"

اور ازلال کے معنے ہیں پھسلانا اور بھکانا۔ اس جگہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطَانُ سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ آدم اور حوا دونوں سے شیطان کے بھکانے اور پھسلانے کی وجہ سے نافرمانی کے ارادے کے بغیر ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کی خطا سرزد ہو گئی تھی لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ شیطان کے بھکانے اور پھسلانے کی نوعیت کیا تھی؟ اور اس نے مکاری اور فریب کاری کا کونسا طریقہ اختیار کیا تھا؟

اس ابہام کی وضاحت سورہ اعراف اور سورہ طٰہ میں اس طرح کی گئی ہے :

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطَانُ لِیُبْدِیَ لَهُمَا مَاوٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهَاکُمَا رَبُّکُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَا مَلَکَیْنِ اَوْ تَکُوْنَا مِنَ الْخَالِدِیْنَo وَ قَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰاصِحِیْنَo فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍo (اعراف ۲۰۔۲۱۔۲۲)

"پس وسوسہ ڈالا دونوں کے دلوں میں شیطان نے تاکہ کھول دے دونوں کے سامنے ان کے وہ اعضاء جو چھپے ہوئے تھے ان سے 'اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت کے پھل سے منع نہیں کیا تھا مگر صرف اس وجہ سے منع کیا تھا کہ تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے یا ہو جاؤ گے تم ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے 'اور قسم کھالی اس نے دونوں کے سامنے کہ یقیناً

میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں' پس نیچے لے آیا دونوں کو اپنی فریب کاری سے۔"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ شیطان نے اللہ کے نام کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اس درخت کی خاصیت یہ ہے کہ جو بھی اس کا پھل کھالیتا ہے وہ یا تو فرشتہ بن جاتا ہے یا پھر اسے حیات جاودانی مل جاتی ہے اور میں تم کو صرف خیر خواہی کے جذبے کے تحت مشورہ دیتا ہوں کہ یہ پھل کھالو تاکہ تم کو ملکیت یا ابدیت کی دولت مل جائے' یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان نے جب یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ اللہ نے اس درخت سے تم دونوں کو روکا تھا مگر روکنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے کھانے میں تمہارا نقصان ہے بلکہ اس کے کھانے میں تمہارا فائدہ ہے تو آدم و حواء نے اس سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ آخر مفید چیز سے ہم کو ہمارے رب نے کیوں منع کیا ہے؟ یا انہوں نے سوال کئے بغیر از خود اپنے دل میں کیوں نہیں سوچا تھا کہ جب یہ درخت مضر نہیں ہے بلکہ مفید ہے تو اس کے کھانے سے ہم کیوں روکا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان نے اس سوال کے جواب میں یا اس شبہے کے ازالے میں کہا ہوگا کہ ابتداء میں تمہارے اندر ملکیت اور حیات ابدی کی استعداد موجود نہیں تھی اور اس وقت کے حالات کے ساتھ ملکیت اور حیوۃ جاودانی کی مناسبت نہیں تھی اس لئے کچھ مدت کے لئے تم کو اس درخت کا پھل کھانے سے روکا گیا تھا اب چونکہ تمہاری استعداد میں ترقی آگئی ہے' حالات تبدیل ہو گئے ہیں اس لئے ممانعت کا حکم باقی نہیں رہا۔ یعنی اس مکار اور فریب کار نے اللہ کے نام پر قسم کھا کر کہا ہوگا کہ یہ نہی کچھ وقت کے لئے تھی ہمیشہ کے لئے نہیں تھی۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ قصص و واقعات کے بیان میں تمام جزئیات و تفصیلات کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ضروری اور بنیادی امور کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطان نے آدم و حواء کے سامنے اور بھی کئی باتیں کی ہوں گی جن کا ذکر قرآن نے ضروری نہیں سمجھا۔ سورہ طہ میں اس کے مکر و فریب کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے کہ:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا

يَبْلٰى. (طٰهٰ ۱۲۰)

"پس وسوسہ ڈالا آدم کو شیطان نے اور کہا اے آدم کیا میں تم کو بتادوں ابدی زندگی کا درخت؟ اور اس بادشاہی کا درخت جو پرانی نہیں ہوتی۔"

یعنی اس درخت کی خاصیت یہ ہے کہ جو بھی اس کا پھل کھائے گا اسے ایسی زندگی مل جائے گی جس پر زوال نہیں آئے گا اور ایسی بادشاہی مل جائے گی جس پر کمزوری نہیں آئے گی۔

باقی رہا یہ سوال کہ شیطان کا یہ وسوسہ "القاء فی القلب" کی صورت میں تھا یا یہ "بالمشافہ مکالمے" کی شکل میں تھا؟ مفسرین نے دونوں کا ذکر کیا ہے اور احتمال کے درجے میں دونوں صورتوں کا جواز موجود ہے مگر وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا و وَ قَاسَمَهُمَا اور قَالَ يَا آدَمُ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالمشافہ گفتگو کی صورت تھی۔ بالخصوص و قَاسَمَهُمَا کے متبادر معنے یہی ہیں کہ یہ آمنے سامنے کی گفتگو تھی۔

ابن جریر طبریؒ نے مکالمے کی صورت کو ترجیح دی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ:

فَفِيْ اِخْبَارِهٖ جَلَّ ثَنَاءُهٗ عَنْ عَدُوِّ اللّٰهِ اَنَّهٗ قَاسَمَ آدَمَ وَ زَوْجَتَهٗ بِقِيْلِهٖ لَهُمَا اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِيْنَ. الدَّلِيْلُ الْوَاضِحُ عَلٰى اَنَّهٗ قَدْ بَاشَرَ خِطَابَهُمَا بِنَفْسِهٖ.

"اللہ جل ثناءہ نے دشمن خدا کے بارے میں جو یہ خبر دی ہے کہ اس نے آدم اور اس کی بیوی کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا کہ بے شک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں، تو یہ خبر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس نے دونوں کے ساتھ بذات خود گفتگو کی تھی۔"(۱)

ابن عطیہ غرناطی نے بھی کہا ہے کہ:

وَوَسْوَسَةُ الشَّيْطٰنِ قَالُوْا كَانَتْ دُوْنَ مُشَافَهَةٍ اِلْقَاءً فِي النَّفْسِ وَ قِيْلَ بَلْ كَانَتْ بِالْمُشَافَهَةِ وَالْمُخَاطَبَةِ وَهُوَ ظَاهِرُ الْقِصَّةِ مِنْ غَيْرِ مَا مَوْضِعٍ.

---

(۱) تفسیر ابن جریر ص۲۳۸ ج۱ البقرہ۳۶

"شیطان کے وسوسے کے بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بالمشافہ گفتگو سے بغیر نفس میں برے خیال ڈالنے کی صورت میں تھا اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں یہ بالمشافہ گفتگو کی شکل میں تھا اور قرآن کے متعدد مقامات پر بیان کردہ اس قصے کے ظاہری الفاظ سے اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔"(۱)

اگرچہ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ یہ وسوسہ اور القاء فی القلب کی صورت تھی جو زمین سے بھی ڈالا جا سکتا ہے لیکن جمہور نے اسے بالمشافہ خطاب ہی قرار دیا ہے اس لئے کہ وَ قَاسَمَهُمَا کے الفاظ کو وسوسے پر محمول کرنا ایک غیر متبادر اور تکلفی قسم کی تاویل ہے جسے ذہن بآسانی قبول نہیں کر سکتا لیکن ابن جریر ابن عطیہ اور جمہور کے قول پر ایک سوال وارد ہوتا ہے جو یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے اصول پر تفسیر کرنے والے مفسرین کی غالب اکثریت کا قول یہ ہے کہ آدم و حواء کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ جنت الماوی اور جنت ساوی تھا زمینی باغات میں سے کوئی باغ نہیں تھا جیسا کہ مجددین کا قول ہے اور ابلیس تو حکم الٰہی سے بغاوت اور انکار کی وجہ سے آسمانوں سے اتار لیا گیا تھا تو آخر یہ رجیم و لعین جنت ساوی میں کیسے داخل ہو گیا؟ اور بالمشافہ خطاب کا موقع اسے کس طرح مل گیا؟ اور آدم و حواء نے شیطان کو اپنا خیر خواہ کس طرح سمجھ لیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ ابلیس اور دوسرے جنی شیاطین کو جس طرح دور سے وسوسہ اندازی کی قوت حاصل ہے اسی طرح ان کو کوئی مادی شکل اختیار کرنے کی قوت و صلاحیت بھی دی گئی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس لعین نے ایک دوست اور خیر خواہ کی شکل میں نمودار ہو کر جب اللہ کے نام کی قسم کھا کر اس پھل کے فوائد بیان کئے اور ممانعت کے حکم کی کوئی تاویل و توجیہ کی تو آدم و حواء نے اللہ کے نام کا احترام کرتے ہوئے اسے اپنا خیر خواہ سمجھ لیا اور اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے۔

(۱) المحرر الوجیز ص ۱۰٤ ج ۱۰ طہ ۱۲۰

شیطان کے پھسلانے اور بھکانے کی نوعیت تو سورہ اعراف اور سورہ طٰہٰ کی آیات سے معلوم ہوگئی لیکن یہاں پر ایک اور اشکال الجھن کا سبب بن رہا ہے اور یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم و حواء کی خطا زلت تھی یعنی معصیت بھی نہیں تھی اور نسیان بھی نہیں تھا اس لئے کہ معصیت قصداً نافرمانی کا نام ہے اور انہوں نے نافرمانی کے ارادے سے پھل نہیں کھایا تھا بلکہ تلبیس ابلیس کی وجہ سے پھسل گئے تھے اور اجتہادی غلطی میں مبتلا ہوگئے تھے اور نسیان بھول جانے اور بات ذہن سے نکل جانے کو کہتے ہیں مگر آدم و حواء کے سامنے تو ابلیس نے خود کہا تھا کہ اس پھل سے اللہ نے تم کو اس لئے منع کیا تھا کہ اس کے کھانے سے تم فرشتے بن جاؤ گے یا تم کو ابدی زندگی مل جائے گی۔ نسیان تب ہوتا جب کہ اللہ کا حکم امتناعی ان کے ذہنوں سے اتر گیا ہوتا اور ان کی یادداشت سے نکل گیا ہوتا لیکن یہاں پر تو شیطان نے ان کو خود ہی یاد دلایا تھا کہ اللہ تعالی نے تم کو اگرچہ منع کیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ پھل کھانے میں تمہارا فائدہ ہے بہر حال سورہ بقرہ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حواء کی خطا زلت اور لغزش تھی معصیت بھی نہیں تھی اور بھول بھی نہیں تھی لیکن سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱۵ میں فرمایا گیا ہے کہ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا. "پس وہ بھول گئے اور نہ پائی ہم نے اس میں پختگی۔" اور اسی سورہ کی آیت ۱۲۱ میں کہا گیا ہے کہ وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى "اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی اور وہ پھسل گئے تھے۔"

ان دونوں آیتوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خطا نسیان اور بھول بھی تھی اور معصیت اور غوایت بھی تھی یعنی دانستہ اور ارادی نافرمانی تھی اس لئے کہ عصیان اور غوایت ارادی نافرمانی کو کہتے ہیں تو سورہ بقرہ کی آیت اور طٰہٰ کی آیات کے درمیان مطابقت کی توجیہ کیا ہے ؟ اور فَنَسِيَ اور عَصٰى کے درمیان تضاد کس طرح رفع کیا جا سکتا ہے ؟

جہاں تک فَنَسِيَ کے مفہوم کا تعلق ہے تو عام طور پر مفسرین کہتے ہیں کہ تلبیس ابلیس کی وجہ سے آدم علیہ السلام بھول گئے تھے اور ان کے ذہن سے ممانعت کا حکم نکل گیا تھا

اور بھول پر اگرچہ مواخذہ نہیں ہوتا لیکن یہ شریعت محمدی کی خصوصیت ہے پہلی شریعتوں میں نسیان پر بھی گرفت ہوتی تھی یا پہلی شریعتوں میں بھی بھول پر گرفت نہیں ہوتی تھی مگر آدم علیہ السلام چونکہ مقربین دربار الٰہی میں شامل تھے اس لئے اس کی بھول پر بھی مواخذہ ہوا اور سرزنش کی گئی کیونکہ بڑوں کی اور قریبی دوستوں کی چھوٹی غلطی اور بے احتیاطی بھی بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے جیسا کہ تفسیر قرطبی میں صوفیاء کے مشہور امام جنید بغدادی کا قول نقل ہوا ہے کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن "عام نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کی شان کے اعتبار سے برائیاں ہوتی ہیں۔" یعنی صالحین کی عمومی نیکیاں بارگاہ خداوندی میں مقربین کے منصب پر فائز اولیاء الرحمٰن کے مقام سے فروتر ہوتی ہیں اس لئے اللہ بھی ان پر گرفت کرتا ہی اور وہ خود بھی اپنی چھوٹی سی غلطی کو بلکہ اپنے مقام سے کم درجے کی نیکی کو بھی بڑی غلطی قرار دیتے ہیں اور معافی کے طلبگار ہوتے ہیں لیکن مفسرین کی یہ تاویل دو وجوہات کی بنا پر محل نظر ہے اور قابل ترجیح نہیں ہے ایک تو یہ کہ نسیان غیر اختیاری چیز ہے جس سے بچنا انسان کی وسعت اور قدرت میں نہیں ہے اور قرآن میں جو قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "اللہ کسی نفس پر بھی اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔"

یہ آیت بغیر کسی استثناء کے اللہ کی یہ سنت بیان کرتی ہے کہ طاقت اور وسعت سے زائد بوجھ کسی نفس پر بھی نہیں ڈالا جاتا خواہ وہ امم ماضیہ کا کوئی نفس ہو یا امت محمدی کا کوئی نفس ہو۔ لہذا یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ امم ماضیہ کی شریعتوں میں نسیان پر بھی مواخذہ ہوتا تھا' دوسری وجہ یہ ہے کہ بھولنے اور یادداشت سے اترنے کی بات تب صحیح ہوتی جب کہ ابلیس نے قسم اٹھا کر کہا ہوتا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت کا پھل کھانے سے منع نہیں کیا اس صورت میں ممکن تھا کہ شیطان کے حلفیہ بیان کی وجہ سے آدم علیہ السلام کی یادداشت سے ممانعت کا حکم اتر جاتا اور وہ بھول جاتے لیکن سورہ اعراف اور

طا کہ مذکورہ آیات میں تو صراحت کی گئی ہے کہ ابلیس نے اس بات پر قسم کھائی تھی کہ تمہارے رب نے تم کو اس سے منع تو کیا ہے لیکن اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ تم اس کے کھانے سے فرشتے بن جاؤ گے یا تمہیں حیات جاوداں مل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں پھسلنے، بہکنے اور اجتہادی خطا میں مبتلا ہونے کا امکان تو ہے لیکن حکم خداوندی کو بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو پھر فَنَسِيَ کا صحیح مفہوم اور ٹھیک ترجمہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امام المفسرین محمد ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ ابن عباس کا ایک قول اور اس کے شاگرد مجاہد بن جبر کی رائے نقل کی ہے کہ اس جگہ نَسِيَ کے معنے ہیں تَرَكَ یعنی آدم علیہ السلام نے اللہ کی وصیت اور اس کے تاکیدی حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور ممنوع پھل کھالیا باقی رہی یہ بات کہ یہ ترک عمل کیا دانستہ طور پر ارادۃً نافرمانی تھی یا غیر ارادی لغزش تھی؟ تو سورہ بقرہ کی آیت میں فَاَزَلَّهُمَا کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ترک عمل اور اکل ممنوع جان بوجھ کر نافرمانی اور دانستہ طور پر سرکشی نہیں تھی بلکہ غیر ارادی لغزش اور حکم خداوندی کے فہم میں رائے اور اجتہاد کی غلطی تھی اور وہ فہم کی غلطی یہ تھی کہ شیطان کی تلبیس اور حلفیہ بیان کی وجہ سے آدم علیہ السلام اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ ممانعت کا یہ حکم موبد نہیں ہے بلکہ موقت ہے یعنی کچھ وقت کے لئے اس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے ہمیشہ کے لئے ممانعت نہیں کی گئی حالانکہ حکم امتناعی میں وقت کی تحدید نہیں کی گئی تھی تو یہ فہم اور تاویل واجتہاد کی غلطی تھی دانستہ نافرمانی نہیں تھی بعض حضرات نے فہم و تاویل کی غلطی کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ اللہ نے مخصوص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ تو آدم علیہ السلام تلبیس ابلیس کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ اس مخصوص اور مشار الیہ درخت کا پھل کھانا منع ہے اس نوع کے دوسرے درختوں کا پھل کھانا منع نہیں ہے۔ حالانکہ اس نوع کے ہر درخت کا پھل کھانا ممنوع تھا مخصوص اور متشخص درخت کا پھل مراد

نہیں تھا لیکن یہ توجیہ قابل ترجیح نہیں ہے اس لئے کہ ابلیس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس متعین درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ وَ مَانَهَاكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ. یعنی تم کو اس متعین درخت کا پھل کھانے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ تم فرشتے بن جاؤ گے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کیا عربی میں نسیان کا لفظ ترک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے؟ تو اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔ سورہ توبہ آیت ۶۷ میں منافقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

نَسُوْا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ.

"انہوں نے اللہ کے احکام پر عمل چھوڑ دیا تھا تو اللہ نے بھی ان پر رحم کرنا چھوڑ دیا بے شک منافقین فاسق ہیں۔"

اس جگہ اگر بھولنا مراد ہوتا تو پھر فاسق نہ کہا جاتا کیونکہ بھول کی وجہ سے غلطی کرنے والے کو فاسق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس آیت میں نسیان کی نسبت اللہ کی جانب کی گئی ہے حالانکہ اللہ بھول سے پاک ہے۔ معلوم ہوا کہ اس آیت میں نسیان سے مراد ترک ہے۔

سورہ مائدہ کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ.

"انہوں نے ان احکام کا ایک حصہ چھوڑ دیا تھا جن کی ان کو نصیحت کی گئی تھی۔"

یہاں پر بھی نسیان ترک عمل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ اہل کتاب ان احکام کو بھولے نہیں تھے بلکہ دانستہ طور پر ان کو پس پشت ڈال دیا تھا اور ارادتاً ان پر عمل چھوڑ دیا تھا۔ فَنَسِيَ کے بعد وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کا مفہوم کیا ہے؟ تو بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا۔"

لیکن علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے صحیح فرمایا ہے کہ:

لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ اَنَّ هٰذَا التَّفْسِيْرَ غَيْرُ مُتَبَادِرٍ وَ لَا كَثِيْرُ الْمُنَاسَبَةِ لِلْمَقَامِ...

"تم پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ یہ تفسیر متبادر بھی نہیں ہے اور یہ موقع محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت بھی نہیں رکھتی۔"

حقیقت یہ ہے کہ نظم کلام اور سیاق و سباق کی روشنی میں اس کا مفہوم وہی ہے جسے ابن جریر نے ابن عباسؓ اور قتادہؒ سے نقل کیا ہے اور اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ :

لَمْ نَجِدْ لَهٗ صَبْرًا عَنْ اَكْلِ الشَّجَرَةِ وَ مُوَاظَبَةً عَلَى اِلْتِزَامِ الْاَمْرِ يُقَالُ لِفُلَانٍ عَزْمٌ اے صَبْرٌ وَ ثَبَاتٌ عَلَى التَّحَفُّظِ.(۱)

"ہم نے اس میں درخت کا پھل کھانے سے صبر نہ پایا اور وہ حکم کی پابندی پر قائم نہ رہ سکے عربی میں کہا جاتا ہے کہ لِفُلَانٍ عَزْمٌ یعنی فلاں شخص کے اندر اپنے آپ کو بچانے کا پختہ ارادہ اور صبر و ثبات موجود ہے۔ یعنی زلت اور لغزش کی وجہ دانستہ نافرمانی و سرکشی نہیں تھی بلکہ عزم و ارادے کی کمزوری اور صبر ثبات کی کمی تھی۔ تفسیر قرطبی' تفسیر خازن اور تفسیر مظہری میں بھی اسی مفہوم کو ترجیح دی گئی ہے۔ شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا ہے.کہ "نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت" اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ترجمانی اس طرح کی کہ "سوان سے غفلت اور بے احتیاطی ہو گئی اور ہم نے اس حکم کے اہتمام میں ان میں پختگی اور ثابت قدمی نہ پائی۔" معارف القرآن اور تفہیم القرآن میں بھی تفہیم و تفسیر ابن عباس اور قتادہ کے مذکورہ قول کے مطابق کی گئی ہے۔ باقی رہی وَ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى کی تاویل تو عربی لغت میں اگرچہ عَصٰى يَعْصِىْ مَعْصِيَةً وَ عِصْيَانًا کے متبادر معنے ہیں نافرمانی کرنا اور اطاعت سے نکل جانا اور غَوٰى يَغْوِىْ غَيًّا وَ غَوَايَتًا کے متبادر اور کثیر الاستعمال معنے ہیں گمراہی اور سرکشی لیکن اس آیت میں معصیت اور غوایت کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے جسے اس زمین پر صرف انسان اول اور ابو البشر کی حیثیت سے نہیں اتارا گیا تھا بلکہ اسے نبوت اور خلافت کا منصب دے کر اتارا گیا تھا اور اللہ نے اسے اس منصب کے لئے خود منتخب کیا تھا اور وہ اس کے

(۱)ابن جریر سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۵ ز

برگزیدہ بندوں میں شامل تھے۔

سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے کہ :

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی آدَمَ وَ نُوْحًا وَّ آلَ اِبْرَاھِیْمَ وَ آلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَo (آل عمران ۳۳)

"بے شک منتخب کر لیا تھا اور برگزیدہ بنایا تھا اللہ نے آدم کو' نوح کو' ابراہیم کے خاندان کو اور عمران کے خاندان کو اپنے زمانے کے سارے جہاں پر۔"

اِصْطِفَاء کے معنے ہیں چن لینا' پسند کرنا اور برگزیدہ بنانا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نبوت کے لئے اور اپنی نمائندگی کے لئے سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو منتخب کیا تھا اور اس کے بعد نوح کو' ابراہیم کے خاندان کو اور عمران کے خاندان کو یہ فضیلت دی تھی۔

سورہ طٰہٰ میں کہا گیا ہے کہ :

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰی. (طٰہٰ ۱۲۲)

"پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ بنالیا' اس پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی اور اسے سیدھے راستے پر چلا دیا۔"

سورہ بقرہ میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةًo (البقرہ ۳۰)

"اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔"

ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے خلیفہ کی تفسیر اس طرح نقل کی ہے کہ :

خَلِیْفَةً مِنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُكْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ وَ ذَالِكَ الْخَلِیْفَةُ آدَمُ وَ مَنْ قَامَ مَقَامَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَ الْحُكْمِ بِالْعَدْلِ بَیْنَ خَلْقِهٖ.(۱)

(۱) تفسیر ابن جریر البقرہ آیت ۳۰ و نحوہ فی معالم التنزیل

"اپنا خلیفہ جو میری مخلوق پر احکام نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا اور یہ خلیفہ آدم تھے اور اس کے بعد جو بھی اللہ کی اطاعت کرتے میں اور اس کی مخلوق کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کرتے میں آدم کا قائم مقام ہو وہ بھی اللہ کا خلیفہ ہے۔"

ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ :

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَىُّ الْاَنْبِيَاءِ كَانَ اَوَّلَ؟ قَالَ آدَمُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ نَبِيٌّ كَانَ؟ قَالَ نَعَمْ نَبِيٌّ مُكَلَّمٌ.(۱)

"اے اللہ کے رسول انبیاء میں سے سب سے پہلا نبی کون تھا؟ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ میں نے کہا کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا ہاں ایسے نبی تھے جس کے ساتھ اللہ نے باتیں کی تھیں۔"

ان آیات اور اس حدیث سے صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا تھا اپنے احکام کی تنفیذ کے لئے اسے اپنا خلیفہ بنایا تھا اور وہ زمین پر اللہ کے پہلے نبی تھے' تو کیا اللہ کے مقرب' مصطفیٰ و مجتبیٰ اور برگزیدہ و پسندیدہ بندے کے ساتھ عصیان بمعنی دانستہ نافرمانی اور غوایت بمعنی ضلالت و سرکشی کی کچھ بھی مناسبت ہے؟ جب کہ اللہ نے اسے اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نبوت کا منصب بھی عطا فرمایا تھا۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہر گز نہیں! عصیان و غوایت کے اس مفہوم کی مقربین بارگاہ خداوندی کے ساتھ کچھ بھی مناسبت نہیں ہے' اس لئے فاعل کے ساتھ اس فعل کی عدم مناسبت اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ اس جگہ عصیٰ اور غویٰ کا متبادر اور کثیر الاستعمال معنے مراد نہیں ہے بلکہ وہ معنی مراد ہے جو شان نبوت کے منافی نہیں اور سورہ بقرہ کی آیت میں فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ کے مفہوم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یعنی پھسلنا' بہکنا اور فہم و اجتہاد کی غلطی میں مبتلا ہو جانا' اور غَوٰی کے بھی یہی معنے ہیں کہ

---

(۱) مسند احمد ص ۱۷۸ ج ۵

اجتہادی خطا کی وجہ سے حکم پر عمل نہ کر سکے۔ اس لئے کہ ان کے اندر ارادے کی کمزوری اور عزم کی کمی تھی۔ چونکہ بظاہر یہ نافرمانی اور حد سے آگے بڑھنے کی صورت تھی اگرچہ دانستہ ارادی نافرمانی نہیں تھی اس لئے اسے صورتاً معصیت اور غوایت کہا گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ معصیت نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی جو صغیرہ گناہ بھی نہیں ہے کیونکہ گناہ جان بوجھ کر اور دانستہ طور پر قصداً و ارادتاً نافرمانی کرنے کا نام ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر میں نے عَصٰی اور غَوٰی کا یہی مفہوم متعین کیا ہے کہ ''نافرمانی کی اور بھک گئے'' جو اگرچہ غیر متبادر مفہوم ہے لیکن اگر فَاَزَلَّهُمَا اور نسبت الی النبی کے قرینے کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ غیر متبادر مفہوم متبادر بن جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے مکے سے قبطی کا قتل

اس کی ایک مثال سورۃ القصص میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی کے قتل کا واقعہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم اسرائیلی کو ظالم قبطی کے ظلم سے چھڑانے کے لئے قبطی کو مکا مارا اور وہ خلاف توقع اس مکے سے مر گیا اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ :

اِنَّهٗ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''یہ کام تو شیطان کے کاموں میں سے ہے یقیناً شیطان کھلا دشمن ہے اور گمراہ کرنے والا ہے۔''

اور بخشش طلب کرتے ہوئے فرمایا کہ :

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

(القصص ١٥.١٦)

''اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے پس مجھے بخش دیجئے تو اللہ نے اسے بخش دیا۔ بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قتل کے ارادے سے گھونسا نہیں مارا تھا اور عادتاً ایک مکے سے کوئی مرتا بھی نہیں ہے اور عرف عام میں ارادہ قتل سے حملہ کرنے والے مکہ نہیں مارا کرتے بلکہ ایسا آلہ یا ذریعہ استعمال کرتے ہیں جو عادتاً قتل کا سبب بنتا ہے اس کے علاوہ یہ مکا مارنا بھی نسلی عصبیت پر مبنی نہیں تھا بلکہ مظلوم کی مدد کرنے اور اسے ظالم سے چھڑانے کی نیت سے تھا تو اسے شیطانی کام کیوں کہا گیا؟ اور اسے ظلم کیسے قرار دیا گیا؟ حالانکہ یہ تو دینی فریضہ تھا جیسا کہ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ:

لِاَنَّ نَصْرَ الْمَظْلُوْمِ دِیْنٌ فِی الْمِلَلِ کُلِّهَا وَ فَرْضٌ فِیْ جَمِیْعِ الشَّرَائِعِ.

اسرائیلی کی مدد کے لئے "مکا اس لئے مارا تھا کہ مظلوم کی مدد کرنا تمام ادیان میں دین کا تقاضی رہا ہے اور تمام شریعتوں میں فرض رہا ہے۔"

علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ:

لِجَوَازِ اَنْ یَّکُوْنَ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَدْ رَاٰی اَنَّ فِی الْوَکْزِ دَفْعُ ظَالِمٍ عَنْ مَظْلُوْمٍ فَفَعَلَهٗ غَیْرَ قَاصِدٍ بِهِ الْقَتْلَ وَ اِنَّمَا وَقَعَ مُتَرَتِّبًا عَلَیْهِ لَا عَنْ قَصْدٍ.

"ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچا ہو کہ مکا مارنے سے ظالم مظلوم سے پیچھے ہٹ جائے گا اس لئے انہوں نے قتل کے ارادے کے بغیر مظلوم کو چھڑانے کے لئے مکا مارا تھا لیکن اتفاقاً اس سے بغیر ارادہ قتل کے موت واقع ہو گئی۔"

جواب یہ ہے کہ چونکہ ظاہری صورت قتل کی تھی اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے اسے عمل شیطان اور ظلم کہہ دیا انہوں نے سوچا ہو گا کہ شاید مجھ سے ضرب لگانے میں بے احتیاطی ہو گئی ہو گی اور شدت خوف خدا کی وجہ سے انہوں نے اس بے احتیاطی کو ظلم اور عمل شیطان قرار دے دیا۔ بے احتیاطی اور گھونسا لگاتے وقت توازن اور اعتدال قائم نہ رکھ سکنا اگرچہ صغیرہ گناہ بھی نہیں ہے لیکن بہر حال ایک غلطی تو ہے اور عام طور پر ہر ناپسندیدہ چیز کا انتساب شیطان کی طرف کیا جاتا ہے جیسا کہ نسیان ایک غیر اختیاری چیز ہے جس پر اللہ کے ہاں کوئی

گرفت نہیں ہوتی یہاں تک کہ بھول کر فرض روزے کی حالت میں کھانے پینے سے روزہ بھی نہیں ٹوٹتا لیکن یہ ایک برائی تو ہے اس لئے قرآن میں اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے۔ سورہ یوسف میں آیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے رہائی پانے والے جیل کے ساتھی سے کہا تھا کہ:

اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ ۔ "اپنے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر بھی کر دینا۔" (تاکہ وہ میرے کیس کی تحقیق کی جانب متوجہ ہو جائے) لیکن فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّهٖ. "شیطان نے اس سے اپنے بادشاہ کے سامنے یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا۔" (یوسف ۴۲)

اسی طرح موسیٰ و خضر کے قصے میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر نے کہا کہ:

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَ مَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ ۝

"میں مچھلی کے زندہ ہونے کا واقعہ بھول گیا تھا اور نہیں بھلایا تھا مجھ سے اس کا ذکر مگر شیطان نے ہی بھلا دیا تھا۔"

ان دونوں آیتوں میں بھول کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے اس لئے کہ اسی نے یوسف علیہ السلام کے رفیق جیل اور موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر کو دوسرے خیالات میں مشغول رکھ کر بھول میں مبتلا کر دیا تھا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ قبطی ایک حربی کافر تھا جس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معاہدہ بھی نہیں تھا اور غیر معاہد حربی کافر کا قتل عمداً بھی جائز تھا لیکن جائز اور مباح ہونے کے باوجود یہ شان نبوت کے خلاف تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عمل شیطان اور ظلم قرار دیا تھا۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ معاہدہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قولی اور تحریری معاہدہ اور دوسرا عملی معاہدہ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس ملک میں مسلمان اور غیر مسلم باہمی امن و امان کے ساتھ رہتے ہوں' ایک دوسرے کے مال و جان اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوں' ایک دوسرے کے مال و جان پر حملہ

کرنے کو غداری سمجھتے ہوں اور سب کے سب ملکی قوانین اور معاشرتی روایات کی پابندی کرتے ہوں تو یہ عرفاً ایک قسم کا عملی معاہدہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی تصور کی جاتی ہے خواہ اس ملک اور علاقے پر مسلمان کی حکومت ہو یا غیر مسلم کی حکومت ہو یا کسی کی بھی حکومت نہ ہو۔ شریعت بھی اس قسم کے عملی معاہدے کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کو غدر قرار دیتی ہے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کتاب الشروط میں نقل کردہ ایک طویل حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنے کچھ رفقاء سفر کو نیند کی حالت میں یا نشے کی حالت میں قتل کر کے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے اور مقتولین سے حاصل کردہ مال بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :

اَمَّا الْاِسْلَامُ فَاَقْبَلُ وَ اَمَّا الْمَالُ فَلَسْتُ مِنْهُ فِیْ شَیْئٍ وَ فِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاوٗدَ وَ اَمَّا الْمَالُ فَمَالُ غَدْرٍ لَا حَاجَةَ لَنَا فِیْهِ.

"تیرا اسلام تو ہم قبول کرتے ہیں لیکن اس مال کے ساتھ میرا کچھ بھی تعلق نہیں ہے اور ابوداؤد کی روایت میں آیا ہے کہ یہ مال غدر اور عہد شکنی سے حاصل ہوا ہے جس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں ہے۔"

معاشرتی روایات یہ ہیں کہ رفقاء سفر ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی باہمی مصاحبت اور رفاقت ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی غدر اور دھوکہ دہی متصور ہوتی ہے۔ مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنے رفقاء سفر کو قتل کر کے اور ان کے اموال پر قبضہ کر کے اس عملی معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس مال کو غدر کا مال قرار دیا۔ اس حدیث کی جو تشریح ابن حجرؒ، قسطلانی اور کرمانی نے کی ہے اس کا حوالہ دینے کے بعد مفتی محمد شفیعؒ نے اپنے شیخ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحقیق اس طرح نقل کی ہے کہ :

اِنَّ الْمُصَاحَبَةَ بِالْاَمْنِ نَوْعٌ مِنَ الْعَهْدِ عَمَلًا وَ اِنْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمْ عَهْدٌ قَوْلِيٌّ وَ لَا اِسْتِيْمَانٌ صَرِيْحٌ فَسَفْكُ الدِّمَاءِ وَ اَخْذُ الْاَمْوَالِ مَعَ ذَالِكَ غَدْرٌ حَرَامٌ.(۱)

"امن وامان کے ساتھ باہمی مصاحبت اور معاشرت بھی عملاً معاہدے ہی کی ایک قسم ہے اگرچہ ان کے درمیان کوئی زبانی یا تحریری معاہدہ نہ ہو اور صریحی طور پر ان کو امن بھی نہ دیا گیا ہو اس لئے اس عملی اور معاشرتی معاہدے کے باوجود ایک دوسرے کا خون بہانا اور ایک دوسرے کے اموال پر قبضہ کرنا غدر اور عہد شکنی متصور ہوگی جو حرام ہے۔"

باقی رہا فقہاء کا یہ قول کہ حربی کافر کا خون اور مال مباح ہے اور وہ شرعاً مباح الدم والمال ہے تو اس سے مراد وہ حربی ہے جس کی ساتھ مسلمان کا نہ قولی معاہدہ ہو اور نہ عملی معاہدہ ہو۔ اس کے علاوہ حربی کافر کا خون اور مال قتال اور محاربت کی حالت میں مباح ہوتا ہے امن کی حالت میں مباح نہیں ہوتا۔

علامہ قسطلانیؒ مغیرہ بن شعبہ کی مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنَّ اَمْوَالَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ اِنْ كَانَتْ مَغْنُوْمَةً عِنْدَ الْقَهْرِ فَلَا يَحِلُّ اَخْذُهَا عِنْدَ الْاَمْنِ.

"مشرکین کے مال اگرچہ جنگ میں غلبے کے وقت غنیمت سمجھے جاتے ہیں اور حلال ہوتے ہیں لیکن امن کی حالت میں ان کے مال پر قبضہ کرنا حلال نہیں ہے۔"

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کا ممنوعہ درخت کا پھل کھانا اور موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو مکا مارنا نبوت سے قبل کے واقعات ہیں اور نبوت سے پہلے نبی چونکہ واجب الاطاعت نہیں ہوتا اس لئے صغائر کا صدور قبل از نبوت منافی عصمت نہیں ہے بشرطیکہ وہ خسیس قسم کے صغائر نہ ہوں۔

امام قرطبیؒ نے وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى کی تفسیر میں ابوبکر ابن فورک سے یہ قول

(۱) احکام القرآن ص۷۲ ج۳

نقل کیا ہے اور اسے ایک نفیس قول قرار دیا ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت اور بعد از نبوت دونوں حالتوں میں کبائر اور صغائر دونوں سے معصوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتا ہو اس کی پوری زندگی کو ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکے کہ تم نے خود تو ماضی میں گناہ کئے ہیں اور ہم کو یہ کہتے ہو کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔

بعض مفسرین نے فَغَوٰی کے دو معنے اور بھی کئے ہیں جو شان نبوت کے منافی بھی نہیں ہیں اور عربی لغت میں ان کی گنجائش بھی ہے۔ ایک معنے ہیں فَخَابَ یعنی ناکام ہو گئے اور جس مقصد کے لئے پھل کھایا تھا یعنی ملکیت یا ابدیت وہ حاصل نہ کر سکے بلکہ نیچے اتار لئے گئے۔

امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ فرماتے ہیں کہ وَ قِیْلَ مَعْنَاہُ خَابَ ''اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہیں خَابَ یعنی ''ناکام ہو گئے۔''(۱)

اور دوسرے معنے ہیں فَفَسَدَ عَلَیْهِ عَیْشُهٗ یعنی پھل کھانے سے اس کی زندگی خراب ہو گئی اور جنت کی آسائشوں سے محروم ہو گئے۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ :

فَفَسَدَ عَلَیْهِ عَیْشُه حَکَاهُ النَّقَّاشُ وَ اخْتَارَهٗ الْقُشَیْرِیُّ وَالْغَیُّ اَلْفَسَادُ وَ هُوَ تَاوِیْلٌ حَسَنٌ.(۲)

''یعنی اس پر اس کی زندگی خراب ہو گئی نقاش نے یہ معنی نقل کیا ہے اور قشیری نے اسے پسند کیا ہے غیّ کے معنے فساد بھی آتے ہیں اور یہ اچھی تاویل ہے۔''

(۸) فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ٥ (البقرہ۳۷)

---

(۱) مفردات القرآن ۳۷۵ مادہ غوی

(۲) قرطبی طٰہٰ آیت ۱۲۱

"پھر سیکھ لئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات (دعا کے) پس توجہ فرمائی اللہ نے اس پر (خطا معاف فرمادی) بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔"

اس آیت میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ دعائیہ الفاظ کونسے تھے جو آدم علیہ السلام کو اس کے رب نے خود بتادیئے تھے؟ اور دعا کے ان کلمات کو قبول فرما کر اس کی خطا معاف فرمادی تھی۔ لیکن ان کلمات کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے کہ:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف ۲۳)

"دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو ہماری بخشش نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہو جائیں گے ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے۔"

(۹) يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَ اِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (البقرہ ۴۰)

"اے اولاد یعقوب! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی ہیں اور تم مجھ سے کیا گیا وعدہ پورا کرو تو میں تم سے کیا گیا وعدہ پورا کروں گا اور تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔"

اس جگہ کوئی تفصیل موجود نہیں ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل سے کونسا وعدہ لیا تھا اور ان کے ساتھ کونسا وعدہ کیا تھا لیکن اسی سورت کی آیت ۸۳۔۸۴ میں اس عہد کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ:

"یاد کرو وہ وقت کہ ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو' والدین' قرابت داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو' لوگوں کو اچھی بات کہا کرو' نماز قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو پھر تم نے اس عہد سے روگردانی کر لی سوائے تھوڑے لوگوں کے تم میں سے اور تم ہی ہو منہ موڑنے والے اور وہ وقت بھی یاد کرو

جب کہ ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤ اور اپنے ہی لوگوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو پھر تم نے اقرار کیا تھا (کہ ہم عہد پورا کریں گے) اور تم اس کے گواہ ہو۔" (البقرہ ۸۳۔ ۸۴)

اس عہد کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرو' آپس میں امن و امان اور اخوت کے ساتھ زندگی گزارو' ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ اور ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالو۔ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ میں اسی میثاق کی طرف اشارہ ہے لیکن انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال کر اللہ کی عبادت کی بجائے غیر اللہ کی عبادت شروع کر دی' نماز اور زکوۃ کے احکام کو ضائع کر دیا اور باہمی اخوت کی بجائے اپنے ہی لوگوں کی خونریزی شروع کر دی۔ تو اللہ نے دُنیا میں ان کو ذلیل و رسوا کر دیا اور قیامت کے دن سخت عذاب میں ڈالے جائیں گے۔

آگے چل کر اس عہد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ :

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَا آتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّ اسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا○ (البقرہ ۹۳)

"اور یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو اٹھا لیا تھا کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں انہیں مضبوطی کے ساتھ تھام لو (یعنی ان کی پابندی کرو) اور ان کو سنو اور سمجھو! انہوں نے کہا کہ ہم نے سن تو لیا ہے مگر ہم نے مانا نہیں ہے۔"

یعنی انہوں نے زبان سے تو اقرار کر لیا مگر عمل کی زبان سے کہا کہ ہم نہیں مانتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے مراد تورات کے احکام پر عمل کرنے کا عہد ہے جو ان سے کوہ طور کے دامن میں لیا گیا تھا۔

سورہ آل عمران میں اس عہد کے ایک دوسرے پہلو کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ :

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَکْتُمُوْنَہٗ فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ○ (آل عمران ۱۸۷)

"اور وہ وقت بھی یاد کرو جب کہ ہم نے اہل کتاب سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرو گے اور اس کے احکام کو لوگوں سے پوشیدہ نہیں رکھو گے پھر انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈالدیا اور خرید لی اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت (یعنی اس کے بدلے دنیا خرید لی) پس بری چیز ہے وہ دنیا جسے وہ خرید رہے ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے تورات کے احکام کی تعلیم دینا اور ان کو خوب پھیلانا مراد ہے۔ لیکن انہوں نے دنیوی مفادات اور ذاتی اغراض کے لئے تورات کے احکام کو نہ صرف یہ کہ بیان نہیں کیا اور چھپائے رکھا بلکہ ان میں تحریف بھی کر دی۔ سورہ مائدہ میں اس معاہدے اور میثاق کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ :

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ آتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ آمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ○ (المائدہ ۱۲)

"اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور مقرر کئے تھے ہم نے ان میں سے بارہ سردار' اور کہا تھا ان کو اللہ نے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہو' زکوۃ دیتے رہو' میرے رسولوں پر تم ایمان لے آئے ان کی مدد کی اور تم نے اللہ کو قرض حسن دیا تو میں تم سے تمہارے گناہ دور کر دوں گا اور ضرور تم کو ان باغات میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں مگر تم میں سے جو کوئی بھی اس عہد کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔"

لیکن انہوں نے جب یہ عہد توڑ دیا تو اللہ نے ان پر لعنت بھیج دی اور وہ اتنے زیادہ سنگ دل ہو گئے کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالا اور ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس کے ایک حصے کو پس پشت ڈال کر بھلا بیٹھے۔ تورات اور انجیل دونوں میں توحید پر قائم رہنے اور محمد رسول اللہ ﷺ

کی نبوت پر ایمان لانے کی تاکید کی گئی تھی لیکن یہود اور نصاریٰ دونوں نے توحید کی بجائے شرک اختیار کر لیا اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کی بجائے ان کے ساتھ حسد و عناد اور عداوت کا رویہ اختیار کر لیا جس کے نتیجے میں یہود ملعون اور مغضوب قوم بن گئی اور نصاریٰ ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔"

قرآن کریم نے جس عہد کا ذکر کیا ہے اس کے ذکر سے تحریف شدہ تورات بھی خالی نہیں ہے بلکہ جگہ جگہ ان احکام کا ذکر موجودہ محرف تورات میں بھی پایا جاتا ہے۔ تورات کے اردو ترجمے سے چند حوالے ملاحظہ کیجئے۔

"میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے' تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا تو انہیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر۔"(۱)

"تم اور قوموں کے معبودوں میں سے جو تمہارے آس پاس ہیں پیروی نہ کرو کیونکہ خداوند تیرا خدا جو تمہارے درمیان ہے غیور خدا ہے۔ نہ ہو کہ خداوند تیرے خدا کے قہر کی آگ تجھ پر بھڑکے اور تمہیں روئے زمین سے فنا کر دے۔"(۲)

خونریزی کی ممانعت کے احکام بھی مروجہ تورات میں ملتے ہیں مثلاً :

"تو خون مت کر۔"(۳)

"بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو۔"(۴)

اللہ کی کتاب یعنی تورات کی تعلیم و اشاعت کے بارے میں ان سے جو وعدہ لیا گیا تھا اس

---

(۱)کتاب استثناء باب ۵:۷۔۸

(۲)استثناء ب ۶:۱٤۔۱۵

(۳)خروج ب ۲۰:۱۳

(٤)استثناء ب ۱۹:۱۰

کا ذکر بھی موجودہ تورات وانجیل پایا جاتا ہے مثلاً :

"تم اس کلام میں جو میں تمہیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو۔"(۱)

"تو یہ باتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا۔"(۲)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ○ (البقرہ ۶۵)

"اور یقیناً تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جنھوں نے تم میں سے ہفتے کے دن کے بارے میں تورات کے حکم سے تجاوز کیا تھا تو ہم نے سزا کے طور پر ان کو حکم دیا تھا کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔"

اس آیت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے یوم السبت کے بارے میں شریعت موسوی کے حکم کو توڑا تھا جس کے نتیجے میں ان کو بندر بنا دیا گیا تھا تاکہ اس واقعے کو ان کے ہم عصر لوگوں کے لئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور نصیحت بنا دیا جائے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عبرتناک اور نصیحت آموز واقعہ نزول قرآن کے وقت مدینہ میں موجود یہودیوں کو اچھی طرح معلوم تھا اس لئے ان کے لئے تو اجمالی طور پر اشارہ بھی کافی تھا لیکن عام لوگوں کو صرف اس آیت کے الفاظ سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ یوم السبت کے بارے میں وہ کونسا قانون تھا جس کی خلاف ورزی کی گئی تھی اور یہ لوگ کہاں رہتے تھے لیکن سورہ اعراف اس اجمال کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے :

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ○ (اعراف ۱۶۳)

(۱) استثناء ب ۴۰ :۲

(۲) استثناء ب ۴ :۹

"اور پوچھ لو ان سے اس بستی والوں کے بارے میں جو سمندر کے کنارے پر تھی جب کہ وہ لوگ سبت کے احکام سے تجاوز کر رہے تھے جب ہفتے کے روز مچھلیاں آتی تھیں ان کے سامنے سطح آب سے ظاہر ہو کر اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ اسی طرح آزمایا تھا ہم نے ان کو اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔"

اس آیت سے وضاحت ہو گئی کہ ہفتے کے دن ان پر مچھلیوں کا شکار حرام تھا لیکن انہوں نے حرمت کے اس حکم کو نظر انداز کر کے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیا' آزمائش کے طور پر ہفتے کے روز ان کی سامنے سطح سمندر پر مچھلیاں نمودار ہو جاتی تھیں اور دوسرے دنوں میں دکھائی نہ دیتیں یہ صبر نہ کر سکے اور مختلف قسم کے حیلوں کے ذریعے شریعت موسوی کے اس حکم کو توڑ کر مچھلیاں پکڑ کر کھانے لگے ان میں سے بعض ہفتے کے دن سمندر میں جال ڈال دیتے تھے اور جب مچھلیاں اس میں پھنس جاتیں تو ہفتے کا سورج ڈوبنے کے بعد جال سے نکال کر گھر لے آتے اگر کوئی اعتراض کرتا کہ تم نے عبادت کے روز مچھلیاں کیوں پکڑی ہیں تو جواب دیتے کہ ہم نے تو ہفتے کے دن نہیں پکڑیں بلکہ بعد میں پکڑی ہیں اور بعض سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے تالاب بنا لیتے جب اس میں مچھلیاں جمع ہو جاتیں تو راستہ بند کر دیتے اور سورج غروب ہونے کے بعد آسانی کے ساتھ پکڑ کر کھانا شروع کر دیتے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ سمندر کے کنارے پر رہتے تھے اور مچھلیوں کا شکار ان کا پیشہ تھا اس لئے اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے اور حرام خوری کے لئے حیلے تراش لئے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حرام کے ارتکاب کے لئے یا کسی فرض سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے حیلے تراشنا حرام ہے اور سنت یہود ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس بستی کا نام کیا تھا اور یہ واقعہ کس زمانے میں پیش آیا تھا؟ تو قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے بستی کے نام اور زمانے کا تعین ضروری نہیں ہے البتہ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا کہ اس

بستی کا نام ایلہ تھا جس کو آج کل عقبہ کہتے ہیں اور یہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے دور حکومت (۱۰۱۳ق م تا ۹۷۳ ق م) میں پیش آیا تھا۔ سبت شریعت موسوی میں ایک مبارک دن ہے یہ دن صرف عبادت کے لئے مخصوص ہے اور اس روز تجارت' زراعت' شکار اور ہر قسم کے دنیوی کام ممنوع تھے۔ ممانعت کا یہ حکم مروجہ تورات میں آج بھی لکھا ہوا ہے :

"پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے' جو اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے' پس جو کوئی روز سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔"(۱)

معلوم ہوا کہ سبت کے دن دنیوی کام کرنے کی سزا یہود کی شریعت میں موت تھی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کے لئے جب حیلے ایجاد کئے تو اللہ تعالی نے تکوینی طور پر ان کی شکلیں مسخ کر دیں اور ان کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے بندر بنادیا اور تین دنوں کے بعد سب کی سب ذلت کی موت مر گئے' موجودہ بندر جو حیوان کی ایک نوع ہے ان کی نسل نہیں ہے بلکہ ابتداء سے چلی آرہی ہے۔ مسخ شدہ مخلوق کی نسل اللہ تعالی آگے نہیں چلاتا۔

ابن کثیر اور روح المعانی کی تحقیق یہ ہے کہ :

مُسِخُوْا قِرَدَةً عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَ عَلٰى ذَالِكَ جُمْهُوْرُ الْمُفَسِّرِيْنَ وَ هُوَ الصَّحِيْحُ.

"حقیقی معنوں میں ان کی شکلیں بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دی گئی تھیں جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے اور یہی رائے صحیح ہے۔"

البتہ ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ :

مُسِخَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ لَمْ يُمْسَخُوْا قِرَدَةً.

"ان کے قلوب اور اذہان مسخ کر دیئے گئے مگر ان کی شکلیں بندروں کی شکل میں

(۱) خروج ۳۱: ۱۴۔۱۵

تبدیل نہیں کی گئی تھیں یعنی ان کے اذہان اور اخلاق وعادات بندروں جیسے بنادیے گئے۔"

لیکن امام قرطبی نے اس قول کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

لَمْ یَقُلْ غَیْرُہٗ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ فِیْمَا اَعْلَمُ.

"میرے علم کے مطابق یہ بات مجاہد کے علاوہ دوسرے مفسرین میں سے کسی نے نہیں کی۔"

یعنی یہ مجاہد کی انفرادی رائے ہے اور بغیر کسی قرینے کے حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی اختیار کرنا اصول تفسیر کی خلاف ہے اس لئے مجاہد کی شخصی اور انفرادی رائے کو جمہور مفسرین کے مقابلے میں ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

فہم قرآن کے لئے تالیف کلام اور سیاق وسباق میں تدبر کرنا ضروری ہے

تفسیر القرآن بالقرآن کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ زیر غور آیت کے نظائر دوسری آیات میں تلاش کئے جائیں اور ان کی روشنی میں زیر بحث آیت کا مفہوم متعین کیا جائے اس کی دس مثالیں گذشتہ عنوان کے تحت آپ نے ملاحظہ کرلی ہیں لیکن تفسیر القرآن بالقرآن کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ زیر غور آیت کے نظم و تالیف اور سیاق و سباق یعنی ماقبل اور مابعد کے مضمون پر غور و فکر کیا جائے اور آیت کا وہ مفہوم متعین کیا جائے جو نظم کلام اور ماقبل و مابعد کے منافی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ مربوط ہو۔ اس لئے کہ قرآن کریم ایک مربوط کلام ہے۔ اس لئے سیاق و سباق کی روشنی میں مفہوم متعین کرنا بھی تفسیر القرآن بالقرآن کی ایک قسم ہے۔

"قوام القرآن" کی بحث میں اس کی متعدد مثالیں آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں اور

درس قرآن کے دوران اس قسم کی مثالیں معلم اور متعلم کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ قرآن کریم میں تدبر اور غور و فکر کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا مفہوم یہی ہے کہ الفاظ و کلمات کے معانی بھی معلوم کیے جائیں اور ما قبل و مابعد کے مضمون کو بھی مد نظر رکھا جائے۔

سیاق و سباق کی روشنی میں فہم قرآن کی چند مثالیں

کیا حجاب کا حکم ازواج رسول کی ساتھ مخصوص ہے؟

(۱) يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَ قُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوْفًاo وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ آتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ.
(الاحزاب ۳۲، ۳۳)

"اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ اختیار کر لو تو پھر تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو' پس تم بات کرنے میں نزاکت اختیار نہ کرو ورنہ غلط امید باندھ لے گا وہ شخص جس کے دل میں کوئی خرابی ہو اور مناسب یعنی شریفانہ بات کیا کرو' اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو اور پرانی جاہلیت کے طریقے پر اپنی زینت کو اجنبی مردوں کے سامنے نمایاں نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوۃ دیا کرو اور اللہ ورسول کی اطاعت کرتی رہو۔"

ان آیات میں چونکہ خطاب ازواج رسول کو کیا گیا ہے اس لئے سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا یہ احکام امہات المؤمنین کے ساتھ مخصوص ہیں اور کیا دوسری مسلمان عورتوں پر شرعاً ان احکام کی پابندی لازم نہیں ہے؟ دور جدید کے مجددین اور عورتوں کی آزادی کے علمبردار اسی طرح کہتے ہیں کہ یہ احکام ازواج رسول کے ساتھ مخصوص ہیں اور عام خواتین ان کی مکلف نہیں ہیں لیکن جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ دونوں آیتوں کے پورے نظم اور سیاق کو پیش

نظر نہیں رکھتے بلکہ صرف یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ کی خطاب خاص کو دیکھ کر عفت و پاکدامنی اور پردے کے ان احکام کو ازواج رسول کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں حالانکہ اس آیت میں فَیَطۡمَعَ الَّذِیۡ فِیۡ قَلۡبِہٖ مَرَضٌ میں جو علت بیان کی گئی ہے وہ عام ہے کہ نرم و نازک باتیں سن کر برے اور فاسد خیالات رکھنے والا شخص غلط امیدیں باندھ لے گا اور نفسیاتی طور پر یہ انداز گفتگو فتنے کا باعث بن جائے گا تو کیا کوئی ذی عقل انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ ازواج رسول کی نرم و نازک باتوں سے تو یہ خطرہ ہے مگر عام خواتین کا یہ انداز گفتگو فتنے کا سبب نہیں بن سکتا؟

ظاہر ہے کہ اگر امہات المؤمنین کی نرم و نازک باتیں کسی فاسد ذہنیت والے شخص کے دل میں برے خیالات پیدا کر سکتی ہیں تو عام خواتین کا باتوں میں نزاکت اختیار کرنا بطریق اولیٰ اس فتنے کا باعث بن سکتا ہے اس لئے علت کے عموم کی وجہ سے یہ حکم بھی عام ہے اور تمام مسلمان خواتین ان احکام کی مکلف ہیں۔ ازواج رسول کو خصوصی طور پر خطاب اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کا درجہ اور مرتبہ بلند ہے' ان کی نیکیاں اور بھلائیاں بھی دوسری خواتین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی کوتاہیاں اور لغزشیں بھی دوسری خواتین پر برا اثر ڈال سکتی ہیں اس لئے ان کو بڑی محتاط اور محفوظ زندگی گزارنی چاہئے تاکہ وہ عام خواتین کے لئے نمونے کا کردار ادا کر سکیں۔ اسی طرح قرار فی البیوت اور ترک تبرج کے حکم کے بعد اقامت صلوۃ' ایتاء زکوۃ اور اللہ و رسول کی اطاعت کے احکام بھی دیئے گئے ہیں اور یہ کہنے کی تو متجددین اور آزادی نسواں کے دلدادہ لوگ بھی جرات نہیں کر سکتے کہ نماز قائم کرنا' زکوۃ دینا اور اللہ و رسول کی اطاعت کرنا ازواج رسول پر تو فرض تھا مگر عام خواتین پر فرض نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نماز' زکوۃ اور اطاعت کے احکام صرف امہات المؤمنین کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام مسلمان خواتین ان کی مکلف ہیں تو "قرار فی البیوت" اور ترک تبرج کے احکام بھی ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ عام خواتین پر بھی ان کی پابندی لازم ہے۔ اس ایک مثال

سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیاق کلام اور پوری آیت کے نظم و تالیف کو نظر انداز کر کے صرف ایک جملے اور ایک لفظ سے احکام معلوم کرنے والا شخص کتنی بڑی تحریف و ضلالت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مگر جو لوگ پوری آیت کے نظم اور سیاق کو پیش نظر رکھتے ہیں اور موضوع سے متعلق دوسری آیات اور احادیث کو بھی مد نظر رکھتے ہیں وہ آیت کے صحیح مفہوم تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً

امام ابوبکر رازی جصاص لکھتے ہیں کہ :

فَهٰذِهِ الْاُمُوْرُ كُلُّهَا مِمَّا اَدَّبَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ نِسَاءَ النَّبِیِّ ﷺ صِيَانَةً لَّهُنَّ وَ سَائِرُ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُرَادَاتٌ بِهَا.(۱)

"یہ سارے احکام وہ ہیں جو نبی ﷺ کی بیویوں کو آداب اور اخلاق سکھانے کے لئے دیئے گئے ہیں تاکہ ان کی زندگی پاک و صاف رہے لیکن مراد مسلمانوں کی تمام خواتین ہیں اور سب کے لئے ان احکام کی پابندی ضروری ہے۔"

(۲) وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ

"اور جب تم ان سے (ازواج رسول سے) کوئی چیز مانگو (یا کوئی مسئلہ پوچھو) تو پردے کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے اور ان کے دلوں کو پاک و صاف رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔"

اس آیت میں بھی خطاب ازواج رسول سے کیا گیا ہے اس لئے سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا نا محرم سے حجاب کا یہ حکم ازواج اور اصحاب رسول کے ساتھ مخصوص ہے یا ساری مسلمان خواتین اور سارے نا محرم مسلمانوں کے درمیان حجاب کا ہونا ضروری ہے؟ لیکن جب ہم ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اگرچہ خطاب خاص ہے لیکن حکم عام ہے اسلئے کہ اس حکم کی علت طہارت قلوب بیان کی گئی ہے اور

---

(۱) احکام القرآن للجصاص سورہ احزاب ۳۳۔۳۴

طہارت قلوب کی حاجت ازواج رسول اور اصحاب رسول کے مقابلے میں عام مسلمات اور مسلمین کو کئی گنا زیادہ ہے۔

یہ بات کوئی معقول انسان نہیں کہہ سکتا کہ ازواج رسول اور اصحاب رسول کے درمیان بغیر حجاب کے گفتگو کرنا تو دونوں کے دلوں کی پاکیزگی کو نقصان پہنچا سکتی تھی مگر آج کل کے مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حجابی کی ساتھ آزادانہ گفتگو دلوں کی صفائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ سیاق کلام کی روشنی جن مفسرین نے آیت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

وَيَدْخُلُ فِيْ ذَالِكَ جَمِيْعُ النِّسَاءِ بِالْمَعْنى. (قرطبی)

"حجاب کے اس حکم مین ساری عورتیں شامل ہیں اس لئے کہ علت عام ہے۔"

(۳) اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا○ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا○ (الاحزاب ۳۳. ۳٤)

"بے شک اللہ چاہتا ہے کہ تم سے آلودگی دور کردے اے نبی کے گھر والو! اور تم کو خوب پاک وصاف کردے' اور تم اللہ کی ان آیات کو اور ان احکام کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھے جاتے ہیں۔ بے شک اللہ باریک بین ہے اور ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔"

عربی زبان میں اہل بیت کا اطلاق ازواج پر بھی ہوتا ہے اور نسبی قرابت داروں پر بھی ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت، میں اہل بیت سے مراد کون ہیں اور اس آیت کا نزول کیا ازواج رسول کے بارے میں ہوا ہے یا اولاد رسول کے بارے میں ہوا ہے؟

اگر ہم آیت کے سیاق و سباق اور ما قبل و مابعد پر غور کریں تو یہ سوال فوراً حل کرلیں گے اس لئے کہ اس سے قبل کی آیت يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ کے خطاب سے شروع ہوئی ہے اور اس میں اللہ نے اپنے نبی کی بیویوں کو ہدایات دی ہیں کہ غیر محرم لوگوں سے بات کرتے وقت

نزاکت اختیار نہ کرو' گھروں میں بیٹھی رہو' اپنی زینت نامحرم مردوں کو دکھاتی نہ پھرو' نماز ادا کرتی رہو' زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ کی اطاعت کرتی رہو۔ اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اے نبی کے گھر والو اللہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر قسم کی اعتقادی' عملی اور اخلاقی آلودگیوں سے پاک و صاف کر دے۔ اس سیاق و سباق سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ازواج رسول کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں اہل بیت سے مراد رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ہیں اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تمہارے گھروں میں جو آیات پڑھی جاتی ہے اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھا کرو اور ان پر عمل کیا کرو ظاہر ہے کہ گھروں سے مراد ازواج مطہرات کے گھر ہیں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی رہائش اپنی بیویوں کے حجروں میں ہوتی تھی اور انہی حجروں میں آیات و احکام ان کو سنائے جاتے تھے۔

ماقبل اور مابعد کی آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے یہی بات قرآن کے سب سے بہترین ترجمان ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے کہ:

نزلت في نساء النبي ﷺ خاصة. (ابن کثیر)

"یہ آیت خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

اس کے علاوہ اہل بیت کا اطلاق بیوی پر قرآن کی دوسری آیت میں بھی ہوا ہے۔

جب فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی اور ان کی بیوی نے یہ بشارت سن کر اپنی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تو فرشتوں نے کہا:

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۝ (ھود ۷۳)

"اے ابراہیم کی گھر والی! تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں کیا تو اللہ کے کاموں میں تعجب کرتی ہو بے شک اللہ حمد کے لائق ہے اور بڑی شان والا ہے۔"

اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہی مراد ہے اس لئے کہ اس سے پہلے

وَامْرَئَتُہٗ' فَاتِمَۃٌ کا لفظ آیا ہے۔

سیاق کلام کی روشنی میں اہل سنت والجماعۃ کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج رسول ہیں اور آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن ان کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ الفاظ کے عموم میں رسول اللہ ﷺ کے اہل قرابت بھی شامل ہیں اور آیت کا انطباق ان پر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ زید بن ارقم نے فرمایا ہے کہ :

اَهْلُ بَيْتِهٖ مَنْ حُرِمَ الصَّدَقَةُ عَلَيْهِ بَعْدَهٗ' آلُ عَلِيٍّ وَ آلُ عَقِيْلٍ وَ آلُ جعفرٍ و آل عباس .(۱)

"آپ کے اہل بیت وہ لوگ ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے یعنی علی' عقیل' جعفر اور عباس کی اولاد۔"

اہل بیت کے عموم میں اہل قرابت کے شامل ہونے کی دلیل ام المؤمنین عائشہ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم نے فضائل الصحابہ باب فضل اہل البیت میں نقل کی ہے :

خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ غَدَاةٍ وَ عَلَيْهِ مِرْطٌ مِنْ شَعْرٍ اَسْوَدَ فَجَلَسَ فَاَتَتْ فَاطِمَةُ فَاَدْخَلَهَا فِيْهِ ثُمَّ جَاءَ عَلِيٌّ فَاَدْخَلَهٗ فِيْهِ ثُمَّ جَاءَ حَسَنٌ فَاَدْخَلَهٗ فِيْهِ ثُمَّ جَاءَ حُسَيْنٌ فَاَدْخَلَهٗ فِيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا.

"نبی ﷺ ایک دن صبح کے وقت گھر سے نکلے اور آپ نے سیاہ بالوں کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جب بیٹھے تو فاطمہ آگئی آپ نے اسے اپنی چادر کے نیچے داخل کر دیا' اس کے بعد حضرت علیؓ آئے تو اسے بھی چادر کے نیچے داخل کر دیا' اس کے بعد حسن آئے تو اسے بھی چادر کے نیچے داخل کر دیا اور پھر جب حسین آئے تو اسے بھی اپنے ساتھ چادر کے نیچے داخل کر دیا جب چاروں آپ کے ساتھ چادر کے نیچے جمع ہو گئے تو فرمایا اے میرے اہل بیت اللہ

(۱) مسلم باب فضائل علی

چاہتا ہے کہ تم سے آلودگی دور کردے اور تم کو پاک وصاف بنادے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد اور اہل قرابت بھی اہل بیت میں شامل ہیں اور آیت ان پر بھی صادق آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ازواج نبی کے ساتھ اولادِ رسول کو بھی ہر قسم کی اعتقادی، عملی اور اخلاقی آلودگیوں سے پاک وصاف رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ نے اہل بیت سے آلودگیاں دور کرنے اور ان کو پاک و صاف رکھنے کا تکوینی طور پر ارادہ کرلیا ہے اگر یہ تکوینی ارادہ ہے تو پھر تو اہل بیت معصوم تھے اس لئے کہ تکوینی طور پر اللہ جو چاہتا ہے وہ ہوجاتا ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہم جب سیاق و سباق پر غور کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشریعی ارادہ ہے کُنْ فیکونی حکم نہیں ہے اس لئے کہ اس سے قبل بھی عفت و پاکدامنی اور نماز، زکوۃ کے بارے میں شرعی احکام بتائے گئے ہیں اور اس کے بعد بھی آیات واحکام کو یاد رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاق و سباق میں آیت کا مفہوم یہی سامنے آتا ہے کہ ان احکام وہدایات کی پابندی تم پر اس لئے لازم کی گئی ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے نتیجے میں تم سے آلودگیاں دور ہوجائیں اور تم کردار اور اخلاق کی خرابیوں سے پاک وصاف ہوجاؤ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت ۶ میں وضوء، غسل اور تیمم کے شرعی احکام دینے کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ :

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ.

"اللہ تم پر کوئی تنگی اور سختی کرنا نہیں چاہتا بلکہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے۔"

یعنی وضوء اور غسل کا حکم تم کو بلاوجہ تنگ کرنے کے لئے نہیں دیا گیا بلکہ تمہارے جسم کی طہارت اور صفائی کے لئے دیا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ احزاب میں اہل بیت کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ شرعی احکام و آداب کی پابندی کا حکم تم کو بلاوجہ تنگ کرنے کے لئے نہیں دیا گیا بلکہ تمہارے اخلاق و کردار کو پاک وصاف رکھنے کے لئے دیا گیا ہے۔ جس طرح جسم کی

صفائی پانی کے استعمال ہی سے ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اخلاق و کردار کی صفائی بھی شرعی آداب کی پابندی ہی سے ہو سکتی ہے۔

(۲) تفسیر القرآن بالسنۃ الثابتۃ عن رسول اللہ ﷺ :

اہل سنت کے نزدیک قرآن کریم کے فہم و تفہیم اور تفسیر و تاویل کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے جو اقوال و افعال ثقہ و معتمد راویوں کے ذریعے سند متصل کے ساتھ ہم تک پہنچے ہوں وہ قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کا دوسرا معتمد ذریعہ ہیں اور سنت ثابتہ غیر منسوخہ کے خلاف تفسیر کرنا اہل سنت کے نزدیک تحریف متصور ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ :

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ.

"وہ ان کو قرآن کی تعلیم دے گا۔" (۱)

ظاہر ہے کہ تعلیم صرف الفاظ پڑھ کر سنانے کو نہیں کہتے بلکہ مفاہیم و معانی اور احکام و معارف سمجھانے کو کہتے ہیں' جب اللہ نے اپنی کتاب کی تعلیم و تفہیم کے لئے اور اپنی ترجمانی کے لئے خود معلم اور نمائندہ پسند کر کے مقرر کر لیا ہے تو اس کی تعبیر و تفسیر کے خلاف قرآن کی ترجمانی کرنا انحراف ہی سمجھا جائے گا۔ کسی حکمران کا نمائندہ اس کے پیغام کی جو تشریح کرتا ہے وہی مستند تشریح سمجھی جاتی ہے اور اس کے خلاف اگر کوئی شخص تعبیر کرتا ہے تو وہ اس کی اپنی رائے تو ہو سکتی ہے مگر حکمران کی نمائندگی نہیں ہو سکتی اسی طرح حاکم حقیقی نے جب اپنی کتاب کی تعلیم کے لئے اور اپنی نمائندگی کے لئے اپنا رسول منتخب کر لیا ہے تو اس کے ثابت شدہ اقوال و افعال کے خلاف قرآن کی تفسیر کرنا تحریف و انحراف تو ہو سکتا ہے مگر قرآن کی تعلیم و تفہیم نہیں ہو سکتی۔

اللہ کے نبی کی ذمہ داری صرف قرآن کے الفاظ و کلمات پہنچانا نہیں ہے بلکہ قرآن کے

---

(۱) البقرہ ۱۲۹۔ آل عمران ۱٦٤۔ الجمعہ ۲

معانی کا بیان اور وضاحت بھی ان کا فرض منصبی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

اِنَّا اَنزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝
(النحل ٤٤)

"بے شک ہم نے اتاری ہے تیرے پاس ایک یادداشت تاکہ تو وضاحت اور تشریح کرے لوگوں کے لئے اس یادداشت کی جو تیرے پاس نازل کی گئی ہے اور تاکہ لوگ خود بھی غور و فکر کریں۔"

اس آیت میں فکر کا ذکر تبیین رسول کے بعد کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان رسول کی روشنی میں غور و فکر کرنا چاہئے تاکہ قرآن کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کی جاسکے اس لئے کہ جو لوگ بیان رسول کو نظر انداز کر کے اپنی آزاد رائے سے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ قرآن کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے سے اکثر محروم رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے احکام کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔

اِنَّا اَنزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِيْنَ خَصِيْمًا۝ (النساء ۱۰۵)

"بے شک ہم نے اتاری ہے تیرے پاس کتاب حق کے ساتھ تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو ان احکام کے مطابق جو اللہ نے تم کو سمجھائے ہیں اور نہ بنو تم خیانت کرنے والوں کے طرف دار۔"

بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو قرآن کے احکام ومعارف بھی سمجھائے ہیں یعنی آپ کے قلب پر صرف الفاظ ہی نہیں اتارے بلکہ معانی و مفاہیم بھی اتارے ہیں اور نبی کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اللہ کے بتائے گئے معانی و مفاہیم کے مطابق لوگوں کے تنازعات اور معاملات کے فیصلے کریں اور خیانت کرنے والوں کی طرف

داری نہ کریں۔ جو لوگ حقوق العباد میں خیانت کرتے ہیں یعنی لوگوں کی جان' مال اور آبرو کو نقصان پہنچاتے ہیں صرف وہی خائنین نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اللہ کے حقوق میں خیانت کرتے ہیں اور اللہ کی کتاب کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر فیصلے کرتے ہیں وہ سب سے بڑے خائنین ہیں۔ دونوں قسم کے خیانت کرنے والوں کی وکالت اور طرفداری نہیں کرنی چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی' آپ کے تمام اقوال وافعال اور آپ کے تمام فیصلے قرآن کی تفسیر ہیں اس لئے کہ آپ کی پوری زندگی قرآنی تعلیمات کا عکس تھی۔ صحاح ستہ' مسند احمد اور حدیث و تفسیر کی دوسری کتابوں میں ہزاروں احادیث کا جو ذخیرہ امت مسلمہ کے پاس محفوظ ہے یہ سب قرآن کی تفسیر ہیں۔ اگرچہ ان روایات میں مستند اور غیر مستند صحیح اور غیر صحیح دونوں قسم کی روایات موجود ہیں بلکہ ان میں اسرائیلی روایات بھی آگئی ہیں لیکن امت کے پاس اصول حدیث اور اسماء الرجال سے متعلق علوم بھی موجود ہیں جن کی روشنی میں مجددین اسلام اور محدثین عظام نے نقد و تنقید اور بحث و تحقیق کے بعد مستند اور غیر مستند روایات اور احادیث رسول اور اسرائیلی روایات کو الگ الگ کر دیا ہے اور علماء راسخین کو قرآن کی تفسیر کرتے وقت صحیح اور مقبول احادیث رسول معلوم کرنے میں اب دقت پیش نہیں آتی۔

تفسیر القرآن بالسنۃ الثابتۃ کی چند مثالیں :

اصول تفسیر میں اس اہم ترین اصول کی وضاحت کے لئے قرآن کی تفسیر بذریعہ سنت رسول کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ تفسیر قرآن کے صحیح منہج سے فہم قرآن کا ذوق و شوق رکھنے والے طلبہ واقف ہو سکیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے الاتقان فی علوم القرآن کے آخر میں سورتوں کی ترتیب کے مطابق وہ احادیث مرفوعہ نقل کی ہیں جو قرآنی آیات کی تفسیر کے

بارے میں وارد ہوئی ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ :

فَهٰذَا مَا حَضَرَنِیْ مِنَ التَّفَاسِیْرِ الْمَرْفُوْعَةِ الْمُصَرَّحِ بِرَفْعِهَا صَحِیْحِهَا وَ حَسَنِهَا وَ ضَعِیْفِهَا وَ مُرْسَلِهَا وَ مُعْضَلِهَا وَ لَمْ أُعَوِّلْ عَلَی الْمَوْضُوْعَاتِ وَالْاَبَاطِیْلِ.

"یہ وہ صراحتاً مرفوع تفاسیر ہیں جو میرے ذہن میں آئی ہیں خواہ صحیح ہوں' حسن ہوں' ضعیف ہوں' مرسل ہوں یا معضل ہوں لیکن موضوع اور جھوٹی احادیث کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔"(۱)

سیوطی کی یہ بہت بڑی خدمت ہے جس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن میں نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر اور سنن ترمذی کی کتاب التفسیر کو سامنے رکھ کر مختلف سورتوں سے جو مثالیں براہ راست اخذ کی ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

(۱) اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (الانعام ۸۲)

"جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا تو یہی لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔"

چونکہ ظلم کا اطلاق ہر گناہ پر بھی ہوتا ہے خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ہو اس لئے اس آیت کے نزول سے صحابہ پر بڑا خوف طاری ہوا اور وہ کہنے لگے کہ اَیُّنَا لَمْ یَظْلِمْ ہم میں سے کون ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو یعنی جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی گناہ نہ کیا ہو؟ اگرچہ اس شبہے کا ازالہ وَلَمْ یَلْبِسُوْا کے معنے میں تدبر کرنے سے بھی ہو سکتا تھا اس لئے کہ لبس کے معنے ہیں خلط اور ملاوٹ اور ایمان کی جگہ دل ہے اور دل میں جس چیز کی ملاوٹ کا خطرہ ہے وہ کفر و شرک کا عقیدہ ہی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ اس باریک نکتے کی طرف ہر شخص کا ذہن متوجہ نہیں ہو سکتا اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس آیت میں لفظ ظلم کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا

(۱)الاتقان طبع دار ابن کثیر دمشق۔ بیروت ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۳۷ تا ۱۲۸۸ ج ۲

کہ اس سے مراد شرک ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں لقمان حکیم کا قول نقل ہوا ہے کہ :

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ○ (لقمان ۱۳)

"اے میرے بیٹے! اللہ کی ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنا و یقیناً شرک بڑا ظلم ہے۔"(۱)

اب اس حدیث کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ سامنے آتا ہے کہ جو لوگ اللہ کو مانتے ہوں اور ان کے دل میں شرک کا کوئی عقیدہ موجود نہ ہو تو عذاب سے مکمل امن اسی خالص ایمان والوں کے لئے مخصوص ہے اور یہی لوگ کامل ہدایت پانے والوں میں شامل ہیں اگرچہ ان سے کچھ گناہ بھی صادر ہوئے ہوں مگر مشرکانہ ایمان والوں کے لئے عذاب سے نجات کا کوئی امکان نہیں ہے اور وہ راہ راست سے مکمل طور پر بھٹکے ہوئے ہیں۔

(۲) وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ○ (الحجر ۸۷)

"بے شک ہم نے تم کو سات دھرائی جانے والی آیتیں دی ہیں اور عظیم قرآن دیا ہے۔"

آیت کے الفاظ سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ سات آیتیں کونسی ہیں اور ذہین سے ذہین تر انسان بھی بیان رسول کے بغیر اپنی رائے سے ان آیات کا تعین نہیں کر سکتا مگر حدیث رسول میں سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کی تفسیر مروی ہے۔

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ.

"الحمد للہ رب العالمین ہی وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار دھرائی جاتی ہیں اور یہی عظیم قرآن ہے۔"(۲)

اس مرفوع حدیث سے معلوم ہوا کہ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ سے سورہ فاتحہ مراد ہے جس کی سات آیتیں ہیں اور جو ہر نماز میں دھرائی جاتی ہیں چونکہ یہ قرآن کریم کے مضامین کی

(۱) بخاری کتاب التفسیر سورہ انعام

(۲) بخاری کتاب التفسیر سورہ حجر

جامع سورت ہے اس لئے اس کو قرآن عظیم بھی کہا گیا ہے۔

(۳) حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَا ذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا الْحَقَّ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُO (السباء ۲۳)

"یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ حق بات کہی ہے اس کی ذات بھی بلند ہے اور اس کی شان بھی بڑی ہے۔"

اس آیت کے کلمات سے اور نظم کلام سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟ ان کے خوف و گھبراہٹ کی وجہ کیا ہے؟ پوچھنے والے کون ہیں؟ اور جواب دینے والے کون ہیں؟

حدیث رسول کو نظر انداز کر کے کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی ان سوالات کو حل نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے آیت ۲۲ میں مشرکین کے آلہہ باطلہ کی الوہیت اور شفاعت کی نفی تو کی گئی ہے لیکن نام نہیں لئے گئے کہ یہ کون ہیں۔ مگر حدیث میں وضاحت کی گئی ہے کہ اس آیت میں فرشتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

عن ابی هريرة اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اِذَا قَضَى اللّٰهُ الْاَمْرَ فِي السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَاَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا لِلَّذِيْ قَالَ الْحَقَّ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ.

"ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں میں کسی کام کا حکم دیتا ہے تو اس کے کلام سے فرشتے ایسی آواز سنتے ہیں جیسے صاف اور ہموار پتھر پر زنجیر کھینچنے کی آواز ہوتی ہے۔ اس آواز کے خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے فرشتے اپنے پر ہلاتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتے ہیں اور جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو نیچے والے اوپر والوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے اوپر والے اللہ کی حکم کے

بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے حق بات کہی ہے اور وہ علی الذات اور کبیر الشان ہے۔"

اس حدیث کی روشنی میں اب آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے کلام اور حکم کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ فرشتے اس کو سن کر خوفزدہ اور مرعوب ہو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے مقرب ترین بندے ہیں تو جو لوگ اللہ کے کلام سے بغاوت کر کے اس کے ساتھ فرشتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور ان کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں تو وہ ایسے لوگوں کی سفارش کب کر سکتے ہیں؟ اس لئے مشرکین کا فرشتوں کو اپنے سفارشی سمجھنا جھوٹ ہے اور خود ساختہ عقیدہ ہے۔

(٤) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُo (القمر ١)

"قیامت بہت زیادہ قریب آگئی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے۔"

اگر حدیث رسول کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو آیت کے الفاظ سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ شق قمر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس میں نفخ صور اور فنائے دنیا کے وقت ہونے والے شق قمر کی طرف اشارہ ہے یا یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے؟ صیغہ اگرچہ ماضی کا ہے لیکن مستقبل میں جس چیز کا وجود پذیر ہونا یقینی ہو تو بلغاء کے کلام میں مبالغتاً اس کا ذکر ماضی کے صیغے میں کیا جاتا ہے اور قرآن میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّo (المائدہ ١١٦)

"اور جب اللہ کہے گا کہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ معبود بنالو؟ وہ کہے گا کہ تو پاک ہے شریکوں سے میرے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ میں وہ بات کہوں جو حق نہ ہو۔"

یہ مکالمہ قیامت کے دن ہوگا لیکن چونکہ اس کا ہونا یقینی ہے اس لئے اس کا ذکر ماضی کے صیغے میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح شق قمر کی آیت کی بھی یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ اس میں

نفخ صور کے وقت وقوع پذیر ہونے والے شق قمر کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن ہم جب اس آیت کی تفسیر کے لئے احادیث رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں تو متواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شق القمر کا معجزہ دور نبوی میں رونما ہو چکا ہے۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنْشَقَّ الْقَمَرُ وَ نَحْنُ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَصَارَ فِرْقَتَيْنِ فِرْقَةً فَوْقَ الْجَبَلِ وَ فِرْقَةً دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِشْهَدُوْا.

"عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ چاند پھٹ کے دو ٹکڑے ہو گیا تھا اور اس وقت ہم نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر تھے ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور دوسرا ٹکڑا اس کے نیچے تھا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گواہ رہو گواہ رہو۔"(۱)

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ معجزہ ہجرت سے ۵ سال قبل رونما ہوا تھا اور اس بارے میں صحیح احادیث تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شق قمر کا معجزہ رونما ہو چکا ہے اور اس سے نفخ صور کے وقت رونما ہونے والا شق قمر مراد نہیں ہے البتہ یہ معجزہ اس کے امکان کی دلیل ہے۔

(۵) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝

(الانشقاق ۷۔۸)

"پس جس کو دیا گیا ہو اس کا عمل نامہ دائیں ہاتھ میں تو اس کے ساتھ آسان حساب کیا جائے گا۔"

"حساب یسیر" کا لفظی معنے سمجھنا تو کوئی مشکل نہیں ہے لیکن اس آسانی کی نوعیت کیا ہو گی؟ اس کا تعین بیان رسول کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی نوعیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ذَالِكَ الْعَرْضُ اس سے مراد صرف پیشی ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ اَحَدٌ یُحَاسَبُ اِلَّا هَلَكَ قَالَتْ

---

(۱) بخاری کتاب التفسیر سورہ قمر

قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ جَعَلَنِي اللّٰهُ فِدَاءَ كَ اَلَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا قَالَ ذَاكَ الْعَرْضُ يُعْرَضُوْنَ وَ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ هَلَكَ.(۱)

"عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے ساتھ بھی حساب کیا جائے گا تو وہ تباہ ہو جائے گا' عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول مجھے اللہ آپ پر قربان کرے کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کو اس کا عمل نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس کے ساتھ آسان حساب کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا یہ تو پیشی ہے یعنی دائیں ہاتھ والے اللہ کے سامنے صرف پیش کئے جائیں گے ان کے ساتھ مناقشہ اور جواب طلبی نہیں ہو گی اور جس کے ساتھ مناقشہ ہو گا اور جس سے جواب طلبی ہو گی تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔"

عائشہؓ کو اشکال یہ تھا کہ آسان جساب کا مطلب تو یہی ہے کہ اسے عذاب نہیں دیا جائے گا لیکن رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر حساب کے نتیجے میں عذاب دیا جائے گا۔ اس اشکال کے ازالے کے لئے آپ نے فرمایا کہ آیت میں حساب یسیر سے مراد مناقشے اور جواب طلبی کے بغیر صرف پیش ہونا ہے اور میرا مقصد حساب بالمناقشہ ہے یعنی جس کے اعمال کا تفصیلی حساب لیا جائے گا اس پر جرح واعتراضات کئے جائین گے اور اس سے جوابات طلب کئے جائیں گے تو وہ عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔ اگر رسول اللہ ﷺ وضاحت نہ فرماتے تو ہم نہ آیت کا صحیح مفہوم سمجھ سکتے تھے اور نہ آیت اور حدیث کا تعارض دفع کر سکتے تھے۔

(٦) لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ۝ (یونس ٢٦)

"جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے لئے جنت کی اچھی زندگی ہے اور زائد نعمت بھی۔"

احسان سے مراد ہے اخلاص یعنی خالص اللہ کی عبادت کرنا اور ہر قسم کے شرک سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا اور الحسنٰی سے مراد ہے اَلْحَيٰوةُ الْحُسْنٰى "اچھی زندگی" یعنی جنت کی

---

(۱) بخاری فی التفسیر الانشقاق

زندگی لیکن زیادت یعنی مزید نعمت سے مراد کیا ہے؟اس کا تعین لفظ کے لغوی معنی سے بھی نہیں ہو سکتا اور سیاق کلام سے بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد دیدار الٰہی ہے جو اہل ایمان کو جنت میں نصیب ہو گی۔

عَنْ صُهَيْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ قَوْلِهِ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ نَادٰى مُنَادٍ اِنَّ لَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ مَوْعِدًا يُّرِيْدُ اَنْ يُّنْجِزَكُمُوْهُ قَالُوْا اَلَمْ يُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا وَ يُنْجِنَا مِنَ النَّارِ وَ يُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ؟ قَالَ فَيُكْشَفُ الْحِجَابُ قَالَ فَوَ اللّٰهِ مَا اَعْطَاهُمُ اللّٰهُ شَيْئًا اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ اِلَيْهِ.(۱)

"صہیب" سے مروی ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ کی تفسیر میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک منادی اعلان کرے گا کہ اے جنتیو اللہ نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا اور وہ چاہتا ہے کہ تم سے اپنا وعدہ پورا کرے' وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کیا اس نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟ کیا اس نے ہم کو دوزخ کی آگ سے نجات نہیں دی؟ اور کیا اس نے ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا؟ یعنی سب کچھ تو مل گیا ہے تو اور کونسا وعدہ ہے جو ابھی تک پورا نہیں ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس موقع پر پردہ اٹھا لیا جائے گا اور اہل جنت کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہو جائے گا۔ فرمایا اللہ کی قسم! نہیں دی ہو گی اللہ نے ان کو کوئی چیز جو ان کو اللہ کی رؤیت سے زیادہ محبوب ہو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کی ساری نعمتوں پر مزید نعمت اور ان سب سے بڑی نعمت دیدار الٰہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان والوں کے دلوں میں اللہ کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ اور محب صادق کے نزدیک اپنے محبوب کی رؤیت اور ملاقات سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہو سکتی' اس کے علاوہ ہر شخص نفسیاتی طور پر

(۱) سنن ترمذی کتاب التفسیر سورہ یونس

اپنے محسن کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اہل جنت پر اللہ نے دنیا میں' برزخ میں اور جنت میں جتنے احسانات اور انعامات کیے ہیں ان کا شمار بھی ممکن نہیں ہے اس لئے فطری اور نفسیاتی طور پر ان کی سب سے بڑی اور حقیقی مسرت اور لذت اپنے محسن کو دیکھنے ہی سے حاصل ہو گی' اس کے علاوہ قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ایمان جنت میں اللہ کے مہمان ہوں گے اور جنت کی بے بہا اور بے مثال نعمتیں ان کی ضیافت ہوں گی۔ اگر مہمان کھانے پینے کی چیزوں سے تو لطف اندوز ہو جائے مگر اپنے میزبان کو دیکھ نہ سکے تو اسے وہ مہمان نوازی اور ضیافت میں بہت بڑی تشنگی اور کمی محسوس کرے گا اس لئے جنت میں اللہ تعالی اپنے مہمانوں کو جنت کی نعمتوں کے علاوہ اپنی شان الوہیت کے مطابق ان کی سامنے جلوہ افروز بھی ہو گا اور وہ اسے پہچان لیں گے کہ یہ ہے ہمارا خالق' مالک' محسن اور محبوب۔ اس آیت میں زیادۃ کے معنے زائد از ضرورت نہیں ہیں بلکہ سب سے فائق نعمت مراد ہے جو ان کو دنیا میں نصیب نہیں ہوئی تھی۔ باقی رہا معتزلہ اور دور حاضر کے متجددین اور مستشرقین کا یہ سوال کہ اللہ کی ذات جسمانیت اور مادیت سے منزہ ہے تو انسان کی آنکھیں اسے کس طرح دیکھ سکیں گی؟

تو ان کے اس تحیر اور تعجب کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آخرت میں اہل ایمان کو دی جانے والی آنکھوں کو دنیوی آنکھوں پر قیاس کر لیا ہے حالانکہ دنیا اور آخرت کی چیزوں کے صرف نام یکساں ہیں حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی یکسانیت نہیں ہے اس لئے موت کے بعد کی چیزوں کو دنیوی اشیاء پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے جنت میں اللہ تعالی اپنے مہمانوں کی آنکھوں کو وہ قوت وصلاحیت دیدیگا جس سے وہ اپنے رب کو دیکھ سکیں گے اور پہچان سکیں گے۔ اس کے علاوہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور جدید میں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ آج کل تو ایسے آلات اور ایسی آنکھیں ایجاد ہوئی ہیں جن سے غیر مادی چیزوں اور برقی لہروں کو نہ صرف یہ کہ دیکھا جاتا ہے بلکہ اس کی توانائی کی تعیین اور تحدید بھی کی جا سکتی ہے۔ بہر حال جنت میں دیدار الہی اور رؤیت باری تعالی کے

ثبوت میں آیات قرآنی اور احادیث متواترہ موجود ہیں اور صحابہ و تابعین وائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور یہ اہل سنت کے اصول میں شامل ایک اجماعی عقیدہ ہے اس وقت اس عقیدے کی تفصیل پیش نظر نہیں ہے بلکہ سورہ یونس کی مذکورہ آیت میں لفظ وَ زِيَادَةٌ کا مفہوم زیر غور ہے جو حدیث مذکور سے متعین ہو گیا ہے۔فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ.

(۷) لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ٥ (یونس ٦٤)

"اللہ کے ان اولیاء کے لئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

آخرت کی بشارت تو ظاہر ہے کہ جنت ہے لیکن دنیا میں وہ کونسی بشارت اور خوشخبری ہے جو اولیاء اللہ کو دی جاتی ہے؟ اس کی وضاحت حدیث رسول میں اس طرح کی گئی ہے کہ یا تو یہ خود اچھے خواب اور مبشرات دیکھیں گے جن میں ان کے روشن اور اچھے مستقبل کی بشارت ہوگی یا ان کے حق میں دوسرے اہل ایمان اور اولیاء اللہ اس قسم کے خواب دیکھیں گے' اولیاء کے خواب اگرچہ کسی چیز کی حرمت یا وجوب کی دلیل تو نہیں بن سکتے اور قرآن و سنت کے احکام کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن اگر کوئی اچھا خواب شرعی اصول واحکام سے متصادم نہ ہو تو وہ کسی خوبی یا اچھے مستقبل کی طرف ایک اشارے کا درجہ تو رکھتا ہے اور اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہامات اور اشارات بیداری اور خواب دونوں حالتوں میں ہوتے رہتے ہیں' مذکورہ آیت میں اَلْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سے مراد یہی بشارات اور اشارات ہیں۔

عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ تُرٰى لَهٗ.(۱)

"ابو الدرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں بشارت سے مراد اچھے خواب ہیں جو کوئی مسلمان خود دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کسی دوسرے مسلمان کو دکھایا جاتا ہے۔"

(۱) ترمذی کتاب التفسیر یونس ٦٤

(٨) وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۝

(بنی اسرائیل ۷۹)

"اور رات کے کچھ حصے میں سو کر نماز میں قرآن پڑھنے کے لئے اٹھ جایا کرو (یعنی تہجد کی نماز پڑھا کرو) یہ تیرے لئے ایک زائد عبادت ہے' قریب ہے کہ تیرا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کر دے گا۔"

رسول اللہ ﷺ کو ختم نبوت اور اولاد آدم کی سیادت کا جو لا مثال مقام اور درجہ دیا گیا ہے وہ قرآن و سنت کی دیگر نصوص سے اہل ایمان کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے اور محتاج بیان نہیں ہے لیکن اس آیت میں جس "مقام محمود" (یعنی قابل تعریف منصب اور مرتبہ) پر فائز کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ابھی ملا نہیں ہے بلکہ قیامت کے روز ملے گا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسا منصب اور مقام ہے جو آپ کو دیا جائے گا؟ اس سوال کا جواب آیت کے الفاظ سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا اور سیاق و سباق سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ اس مقام کا تعین خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے کہ اس سے مراد اہل محشر کے لئے حساب شروع کرنے اور محشر کی تکالیف و مصائب سے نجات دلانے کے لئے شفاعت کبریٰ مراد ہے۔ جس سے آدم علیہ السلام' نوح علیہ السلام' ابراہیم علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام معذرت کر لیں گے مگر محمد رسول اللہ ﷺ اجازت طلب کریں گے اور اجازت ملنے پر سجدے کی حالت میں شفاعت کریں گے اور یہ شفاعت قبول کر لی جائے گی۔

صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ بنی اسرائیل میں یہ حدیث تفصیل کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ مذکورہ آیت میں مقام محمود سے مراد یہی شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص ہے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا وَ سُئِلَ عَنْهَا قَالَ هِيَ الشَّفَاعَةُ.(١)

(١) [illegible] کتاب التفسیر سورہ بنی اسرائیل

"ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جب کہ آپ سے مقام محمود کے بارے میں سوال کیا گیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اس مقام سے مراد شفاعت ہے۔"

(۹) وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مریم ۷۱)

"اور نہیں ہے تم میں سے کوئی بھی مگر وارد ہونے والا ہے جہنم پر یہ تیرے رب کے ذمے لازم ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے پھر ہم بچالیں گے ان کو جنہوں نے شرک سے اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا اور چھوڑ دیں گے مشرکوں کو اس میں گھٹنوں پر بیٹھے ہوئے۔"

اس آیت کے فہم اور تفہیم کے وقت ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ منکم میں مخاطب کون لوگ ہیں اگر چہ اس سے ما قبل منکرین آخرت اور کفار کے عذاب کا ذکر ہوا ہے جس کو مد نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ مخاطب کفار ہیں اور ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ اے انکار کرنے والو! تم سب جہنم میں جاؤ گے یہ اللہ کا قطعی فیصلہ ہے لیکن اس کے متصل بعد کہا گیا ہے کہ پھر ہم تقویٰ والوں کو بچالیں گے۔ اگر مخاطب کفار ہیں تو پھر اس فقرے کی کوئی مناسبت اور توجیہ بیان نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ کفار اور مشرکین کو نہ متقی کہا جاسکتا ہے اور نہ ان کو نجات مل سکتی ہے اور اگر اس کے مخاطب مؤمنین ہیں تو اگر چہ بعض مؤمنین اپنے گناہوں کی سزا کاٹنے کے لئے دوزخ میں جائیں گے اور پھر نکال دیئے جائیں گے لیکن ایسے مؤمنین بھی ہیں جو دوزخ سے محفوظ رہیں گے جیسا کہ سورہ انبیاء میں فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (الانبیاء ۱۰۱)

"یقیناً جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے اچھی زندگی کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے وہ دوزخ سے دور ہی رکھے جائیں گے اور وہ اس کی آہٹ تک نہ سنیں گے۔"

یعنی جن لوگوں کو عذاب کے بغیر جنت میں لے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ جہنم میں

داخل نہیں ہوں گے بلکہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے اور ہماری زیر غور آیت میں تو کہا گیا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی جہنم پر وارد ہونے سے نہیں بچ سکے گا' جب کفار بھی مراد نہیں لئے جاسکتے اور مومنین بھی مراد نہیں لئے جاسکتے تو پھر اس خطاب کے مخاطب کون ہیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے وَارِدُھَا کے لفظ کا لغوی معنی بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد سنت رسول میں اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کا ذکر کیا جائے گا تاکہ لغت اور سنت دونوں کی روشنی میں آیت کا مفہوم معلوم کیا جاسکے۔

ورود کے لغوی معنے

ع ...) امہات الکتب میں ائمہ لغت نے وَرَدَ یَرِدُ وُرُوْدًا کی جو لغوی تحقیق کی ہے

ا تا ہے کہ اس لفظ کے حقیقی معنے دُخول نہیں ہیں بلکہ بلوغ' حضور اور اتیان

ضر ہونا اور آجانا ہیں۔ کبار ائمہ لغت کے معاجم کے حوالے ملاحظہ کیجئے۔

سور محمد بن احمد الازہری متوفی ۳۷۰ھ :

لغةِ وَرَدْتُ بَلَدَ كَذَا وَ مَاءَ كَذَا إِذَا أَشْرَفَ عَلَيْهِ دَخَلَهُ أَوْ لَمْ يَدْخُلْه

دْنَ الْمَاءَ زُرْقًا جِمَامُهُ وَضَعْنَ عِصِيَّ الْحَاضِرِ الْمُتَخَيِّمِ الْمَعْنى لَمَّا

نَ فَالْوُرُوْدُ بِإِجْمَاعٍ لَيْسَ بِدُخُوْلٍ.(۱)

بان میں وَرَدْتُ بَلَدَ كَذَا وَ مَاءَ كَذَا اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص

پہنچ گیا ہو اور اس پر جھانک رہا ہو خواہ اس میں داخل ہوا ہو یا داخل نہ ہوا ہو۔

شعر میں فَلَمَّا وَرَدْنَ الْمَاءَ کے معنے ہیں فَلَمَّا بَلَغْنَ یعنی ... وہ پانی

ے ورود کے معنے بالاجماع دخول نہیں ہیں۔"

(۱) تہ ...زہری طبع بیروت ۲۰۰۱ء۔ ۱۴۲۱ھ ص ۱۱۷ ج ۱۴ مادہ ورد

(۲) علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری متوفی ۳۹۳ھ:

وَرَدَ فُلَانٌ وُرُوْدًا حَضَرَ وَ اَوْرَدَهُ غَيْرُهُ وَاسْتَوْرَدَهُ اَحْضَرَهُ.(۱)

"وَرَدَ فُلَانٌ کے معنے ہیں فلاں حاضر ہو گیا اور اَوْرَدَهُ غَيْرُهُ یا اِسْتَوْرَدَهُ کے معنے ہیں دوسرے شخص نے اسے حاضر کر دیا۔"

(۳) علامہ ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ:

انہوں نے اپنی مشہور اور متداول کتاب لسان العرب میں بلفظہ وہی عبارت ذکر کی ہے جو جوہری کی الصحاح میں عربی محاورہ سے نقل کی گئی ہے۔(۲)

(۴) علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ:

اَلْوِرْدُ اَلْاِشْرَافُ عَلَى الْمَاءِ وَ غَيْرِهِ دَخَلَهُ اَوْ لَمْ يَدْخُلْهُ.(۳)

"ورد اور ورود کے معنے ہیں پانی پر یا کسی دوسری جگہ پر جھانکنا خواہ اس میں داخل ہوا ہو یا داخل نہ ہوا ہو۔"

(۵) قاموس کے شارح علامہ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ:

كُلُّ مَنْ اَتٰى مَكَانًا فَقَدْ وَرَدَ .... لِاَنَّ الْعَرَبَ تَقُوْلُ وَرَدْنَا مَاءَ كَذَا وَ لَمْ يَدْخُلُوْهُ.(۴)

"جو شخص کسی جگہ پر آیا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ وارد ہوا تھا اس لئے کہ عرب کہتے ہیں ہم فلاں پانی پر وارد ہوئے تھے حالانکہ وہ اس پانی میں داخل نہیں ہوتے۔"

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ پہنچنے اور حاضر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا

---

(۱) الصحاح للجوہری طبع قاہرہ ۱۹۸۴ء ص۵۴۹ ج۲ مادہ ورد

(۲) لسان العرب ص۴۵۷ ج۳ مادہ ورد

(۳) القاموس المحیط طبع بیروت ۱۹۸۷ء ص۴۱۵ مادہ ورد

(۴) تاج العروس شرح القاموس طبع بیروت ۱۹۷۱ء ص۲۸۹ ج۹ مادہ ورد

کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ. (القصص ۲۳)

"اور جب وہ پہنچے مدین کے پانی پر۔"

ممتاز ائمہ لغت کی مذکورہ لغوی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ وُرود کے مشہور اور حقیقی معنے ہیں بلوغ' حضور اور اتیان۔ اگرچہ قرآن کریم میں یہ لفظ دخول کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً مشرکین اور ان کے معبودین یعنی ان کے ائمہ الشرک کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَO (الانبیاء ۹۸)

"بے شک تم اور وہ معبودین جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا سب کے سب دوزخ کا ایندھن بنو گے اور تم سب اس میں داخل ہو گے۔"

یہاں پر وَارِدُوْنَ دَاخِلُوْنَ کے معنوں میں آیا ہے اس لئے کہ ایندھن آگ کے اندر ہوتا ہے باہر تو نہیں ہوتا مثلاً فرعون کے بارے میں کہا گیا ہے کہ :

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَO (ھود ۹۸)

"قیامت کے روز فرعون اپنی قوم کے آگے ہوگا اور لے آئے گا ان کو دوزخ میں۔"

یہاں پر بھی فَاَوْرَدَهُمْ اَدْخَلَهُمْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ فرعون اور اس کی قوم جہنم کے اندر جائے گی باہر تو نہیں رہ سکتی۔ لیکن ہماری زیر غور آیت میں لفظ وَارِدُهَا کے معنے داخل ہونے کے نہیں لئے جا سکتے اس لئے کہ اگر کفار مراد لئے جائیں تو ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا کی ساتھ تعارض آتا ہے اس لئے کہ کفار کو تو متقی نہیں کہا جا سکتا اور اگر مؤمن مراد لئے جائیں تو وہ تو سب کے سب جہنم میں داخل نہیں ہوں گے بلکہ ان میں سے بعض کو جہنم سے دور رکھا جائے گا جیسا کہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۱ سے ثابت ہوتا ہے اور اگر

بعض مؤمن مراد لئے جائیں تو وَ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کے ساتھ تعارض لازم آتا ہے کیونکہ وَ اِنْ مِّنْکُمْ استغراق پر دلالت کرتا ہے یعنی سب لوگ دوزخ پر وارد ہوں گے۔

سنت رسول کی روشنی میں وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کا مفہوم

عربی لغت سے اس آیت کے جو معنے معلوم ہوتے ہیں وہی سنت رسول سے بھی ثابت ہوتے ہیں یعنی تمام لوگ مؤمنین اور کفار سب کے سب دوزخ پر بنائے گئے پل یعنی پل صراط عبور کرنے کے لئے آئیں گے کفار تو سب کے سب دوزخ میں گر جائیں گے اور مؤمنین میں سے بعض اپنے اعمال اور درجات کے مطابق صحیح سالم گزر جائیں گے اور بعض اپنے گناہوں کی سزا کاٹنے کے لئے پل عبور کرتے وقت نیچے گر جائیں گے اور پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور اللہ کی رحمت کی بنا پر درجہ بدرجہ دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے یہاں تک کہ دوزخ میں کوئی مؤمن باقی نہیں رہے گا بلکہ سب کے سب کفار ہی رہ جائیں گے۔ پل صراط سے متعلق روایات کافی تعداد میں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے سند کے اعتبار سے بعض صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں لیکن اس کے متعلق بخاری میں ابو ہریرہؓ اور ابو سعید الخدریؓ سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل ہوئی ہے جس میں میدان محشر کے حالات، دیدار الٰہی، پل صراط، اہل ایمان کو دوزخ سے نکالنے، نہر حیوۃ میں غسل دینے اور پھر جنت میں داخل کرنے کے بارے میں تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔ اس حدیث کا متعلقہ حصہ یہ ہے :

وَ يُضْرَبُ الصِّرَاطُ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ جَهَنَّمَ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يَّجُوْزُ مِنَ الرُّسُلِ بِاُمَّتِهٖ وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ اَحَدٌ اِلَّا الرُّسُلُ وَ كَلَامُ الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ وَ فِيْ جَهَنَّمَ كَلَالِيْبُ مِثْلُ شَوْكِ السَّعْدَانِ هَلْ رَاَيْتُمْ شَوْكَ السَّعْدَانِ؟ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَاِنَّهَا مِثْلُ شَوْكِ السَّعْدَانِ غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يَعْلَمُ قَدْرَ عِظَمِهَا اِلَّا اللّٰهُ تَخْطَفُ النَّاسَ بِاَعْمَالِهِمْ

فَمِنْهُمْ مَنْ يُوْبَقُ بِعَمَلِهِ وَ مِنْهُمْ مَنْ يُخَرْدَلُ ثُمَّ يَنْجُوْ حَتّٰى اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ رَحْمَةَ مَنْ اَرَادَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ اَمَرَ اللّٰهُ الْمَلٰئِكَةَ اَنْ يُّخْرِجُوْا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَيُخْرِجُوْنَهُمْ(۱)

''اور بنا دیا جائے گا جہنم کے دونوں کونوں کے درمیان ایک پل' پس رسولوں میں سے پہلا رسول میں ہوں گا جو اپنی امت کے ساتھ اس پل سے گزرے گا' اس دن رسولوں کے علاوہ کوئی بھی بات نہیں کر سکے گا اور رسولوں کا کلام اس دن یہ دعا ہو گی کہ یا اللہ حفاظت فرما! یا اللہ حفاظت فرما! اور جہنم میں سعدان درخت کے کانٹوں کی طرح کھینچنے والے کونڈے ہوں گے' کیا تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں؟ صحابہ نے کہا جی ہاں دیکھے ہیں۔ آپ نے فرمایا بس یہ سعدان کے کانٹوں کی طرح ہوں گے بغیر اس کے کہ ان کونڈوں کی موٹائی اور چوڑائی کی مقدار اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے' یہ کونڈے لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے اچک لیں گے پس ان میں سے بعض تو اپنے اعمال کی وجہ سے تباہ ہو جائیں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کے گوشت کی بوٹیاں کاٹ دی جائیں گی مگر پھر نجات پا لیں گے' یہاں تک کہ جب اللہ تعالی دوزخیوں میں سے جن پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرشتوں کو حکم دے گا کہ جو لوگ اللہ ہی کی عبادت کرتے تھے یعنی توحید پر قائم تھے ان سب کو دوزخ سے نکال دو پس فرشتے ان کو نکال دیں گے۔''

کتاب التوحید میں ابو سعید خدری کی روایت میں پل صراط کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ :

ثُمَّ يُؤْتٰى بِالْجِسْرِ فَيُجْعَلُ بَيْنَ ظَهْرَيْ جَهَنَّمَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا الْجِسْرُ؟ قَالَ مَدْحَضَةٌ مَزِلَّةٌ عَلَيْهِ خَطَاطِيْفُ وَ كَلَالِيْبُ وَ حَسَكَةٌ مُفَلْطَحَةٌ لَهَا شَوْكَةٌ عُقَيْفَةٌ تَكُوْنُ بِنَجْدٍ يُقَالُ لَهَا السَّعْدَانُ' اَلْمُؤْمِنُ عَلَيْهَا كَالطَّرْفِ وَ كَالْبَرْقِ وَ كَالرِّيْحِ وَ كَاَجَاوِيْدِ الْخَيْلِ وَالرِّكَابِ فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ وَ نَاجٍ مَخْدُوْشٌ وَ مَكْدُوْسٌ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ

(۱) صحيح بخاری ابواب صفة الصلوة باب فضل السجود'
صحیح بخاری كتاب الرقاق باب الصراط جسر جهنم.
صحيح بخاری كتاب التوحيد باب قول الله وجوه يومئذ ناضرة

حَتّٰی یَمُرَّ آخِرُهُمْ یُسْحَبُ سَحْبًا.

"پھر ایک پل لا کر دوزخ کے دونوں کونوں کے درمیان رکھ دیا جائے گا' راوی کہتا ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول یہ پل کیسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ یہ ایک پھسلانے والا پل ہوگا (جس پر قدم جم نہیں سکتا بلکہ پھسل جاتا ہے) جس پر تیزی سے کھینچ لینے والے لوہے کے کونڈے ہوں گے اور مڑے ہوئے چوڑے کانٹے ہوں گے جو نجد کے علاقے میں پائے جاتے ہیں اور جن کو سعدان کہا جاتا ہے' بعض مؤمن اس پل سے آنکھ جھپکنے کی طرح گزر جائیں گے' بعض بجلی کی چمک کی طرح گزر جائیں گے بعض ہوا کی طرح گزر جائیں گے' اور بعض تیز رفتار گھوڑوں اور اونٹوں کی طرح گزر جائیں گے۔ پس بعض صحیح سالم حالت میں نجات پالیں گے' بعض پر خراش اور زخم آجائیں گے اور بعض دوزخ میں گرا دیئے جائیں گے' یہاں تک کہ ان میں سے آخری شخص گھسیٹ کر گزار لیا جائے گا۔"

سنن ترمذی میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَرِدُ النَّاسُ النَّارَ ثُمَّ یَصْدُرُوْنَ عَنْهَا بِاَعْمَالِهِمْ فَاَوَّلُهُمْ كَلَمْحِ الْبَرْقِ ثُمَّ كَحُضْرِ الْفَرَسِ ثُمَّ كَالرَّاكِبِ فِیْ رَحْلِهٖ ثُمَّ كَشَدِّ الرَّجُلِ ثُمَّ كَمَشْیِهٖ.(۱)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگ دوزخ کی آگ پر وارد ہوں گے اور پھر اپنے اعمال کے مطابق گزر جائیں گے۔ ان میں پہلا شخص بجلی کی چمک کی طرح گزر جائے گا پھر دوسرا ہوا کی طرح گزر جائے گا' پھر تیسرا تیز رفتار گھوڑے کی رفتار سے گزر جائے گا' پھر چوتھا اونٹ پر رکھے ہوئے کجاوے پر سوار شخص کی طرح گزر جائے گا' پھر پانچواں شخص دوڑ کر گزر جائے گا اور چھٹا شخص پیدل چلنے والے کی طرح گزر جائے گا۔"

صحیح بخاری کی یہ احادیث رسول وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی ایسی تفسیر کرتی ہیں جو

(۱) سنن ترمذی کتاب التفسیر سورہ مریم و قال هذا حدیث حسن

جنہوں نے

یعنی وارد ہو

ان دو حدیثوں

ہوں یا جو غزوہ بدر اور حدیبیہ

اسے بھی لازماً گزرنا ہوگا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دوزخ

ہوں یا کافر ہوں اور خواہ نیکوکار ہوں یا بدکار،

ٹھنڈی ہو جائے گی جس طرح ابراہیم علیہ السلام پر

سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس قول کے قائلین کی ر

ہے:

قَالَ اَبُوْ سُمَيَّةَ اِخْتَلَفْنَا هٰهُنَا فِي الْوُرُوْدِ فَقَالَ بَعْضُنَا لَا

بَعْضُهُمْ يَدْخُلُوْنَهَا جَمِيْعًا ثُمَّ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَلَقِيْتُ جَابِر

اِنَّا اِخْتَلَفْنَا فِيْ ذَالِكَ الْوُرُوْدِ فَقَالَ بَعْضُنَا لَا يَدْخُلُهَا مُؤْمِنٌ وَ قَالَ بَعْض

جَمِيْعًا فَاَهْوٰى بِاِصْبَعَيْهِ اِلٰى اُذُنَيْهِ وَ قَالَ صُمَّتَا اِنْ لَّمْ اَكُنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ ا

يَقُوْلُ اَلْوُرُوْدُ الدُّخُوْلُ لَا يَبْقٰى بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ اِلَّا دَخَلَهَا فَتَكُوْنُ عَلَى الْمُؤْمِنِ بَرْد

سَلَامًا كَمَا كَانَتْ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ حَتّٰى اِنَّ لِلنَّارِ او قَالَ لِجَهَنَّمَ ضَجِيْجًا مِنْ بَرْدِهِمْ ثُمَّ

يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَ يَذَرُ الظَّالِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا.(۱)

"ابوسمیہ کہتے ہیں کہ یہاں پر ہمارے درمیان ورود کے مفہوم میں اختلاف ہو گیا تھا ہم میں سے بعض کہتے تھے کہ دوزخ میں مؤمن داخل نہیں ہوگا اور بعض کہتے تھے کہ سب لوگ داخل ہوں گے مگر پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نجات دیدے گا جنہوں نے شرک سے اجتناب

(۱) مسند احمد طبع دار الحدیث قاہرہ ۱۹۹۵ء ۴۷۳ ج ۱۱ رقم الحدیث ۱۴۴۵۷

کیا تھا' ابوسمیہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے ملاقات کی اور کہا کہ ہمارے درمیان ورود کے معنوں میں اختلاف ہو گیا ہے' بعض کہتے ہیں کہ دوزخ میں مؤمن داخل نہیں ہو گا اور بعض کہتے ہیں کہ سب لوگ داخل ہوں گے' جابر نے اپنی انگلیاں دونوں کانوں کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے نہ سنا ہو کہ ورود سے مراد دخول ہے' باقی نہیں رہے گا کوئی بھی نیکوکار اور بدکار مگر دوزخ میں داخل ہو گا لیکن مؤمن پر آگ ٹھنڈی ہو جائے گی جس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ دوزخ کی آگ ٹھنڈک کی وجہ سے شور مچائے گی' پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نجات دیدے گا جنہوں نے شرک سے اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا اور چھوڑ دے گا مشرکین کو دوزخ میں گھٹنوں پر بیٹھے ہوئے۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ میں داخل تو سب لوگ ہوں گے لیکن ایمان والوں پر آگ ٹھنڈی ہو جائے گی اور ان کو کسی قسم کا درد اور عذاب محسوس نہیں ہو گا بلکہ صرف دوزخ کے احاطے میں کچھ وقت کے لئے آرام سے رہیں گے' پھر ان کو نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور مشرکین کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ و تابعین سے بھی تفاسیر میں نقل ہوا ہے لیکن یہ تفسیر چونکہ قرآن کی آیت اور بخاری کی صحیح احادیث سے متصادم ہے اس لئے اس کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۱ کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے جس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ بعض مؤمن جہنم سے دور رکھے جائیں گے اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ کے حقیقی اور ظاہری معنی یہی ہیں کہ جہنم میں داخل نہیں ہوں گے۔ لفظ مُبْعَدُوْن اور لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا کی یہ تاویل کرنا کہ داخل تو ہوں گے مگر ان کو تکلیف محسوس نہیں ہو گی ایک ایسی دور دراز کی تاویل ہے جسے ذہن قبول نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کی جو احادیث پہلے نقل کی گئی ہیں ان میں بغیر کسی ابہام کے صراحت و وضاحت کی

ساتھ کہا گیا ہے کہ بعض مسلمان بجلی کی چمک کی طرح پل سے گزر جائیں گے اور جو مؤمن بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوئے ہوں یا جن کے تین نابالغ بچے فوت ہوئے ہوں تو وہ جہنم میں داخل ہی نہیں ہوں گے۔ مگر ابو سمیہ عن جابر کی مذکورہ حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن اور کافر سب لوگ جہنم میں داخل ہوں گے مگر ایمان والوں پر آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی آیت اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی حدیث کے مقابلے میں مسند احمد کی روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی جب کہ اس روایت کا راوی ابو سمیہ ہے جس کے بارے میں شمس الدین ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ مجہول راوی ہے یعنی اس کے حالات اور کوائف اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اس لئے اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی تحقیق نہیں کی جا سکتی۔(۱)

اصول حدیث کی روشنی میں ایک مجہول الاسم اور مجہول الحال راوی کی روایت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا جب کہ وہ روایت قرآن کی آیت اور بخاری کی حدیث سے متصادم بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام المفسرین امام ابن جریر طبری نے ورود بمعنے دخول کی روایات نقل تو کی ہیں لیکن ترجیح اس قول کو دی ہے جس میں ورود کے معنے مرور علی الصراط بیان کئے گئے ہیں:

وَ اَوْلَى الْاَقْوَالِ فِي ذٰلِكَ بِالصَّوَابِ قَوْلُ مَنْ قَالَ يَرِدُهَا الْجَمِيْعُ ثُمَّ يَصْدُرُ عَنْهَا الْمُؤْمِنُوْنَ فَيُنْجِيْهِمُ اللّٰهُ وَ يَهْوِيْ فِيْهَا الْكُفَّارُ وَ وُرُوْدُ هُمُوْهَا هُوَ مَا تَظَاهَرَتْ بِهِ الْاَخْبَارُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ مُرُوْرِهِمْ عَلَى الصِّرَاطِ الْمَنْصُوْبِ عَلٰى مَتْنِ جَهَنَّمَ فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ وَ مَكْدُوْسٌ فِيْهَا.(۲)

"اس بارے میں تمام اقوال میں سے صحیح ترین قول ان مفسرین کا ہے جو کہتے ہیں کہ دوزخ پر وارد تو سب ہوں گے مگر مؤمنین اس سے گزر جائیں گے' اللہ ان کو بچا لے گا اور کفار

(۱)میزان الاعتدال ص۵۳۴ج۴ رقم الترجمہ ۱۰۲۷۰

(۲)جامع البیان عن تاویل آی القرآن طبع بیروت ۱۹۸۸ء ص۱۱۲ج۱۶ مریم آیت۱۷

تفسیر بالسنۃ کے بارے میں عائشہؓ کی حدیث سنداً ضعیف ہے

قرآن کریم کی تفسیر کا دوسرا اہم ترین ماٗخذ اور منبع سنت رسول ہے جس کی تفصیل اور تمثیل گذشتہ عنوان کے تحت قارئین پڑھ چکے ہیں لیکن اس سلسلے میں ام المؤمنین عائشہؓ سے مروی ایک حدیث الجھن کا سبب بن سکتی ہے اس لئے اس کی اسنادی حیثیت پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پہلے اس حدیث کا اصل متن ملاحظہ کیجئے۔

عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُفَسِّرُ شَيْئًا مِنَ الْقُرآنِ اِلَّا آيَا تُعَدُّ عَلَّمَهُنَّ اِيَّاهُ جِبْرِيْلُ.(۱)

"عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ قرآن کی تفسیر نہیں کرتے تھے مگر چند گنی چنی آیات کی تفسیر کرتے تھے جن کی تعلیم آپ کو جبریل نے دی تھی۔" (یعنی تھوڑی سی آیات کی تفسیر کرتے تھے)

ابن جریر نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک ایسی علت اور نقص موجود ہے جس کی وجہ سے اس پر کوئی بھی ایسا شخص استدلال نہیں کر سکتا جو احادیث کے اسانید کی صحت اور فساد کا علم رکھتا ہو اس لئے کہ اس کے راوی جعفر بن محمد زبیری ہیں جس کو محدثین نہیں جانتے کہ یہ کون تھا؟ یعنی یہ ایک مجہول الحال راوی ہے۔(۲)

اس راوی کا پورا نسب اس طرح نقل ہوا ہے کہ جعفر بن محمد بن خالد بن زبیر بن العوام القرشی۔ اس کو اپنے جد خالد کی نسبت سے جعفر بن خالد بھی کہا جاتا ہے اور اپنے جد اعلی زبیر بن العوام کی نسبت سے جعفر بن محمد زبیری بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں حافظ شمس الدین ذہبی فرماتے ہیں:

---

(۱) تفسیر ابن جریر ص۳۷ ج۱

(۲) تفسیر ابن جریر ص۳۹ ج۱

قَالَ الْبُخَارِیْ لَا یُتَابَعُ فِیْ حَدِیْثِہٖ وَ قَالَ اَبُوْالفتح الازدِیْ مُنْکَرُ الحَدِیْثِ۔

"حدیث میں اس کی متابعت اور موافقت نہیں کی جاتی یعنی یہ جو حدیث روایت کرتا ہے بالعموم وہ دوسرے راوی سے منقول نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کے نقل کرنے میں تنہا ہوتا ہے اور ابو الفتح ازدی نے کہا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے یعنی اس کی روایات بالعموم ثقہ راویوں کی روایات کے خلاف ہوتی ہیں۔"(۱)

ابن جریر، ذہبی اور ابن حجر کی رائے میں تو سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے اور قابل استدلال نہیں ہے لیکن اگر اس کے راوی کی توثیق کہیں سے تلاش کر بھی لی جائے تو پھر بھی یہ قابل قبول نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ اور لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ میں نبی کریم ﷺ کا فرض منصبی اور فریضہ نبوت یہ بتایا گیا ہے کہ پورے قرآن کے معانی و مفاہیم کی تعلیم دے اور ان کی تشریح و تبیین کرے۔ اس کے علاوہ جبریل نے آپ کو چند گنی چنی آیات کی تعلیم نہیں دی تھی جس طرح کہ اس روایت میں آیا ہے بلکہ پورے قرآن کے الفاظ بھی پڑھائے تھے اور پورے قرآن کے معانی بھی سمجھائے تھے۔ اس لئے سند اور معنی دونوں کے لحاظ سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ:

اس بات کو جاننا واجب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں بیان کئے ہیں اور لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ کا ارشاد خداوندی الفاظ اور معانی دونوں کے بیان کو شامل ہے، ابو عبدالرحمٰن سلمی نے کہا ہے کہ جو صحابہ ہم کو قرآن پڑھایا کرتے تھے جیسے عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے صحابہ انہوں نے ہم کو بتایا ہے کہ وہ جب نبی کریم ﷺ سے دس آیات پڑھ لیتے تو آگے نہ بڑھتے جب تک کہ ان میں علم و عمل سے تعلق رکھنے والی باتیں اچھی طرح سیکھ نہ لیتے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے

(۱) میزان الاعتدال ص ۴۱۶ ج ۱ و مثلہ فی لسان المیزان لابن حجر ص ۲۲۴ ج ۲

رکھتا اس لئے اس کی بنیاد پر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف چند آیات کی تفسیر کی ہے لیکن یہ کہنا بھی مناسب نہیں ہے کہ آپ نے ہر آیت کی تفسیر کی ہے بلکہ متوازن بات یہ ہے کہ جن آیات کے معانی ومفاہیم اور ان کے احکام کی تفصیلات بیان کرنا فہم اور عمل بالقرآن کے لئے ضروری تھا ان کی مکمل تفسیر و تبیین آپ نے اپنے قول اور یعے کر دی ہے تا کہ امت کو ان آیات پر عمل کرنے میں کوئی اشکال پیش نہ آئے

گی رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اور آپ کی کامل اور جامع سیرت پورے

قرآن کریم میں وحی سے متعلق جو آیات ہیں ان کی تفسیر وحی کے

جو احادیث کی کتابوں میں مروی ہیں خواہ ان میں آیت کا حوالہ

'نماز' زکوۃ' روزہ اور حج کے بارے میں جتنی آیات

ضروری تفصیلات و تشریحات کتاب الایمان'

کی ان تمام احادیث میں بیان ہو گئی ہیں

آیات نازل ہوئی ہیں ان کی

رت میں مروی ہیں۔

متعلق آیات کی

'الاجارہ'

حقوق العباد سے متعلق ان تمام احادیث سے بآسانی معلوم کی جاسکتی ہیں جو صحاح ستہ اور دوسرے مسانید و معاجم میں نقل ہوئی ہیں۔

☆امارت و حکومت اور عدل و قضاء سے متعلق آیات کی تفصیلات کتاب الامارۃ' کتاب الاحکام' ابواب القضاء والشہادۃ کے ابواب میں نقل کردہ احادیث سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

☆حدود و قصاص اور دیات سے متعلق آیات کی تفسیر حدود و دیات کے ابواب میں نقل کردہ احادیث کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔

☆جہاد اور جنگ و صلح کے بارے میں نازل شدہ آیات کی تفسیر و تاویل جہاد و مغازی اور صلح کے ابواب میں وارد شدہ احادیث کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔

☆میراث سے تعلق رکھنے والی آیات کی تفسیر ان احادیث میں موجود ہے جو کتاب الفرائض کے ابواب میں بیان ہوئی ہیں۔

☆عالم برزخ کے ثواب و عذاب سے متعلق آیات کی تشریح عذاب قبر کے ابواب میں روایت شدہ احادیث سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

☆اسی طرح قیامت' جنت اور دوزخ کے بارے میں قرآنی آیات کی تفصیلات ابواب صفۃ القیامۃ میں بیان کردہ احادیث سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

غرض یہ کہ جس طرح زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں قرآنی آیات موجود ہیں اسی طرح زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں احادیث رسول بھی ہزاروں کی تعداد میں احادیث کی کتابوں میں مبوّب اور مدون شکل میں موجود ہیں۔

امام بخاری نے صحیح البخاری کے اکثر ابواب میں قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے اور پھر متعلقہ احادیث نقل کی ہیں جن سے آیات مذکورہ فی الباب کی تفسیر بھی ہو جاتی ہے اور ان سے ثابت شدہ احکام بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ احادیث تو حدیث کی بڑی بڑی کتابوں

کے ابواب میں بکھری ہوئی ہیں اس لئے آیات کی تفسیر کرتے وقت متعلقہ حدیث تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بکھری ہوئی نہیں ہیں بلکہ موضوعات اور عنوانات وابواب کے تحت مدون اور مرتب شکل میں مدارس اسلامیہ اور مراکز دینیہ کی لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ ادارہ دارالسلام للنشر والتوزیع ریاض نے اپریل ۲۰۰۰ء میں صحاح ستہ کو ایک ہی جلد میں شائع کیا ہے جس میں ہر کتاب کے آخر میں کتب اور ابواب کی تفصیلی فہرست بھی شائع کی گئی ہے۔ اگر بحث و تحقیق کرنے والا کوئی شخص اسی مجموعے کو سامنے رکھ کر اس کی فہارس کی مدد سے مطلوبہ احادیث تلاش کرنا چاہے تو تھوڑی سی محنت سے وہ ہر موضوع پر احادیث معلوم کر سکتا ہے۔

امام احمد کی مسند' ابن الاثیر کی جامع الاصول' بغوی کی شرح السنۃ اور دوسرے مسانید اور معاجم کی حروف ہجا کی ترتیب کے مطابق تفصیلی فہارس بھی تیار ہو گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اطراف الحدیث پر مشتمل مختلف موسوعات الحدیث بھی دستیاب ہیں جن کی مدد سے مطلوبہ احادیث معلوم کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے تو اب فہارس اور موسوعات کی ورق گردانی سے بھی شائقین علم کو مستغنی کر دیا ہے۔ تقریباً تمام احادیث اور شروح احادیث کو کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا گیا ہے جس سے بڑی آسانی سے مطلوبہ حدیث بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس کی تشریح بھی معلوم کی جا سکتی ہے اور اس کی تخریج بھی کی جا سکتی ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک

تفسیر القرآن بالآثار الثابتہ عن اصحاب رسول اللہؐ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے دین کی تعلیم و تفہیم کے لئے اپنا آخری رسول محمد ﷺ منتخب کیا ہے اس لئے قرآن کی صحیح تفسیر اور دین کی صحیح تعبیر تو وہی تسلیم کی جائے گی جو سنت رسول سے سند صحیح کے ساتھ ثابت ہو اور سنت رسول میں بیان کردہ تفسیر و تعبیر کے خلاف نہ کسی صحابی و تابعی کی تاویل کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی فقیہ و مجتہد اور محدث و مفسر کے قول کو دلیل بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ سنت رسول صحیح الاسناد ہو' صریح الدلالت ہو اور اس کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو لیکن اگر رسول اللہ ﷺ سے کوئی مستند تفسیر ثابت نہ ہو تو پھر صحابہ کے آثار کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی جائے گی اس لئے کہ انہوں نے براہ راست اللہ کے منتخب کردہ اور مقرر کردہ معلم قرآن سے قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں سیکھے تھے' انہوں نے وہ حالات اور واقعات دیکھے تھے جن کے بارے میں آیات نازل ہوئی تھیں' ان کو آیات کا زمانہ نزول بھی معلوم تھا اور انہوں نے معلم قرآن اور داعی الی القرآن کو قرآنی آیات اور دینی احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے منتخب کردہ معلم قرآن کے اصحاب اور براہ راست تلامذہ کی تفسیر سے زیادہ مستند تفسیر اور کس کی ہو سکتی ہے ؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی معروف و مقبول اور مستند تعلیمی ادارے کے فضلاء کو عام قسم کی درس گاہوں کے فضلاء پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور کسی ماہر ترین اور مقبول ترین استاد کے شاگردوں کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے تو خود رسول اللہ ﷺ کی نگرانی اور اہتمام میں چلنے والے تعلیمی ادارے کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ فضلاء اور آپ کے براہ راست شاگردوں کی تفسیر سے زیادہ مستند تفسیر اور کس کی ہو سکتی ہے ؟ اس کے علاوہ فہم قرآن کے لئے علمی صلاحیت کے علاوہ ایمانی فراست' اخلاص و للّٰہیت اور تقویٰ کو بھی ایک موثر حیثیت حاصل ہے اور اصحاب رسول کا ایمان کامل تھا' ان کے دل پاک و صاف تھے' ان

پھر مرفوع حقیقتاً کو مرفوع حکماً پر ترجیح دی جائے گی لیکن اگر تعارض نہ ہو تو اس قسم کے آثار صحابہ کی روشنی میں تفسیر کو "تفسیر بسنۃ الرسول" کی حیثیت حاصل ہو گی۔

امام حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس نے اپنی دوسری کتاب علوم الحدیث کے النوع الخامس میں خود لکھا ہے کہ صحابہ کی تفسیر احادیث موقوفہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ صحابی کی تفسیر حدیث مسند مرفوع کا درجہ رکھتی ہے تو اس قول کا تعلق ان امور سے ہے جو عقل ورائے سے معلوم نہ ہو سکتے ہوں' ابن الصلاح نے مقدمہ ابن الصلاح کی النوع الثامن میں بھی اسی طرح لکھا ہے کہ صحابی کی تفسیر مطلقاً حدیث مرفوع کا درجہ نہیں رکھتی۔

(۲) جو بات عقل وبصیرت' غور وفکر اور تدبر سے معلوم ہو سکتی ہو تو اس نوع کی بات جب صحابی سے مروی ہو تو وہ اس کی رائے سمجھی جائے گی اور صحابی کی رائے اور تفسیر کو غیر صحابی کی رائے اور تفسیر پر ترجیح تو حاصل ہے لیکن اسے سنت رسول کی حیثیت حاصل نہیں ہے اس لئے اس سے اختلاف کرنا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مسائل میں اور بعض آیات کی تفسیر میں بعض مجتہدین نے اور بعض مفسرین نے صحابی کی رائے کے مقابلے میں غیر صحابی کی رائے کو ترجیح دی ہے البتہ اگر کسی رائے پر یا کسی آیت کی تعبیر و تفسیر پر صحابہ کرام کا اتفاق رائے ثابت ہو چکا ہو (صرف اجماع کا دعویٰ نہ ہو) تو پھر اس کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا یا کوئی تعبیر کرنا جائز نہیں ہو گا اس لئے کہ صحابہ کی پوری جماعت کو غلطی پر اتفاق کرنے سے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا تھا۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے صریح اور قطعی حکم کے خلاف کسی صحابی کی انفرادی رائے بھی قبول نہیں کی جا سکتی اور جماعت صحابہ کی اجتماعی رائے بھی حجت نہیں بن سکتی۔

(۳) جو بات کسی صحابی نے اہل کتاب کے علماء سے یا ان کی کتابوں سے نقل کی ہو تو وہ صحابی کی رائے بھی نہیں سمجھی جائے گی اور اس کو قول رسول کی حیثیت بھی حاصل نہیں ہو گی

اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کے اقوال کو بطور حکایت نقل کرنے کی اجازت تو دی ہے لیکن ان کو حجت قرار نہیں دیا جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ :

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً وَ حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ وَ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ

"میری جانب سے پہنچاؤ اگر چہ ایک آیت ہو' اور بنی اسرائیل کے اقوال بیان تو کر سکتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا ہو تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

اس حدیث میں آپ نے خبر دار کیا ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا یعنی اہل کتاب کے قول کو یا کسی اور کی بات کو میرے قول کے طور پر پیش کرے گا تو اس کا ٹھکانا جہنم میں ہو گا۔

اسرائیلی روایات کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کا حکم الگ الگ ہے۔

پہلی قسم وہ روایات ہیں جن کے مضامین کی صحت اور سچائی قرآن و سنت سے ثابت ہو جیسے توحید اور رسالت محمدی کی تصدیق کرنے والی روایات ان کو استشہاد اور تائید کے طور پر نقل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مفید ہے لیکن ان پر استدلال کرنا اور ان کو بطور دلیل نقل کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ قرآن و سنت کی نصوص کی موجودگی میں کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہو جائیں تو اس کے لئے بھی قرآن و سنت کو چھوڑ کر تورات کا اتباع جائز نہیں ہو گا اور عیسیٰ علیہ السلام جب نزول فرمائیں گے تو وہ انجیل کی بجائے شریعت محمدی کا اتباع کریں گے۔

دوسری قسم وہ روایات ہیں جن کے مضامین کا باطل اور جھوٹ ہونا قرآن و سنت سے ثابت ہو جیسے شان الوہیت' شان رسالت' عصمت انبیاء' اور عصمت ملائکہ کے خلاف اسرائیلی خرافات تو ان کا نقل کرنا تردید اور تکذیب کے لئے تو جائز ہے اس لئے کہ کفر و شرک اور اباطیل و اکاذیب کی تردید و تکذیب ان کے نقل کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اسی بنا پر

قرآن میں کفریات وشرکیات نقل کی گئی ہیں اور پھر ان کی تردید کی گئی ہے۔ لیکن تردید کے بغیر ان کا نقل کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ جھوٹ کی اشاعت کرنا بھی جھوٹ ہے۔ جن مفسرین نے اس قسم کے اسرائیلی خرافات کو تردید و تکذیب کے بغیر نقل کیا ہے ان سے ذہول اور غفلت سرزد ہو گئی ہے یا پھر انہوں نے یہ خیال کیا ہو گا کہ ان کا باطل اور بے بنیاد ہونا اتنا زیادہ واضح ہے کہ تردید کرنا ضروری ہی نہیں ہے بلکہ مطالعہ کرنے والے ان کی لغویت کو دیکھتے ہی سمجھ لیں گے۔ مگر محققین مفسرین کا طریقہ یہ نہیں ہے وہ یا تو ان خرافات کی طرف اشارہ کر کے گزر جاتے ہیں اور نقل نہیں کرتے اور یا پھر نقل کر کے ان کی تردید اور تکذیب وابطال کرتے ہیں۔ جیسے ابن عطیہ غرناطی اور حافظ ابن کثیر' غرناطی کی "المحرر الوجیز" اور ابن کثیر کی "تفسیر القرآن العظیم" میں اسرائیلی روایات اکثر تو نقل ہی نہیں کی جاتیں اور جہاں پر نقل ہوئی ہیں وہاں پر دلائل کے ساتھ ان کا بطلان بھی ثابت کیا گیا ہے اگرچہ بعض مقامات پر ان سے بھی سہو ونسیان ہو گیا ہے اور تردید کے بغیر گزر گئے ہیں لیکن اکثر تردید کے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔

تیسری قسم وہ اسرائیلی روایات ہیں جن کی قرآن وسنت میں نہ تصدیق کی گئی ہے اور نہ تکذیب کی گئی ہے تو ہم بھی ان کی نہ تصدیق وتائید کریں گے اور نہ تکذیب وتردید کریں گے البتہ تائید اور تردید کے بغیر اس قسم روایات کا بطور حکایت نقل کرنا منع نہیں ہے جیسا کہ پہلے حدیث بیان ہو چکی ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:

وَغَالِبُ ذَالِكَ مِمَّا لَا فَائِدَةَ فِيْهِ تَعُوْدُ اِلَى اَمْرٍ دِيْنِيٍّ وَ لِهٰذَا يَخْتَلِفُ اَهْلُ الْكِتَابِ فِيْ هٰذَا كَثِيْرًا وَ يَأْتِيْ عَنِ الْمُفَسِّرِيْنَ خِلَافٌ بِسَبَبِ ذَالِكَ.

اس قسم کی روایات کا غالب اور زیادہ تر حصہ وہ ہے جس میں کوئی دینی فائدہ نہیں ہے اور اسی بنا پر اہل کتاب کے علماء اس بارے میں بہت زیادہ اختلاف کرتے ہیں اور ہمارے مفسرین سے بھی اسی وجہ سے مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں' اس قسم کی لایعنی اور بے فائدہ اسرائیلیات

کی بعض مثالیں یہ ہیں :

اصحاب کہف کے نام' ان کے کتے کا رنگ' ان کی تعداد' موسیٰ علیہ السلام کا عصا کونسے درخت کی لکڑی کا تھا' ان پرندوں کے نام جن کو اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ السلام کی درخواست پر زندہ کیا تھا گائے کے اس عضو کا تعین جس کی ضرب سے بنی اسرائیل کے مقتول نے زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتایا تھا' اس درخت کے نوع کا تعین جس سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کلام کیا تھا اور اس قسم کی دوسری چیزیں جن کو اللہ نے قرآن میں مبہم چھوڑ دیا ہے اور جن کے تعیین میں کسی قسم کا دنیوی یا دینی فائدہ نہیں ہے۔"(۱)

قرآن کی تفسیر کے جو طریقے گذشتہ عنوانات ثلاثہ کے تحت بیان ہوئے ہیں ان کے متعلق ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

"اگر کوئی پوچھے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ سب سے زیادہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کے ذریعے کی جائے کیونکہ جس آیت میں ایک جگہ اجمال ہو تو دوسری جگہ اس کی تفسیر مل جاتی ہے' اگر اس طریقے نے تم کو تھکا دیا ہو اور آیت کا اجمال ختم نہ ہو سکا ہو تو پھر تم پر لازم ہے کہ سنت رسول کے ذریعے تفسیر معلوم کرو اس لئے کہ سنت رسول قرآن کی شرح اور وضاحت کرتی ہے۔ بلکہ امام شافعی نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام فیصلے قرآن سے اخذ کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی دیا گیا ہے یعنی سنت رسول۔ سنت بھی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے جس طرح کہ قرآن وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ سنت رسول کی قرآن کی طرح تلاوت نہیں کی جاتی اس لئے کہ اس کے الفاظ منزل نہیں ہیں۔ امام شافعی اور دوسرے ائمہ نے سنت کے وحی ہونے پر بہت سے دلائل بیان کئے ہیں جن کے بیان کا یہ مقام نہیں ہے۔

---

(۱) مقدمہ ابن کثیر ص ۱٤

غرض یہ کہ تم پہلے قرآن کی تفسیر خود قرآن میں تلاش کرو اگر اس میں نہ مل سکے تو پھر سنت میں تلاش کرو جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل کو یمن کی امارت پر بھیجتے وقت فرمایا تھا تم کس قانون پر فیصلے کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی کتاب پر فیصلے کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم کو کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملا ہو تو پھر کس قانون پر فیصلے کرو گے؟ معاذؓ نے جواب دیا کہ پھر سنت رسول کے مطابق فیصلے کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی تم کو کوئی حکم نہ مل سکے تو پھر کیا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اَجْتَهِدُ بِرَأيِیْ پھر میں اپنے اجتہاد سے فیصلے کروں گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک معاذؓ کے سینے پر مارا اور فرمایا کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دیدی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔ یہ حدیث مسانید اور سنن میں اسناد جید کے ساتھ نقل ہوئی ہے' چونکہ قرآن و سنت کے بعد اس حدیث میں صحابی کو اجتہاد کی اجازت دی گئی ہے اور اس کو پسند کیا گیا ہے اس لئے ہم کو جب قرآن و سنت میں کسی آیت کی تفسیر نہ مل سکے تو پھر ہم صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے اس لئے کہ صحابہ قرآن کو ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ انہوں نے وہ قرائن اور حالات دیکھے تھے جن کا دیکھنا انہی کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کو فہم تام' علم صحیح اور عمل صحیح کی فضیلت حاصل تھی۔ بالخصوص خلفاء راشدین' ائمہ مہدیین اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرھم۔"(۱)

(۱) مقدمہ ابن کثیر ص۱۲۔۱۳

طبقہ صحابہ کے مشہور مفسرین

جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ :

اِشْتَهَرَ بالتفسير مِنَ الصَّحابَةِ عَشَرَةٌ اَلْخُلَفَاءُ الْاَرْبَعَةُ وَابنُ مَسْعُوْدٍ' وابن عباسٍ' و اُبَیّ بن كَعْبٍ' وَ زَيْدُ بنُ ثَابِتٍ وَ أَبو موسَى الْاَشْعَرِیّ وَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ. رضی الله عنهم

"صحابہ میں سے تفسیر میں دس صحابہ زیادہ مشہور تھے۔ چار خلفاء راشدین یعنی ابو بکر صدیقؓ' عمر فاروقؓ' عثمان بن عفانؓ اور علی بن ابی طالبؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عباسؓ' ابی بن کعبؓ' زید بن ثابتؓ' ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ۔"

خلفاء راشدین سے تفسیری روایات بہت ہی قلیل تعداد میں نقل ہوئی ہیں۔ شاید اس کا سبب ان کا بہت پہلے وفات پاجانا ہے جیسا کہ ابو بکرؓ سے مروی احادیث کی قلت کا سبب بھی یہی ہے۔

مجھے ابو بکرؓ سے مروی تفسیری آثار بہت ہی کم یاد ہیں جو دس سے متجاوز نہیں ہیں۔ البتہ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ سے قرآن کی تفسیر سے متعلق آثار بڑی تعداد میں مروی ہیں۔(۱)

جامعہ ازہر کے ڈاکٹر محمد حسین الذہبی لکھتے ہیں کہ :

"قرآن کی تفسیر کرنے والے صحابہ اور بھی تھے۔ مثلاً انس بن مالک' ابو ہریرہ' عبداللہ بن عمر' جابر بن عبداللہ' عبداللہ بن عمرو بن عاص اور عائشہؓ۔ لیکن ان سے تفسیری روایات بہت تھوڑی نقل ہوئی ہیں اور ان کو تفسیر میں وہ شہرت بھی حاصل نہیں تھی جو مذکورہ دس صحابہ کو حاصل تھی اور ان دس کے درمیان بھی قلت اور کثرت کے اعتبار سے تفاوت ہے۔ ابو بکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ سے تفسیر میں بہت ہی قلیل تعداد میں اقوال نقل ہوئے ہیں۔ اس قلت کا ایک

(۱) الاتقان فی علوم القرآن النوع الثمانون ص۲۲۷ ج۲

سبب تو یہ ہے کہ ان کا انتقال پہلے ہو چکا تھا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ تینوں خلفاء خلافت اور فتوحات کی ذمہ داریوں میں زیادہ مصروف رہتے تھے اور ایک تیسرے سبب کا اضافہ بھی کر لو اور وہ یہ کہ خلفاء ثلاثہ کے دور میں کتاب اللہ کے علماء اور اس کے معانی واحکام کو جاننے والے زیادہ تھے اور تفسیر کے لئے خلفاء کی طرف رجوع کرنے کی حاجت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جہاں تک حضرت علیؓ کا تعلق ہے تو خلفاء راشدین میں سے سب سے زیادہ تفسیری روایات ان سے مروی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ طویل مدت تک آپ خلافت کی ذمہ داریوں سے فارغ تھے اور فراغت کی یہ مدت عثمانؓ کی خلافت کے اختتام تک جاری تھی' دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی وفات طویل مدت کے بعد ہوئی تھی اور ان کے دور میں اسلام کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا کافی تعداد میں عجمی لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور عربی زبان کی خصوصیات کا علم بھی کم ہو گیا تھا اس لئے قرآن کے معانی کو سمجھنے کے لئے لوگوں کی حاجت زیادہ ہو گئی تھی اور فہم قرآن کے لئے علماء کی طرف رجوع کا تناسب بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح تفسیر سے تعلق رکھنے والی روایات عبداللہ بن عباسؓ' عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے بھی زیادہ تعداد میں مروی ہیں کیونکہ یہ تینوں اور حضرت علیؓ تفسیر میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عربی زبان کے اسالیب پر ان کو عبور حاصل تھا' لوگ ان کی طرف بہت زیادہ رجوع کرتے تھے اور یہ اجتہاد کرنے اور لوگوں کے مسائل اور اشکالات حل کرنے میں پس و پیش بھی نہیں کرتے تھے۔ باقی رہے زید بن ثابتؓ' ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ تو یہ اگرچہ مشہور تو تھے لیکن مذکورہ چار صحابہ کے مقام کو نہیں پہنچ سکے تھے جن سے بہت زیادہ تفسیری روایات منقول ہیں۔ اگر ہم روایات کی کثرت کے اعتبار سے ان چاروں کی ترتیب بنائیں تو پہلے نمبر پر ابن عباسؓ ہیں' دوسرے نمبر پر عبداللہ بن مسعودؓ ہیں' تیسرے نمبر پر علی بن ابی طالبؓ ہیں اور چوتھے نمبر پر ابی بن کعبؓ ہیں۔(۱)

(۱) التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص۶۳۔۶۴ ج۱ طبع بیروت ۱۹۷۶ء

طبقہ صحابہ کے مفسرین میں سے چونکہ زیادہ تر تفسیری آثار انہی چار صحابہ سے مروی ہیں اس لئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے اس لئے کہ کسی قول کی اہمیت اور علمی وزن معلوم کرنے کے لئے اس کے قائل کے علمی و دینی مقام کی پہچان بڑی افادیت رکھتی ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ متوفی ۶۸ھ

یہ عباس بن عبدالمطلب کے بیٹے اور رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کی ولادت ہجرت سے تین سال پہلے مکہ مکرمہ میں اس زمانے میں ہوئی تھی جب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کا خاندان بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور تھا اور کفار مکہ نے آپ کا مکمل معاشرتی بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ ۶۸ھ میں بمقام طائف انہوں نے وفات پائی تھی۔ وفات کے وقت عمر ۷۰ یا ۷۱ سال تھی۔ ان کی والدہ لبابہ بنت الحارث الھلالیہ ام المؤمنین میمونہ بنت الحارث کی بہن تھیں۔ یعنی ابن عباس ام المؤمنین کے بھانجے تھے' لبابہ خالد بن ولیدؓ کی خالہ تھی اور ابن عباس خالد بن ولید کے خالہ زاد بھائی تھے۔ دور صحابہ میں یہ عظیم صحابی "ترجمان القرآن" "حبر الامۃ" اور "البحر" کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے اس لئے کہ یہ قرآن کے ممتاز اور بہترین مفسر تھے۔ امت مسلمہ کے بہت بڑے عالم تھے اور علم کے بہت بڑے سمندر تھے۔ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ نے اپنے ہاتھوں سے ابن عباس کو قبر میں اتارا تھا اور جب قبر پر مٹی ڈال دی گئی تو فرمایا:

اَلْيَوْمَ مَاتَ رَبَّانِيُّ الْأُمَّةِ وَ فِيْ رِوَايَةٍ حَبْرُ الْأُمَّةِ.

"آج امت کا بہت بڑا عالم ربانی فوت ہوا ہے۔"(۱)

رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے خصوصی دعا کی تھی کہ:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ.(۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ص۱۷۵ ج۱

(۲) مسند احمد ص۲۶۶ ج۱

"یا اللہ ابن عباسؓ کو دین میں فقاہت عطا فرما اور ان کو قرآن کے معانی و مفاہیم کا علم عنایت فرما۔"

بخاری کی روایت میں یہ دعا اس طرح نقل ہوئی ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ.

"یا اللہ ابن عباسؓ کو حکم و اسرار کا فہم عنایت فرما۔"(۱)

حضرت عمرؓ ان کو اپنی مجلس میں شیوخ بدر اور اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے' اسے اپنے قریب جگہ دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ابن عباس قرآن کی اچھے مفسر اور شارح ہیں۔ عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ زندہ رہنے والے صحابہ میں سے ابن عباس سنت رسول کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے ابن عباسؓ ہیں اور مجاہد بن جبر کہتے ہیں کہ علم کی کثرت کی وجہ سے لوگ ابن عباس کو "البحر" یعنی علم کا سمندر کہتے تھے۔(۲)

ابن عباسؓ ذہانت' فطانت اور فراست میں منفرد اور ممتاز مقام پر فائز تھے۔ قرآنی آیات کے منطوق کو سمجھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے مگر اشارات و ایماءات کو سمجھنے کے لئے مخصوص قسم کی ذہانت اور ذوق لطیف کی ضرورت ہوتی ہے جو ابن عباس کی خصوصیت تھی۔ سعید بن جبیرؒ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ عمر بن خطابؓ مجھے بدری اشیاخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بٹھاتے تھے' ان میں سے بعض اس امتیاز کو محسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس جیسے تو ہمارے بیٹے بھی ہیں' اس کو ہمارے ساتھ مجلس میں کیوں بٹھایا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ ان اہل علم میں شامل ہے جن کو تم جانتے ہو' ایک روز عمرؓ نے ان اکابر صحابہ کو مجلس میں بلایا اور مجھے بھی بلا کر ان کے ساتھ بٹھا دیا میں سمجھ گیا کہ آج ان اکابر کا اور میرا امتحان

(۱) بخاری فضائل الصحابہ باب ذکر ابن عباسؓ

(۲) تاریخ بغداد ص۱۷۳۔۱۷۴ ج۱

لیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ یعنی اس میں کس بات کی طرف اشارہ ہے؟ بعض نے کہا کہ اس میں ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح مل جائے تو ہم اللہ کی حمد و ثنا کریں اور اس سے بخشش طلب کریں یعنی الحمد للہ استغفر اللہ پڑھا کریں' اور بعض خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے مجھے کہا ابن عباس! کیا تم بھی ایسا ہی کہتے ہو؟ میں نے کہا نہیں جی! میں تو ایسا نہیں کہتا۔ فرمایا پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا کہ اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کی موت کی طرف اشارہ ہے کہ جب مدد آگئی' غلبہ مل گیا یعنی اسلام غالب ہو گیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تیرے وصال کا وقت قریب آگیا ہے لہذا اب اس آخر وقت میں اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے رہو اور اس سے مغفرت مانگا کرو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق بھی اس سورت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا ذکر تم نے کیا ہے۔"(۱)

اکابر صحابہؓ نے جو جواب دیا تھا وہ غلط نہیں تھا اس لئے کہ فتح و نصرت کا شکر یہ یہی ہے کہ اللہ کی حمد و تسبیح کی جائے اور اس سے مغفرت کی طلب کی جائے۔ لیکن اس سورت میں جو بات اشارتاً بتائی گئی تھی اس کو صرف ابن عباس ہی سمجھ سکے تھے اور عمرؓ نے اس کی تائید کی تھی۔ یہ تو اس نوجوان مفسر قرآن کی فطانت اور فہم ثاقب کی صرف ایک مثال ہے ورنہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؓ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جو حدیث رسول کو اور ابو بکرؓ' عمرؓ اور عثمانؓ کے فیصلوں کو ابن عباسؓ سے زیادہ جانتا ہو۔ میں نے اس سے بڑا فقیہ بھی نہیں دیکھا' شعر' عربیت' قرآن کی تفسیر اور حساب میں بھی میں نے ابن عباسؓ سے بڑا عالم نہیں دیکھا' ہر مسئلے میں ان سے بڑا روشن خیال اور فکر ثاقب والا شخص میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ایک دن مجلس میں بیٹھتا اور فقہی

(۱) بخاری کتاب التفسیر سورۃ النصر

مسائل بیان کرتا ایک دن قرآن کی تاویل و تفسیر کے لئے مجلس قائم کرتا' ایک دن غزوات رسول کے لئے مجلس قائم کرتا' ایک دن شعر کے لئے مخصوص ہوتا تھا اور ایک دن ایام عرب یعنی عربوں کے تاریخی واقعات کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔"

لیث بن ابی سلیم کہتے ہیں کہ :

"میں نے طاؤسؒ کو کہا کیا وجہ ہے کہ تم اس لڑکے یعنی ابن عباس کے ساتھ چمٹے رہتے ہو اور اکابر صحابہ کی مجالس کو تم نے چھوڑ دیا ہے ؟ اس نے جواب میں کہا کہ :

اِنِّیْ رَئَیْتُ سَبْعِیْنَ رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَدَارَؤُا فِیْ اَمْرٍ صَارُوْا اِلٰی قَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ.

"میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر صحابہ دیکھے ہیں کہ ان کے درمیان جب کسی بات میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو فیصلے کے لئے وہ ابن عباسؓ کے قول کی طرف رجوع کرتے تھے۔"(۱)

رسول اللہ ﷺ کی خصوصی دعاؤں کی تاثیر تھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عبداللہ بن عباسؓ کو اجتہاد و فقاہت' تفسیر و حدیث اور دوسرے علوم میں امتیازی اور اختصاصی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور طبقہ صحابہ میں ان کو وہ مقام و مرتبہ عطا فرمایا تھا کہ عمر فاروقؓ جیسے صاحب اجتہاد والہام صحابی اور دوسرے اکابر صحابہ قرآن کی تفسیر اور دوسرے مشکلات و معضلات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چونکہ عبداللہ بن عباسؓ کو صحابہ و تابعین کے دور میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل تھی اور دوسرے اہل علم کے مقابلے میں لوگوں کا ان کی طرف رجوع سب سے زیادہ تھا اس لئے تفسیری روایات ان سے بہت زیادہ تعداد میں مروی ہیں ایسی آیات بہت ہی قلیل ہیں جن کی تفسیر میں ان کا کوئی قول موجود نہ ہو۔ "مکثرین فی التفسیر" میں سب زیادہ کثیر الروایت عبداللہ بن عباسؓ ہی ہیں۔

(۱) اسدالغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن الاثیر ص۱۹۳۔۱۹۴ ج۳ طبع ۱۲۸۶

عبداللہ بن عباسؓ اور اسرائیلیات

مشہور مستشرق جولڈ زیہر نے ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ پر اعتراض کیا ہے کہ وہ کعب الاحبار' عبداللہ سلام' وہب بن منبہ اور دوسرے علماء اہل کتاب سے روایات نقل کرتے تھے اور قرآن کی تفسیر کے لئے بھی ان کی طرف رجوع کرتے تھے' حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

اِذَا حَدَّثَکُمْ اَھْلُ الْکِتَابِ فَلَا تُصَدِّقُوْھُمْ وَلَا تُکَذِّبُوْھُمْ.

"جب اہل کتاب تم کو کوئی بات بتائیں تو ان کی تصدیق بھی نہ کرو اور تکذیب بھی نہ کرو۔"

لیکن اس نہی کے باوجود ابن عباس اہل کتاب سے روایات نقل کرتے تھے اور نہی کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے' اس مستشرق کی متابعت میں احمد امین مصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔(۱)

جولڈ زیہر کا یہ اعتراض دراصل ایک اتہام ہے جو تعصب پر مبنی ہے اور احمد امین کی تائید لاعلمی پر مبنی ہے۔ ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ اہل کتاب کی روایات نہ عقیدے کے اثبات کے لئے نقل کرتے تھے' نہ کسی حکم شرعی کے اثبات کے لئے نقل کرتے تھے اور نہ تصدیق اور تائید کے لئے نقل کرتے تھے بلکہ صرف تاریخی واقعات اور قصص و حکایات کے طور پر نقل کرتے تھے۔ جو روایات دین اور عقل کے مطابق ہوتیں ان کی تائید کرتے' جو مخالف ہوتیں ان کی تکذیب کرتے اور جو نہ موافق ہوتیں نہ مخالف ہوتیں ان کی نہ تصدیق کرتے اور نہ تکذیب کرتے بلکہ صرف اخبار ماضیہ کے طور پر نقل کرتے تھے جس کی رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہے جیسا کہ حدیث کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اہل کتاب کی روایات

---

(۱) المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن از جولڈزیہر ص ۶۵-۶۷ اور فجر الاسلام ۲۴۸

کی تصدیق بغیر تحقیق کے وہ کیسے کر سکتے تھے؟ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے بلکہ ابن عباسؓ خود بھی لوگوں کو سختی کے ساتھ اس سے منع کیا کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کا قول نقل ہوا ہے کہ:

يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ كَيْفَ تَسْأَلُونَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَ كِتَابُكُمُ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَى نَبِيِّهِ ﷺ أَحْدَثُ الْأَخْبَارِ بِاللَّهِ تَقْرَؤُنَهُ لَمْ يُشَبْ وَ قَدْ حَدَّثَكُمُ اللَّهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوْا مَا كَتَبَ اللَّهُ وَ غَيَّرُوْا بِأَيْدِيهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أَفَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ؟ وَلَا وَاللَّهِ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا مِنْهُمْ قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ.(١)

"اے مسلمانو! تم کیوں اہل کتاب سے سوالات کرتے ہو؟ جب کہ تمہاری وہ کتاب جو اللہ کے نبی پر نازل ہوئی ہے وہ اللہ کی جانب سے تازہ ترین خبریں ہیں جسے تم پڑھتے ہو اور جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوئی حالانکہ اللہ نے تم کو بتادیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کے احکام کو اور اس کی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے بدل دیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حکم اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے بدلے میں تھوڑا سا عوض لے لیں کیا جو علم تمہارے پاس آچکا ہے وہ تم کو اہل کتاب سے پوچھنے سے منع نہیں کرتا؟ اللہ کی قسم میں نے تو ان میں سے ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو تم سے اس کتاب کے بارے میں پوچھتا ہو جو تم پر نازل ہوئی ہے۔" (یعنی حق معلوم کرنے کے لئے ورنہ شرارت کے لئے تو پوچھتے رہتے تھے)

جب اہل کتاب کے بارے میں ابن عباسؓ کے جذبات اتنے سخت ہیں اور وہ اہل اسلام کو ان سے علم حاصل کرنے اور ان سے سوالات کرنے سے اتنی سختی کے ساتھ روکتے ہیں تو پھر وہ خود کیسے ان کی روایات کی تصدیق کر سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ابن عباس عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، عبداللہ بن سلامؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اہل کتاب سے جو کچھ بھی نقل کیا ہے

(١) صحیح بخاری کتاب الشهادات باب لا يُسأل اهل الشرك عن الشهادة وغيرها

صرف قصص وحکایات اور تاریخی روایات کے طور پر نقل کیا ہے تصدیق وتائید کے لئے نقل نہیں کیا۔ عبداللہ بن عباسؓ کے مذکورہ قول کے بعد مستشرقین اور ان کے مقلدین کے اعتراض واتہام میں آخر کیا وزن رہ جاتا ہے۔ تحدیث عن اہل الکتاب کی اجازت اور تصدیق اہل کتاب کی ممانعت کے درمیان مطابقت اور موافقت کی توجیہ تو بیان ہوگئی لیکن بعض احادیث میں تحدیث کی مذمت بھی آئی ہے مثلاً مسند احمد کے حوالے سے مشکوۃ شریف میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجلس رسول میں حاضر ہوکر عرض کی کہ یہودیوں کی بعض باتیں ہم کو پسند آجاتی ہیں تو کیا ہم ان میں سے بعض کو اپنے پاس لکھ سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اپنے دین میں متحیر ہوگئے ہو جس طرح کہ یہود ونصاریٰ حیران ہوگئے تھے۔ میں ملت حنیفیہ کو واضح اور پاک وصاف شکل میں لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اس کے لئے بھی میرے علاوہ کسی اور کا اتباع جائز نہ ہوتا۔(۱)

دارمی کے حوالے سے ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول یہ تورات کا ایک نسخہ ہے آپ خاموش ہوگئے اور اس خاموشی کو اجازت سمجھ کر عمرؓ نے اسے پڑھنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے مبارک چہرے کا رنگ غصے سے بدلنے لگا' ابوبکر کے توجہ دلانے پر جب عمرؓ نے سر اٹھا کر آپ کے چہرے کو دیکھا تو کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔(۲)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ نے اہل کتاب کی روایات کو تصدیق کے بغیر بیان کرنے کی اجازت دی تھی تو پھر لکھنے کی اجازت طلب کرنے پر اور پڑھنے پر عمرؓ کی سرزنش کیوں کی اور غصے کیوں ہوئے؟ بیان کرنے اور لکھنے پڑھنے کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں

(۱) باب الاعصام بالکتاب والسنۃ

(۲) مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل ثالث

ہے، جس بات کا نقل اور بیان کرنا جائز ہو اس کا لکھنا اور پڑھنا آخر کیوں ناجائز ہوگا؟

اس سوال کا ایک جواب تو ابن حجرؒ اور بعض دوسرے شارحین حدیث نے یہ دیا ہے کہ تورات اور اہل کتاب کی روایات کو لکھنے اور پڑھنے کی مذمت اسلام کے ابتدائی دور میں کی گئی تھی جب کہ اسلامی احکام اور دینی قواعد کی پوری طرح وضاحت اور تکمیل نہیں ہوئی تھی اور خطرہ تھا کہ لوگ اہل کتاب کے اقوال کو شرعی حکم کی حیثیت سے قبول نہ کرلیں مگر جب اس فتنے کا خطرہ باقی نہ رہا تو تصدیق و تائید کے بغیر بیان کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ اور دوسرا جواب ملا علی قاری نے سید جمال الدین نیشاپوری متوفی ۱۰۰۰ھ سے یہ نقل کیا ہے کہ:

"اہل کتاب کی روایات میں مشغول ہونے کی ممانعت اور رخصت کے درمیان موافقت و مطابقت کی توجیہ یہ ہے کہ قصص و حکایات نقل کرنا اور قرآنی قصص کی تفصیلات بیان کرنا جائز ہے مگر ان کی کتابوں سے احکام و شرائع نقل کرنا ممنوع ہے۔ (الا یہ کہ وہ اسلامی احکام کے مطابق ہوں) اس لئے کہ ہمارے نبی کی شریعت کے آنے پر سابقہ شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔" (۱)

ابن بطال نے بھی شرح بخاری میں اسی طرح لکھا ہے کہ غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لئے علماء اہل کتاب کی طرف رجوع جائز نہیں ہے بلکہ اجتہاد کے ذریعے حکم معلوم کرنا چاہئے مگر ہماری شریعت کی تصدیق کرنے والی روایات معلوم کرنا یا امم سابقہ کے واقعات معلوم کرنے کے لئے اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ممنوع نہیں ہے۔

پہلا جواب بھی غلط نہیں ہے مگر راجح جواب وہی ہے جس کا ذکر ملا علی قاریؒ اور ابن بطال نے کیا ہے۔

---

(۱) مرقاۃ کتاب العلم فصل أول

عبداللہ بن عباسؓ سے مروی تفسیری روایات کے طرق واسانید

عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کی تفسیر میں بے شمار روایات مروی ہیں اور ان کے مختلف طرق واسانید ہیں جن میں سے بعض صحاح ہیں، بعض حسان ہیں، بعض ضعاف ہیں اور بعض موضوع ہیں اور مفسر کے لئے ضروری ہے کہ بغیر تحقیق کے ابن عباس سے مروی کسی قول کو حتمی نہ سمجھے بلکہ اس کی اسنادی حیثیت معلوم کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے، جب مطلق قال رسول اللہ یا عن النبی پر استدلال کرنا جائز نہیں ہے بلکہ روایت اور درایت دونوں کے اعتبار سے صحت یا عدم صحت کی تحقیق کرنے کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے تو مطلق عن ابن عباس یا قال ابن عباس کے الفاظ دیکھ کر کیسے تفسیر کرنا جائز ہو سکتا ہے ؟ جس طرح حدیث مرفوع کے ثبوت اور عدم ثبوت کا علم سند سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح حدیث موقوف کے ثبوت اور عدم ثبوت کا فیصلہ بھی سند ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال ابن عباسؓ کی روایات کی قوت اور ضعف کا فیصلہ اس کے طرق واسانید کی قدر و قیمت کے تعین پر موقوف ہے۔ ذیل میں مشہور طرق اور ان کی قدر و قیمت اور صحت و ضعف کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) پہلا طریق ہے معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ۔

معاویہ بن صالح بن حدیر متوفی ۱۵۸ھ :

اس نے حمص میں کافی وقت گزارا ہے اس لئے اس کو حمصی کہتے ہیں یہ اندلس میں قاضی بھی رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحیٰ بن معین، عبدالرحمٰن بن مہدی، نسائی، ابو زرعہ رازی اور متعدد ائمہ حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ مسلم نے صحیح مسلم میں اور ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنے سنن میں اس کی روایات نقل کی ہیں۔ امام بخاری نے اگرچہ صحیح بخاری میں اس کی روایات نقل نہیں کی ہیں لیکن اپنے دوسری کتاب "الادب المفرد" میں

اس کی روایت نقل کی ہے۔(۱)

علی بن ابی طلحہ متوفی ۱۴۳ھ کے حالات حافظ مزی متوفی ۷۴۲ھ نے تہذیب الکمال ص ۳۰۶ تا ۳۰۸ ج ۱۳ پر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

اس کا نام سالم بن مخارق تھا اور یہ عباس بن عبد المطلب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اصل میں یہ الجزیرہ کے رہنے والے تھے مگر شام کے شہر حمص منتقل ہو گئے تھے، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں لیکن اس کی ملاقات ابن عباس سے ثابت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابن عباس کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا تھا اور علی بن ابی طلحہ ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے تھے یعنی یہ ابن عباسؓ کی وفات سے ۷۵ سال بعد فوت ہوئے تھے اور اتنے بڑے فرق کی صورت میں ملاقات اور سماع کا امکان بعید از قیاس ہے۔ اسی بنا پر حفاظ الحدیث کا تقریباً اتفاق ہے کہ ابن عباسؓ سے اس کا سماع ثابت نہیں ہے۔ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ یہ طریق اور سند تمام طرق میں سے جید اور صحیح ترین طریق ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ مصر میں تفسیر کا ایک صحیفہ ہے جس کے راوی علی بن ابی طلحہ ہیں اگر کوئی شخص صرف اس صحیفے کے لئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی محنت نہیں ہو گی بلکہ بڑا مبارک اور نفع بخش سفر ہو گا۔ ابو جعفر نحاس نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں اس کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ تفسیر کا یہ نسخہ مصر کے مشہور محدث لیث بن سعد کے کاتب ابو صالح کے پاس موجود تھا، امام بخاری نے صحیح بخاری کے بہت سے مقامات پر اپنے تعلیقات میں ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ کے سند پر اعتماد کیا ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے بھی اسی طریق سے ابن عباسؓ کی تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ اس سند پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ کا سماع ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے لہذا یہ سند منقطع ہے اور سند کی صحت کے لئے اتصال شرط ہے تو اس کو کس طرح اَجْوَدُ الطرق

---

(۱) تہذیب الکمال للحافظ مزی طبع دار الفکر بیروت ۱۹۹۴ء ص ۲۰۶ تا ۲۱۰ ج ۱۸

کہا جاسکتا ہے۔ لیکن حافظ مزیؒ' ابن حجرؒ اور دوسرے حفاظ نے کہا ہے کہ ابن ابی طلحہ اور ابن عباسؓ کے درمیان واسطہ مجاہد بن جبر اور سعید بن جبیر ہیں جن کی ثقاہت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے اور جب واسطہ مجہول نہ ہو بلکہ معروف و معلوم ہو اور اس کی ثقاہت بھی ثابت ہو تو ایسی صورت میں انقطاع اور عدم سماع سند کی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود انقطاع کے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری نے اس طریق پر اعتماد کیا ہے۔(۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ ابن عباسؓ کی جو تفسیر ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ کے سند کے ساتھ نقل ہوئی ہو وہ سب سے زیادہ معتمد تفسیر ہو گی بشر طیکہ ان کا مأخذ علماء اہل کتاب نہ ہوں بلکہ ابن عباس کی اپنی رائے ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ ابو صالح تک سند صحیح ہو۔

(۲) دوسرا طریق ہے قیس بن مسلم الکوفی عن عطاء بن سائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ:

اس سند کے راوی بخاری و مسلم کے راویوں کی شرائط پر پورے اترتے ہیں اور یہ طریق صحیح ہے۔

(۳) تیسرا طریق ہے محمد بن اسحاق بن یسار صاحب سیرۃ عن محمد بن ابی محمد عن عکرمہ اَو سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ یہ اسناد حسن ہے اور اس سے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بہت سی روایات نقل کی ہیں' امام طبرانی نے بھی معجم کبیر میں اس سند سے روایات نقل کی ہیں۔

(۴) چوتھا طریق ہے اسماعیل بن عبد الرحمٰن السدی الکبیر عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباسؓ۔ یہ طریق بھی کم از کم مقبول کے درجے میں ہے۔ تفاسیر میں سدی کے نام سے بہت زیادہ اقوال نقل ہوئے ہیں مگر اس نام سے دو الگ الگ راوی مشہور ہیں۔ ایک ہے سدی صغیر جس کا نام محمد بن مروان ہے جو ضعیف ترین راوی ہے بلکہ اس کو کذاب بھی کہا گیا

---

(۱) اتقان ص ۱۲۳۰۔۱۲۳۱ ج ۲

ہے اور دوسرا سدی کبیر کے نام سے مشہور ہے اور کتابوں میں جب مطلق سدی کا نام آئے تو اس سے سدی کبیر مراد ہوتا ہے۔

اس کا پورا نام ہے ابو محمد اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ السدی الکبیر جو ۱۲۷ھ میں فوت ہوئے تھے۔ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں لکھا ہے کہ سدی کوفہ کی مسجد کے دروازے کے باہر ایک "سدہ" یعنی چبوترے یا بر آمدے کی طرف منسوب ہے جس پر بیٹھ کر یہ اوڑھنیاں فروخت کرتے تھے۔ محدثین کے نزدیک یہ بالاتفاق ثقہ بھی نہیں ہیں اور بالاتفاق ضعیف بھی نہیں ہیں بعض نے اس کی توثیق کی ہے اور بعض نے اس کی تضعیف کی ہے۔ حافظ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں سدی کبیر کے بارے میں محدثین کے درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

یحیٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ:

مَا رَئَيْتُ اَحَدًا يَذْكُرُ السَّدِّىَّ اِلَّا بِخَيْرٍ وَمَا تَرَكَهُ اَحَدٌ.

"میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو سدی کی برائی بیان کرتا ہو بلکہ ہر ایک اس کا ذکر خیر کرتا تھا اور اس کی حدیث کو کسی نے بھی ترک نہیں کیا۔"

احمد بن حنبلؒ، عبدالرحمٰن بن مہدی، نسائی، ابن عدی اور العجلی نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ انس اور ابن عباس سے اس نے روایات نقل کی ہیں اور ابن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، ابو سعید الخدریؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کو اس نے دیکھا تھا۔ مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس سے روایات نقل کی ہیں۔ امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے ائمہ حدیث نے بھی اس سے روایات نقل کی ہیں جو ان کے نزدیک توثیق کی علامت ہے۔ اس کا انتقال ۱۲۷ھ میں ہوا تھا۔ ابن حبان نے اس کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یحیٰ بن معین، ابو حاتم، شعبی، حسین بن واقد اور جوزجانی نے اس پر جرح کی ہے اور اس پر تشیع کی تہمت بھی لگائی گئی ہے۔(۱)

(۱) میزان الاعتدال ص۲۳۶۔۲۳۷ ج۱ تہذیب التہذیب ص۳۱۳۔۳۱۴ ج۱

سیوطی نے لکھا ہے کہ سدی کی تفسیر بہترین تفسیر ہے اور ابن جریر اکثر ابن عباس کے اقوال سدی کبیر عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباس کے طریق سے نقل کرتے ہیں۔

(۵) پانچواں طریق ہے عبدالملک بن جریج عن ابن عباس لیکن اس طریق سے نقل کردہ اقوال کو چھان بین اور بحث و تحقیق کے بعد قبول نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ ابن جریج صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایات نقل کرتے ہیں اور دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ ابن جریج سے بہت سے راویوں نے روایات نقل کی ہیں مثلاً محمد بن ثور عن ابن عباس اور حجاج بن محمد عن ابن جریج عن ابن عباس۔ یہ طریق صحیح ہے۔ جریج عبدالملک کے دادا تھے جس کی طرف اس کی نسبت مشہور ہو گئی ہے اور اس کے والد کا نام عبدالعزیز تھا' یہ مکہ کے مشہور مفسر عطاء بن ابی رباح کے خصوصی شاگرد تھے اور ۱۸ سال تک ان کی مجالس میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ طلحہ بن عمر المکی کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھیں؟ اس نے کہا یہ نوجوان اگر زندہ رہے تو اس سے پوچھا کرو یعنی ابن جریج سے۔ علی بن المدینی نے کہا ہے کہ میں نے یحیٰی بن سعید القطان سے پوچھا کہ نافع کے شاگردوں میں زیادہ مضبوط کون ہے؟ اس نے فرمایا کہ ایوب' عبیداللہ اور مالک۔ مگر ابن جریج نافع سے روایت کرنے میں امام مالک سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ :

كَانَ ابْنُ جُرَيْجٍ مِنْ اَوْعِيَةِ الْعِلْمِ.

"ابن جریج علم کے برتنوں میں سے ایک برتن تھے۔"

یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ اگرچہ امام مالک اور بعض دوسروں نے اس پر جرح کی ہے لیکن اکثر محدثین نے اس کی توثیق کی ہے البتہ ابن جریج جب عن فلاں کے الفاظ کے ساتھ کوئی روایت نقل کرے تو اس کو تحقیق کے بعد قبول کرنا چاہئے کیونکہ یہ تدلیس بھی کر لیا

کرتے تھے یعنی اپنے شیخ کا نام بعض اوقات چھپالیا کرتے تھے۔ اس کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا تھا اور اس کی عمر سو سال سے متجاوز تھی۔(۱)

(۶) چھٹا طریق ہے ضحاک بن مزاحم ہلالی عن ابن عباس۔ یہ طریق ضعیف ہے اس لئے کہ ضحاک کی ملاقات ابن عباس سے ثابت نہیں ہے۔ اکثر محدثین نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ احمد بن حنبل' یحیٰ بن معین' ابوزرعہ اور دوسرے ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے مگر یحیٰ بن سعید القطان اور شعبہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔ یہ خراسان کے باشندے تھے اور اس کا انتقال ۱۰۲ھ اور ۱۰۶ھ کے درمیان ہوا ہے۔ ابن عباس کے جو اقوال ان کے طریق سے نقل ہوئے ہیں محدثین نے عدم سماع کی وجہ سے انہیں ضعیف قرار دیا ہے البتہ ان کے اپنے تفسیری اقوال بالعموم بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے البدایہ والنھایہ ص ۲۲۳ پر ۱۰۲ھ کے احوال میں لکھا ہے کہ ضحاک اپنی ماں کے پیٹ میں دو سال رہے تھے اور جب پیدا ہوئے تو اس کے دانت نکل آئے تھے اور پیدائش کے وقت وہ ہنس رہے تھے اس لئے وہ ضحاک کے نام سے مشہور ہو گئے کیونکہ ضحاک کے معنے ہیں کثیر الضحک یعنی بہت زیادہ ہنسنے والا۔ یہ اگرچہ صحابہ کے دور میں پیدا ہوئے تھے مگر کسی صحابی سے اس کی روایت مشکوک ہے ثابت نہیں ہے۔

(۷) ساتواں طریق ہے عطیہ بن سعد العوفی عن ابن عباس۔ یہ بھی ضعیف اور غیر مقبول طریق ہے اس لئے کہ عطیہ عوفی اکثر محدثین کے نزدیک کمزور راوی ہے۔ امام احمد' امام نسائی' یحیٰ بن سعید القطان' ابو حاتم' ابن عدی' ابن حبان اور ابوداؤد نے اس کی تضعیف کی ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ صَدُوْقٌ یُخْطِئُی کَثِیْرًا کَانَ شیعِیًّا مُدَلِّسًا "سچ بولنے والے تو تھے مگر شیعہ تھے اور مدلس تھے۔"

ابن حجر نے احمد بن حنبل اور ابن حبان کے حوالے سے عطیہ عوفی کی مغالطہ انگیزی کی

---

(۱) تہذیب الکمال ص ۵۵ تا ۶۲ ج ۱۲

ایک مثال یہ نقل کی ہے کہ کلبی سے روایات لیتے تھے اور ابو سعید کے نام سے نقل کرتے تھے۔ کلبی چونکہ بدنام ترین راوی ہیں اس لئے اس نے اس کا فرضی کنیہ ابو سعید رکھ لیا تھا اور جب کلبی کی کوئی روایت بیان کرتے تو کہتے کہ یہ ابو سعید نے اس طرح کہا ہے۔ ابو سعید خدری چونکہ مشہور صحابی کا نام ہے جس سے عطیہ عوفی نے بعض احادیث سنی تھیں اس لئے ناواقف لوگ یہ سمجھتے کہ یہ روایت بھی ابو سعید خدری سے مروی ہوگی حالانکہ وہ دراصل کلبی کی روایت ہوتی تھی۔(۱)

یہ کوفہ کے رہنے والے تھے' تابعی تھے۔ ابو سعید خدری' ابو ہریرہ' ابن عباس' ابن عمر اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہم سے روایات نقل کرتے تھے۔ اس کی وفات ۱۱۱ھ میں ہوئی تھی۔

(۸) آٹھواں طریقہ مقاتل بن سلیمان ازدی خراسانی کا ہے۔ تفاسیر میں مقاتل کے نام سے دو راوی مشہور ہیں ایک ابو بسطام مقاتل بن حیان اور دوسرے ابو الحسن مقاتل بن سلیمان۔ دونوں ہم عصر تھے' دونوں بلخ کے رہنے والے تھے اور دونوں کے شیوخ بھی مشترک تھے اس لئے بعض اوقات بعض لوگوں کو دونوں کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ التباس واشتباہ میں پڑ جاتے ہیں۔ مقاتل بن حیان ثقہ تھے اور ممتاز علماء میں سے تھے لیکن تفسیروں میں اس کا حوالہ بہت ہی کم آتا ہے اور جب مطلق مقاتل کا نام آتا ہے تو اس سے مراد مقاتل بن سلیمان ہوتا ہے۔ یہ ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے تھے۔ امام شافعی اور کچھ دوسرے حضرات سے اس کی مدح و تعریف بھی نقل ہوئی ہے لیکن اکثر محدثین نے اسے مجروح' ضعیف اور ناقابل اعتماد راوی قرار دیا ہے۔ امام وکیع' امام جوزجانی' امام نسائی اور امام دارقطنی نے اسے کذاب کہا ہے اور امام بخاری' یحییٰ بن معین' ابو حاتم' ابن سعد اور العجلی نے اس کی بڑے سخت الفاظ میں تضعیف کی ہے۔ اس پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ مجسمہ اور مشبہہ میں سے تھے یعنی اللہ کی صفات کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے تھے۔ اس کے تفصیلی حالات

(۱) تہذیب التہذیب ص ۲۲۵۔۲۲۶ ج ۷

کے لئے ملاحظہ کیجئے تہذیب التہذیب ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ ج ۱۰۔

(۹) نواں طریق ہے مروان بن محمد السدی الصغیر عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس۔ یہ ابن عباسؓ کی روایات کے تمام طرق واسانید میں سے سب سے زیادہ واہی اور ضعیف طریق ہے۔ بلکہ سیوطی نے اس کو سلسلۃ الکذب یعنی جھوٹ کا سلسلہ کہا ہے۔(۱)

اس طریق سے ابن عباس کی روایات ثعلبی اور اس کے تلمیذ واحدی اکثر نقل کرتے ہیں لیکن ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ ان کی کتابوں میں باطل اور جھوٹی روایات بہت زیادہ نقل ہوئی ہیں۔(۲)

مروان بن محمد سدی صغیر کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ عبدالرحمن بن زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور محمد بن السائب الکلبی کے شاگرد تھے۔ اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں اس کے بارے میں ائمہ حدیث کے اقوال اس طرح نقل کئے ہیں۔

جریر بن عبدالحمید نے کہا ہے کہ یہ کذاب تھے۔ یحیٰ بن معین نے کہا ہے کہ لیس بثقة یہ ثقہ راوی نہیں ہیں۔ صالح بن محمد بغدادی کہتے ہیں کہ کَانَ ضَعِیفًا وَ کَانَ یَضَعُ الْحَدِیْثَ اَیضًا یہ ضعیف تھے اور حدیث اپنی طرف سے گھڑتے بھی تھے۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ ذَاهِبُ الْحَدِیْث' مَتْرُوكُ الْحَدِیْثِ لَا یُکْتَبُ حَدِیْثُه' "یہ ضعیف اور گری ہوئی حدیثیں بیان کرنے والا ہے' اس کی حدیث کو محدثین نے ترک کر دیا ہے اور اس کی حدیث قطعاً نہیں لکھی جاتی۔"

امام بخاری اور نسائی نے بھی کہا ہے کہ لَا یُکْتَبُ حَدِیْثُه ان کی حدیث نہیں لکھی جاسکتی۔(۳)

(۱) الاتقان ص ۱۲۳۲ ج ۲
(۲) فتاوی ابن تیمیه ص ۳۸۶ ج ۱۳
(۳) تہذیب الکمال ص ۲۰۷ ج ۱۷

ابو النضر محمد بن السائب بن بشر الکلبی الکوفی متوفی ۱۴۶ھ۔ بنو کلب قبیلے کی نسبت سے یہ کلبی کے نام سے مشہور ہے اور کوفہ کے رہنے والے تھے۔ یہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ تہذیب الکمال میں اس کے بارے میں ائمہ حدیث کے جو اقوال نقل ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ضعیف ہے بلکہ کذاب اور وضاع الحدیث ہے۔

معتمر بن سلیمان نے لیث بن ابی سلیم سے نقل کیا ہے کہ کوفہ میں دو کذاب رہتے ہیں ایک کلبی اور دوسرا اسدی یعنی محمد بن مروان' یحی بن معین نے کہا ہے کہ لیس بشیئی یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ امام بخاری نے فرمایا ہے کہ ترکہ' یحی بن سعید القطان و ابن مھدی۔ یحی بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ یعنی اس سے روایات نہیں لیتے تھے۔ اصمعی' ابو عوانہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے کلبی سے کفر کی باتیں سنی ہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا ہے کہ عمرو بن العلاء کے دروازے پر ہمارے پاس ابو جزء بیٹھا ہوا تھا اور کہنے لگا کہ اَشْهَدُ اَنَّ الْكَلْبِيَّ كَافِرٌ میں گواہی دیتا ہوں کہ کلبی کافر ہے۔ یزید بن زریع نے کہا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو ابو جزء نے کہا کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جبریل وحی لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے مگر آپ کسی حاجت کے لئے اٹھ گئے تھے اور حضرت علیؓ بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ جبریل نے وحی علیؓ کو پہنچا دی" یزید نے کہا کہ میں نے تو کلبی سے یہ بات نہیں سنی البتہ میں نے اس سے یہ سنا ہے کہ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ اَنَا سَبَائِیٌّ اَنَا سَبَائِیٌّ میں سبائی ہوں' میں سبائی ہوں۔ کلبی سے ابو صالح روایات نقل کرتا تھا لیکن ابو جناب کلبی سے مروی ہے کہ حَلَفَ ابو صالح اَنِّیْ لَمْ اَقْرَأْ عَلَى الْكَلْبِيِّ مِنَ التَّفْسِيْرِ شَيْئًا ابو صالح نے قسم اٹھا کر کہا ہے کہ میں نے کلبی کے سامنے تفسیر میں سے کچھ بھی بیان نہیں کیا۔ سفیان ثوری نے کہا ہے کہ میرے سامنے کلبی نے اقرار کیا تھا کہ میں نے ابو صالح عن ابن عباس کی سند سے جو کچھ بھی بیان کیا ہے وہ سب جھوٹ ہے پس تم اسے نقل نہ کیا کرو۔ قرہ بن خالد کہتے ہیں کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ کلبی جھوٹ بولتا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے

کہ کلبی کی حدیث کے ترک پر اجماع ہے۔ نسائی نے کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے اس سے حدیثیں نہیں لکھنی چاہئیں۔(۱)

ابن حجر لکھتے ہیں کہ جوزجانی نے اس کو کذاب کہا ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس کا جھوٹا ہونا واضح ہے اس لئے اس کی تعریف میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس نے ابو صالح سے تفسیر نقل کی ہے لیکن ابو صالح نے ابن عباس سے کچھ بھی سنا نہیں۔ ساجی نے کہا ہے کہ کلبی متروک الحدیث اور بہت زیادہ ضعیف ہے اس لئے کہ یہ شیعیت میں حد سے آگے نکل چکا ہے۔ احکام و فروع میں اس کی روایت ترک کرنے اور اس کی مذمت پر ثقات نے اتفاق کر لیا ہے۔ امام حاکم نے کہا ہے کہ الکلبی نے ابو صالح سے موضوع احادیث نقل کی ہیں۔(۲)

تفسیر ابن عباسؓ کی اسنادی حیثیت

"تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس" کے نام سے ابن عباس کی تفسیری روایات پر مشتمل ایک کتاب القاموس المحیط کے مصنف علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ۷۸۱ھ نے مرتب کی ہے جو تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے اور مصر میں متعدد بار طبع ہوئی ہے جس کو دار الاشراق بیروت نے ۱۹۹۸ء میں بہترین کمپوزنگ اور طباعت کے ساتھ مصحف کے حاشیئے پر چھاپا ہے۔

اس کتاب کے مرتب نے سورۃ فاتحہ کے آغاز میں ابن عباسؓ تک اپنی سند اس طرح بیان کی ہے:

اَخْبَرَنَا عبداللّٰہِ الثِّقَۃُ بْنُ الْمَأْمُوْنِ الْھَرَوِیُّ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبِیْ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْعَبْدِ اللّٰہِ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ عُبَیْدِاللّٰہِ مَحْمُوْدُ بْنُ مُحمدَ الرَّازِیُّ قَالَ اَخْبَرَنَا عَمَّارُ بْنُ عَبْدِ

(۱) تہذیب الکمال للمزی ص۲۹۵ تا ۲۹۷ ج۱٦

(۲) تہذیب التہذیب لابن حجر ۱۵۹ ج۹

الْمَجِيْدِ الْهَرَوِیُّ قَالَ اَخْبَرَنَا عَلِیُّ بْنُ اِسْحَاقَ السَّمَرْقَنْدِیُّ عَنْ مُحَمَّدِبْنِ مَرْوَانَ عَنِ الْکَلْبِیِّ عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ۔

''ہم کو خبر دی ہے عبداللہ بن مامون ہروی نے جو ثقہ تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے میرے باپ نے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے ابو عبداللہ نے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے ابو عبیداللہ محمود بن محمد رازی نے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے عمار بن عبدالمجید ہروی نے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے علی بن اسحاق سمرقندی نے وہ نقل کرتے ہیں محمد بن مروان (سدی صغیر) سے اور وہ نقل کرتے ہیں کلبی سے اور کلبی نقل کرتے ہیں ابو صالح سے اور ابو صالح نقل کرتے ہیں ابن عباسؓ سے۔''

اور سورہ بقرہ کے آغاز میں جو سند ذکر کی گئی ہے اس میں عمار بن عبدالمجید ہروی کی جگہ عبداللہ بن مبارک کا نام ہے اور اس سے آگے وہی سند ہے جو سورہ فاتحہ کے اول میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد ہر سورت کے آغاز میں اسی اسناد کا حوالہ دے کر ابن عباس کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مرتب نے جن طرق سے بھی یہ اقوال جمع کئے ہیں ان سب کا دارومدار محمد بن مروان عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس پر ہے۔ محمد بن مروان اور کلبی کے حالات تو مستند کتابوں کے حوالے سے بیان کر دیے گئے ہیں کہ یہ دونوں جھوٹے تھے اور حدیثیں گھڑنے والے راوی تھے اور ابو صالح کا سماع ابن عباس سے ثابت نہیں ہے اس لئے ابن عباس کی جانب منسوب اس تفسیر کی اسناد کے اعتبار سے کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ یہ وَضّاعین کی وضع کردہ ہے البتہ ابن جریر' ابن کثیر اور دوسری تفاسیر میں اور صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ابن عباس کے تفسیری اقوال صحیح یا حسن کی درجے کے طرق و اسانید کی ساتھ نقل ہوئے ہیں جن کی روشنی میں تفسیر کرنی چاہئے۔ لیکن ابن عباس کی طرف منسوب اس تفسیر کے غیر مستند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی تمام باتیں باطل اور ناقابل قبول ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نسبت ابن عباس کی طرف صحیح

نہیں ہے۔ ورنہ اس تفسیر میں اور دوسری غیر مستند تفاسیر میں بھی بعض آیات کی تفہیم و تفسیر میں اچھے اور مفید نکات بھی ملتے ہیں لیکن ان کی نسبت ابن عباس یا دوسرے صحابہ کی طرف اسی وقت صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے جب کہ ان کے اسانید و طرق اصول حدیث کی روشنی میں قابل قبول ہوں۔

عبداللہ بن مسعودؓ متوفی ۳۲ھ

عبداللہ بن عباسؓ کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کی تفسیر میں زیادہ روایات مروی ہیں اور دور صحابہ میں ان کو فقہ اور تفسیر میں امتیازی مقام حاصل تھا۔ ابن الاثیر جزری نے اسد الغابہ میں ان کے حالات اور فضائل و مناقب پانچ صفحات پر تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ بن غافل کا اسم کنیہ ابو عبدالرحمٰن تھا اور یہ بنو ہذیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اس کو ابو عبدالرحمٰن ہذلی کہا جاتا تھا اس کے والد مسعود جاہلیت کے زمانے میں بنو زہرہ کے حلیف کے نام سے بھی یاد کئے جاتے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت عمرؓ سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور السابقون الاولون صحابہ میں شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :

اِستَقرِؤُوا القرآنَ مِنْ اَربَعَةٍ مِنْ عَبدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٌ فَبَدَءَ بِهٖ وَ سَالِمٍ مَوْلٰی اَبِیْ حُذَیفَةَ وَ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ وَ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ

"چار صحابہ سے قرآن پڑھا کرو عبداللہ بن مسعودؓ سے آغاز ان کے نام سے کیا ابو حذیفہ کے غلام سالم سے' ابی بن کعب سے اور معاذ بن جبل سے۔"(۱)

عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے درخواست کی کہ ہم کو ایسا شخص بتایئے جو اخلاق و شمائل میں اور طرز زندگی میں نبی کریم ﷺ کے زیادہ قریب

(۱) بخاری ابواب فضائل صحابة

ہو تا کہ ہم اس سے علم حاصل کریں۔ حذیفہؓ نے فرمایا کہ مجھے اخلاق وسیرت میں اور طرز زندگی میں نبی کریم ﷺ سے زیادہ قریب ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ دوسرا کوئی شخص معلوم نہیں ہے۔(۱)

ان کے اسلام لانے کا سبب معجزاب رسول میں سے ایک معجزہ تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ :

"میں نوجوان لڑکا تھا اور عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرا رہا تھا ایک روز نبی ﷺ ابو بکر کے ہمراہ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے لڑکے کیا تیرے پاس دودھ ہے؟ میں نے کہا جی ہاں دودھ تو ہے لیکن یہ میرے پاس امانت ہے یعنی میں چرواہا ہوں مالک نہیں ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس ایسی بکری لے آؤ جسے کسی بکرے نے جفتی نہ کیا ہو۔ میں ایک چھوٹی بکری لے آیا (جس پر ابھی سال پورا نہیں ہوا تھا) آپ نے اس کی ٹانگ کو اپنی ران اور پنڈلی کے درمیان دبایا اور اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے اور ساتھ دعا بھی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ ابو بکر ایک صاف ستھرا پیالہ لے آئے۔ آپ نے اس میں تازہ دودھ نکالا اور ابو بکر کو فرمایا کہ یہ دودھ پی لو۔ اس نے بھی پیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کے بعد پیا۔ پھر آپ نے تھنوں کو حکم دیا کہ سکڑ جاؤ اور وہ سکڑ گئے جس طرح کہ پہلے سکڑے ہوئے تھے۔ یہ معجزہ دیکھ کر میں آپ کے پاس آیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے قرآن میں سے کچھ بتا دیجئے۔ آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا اِنَّكَ غُلَامٌ مُعَلَّمٌ تم تو وہ لڑکے ہو جو دوسروں کو قرآن کی تعلیم دو گے۔"

زبیر بن عوامؓ نے فرمایا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے پہلے بلند آواز سے مشرکین کو قرآن سنانے والے ابن مسعود ہیں۔ ایک دن اصحاب رسول اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ قریش نے ابھی تک بلند آواز سے قرآن نہیں سنا ہیں کون ہے جو ان کو قرآن

(۱) بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعودؓ

سنائے؟ ابن مسعود نے فرمایا کہ میں سناؤں گا۔ صحابہ نے کہا کہ خطرہ ہے کہ وہ تم کو تکلیف پہنچائیں گے ہم ایسا شخص چاہتے ہیں جس کا یہاں پر قبیلہ ہو جو ان لوگوں سے اس کی حفاظت کرے اگر وہ ظلم کا ارادہ کریں۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو میری حفاظت اللہ کرے گا۔ چنانچہ دوسرے دن چاشت کے وقت ابن مسعودؓ حرم کعبہ میں مقام ابراہیم کے پاس پہنچے۔ قریش اپنی مجالس میں بیٹھے ہوئے تھے اس نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے سورہ رحمان کی تلاوت شروع کی۔ قریش ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ام عبد کا بیٹا کیا پڑھ رہا ہے؟ پھر کہنے لگے یہ تو اس کلام کا کچھ حصہ پڑھ رہا ہے۔ اس پر وہ اٹھے اور جا کر ان کے چہرے پر تھپڑ مارنے لگے اور اس حالت میں بھی ابن مسعود نے قراءت جاری رکھی یہاں تک کہ وہ اس سورت کی اس آیت تک پہنچ گئے جہاں تک پہنچنے کا اللہ نے ارادہ کیا تھا اور پھر اپنے ساتھیوں کے پاس اس حال میں آئے کہ اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو اسی چیز کا خطرہ تھا۔ اس نے کہا کہ اللہ کے یہ دشمن اس سے قبل مجھے اتنے زیادہ حقیر نہیں دکھائی دیتے تھے جتنے آج حقیر نظر آ رہے تھے۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں کل پھر ایسا کروں گا۔ انہوں نے کہا بس اتنا ہی کافی ہے تم نے ان کو وہ قرآن سنا دیا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتے۔

ابن مسعودؓ نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی تھی اور مدینہ کو بھی ہجرت کی تھی۔ دونوں قبلوں کی طرف نمازیں پڑھی تھیں۔ غزوہ بدر' غزوہ احد' غزوہ خندق' بیعت الرضوان اور دوسرے محاذوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرکت کی تھی اور آپ کی وفات کے بعد جنگ یرموک میں بھی شریک ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی تھی۔

صحابہ میں سے ابن عباسؓ' ابن عمرؓ' ابو موسیٰؓ' عمران بن حصینؓ' عبداللہ بن زبیرؓ' جابر بن عبداللہؓ' انس بن مالکؓ' ابو سعید خدریؓ' ابو ہریرہؓ' ابو رافعؓ اور دوسرے صحابہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ اور علم حاصل کیا ہے اور تابعین میں سے علقمہ' ابو وائل' اسود' مسروق' عبیدہ اور قیس بن حازم جیسے مشاہیر ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا تھا کہ مجھے قرآن سناؤ' حذیفہ بن یمان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

وَ تَمَسَّكُوْا بِعَهْدِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ.

"ام عبد کے بیٹے کے طریقے کا اتباع کیا کرو۔"

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو مشورے کے بغیر امیر بناتا تو ام عبد کے بیٹے کو امیر بنا دیتا۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات ابن مسعود کے فضل و کمال اور اس کے علم و فقاہت کی بہت بڑی شہادت ہے۔

حضرت عمرؓ نے جب ابن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو خط لکھا کہ میں نے عمار بن یاسرؓ کو تمہارے پاس بطور امیر بھیجا ہے اور ابن مسعودؓ کو معلم اور وزیر کے طور پر بھیجا ہے۔ یہ دونوں اصحاب رسول میں سے بڑی نجابت اور شرافت والے ہیں اور اہل بدر میں سے ہیں۔ پس تم ان دونوں کی پیروی کرو اور ان کی سمع و طاعت کرو۔ میں نے ابن مسعود کو تمہارے پاس بھیج کر ایثار کیا ہے۔ (اس لئے کہ اس کی مرکز میں مجھے زیادہ ضرورت تھی)

ایک روز ابن مسعودؓ عمر فاروقؓ کی مجلس میں تشریف فرما تھے اور جب واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ اسے پیچھے سے دیکھتے رہے جب ان کی نظر سے اوجھل ہوئے تو فرمایا :

كُنَيْفٌ مَلِيْءٌ عِلْمًا.

"ابن مسعود علم سے بھرا ہوا برتن ہے۔"

اعمش نے زید بن وہب سے نقل کیا ہے کہ جب عثمان بن عفانؓ نے ابن مسعودؓ کو مدینہ تشریف لانے کے لئے پیغام بھیجا تو لوگ اس کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ یہیں پر ٹھہرے رہو ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ (ابن مسعودؓ کو تدوین قرآن کے بارے میں عثمانؓ سے کچھ شکایات تھیں اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی) ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ عثمانؓ کا مجھ پر اطاعت کا حق ہے (اس لئے کہ وہ امیر ہے) عنقریب فتنے رونما

ہوں گے اور میں نہیں چاہتا کہ ان فتنوں کا دروازہ پہلے میں کھولوں۔ چنانچہ لوگوں کو واپس بھیجا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں ان کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی۔ نماز جنازہ عثمان بن عفانؓ نے پڑھائی۔ (بعض کہتے ہیں کہ عمار بن یاسر نے پڑھائی تھی اور بعض کے نزدیک زبیر بن عوامؓ نے پڑھائی تھی) اور ان کی وصیت کے مطابق رات کے وقت بقیع الغرقد میں دفن کئے گئے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر تھی۔ ابن مسعودؓ کی وفات پر ابو الدرداءؓ نے فرمایا تھا کہ :

مَا تَرَكَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ.

"اس نے اپنے بعد اپنا جیسا کوئی نہیں چھوڑا۔" (۱)

عبداللہ بن مسعودؓ کے تفسیری اقوال کے طرق واسانید

تفسیر کے بارے میں ابن مسعودؓ کے علم سے سب سے استفادہ اہل کوفہ نے کیا ہے اس لئے کہ یہ کوفہ میں بطور معلم رہتے تھے اور لوگ ان کی مجالس میں حاضر ہو کر ان سے علم حاصل کرتے تھے اور ان سے روایات نقل کرتے تھے۔ تفسیر بالماثور کی کتابوں میں بہت سے اسانید اور طرق نقل ہوئے ہیں جو ابن مسعودؓ تک پہنچتے ہیں۔ ان میں سے بعض طرق معتمد اور مستند ہیں اور بعض راویوں کی عدم ثقاہت کی وجہ سے یا سند کے عدم اتصال کی وجہ سے ضعیف ہیں۔

ابن مسعودؓ کی تفسیری روایات کے مشہور طرق درج ذیل ہیں :

(۱) پہلا طریق ہے اعمش عن ابی الضحی عن مسروق عن ابن مسعودؓ۔

یہ صحیح ترین طریق ہے اور بخاری نے صحیح بخاری میں اسی طریق پر اعتماد کیا ہے۔

(۲) دوسرا طریق ہے مجاہد عن ابی معمر عن ابن مسعودؓ۔

(۱) أسد الغابه فی معرفة الصحابه ص۲۵۶ تا ۲۶۰ ج۳

یہ بھی صحیح سند ہے اور صحیح بخاری میں اس پر بھی اعتماد کیا گیا ہے۔

(۳) تیسرا طریق ہے اعمش عن ابی وائل عن ابن مسعود۔

یہ بھی صحیح ہے اور بخاری نے اس طریق سے بھی ابن مسعود کی روایات نقل کی ہیں جو اس کی صحت کی دلیل ہے۔

(۴) چوتھا طریق سدی کبیر عن مرۃ الہمدانی عن ابن مسعود۔

اس طریق سے ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں بہت سی روایات نقل کی ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سدی کبیر اکثر محدثین کے نزدیک ثقہ تھے البتہ سدی صغیر ضعیف تھے بلکہ کذاب تھے۔

(۵) پانچواں طریق ہے ابو روق عن الضحاک عن ابن مسعود۔

اگرچہ ابن جریر اس طریق سے بھی ابن مسعود کی روایات نقل کرتے ہیں لیکن یہ طریق پسندیدہ نہیں ہے اس لئے کہ ضحاک کی ملاقات ابن مسعود سے نہیں ہوئی لہذا یہ اسناد منقطع ہے۔(۱)

علی بن ابی طالبؓ متوفی ۴۰ھ

حضرت علیؓ کو فقاہت اور قضاء میں مہارت اور فراست کے ساتھ علم تفسیر و تاویل میں بھی امتیازی مقام حاصل تھا اور قرآن کی تفسیر میں ان سے بے شمار روایات مروی ہیں لیکن چونکہ غالی شیعوں نے حضرت علی کی جانب منسوب کر کے بہت زیادہ موضوعی اور جعلی روایات بھی پھیلادی ہیں اس لئے علماء اہل سنت حضرت علی کی مرویات کو ان کے اسانید و طرق کی تحقیق و تنقید کے بغیر قبول نہیں کرتے۔ قول اصح کے مطابق ان کی پیدائش بعثت نبوی سے دس سال قبل ہوئی تھی۔

(۱)التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص ۸۷-۸۸ ج ۱

علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور سیدہ نساء العالمین فاطمہ بنت محمد کے شوہر تھے۔ ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھا اس لئے آپ والد اور والدہ دونوں کی جانب سے ہاشمی تھے جو بقول رسول تمام قبائل میں بہترین قبیلہ ہے۔ بہت سے علماء کے نزدیک سب سے پہلے اسلام لانے والے حضرت علی تھے لیکن تحقیقی قول یہ ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے ابو بکر ایمان لائے تھے۔ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی خدیجہ بنت خویلد زوجہ رسول تھیں اور بچوں میں سب سے پہلے مؤمن علی بن ابی طالب تھے۔ اصح الاقوال کے مطابق حضرت علیؓ نے دس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا۔ جب کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو جبریل نے آکر حکم دیا کہ آج رات آپ اپنی خواب گاہ تبدیل کر دیں چنانچہ آپ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلایا اور خود ابو بکر کے ہمراہ غار ثور تشریف لے گئے اور پھر ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے اور حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگوں کی جو امانتیں تھیں ان کو حقداروں تک پہنچا کر بعد میں بڑی تکلیف کے ساتھ پیدل چل کر مدینہ پہنچے۔ ان کے پاؤں طویل پیدل سفر کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے مگر رسول اللہ ﷺ کی دعا اور لعاب مبارک کی برکت سے زخم مندمل ہو گئے اور ان کی صحت اور قوت بحال ہو گئی۔

غزوہ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک ہوئے تھے اور بعض غزوات میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ غزوہ تبوک میں اس لئے شریک نہیں ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اہل بیت کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر رہنے کا حکم دیا تھا۔

امام احمد، قاضی اسماعیل، امام نسائی اور ابو علی نیشاپوری نے فرمایا ہے کہ:

لَمْ يَرِدْ فِي حَقِّ أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ بِالْأَسَانِيْدِ الْجِيَادِ أَكْثَرُ مَا جَاءَ فِي عَلِيٍّ.(۱)

(۱) فتح الباری، باب مناقب علیؓ

"جید اور صحیح اسانید کے ساتھ کسی صحابی کے حق میں اتنی زیادہ احادیث وارد نہیں ہوئیں جتنی حضرت علیؓ کے حق میں وارد ہوئی ہیں۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن بھیجنا چاہا تو میں نے کہا کہ یارسول اللہ آپ مجھے یمن بھیج رہے ہیں لیکن وہاں پر لوگ مجھ سے اپنے مسائل اور تنازعات کے فیصلوں کے بارے میں پوچھیں گے اور میرے پاس علم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا میرے قریب آجاؤ جب میں قریب ہوا تو آپ نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ مارا اور پھر دعا کی کہ:

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ لِسَانَهٗ وَاهْدِ قَلْبَهٗ.

"اے اللہ اس کی زبان کو مضبوطی عنایت فرما اور اس کے دل کو ہدایت اور علم عطا فرما۔"

اللہ کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا ہے اور روح کو پیدا کیا ہے کہ اس کے بعد میرے دل میں فریقین کے کسی بھی معاملے کا فیصلہ کرنے میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوا۔

عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں مدینۃ العلم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے پس جو کوئی بھی علم کے حصول کا ارادہ رکھتا ہو تو علم کے دروازے پر آجائے۔

اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ علم کے اس شہر کا دروازہ صرف حضرت علیؓ ہے اس لئے کہ علوم نبوت کے راستے اور دروازے تمام صحابہ ہیں۔ کسی کے پاس علم زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم ہے مگر بعض صحابہ کے پاس مدینۃ العلم سے حاصل کردہ علم بہت زیادہ ہے اور ان کو تخصص کا درجہ حاصل ہے ایسے متخصصین صحابہ میں حضرت علی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہتے تھے کہ:

اِنَّ اَقْضٰی اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ عَلِیُّ بن ابی طالبؓ.

"اہل مدینہ میں سب سے بڑے قاضی علی بن ابی طالب ہیں۔"

سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اس مشکل مسئلے سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے جس کو حل کرنے کے لئے ابوالحسن یعنی علی بن ابی طالب موجود نہ ہو۔ یعنی حضرت علیؓ موجود نہ ہوتے اور کوئی مشکل پیش آجاتی تو حضرت عمر کو بڑی دقت پیش آتی اس لئے وہ حضرت علیؓ کی غیر موجودگی میں کسی مشکل کے پیش آنے سے پناہ مانگتے تھے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اے علی تیری مثال کعبے کی ہے جس کے پاس لوگ آتے ہیں مگر کعبہ لوگوں کے پاس نہیں جاتا۔ اگر یہ لوگ تیرے پاس آئے اور خلافت تیرے سپرد کی تو قبول کر لو اور اگر وہ تیرے پاس نہ آئے تو تم خلافت حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس نہ جاؤ۔

عثمان بن عفانؓ کی شہادت کے بعد ذوالحجہ ۳۵ھ کو مدینہ کی مسجد نبوی میں انصار و مہاجرین کے نمائندوں نے خلافت ان کے سپرد کی اور تین ماہ کم پانچ سال خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد ۴۰ھ میں شہید کر دیئے گے۔ صحیح قول کے مطابق ان کی عمر ۶۳ سال تھی۔(۱)

حضرت علیؓ کی تفسیری روایات کے طرق واسانید

تفسیر میں حضرت علیؓ سے بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں لیکن سند صحیح کے ساتھ مروی روایات کی تعداد تھوڑی ہے اور اس کا سبب غالی شیعہ ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی ترویج کے لئے اور اپنے آراء فاسدہ کی تائید کے لئے حضرت علیؓ کی جانب ایسے اقوال منسوب کر دیئے ہیں جن کے صحیح اسانید موجود نہیں ہیں مثلاً شیعوں نے حضرت علیؓ کی جانب جو یہ قول منسوب کیا ہے کہ اگر میں چاہوں تو سورۃ فاتحہ کی ایسی تفسیر لکھ سکتا ہوں جس کا بوجھ ستر

(۱) اسدالغابہ فی معرفۃ الصحابہ ص۱۶ تا ۴۰ ج ٤

اونٹ اٹھائیں گے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کی تفاسیر موضوعی روایات سے بھری ہوئی ہیں جو شخص بھی ذرا ہمت کر کے حسن عسکری کی تفسیر' طبرسی کی مجمع البیان (جو نسبتاً معتدل تھا) ملا محسن کاشی کی الصافی' عبداللطیف کازرانی کی مرآۃ الانوار اور امامیہ کے متقدمین اور متاخرین کی دوسری تفاسیر کا مطالعہ کرے گا اسے آیات قرآنی کی تاویل میں موضوعی' جعلی اور بے بنیاد روایات کی کافی تعداد مل جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کی جانب منسوب وضعی اور جعلی روایات کی کثرت نے ان کے علم کا بہت بڑا حصہ ضائع کر دیا ہے ورنہ قرآن کے فہم اور تفہیم اور فقہ و اجتہاد میں ان کو بہت بڑا مقام حاصل تھا اور ایمانی فراست اور بصیرت میں ان کا درجہ بہت زیادہ ممتاز تھا۔ رضی اللہ عنہ وعن اصحابہ و آلہ اجمعین۔

وضعی روایات کی اسی کثرت کی وجہ سے صحیح احادیث نقل کرنے والے محدثین حضرت علی سے مروی انہی روایات پر اعتماد کرتے ہیں جو ثقات اور مضبوط راویوں سے منقول ہوں۔

حضرت علی کی روایات کے مشہور اور اہم طرق یہ ہیں :

(۱) پہلا طریق ہے ہشام عن ابن سیرین عن عبیدہ سلمانی عن علی۔

یہ طریق صحیح ہے امام بخاری وغیرہ اس طریق سے حضرت علی کی روایات نقل کرتے ہیں۔

(۲) دوسرا طریق ہے ابن ابی الحسین عن ابی الطفیل عن علی۔

یہ طریق بھی صحیح ہے سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں اس طریق سے روایات نقل کی ہیں۔

(۳) تیسرا طریق ہے زہری عن علی بن حسین زین العابدین عن ابیہ الحسین عن ابیہ علی۔

یہ صحیح ترین طریق ہے بلکہ ابن الصلاح نے اپنے مقدمے علوم الحدیث میں لکھا ہے کہ بعض ائمہ حدیث نے اس کو حدیث کے تمام اسانید میں اصح الاسانید قرار دیا ہے لیکن اس طریق کو وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی ہے جو پہلے دو طریقوں کو حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے

کہ وضاعین کذابین اور ضعفاء نے بہت سی جھوٹی روایات امام زین العابدین کی طرف منسوب کر دی ہیں۔(۱)

ابی بن کعبؓ متوفی ۲۲ھ

چوتھا صحابی جس سے قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق روایات نقل ہوئی ہیں وہ ابی بن کعبؓ بن قیس ہیں۔ یہ انصار کے بنو النجار قبیلے سے نسبی تعلق رکھتے تھے اس کے اسماء کنیہ دو ہیں۔ ایک ابو المنذر یہ نام آپ کو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا اور دوسرا ابو الطفیل اور یہ نام حضرت عمرؓ نے رکھا تھا۔ منذر اور طفیل دونوں اس کے بیٹے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ اور بدر دونوں میں شریک ہوئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

اَقْرَءُ هُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ اُبَیٌّ بْنُ كَعْبٍ.

"قرآن کی سب سے اچھی قراءت کرنے والا ابی بن کعب ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تیرے سامنے **لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ** پڑھوں ابی نے کہا کیا اللہ نے میرا نام لیا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں تیرا نام لیا تھا۔ اس پر وہ خوشی سے رونے لگے۔ عبد الرحمٰن بن ابزی کہتے ہیں کہ کیا تم اس پر خوش ہو گئے ہو؟ انہوں نے فرمایا مجھے خوش ہونے سے کون روک سکتا ہے جب کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کہو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر چاہئے کہ وہ خوش ہو جائیں۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب کا امتحان لیا اور فرمایا کہ اے ابو المنذر! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی کتاب میں کونسی آیت عظمت اور شان میں سب سے بڑی ہے؟ ابی کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ یعنی میں

(۱) التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص ۹۱ ج ۱

تو نہیں جانتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سوال پھر دہرایا (تاکہ وہ سوچے اور جواب معلوم کرے) تو دوسری مرتبہ اس کے ذہن میں جواب آگیا اور فرمایا کہ سب سے زیادہ عظمت والی آیت اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الحَیُّ القَیُّوْم یعنی آیت الکرسی ہے۔ (سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لِیَھْنِكَ العِلْمَ اَبَا المُنْذِرِ.

"تجھے علم مبارک ہو اے ابو المنذرؓ۔"

یہ ارشادات رسول ابی بن کعب کی ذہانت' فقاہت' فطانت اور علم پر بہت بڑی شہادت ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ:

اُبَیٌّ سَیِّدُ المُسْلِمِیْنَ.

"ابی ابن کعب مسلمانوں کے سردار اور قائد ہیں۔"

ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور مشکل مسائل و معاملات فیصلے کے لئے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ مشہور تابعی مسروق فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں چھ افراد اصحاب القضاء تھے یعنی معاملات اور تنازعات کا فیصلہ کرنے میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ' حضرت علیؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' ابی بن کعب' زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری' کاتبان رسول میں سے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے کاتب رسول ابی بن کعب تھے۔ البتہ کتابت کی ذمہ داری سب سے زیادہ زید بن ثابت نے انجام دی ہے۔ ابی بن کعب کی تاریخ وفات میں اقوال مختلف ہیں بعض کے نزدیک اس کی وفات حضرت عمرؓ کی خلافت میں ۲۲ھ کو ہوئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا انتقال عثمان بن عفانؓ کی خلافت میں ۳۰ھ میں ہوا تھا۔ ابو نعیم اصفہانی نے اس قول کو اصح قرار دیا ہے اس لئے کہ عثمانؓ کی خلافت میں زر بن حبیش نے ان سے ملاقات کی تھی لیکن زیادہ مشہور

قول یہ ہے کہ ان کا انتقال حضرت عمرؓ کی خلافت میں ہوا تھا۔(۱)

ابی بن کعبؓ کی تفسیری روایات کے طرق واسانید

ابی بن کعب کی روایات بھی متعدد طرق سے نقل ہوئی ہیں لیکن ان میں سے مشہور طرق دو ہیں:

(۱) پہلا طریق ہے ابو جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابی۔

یہ طریق صحیح ہے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس طریق سے ابی بن کعب کی بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ امام احمد نے مسند اور حاکم نے مستدرک میں بھی اس طریق سے روایات کی تخریج کی ہے۔

(۲) دوسرا طریق ہے وکیع عن سفیان عن عبداللہ بن محمد بن عقیل عن الطفیل بن ابی بن کعب عن ابیہ ابی۔

یہ طریق حسن کے درجے کا ہے اور مقبول ہے امام احمد نے مسند میں اس طریق سے ابی کی روایات نقل کی ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے کہ عبداللہ بن محمد بن عقیل اگرچہ سچ بولنے والے راوی ہیں لیکن اس کے حافظے پر بعض اہل علم نے اعتراض کیا ہے اور امام بخاری سے میں نے سنا ہے کہ احمد بن حنبل' اسحاق بن ابراہیم اور حمیدی اس کی حدیث پر استدلال کرتے تھے۔ حافظ نورالدین ہیثمی نے مجمع الزوائد میں تصریح کی ہے کہ اس کی حدیث حَسَن ہے۔(۲)

---

(۱) اسد الغابہ ص۴۹۔۵۰ ج۱

(۲) التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص۹۲۔۹۳ ج۱

تفسیر القرآن بآثار التابعینؒ

قرآن کی تفسیر کا چوتھا ماخذ تابعین کے اقوال و آثار ہیں بشرطیکہ سند صحیح کے ساتھ منقول ہوں۔ تابعین صحابہ کرام کے تلامذہ تھے اور انہوں نے صحابہ کے قائم کردہ مدارس اور ان کی تعلیمی و تربیتی مجالس میں علم حاصل کیا تھا وہ اصحاب رسول کی سیرت اور سنت کے تابعین باحسان تھے اس لئے ان کو تابعین کہا جاتا ہے جس طرح صحبت رسول تطہیر افکار اور تعمیر سیرت کا مؤثر سبب ہے۔ اسی طرح صحبت اصحاب رسول کا بھی تعلیم و تربیت میں بڑا دخل ہے اس لئے کہ رفقاء رسول کے ایمان کامل اور عدالت و تقویٰ کی شہادت خود اللہ نے قرآن میں دی ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کاملین اور پختہ اساتذہ کے تلامذہ اور مصاحبین بھی کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں جب راویوں کا تعارف کرایا جاتا ہے تو ان کے اساتذہ و تلامذہ کے نام بھی بتائے جاتے ہیں اگر ان کے شیوخ اور تلامذہ میں ممتاز مقام والے لوگ شامل ہوں تو وہ بھی ثقہ اور مضبوط راوی سمجھے جاتے ہیں مگر صحابہ کے اقوال اور تابعین کے اقوال کے درمیان فرق یہ ہے کہ اگر صحابی کا قول ان امور سے متعلق ہو جو قیاس و اجتہاد اور غور و فکر سے معلوم نہ ہو سکتا ہو تو وہ حدیث مرفوع حکماً یعنی قول رسول سمجھا جائے گا جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے اور اگر ان امور سے متعلق ہو جو عقل و رائے اور تدبر سے معلوم ہو سکتے ہوں تو پھر وہ صحابی کا اجتہاد اور اس کی رائے ہو گی جس سے اختلاف کرنا اگرچہ ممنوع نہیں ہے (الا یہ کہ اجماع صحابہ ثابت ہو جائے) لیکن صحابی کی تفسیر اور رائے کو غیر صحابی کی تفسیر پر ترجیح حاصل ہے اس لئے کہ صحبت رسول کی برکت سے، علم و فہم کی گہرائیت کی وجہ سے اور ایمان و عمل کی نورانیت کی بنا پر صحابی کی رائے میں خطا کا احتمال کم ہے مگر تابعی کی تفسیر اور رائے کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے البتہ فہم قرآن میں تابعین کے اقوال سے استفادہ کرنا بڑی افادیت رکھتا ہے اور اسی افادیت اور اہمیت کی وجہ سے

ابن جریر' ابن ابی حاتم' ابن کثیر اور تفسیر بالماثور کرنے والے دوسرے مفسرین آیات کی تفہیم و تفسیر میں صحابہ کے اقوال کے علاوہ تابعین کے اقوال بھی بڑی کثرت کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

"جب کسی آیت کی تفسیر قرآن' سنت رسول اور اقوال صحابہ تینوں میں نہ مل سکے تو پھر بہت سے ائمہ تابعین کی اقوال کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسے مجاہد بن جبر' سعید بن جبیر' عکرمہ' مولی ابن عباس' عطاء بن ابی رباح' حسن بصری' مسروق بن اجدع' سعید بن میتب' ابو العالیہ' ربیع بن انس' قتادہ' ضحاک بن مزاحم اور دوسرے تابعین' تبع تابعین اور وہ مفسرین جو ان کے بعد گزرے ہیں' ان کے اقوال جب کسی آیت کی تفسیر میں ذکر کیے جاتے ہیں تو بعض اوقات ان کی عبارات میں لفظی اختلاف نظر آتا ہے جس کو لاعلم لوگ تفسیر میں اختلاف سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ صرف تعبیر اور الفاظ کا اختلاف ہوتا ہے مفہوم کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ اکثر مقامات پر سب کا مقصد ایک ہوتا ہے' عقل و فہم والے کو چاہئے کہ وہ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لے۔ لیکن شعبہ بن حجاج اور دوسرے اہل علم نے کہا ہے کہ تابعین کے اقوال فرعی احکام میں حجت نہیں ہے تو تفسیر میں کیسے حجت ہو سکتے ہیں۔ یعنی ان کے اقوال اختلاف کرنے والوں کے خلاف حجت نہیں بن سکتے اور یہ بات صحیح ہے۔ تاہم جب تابعین کا کسی بات پر اجماع ثابت ہو جائے تو پھر اس کے حجت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر جب ان کے درمیان اختلاف رائے تو ان میں سے بعض کی رائے دوسرے کے خلاف بھی حجت نہیں ہو سکتی اور ان علماء کی خلاف بھی حجت نہیں بن سکتی جو ان کے بعد آئے ہوں بلکہ ایسی صورت میں قرآن و سنت کی لغت' عام عربی لغت یا صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کیا جائے گا۔"(۱)

(۱) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر مقدمہ فصل الرجوع الی اقوال التابعین

عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں جب بہت سے علاقے فتح ہوئے تو صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہو گئے بعض ولات اور امراء تھے بعض وزراء تھے بعض قضاۃ تھے بعض معلمین تھے اور بعض دوسری ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے۔ یہ صحابہ اپنے ساتھ وہ علم بھی لے گئے تھے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا تھا اور اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا' ان کی مجالس میں تابعین بیٹھتے اور ان سے علم حاصل کر کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرتے تھے۔ چنانچہ اس تعلیم و تعلم کی وجہ سے مختلف شہروں میں علمی مدارس اور مراکز قائم ہو گئے جن کے اساتذہ صحابہ کرام تھے اور تلامذہ تابعین تھے' ان مدارس میں سے بعض تفسیر کے مدارس و مراکز کے طور پر مشہور ہو گئے جن میں مشاہیر صحابہ سے تابعین کی کثیر تعداد قرآن کی تفسیر سیکھتی تھی' تفسیر کے ان مدارس اور مراکز میں تین کو بڑی شہرت ملی تھی۔

مدرسہ تفسیر مکہ مکرمہ میں

ایک مدرسہ تفسیر مکہ مکرمہ میں قائم ہوا جس کے شیخ التفسیر عبداللہ بن عباسؓ تھے جو اپنے تلامذہ کو اس مرکز میں تفسیر پڑھاتے تھے' ان کے شاگردوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے پانچ کو تفسیر میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

(۱)سعید بن جبیرؒ (۲)مجاہد بن جبرؒ (۳)عکرمہؒ مولی ابن عباس

(۴)طاؤس بن کیسانؒ (۵)اور عطاء بن ابی رباحؒ

یہ پانچوں موالی میں سے تھے اور ابن عباس سے تحصیل علم میں قلت اور کثرت کے اعتبار سے ان کے درمیان اگرچہ تفاوت ہے لیکن ابن عباس کے مدرسے کے فضلاء میں ان کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ ابن تیمیہ نے اپنے مقدمہ فی اصول التفسیر میں لکھا ہے کہ تفسیر

کو زیادہ جاننے والے اہل مکہ ہیں اس لئے کہ یہ ابن عباس کے اصحاب اور تلامذہ ہیں۔

ابن عباس کے تلامذہ میں سے مذکورہ پانچ مشاہیر کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۱) سعید بن جبیرؒ متوفی ۹۵ :

ابن عباسؓ کے تلامذہ اور اہل مکہ کے مفسرین میں نمایاں مفسر مشہور تابعی سعید بن جبیر شہید ہیں جو بنو اسد کے مولی تھے' اس نے کوفہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اس لئے اس کو ابو عبداللہ کوفی بھی کہتے ہیں۔ حاکم عراق حجاج بن یوسف ظالم کے خلاف بغاوت میں اس نے بھی حصہ لیا تھا اس لئے حجاج نے اسے گرفتار کر کے بڑی بے دردی کے ساتھ اذیتناک طریقے پر ۹۵ھ میں واسط کے مقام پر شہید کر دیا تھا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر ۴۹ سال تھی۔ اس کی گرفتاری اور شہادت کا واقعہ بڑا اندوہناک اور دردناک ہے مگر بڑا عبرتناک اور سبق آموز بھی ہے اس لئے اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

حجاج بن یوسف متوفی ۹۵ھ کے مظالم اور سفاکی و درندگی کے واقعات تاریخ میں بیان ہوئے ہیں اور انہی واقعات کی وجہ سے اس کو اس امت کا فرعون کہا گیا ہے جس زمانے میں یہ عراق کا والی تھا اس زمانے میں عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث نے اس ظالم و سفاک سے بغاوت کر دی اور بہت سے اکابر علماء نے اس بغاوت میں ابن الاشعث کا ساتھ دیا جن میں سعید بن جبیر بھی شامل تھے مگر ابن الاشعث کی بغاوت ناکام ہو گئی۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد سعید بن جبیر اصفہان چلے گئے' جب یہاں پر گرفتاری کا خطرہ محسوس ہوا تو آذربائیجان تشریف لے گئے اور یہاں پر کئی سال رہے پھر مکہ میں جاکر سکونت اختیار کر لی اور پھر گرفتار ہو کر حجاج کے سامنے پیش کئے گئے اور شہید کر لئے گئے' اس کی گرفتاری اور شہادت کی تفصیل حافظ جمال الدین المزی متوفی ۷۴۲ھ نے اس طرح نقل کی ہے :

"حجاج نے اہل شام میں سے اپنا خاص کمانڈر متلمس بن احوص بیس افراد کے ہمراہ سعید بن جبیر کو تلاش کرنے اور گرفتار کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ اس کی تلاش کے دوران اتفاقا

ایک راہب سے ملے جو اپنے گرجے میں بیٹھا ہوا تھا' انہوں نے اس سے سعید بن جبیر کے بارے میں پوچھا اس نے کہا مجھے اس کا حلیہ بتاؤ انہوں نے جب اس کا حلیہ بتایا تو راہب نے اس کو اس کی جگہ بتادی۔ جب یہ لوگ اس جگہ پہنچے تو اسے سجدے کی حالت میں پایا جو اپنے رب سے مناجات کر رہا تھا۔ انہوں نے سلام کیا تو سر اٹھا کر نماز پوری کی اور سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو حجاج نے بھیجا ہے اور وہ تمہیں بلا رہا ہے پس اس کا حکم مان لو۔ اس نے کہا کیا یہ حکم ماننا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا ہاں ضروری ہے۔ اس نے اللہ کی حمد و ثنا اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا اور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جب یہ لوگ سعید بن جبیر کو لے کر راہب کے گرجے کے پاس پہنچے تو راہب نے کہا اس گرجے کے اوپر والے حصے میں چلے جاؤ کیونکہ ایک شیرنی اور شیر رات کو گرجے کے پاس آتے ہیں پس رات آنے سے پہلے پہلے اندر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ سب اندر چلے گئے مگر سعید نے اندر جانے سے انکار کر لیا۔ انہوں نے کہا تم ہم سے بھاگنا چاہتے ہو اس نے کہا بھاگنا نہیں چاہتا بلکہ میں ایک مشرک کے گھر میں داخل نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے کہا ہم تمہیں باہر نہیں چھوڑیں گے اس لئے کہ درندے تمہیں قتل کر دیں گے۔ اس نے کہا مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ان درندوں کو مجھ سے ہٹا دے گا اور ان کو میرے چوکیدار بنا دے گا جو انشاء اللہ میری حفاظت کریں گے۔ انہوں نے کہا تم انبیاء میں سے ہو؟ اس نے کہا نہیں! میں انبیاء میں سے نہیں ہوں بلکہ اللہ کے بندوں میں سے ایک خطاکار اور گنہگار بندہ ہوں۔ راہب نے کہا کہ مجھے ایسا کفیل دیدو جس پر اطمینان کے ساتھ اعتماد کر سکوں۔ اس نے کہا کہ میں اس عظیم رب کو اپنا کفیل بناتا ہوں یعنی اس کے نام کی قسم کھاتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں ہے کہ ان شاء اللہ میں صبح تک اپنی یہ جگہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس پر راہب مطمئن ہو گئے اور اس کے ساتھیوں کو کہنے لگے کہ اوپر چڑھ جاؤ اور اپنی کمانوں میں تانتیں لگا دو تاکہ تم اس نیک بندے سے درندوں کو بھگا سکو اس لئے کہ یہ میرے پاس گرجے میں

تمہاری وجہ سے نہیں آتا۔ جب وہ اوپر چلے گئے اور اپنی کمانوں میں تانتیں لگا دیں تو اچانک انہوں نے اوپر سے شیرنی دیکھی جو سعید کے پاس آرہی ہے جب وہ اس کے قریب آئی تو اسے کھجلایا اور چھوا اور پھر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے بعد شیر آیا اور وہ بھی انہیں چھو کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ جب راہب نے اس کے دین کے احکام اور اس کے رسول کے سنن کے بارے میں سوالات کئے اور سعید نے اسے احکام و سنن بتائے تو راہب نے اسلام قبول کر لیا اور اخلاص کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ سعید کی یہ کرامت دیکھ کر متلمس اور اس کے سپاہی جو اسے گرفتار کرنے آئے تھے اس کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے۔ اس کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور جس مٹی پر اس نے رات کو پاؤں رکھے تھے اسے جمع کر کے اس پر نماز پڑھنے لگے اور کہنے لگے۔ اے سعید! حجاج نے ہم کو بیویوں کی طلاق کی قسم دی ہے کہ اگر ہم نے تم کو دیکھا تو چھوڑیں گے نہیں جب تک کہ اس کے سامنے حاضر نہ کر لیں۔ پس ہم کو حکم دیجئے کہ ہم کیا کریں؟ سعید نے فرمایا تم اپنا کام جاری رکھو میں اپنے خالق کی پناہ مانگتا ہوں اور اس کے فیصلے کو ٹالنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسے لے کر روانہ ہوئے اور واسط کو پہنچ گئے۔ یہاں پر سعید بن جبیر نے فرمایا:

"اے لوگو! میں اب تک تمہارے ساتھ محفوظ رہا ہوں اور تمہارا رفیق سفر رہا ہوں اور مجھے اب اس بارے میں کوئی شک نہیں رہا کہ میری موت کا وقت آگیا ہے اور میری زندگی اب پوری ہو گئی ہے اس لئے آج رات مجھے چھوڑ دو کہ میں موت کی اور منکر نکیر کا سامنا کرنے کی تیاری کر لوں اور قبر پر مٹی ڈالنے اور قبر کے عذاب کی طرف دھیان دے سکوں۔ جب صبح ہو جائے تو میرے اور تمہارے درمیان وعدہ ہے کہ میں تم کو اسی جگہ پر ملوں گا جہاں پر تم مجھے ملنا چاہتے ہو۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ تم امن کے ساتھ پہنچ چکے ہو اور امیر کے انعامات کے حق دار بن چکے ہو پس اسے گرفتار کر کے پیش کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ اور بعض نے کہا کہ یہ تمہارے ساتھ وہی وعدہ کر رہا ہے جو اس نے راہب کے ساتھ کیا تھا۔ کیا

تم شیر سے عبرت حاصل نہیں کرتے جس نے اس کو کھجلایا تھا اور چھوا تھا اور صبح تک اس کی حفاظت کی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا یہ میری ذمہ داری ہے کہ صبح میں اسے تمہارے سپرد کروں گا۔ انشاء اللہ۔ انہوں نے سعید کو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں' اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں' اس کا رنگ بدلا ہوا ہے' جس روز یہ لوگ اس سے ملے تھے اس روز سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور نہ وہ ہنسے تھے۔ اس پر سب نے کہا اے زمین والوں میں بہترین انسان! کاش ہم نے تم کو پہچانا نہ ہوتا اور ہم تمہارے پاس پہنچے نہ ہوتے' ہماری بہت بڑی بدبختی ہے کہ ہم آپ کو گرفتار کرنے میں کس طرح مبتلا ہو گئے' حشر کے دن ہمارے خالق کے سامنے ہماری معذرت پیش کر دیجئے اس لئے کہ وہی بڑا قاضی اور عادل ہے' جو ظلم نہیں کرتا۔ جب وہ گفتگو اور رونے سے فارغ ہوئے تو جو اس کو صبح حاضر کرنے کا کفیل بنا تھا اس نے کہا۔ اے سعید! میں آپ سے اللہ کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اپنی دعا کا زادِ راہ دیجئے اس لئے کہ آپ جیسا شخص ہمیں کبھی نہیں ملے گا اور ہمارا گمان نہیں ہے کہ ہماری اور آپ کی ملاقات قیامت تک پھر ہو سکے گی۔ سعید نے ان کو دعائیں دیں اور انہوں نے اس کو چھوڑ دیا جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو سعید ان کے مکان پر آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہوں نے کہا کعبے کے رب کی قسم تمہارا ساتھی آ گیا وہ نیچے اترے اور کافی دیر تک اس کے پاس روتے رہے اور پھر اسے حجاج کے پاس لے گئے۔ حجاج نے کہا سعید بن جبیر کو لے کر آ گئے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں لے آئے ہیں اور ہم نے اس سے عجیب و غریب واقعات دیکھے ہیں۔ حجاج نے اس سے منہ پھیر لیا اور کہا اسے میرے پاس لے آؤ۔ اس پر متلمس نکلا اور کہا کہ میں تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور تم کو سلام کرتا ہوں۔ حجاج کے پاس اندر چلے جاؤ۔ اندر جانے کے بعد حجاج بن یوسف اور سعید بن جبیر کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا وہ درج ذیل ہے:

حجاج نے کہا تیرا نام کیا ہے؟

سعید نے کہا میرا نام سعید بن جبیر ہے۔

حجاج نے کہا تم تو شقی بن کسیر ہو۔

سعید نے کہا میری ماں کو میرے نام کا علم تجھ سے زیادہ ہے۔

حجاج نے کہا کہ تو بھی بدبخت ہے اور تیری ماں بھی بدبخت تھی۔

سعید نے کہا کہ غیب کا علم تیرے علاوہ کسی اور کے پاس ہے۔

حجاج نے کہا کہ میں اس دنیا کو تیرے لئے آگ کے شعلے بنادوں گا۔

سعید نے کہا کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ اس کا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے تو میں تجھے الله بنالیتا۔

حجاج نے کہا محمد ﷺ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے ؟

سعید نے کہا کہ وہ رحمت کا نبی ہے اور ہدایت کا امام ہے۔

حجاج نے کہا علیؓ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے وہ جنت میں ہے یا دوزخ میں ؟

سعید نے کہا اگر میں جنت اور دوزخ میں داخل ہوا ہوتا تو پہچان لیتا کہ اس میں کون لوگ رہتے ہیں

حجاج نے کہا کہ خلفاء کے متعلق تو کیا کہتا ہے ؟

سعید نے کہا میں ان پر وکیل نہیں ہوں۔

حجاج نے کہا ان میں سے تم کو کون زیادہ پسند ہے ؟

سعید نے کہا جو میرے خالق کو زیادہ پسند ہے۔

حجاج نے کہا خالق کو ان میں سے کون زیادہ پسند ہے ؟

سعید نے کہا اس کا علم تو اس کے پاس ہے جو لوگوں کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی رازوں کو جانتا ہے۔

حجاج نے کہا کہ تم نے میرے سامنے سچ بولنے سے انکار کر لیا ہے۔

سعید نے کہا کہ میں تیرے سامنے جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

حجاج نے کہا تو ہنستا کیوں نہیں ہے؟

سعید نے کہا کہ کیسے ہنستی ہے وہ مخلوق جو مٹی کے گھارے سے پیدا کی گئی ہے۔

حجاج نے کہا پھر ہم لوگ کیوں ہنستے ہیں؟

سعید نے کہا کہ سب لوگوں کے دل برابر نہیں ہوتے۔

اس کے بعد حجاج کے حکم پر سعید بن جبیر کے سامنے موتیوں ا زبرجد و یاقوت اکٹھے کر کے رکھ لئے گئے۔

سعید نے کہا کہ اگر تم نے یہ چیزیں اس لئے جمع کی ہیں کہ ان کو قیامت کے دن کی ہیبت اور دہشت کے بدلے میں دے دو (یعنی نیکی کے کاموں میں خرچ کر سکو) تو ٹھیک ہے ورنہ قیامت کی ہیبت دودھ پلانے والی ماں کو اپنے دودھ پیتے بچے سے بھی غافل کر دے گی اور ان چیزوں میں کیا خیر ہے جو دنیا کے لئے جمع کی گئی ہوں سوائے ان کے جو حلال اور پاک ہوں۔

اس کے بعد حجاج نے سارنگی اور بانسری منگوائی۔ جب سارنگی پر ضرب لگائی گئی اور بانسری میں پھونک ماری گئی تو سعید بن جبیر رونے لگے۔

حجاج نے کہا کیوں روتے ہو؟ یہ تو تفریح ہے۔

سعید نے کہا نہیں یہ تو غم و حزن کی آواز ہے۔ بانسری نے مجھے وہ دن یاد دلایا ہے جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی اور سارنگی درخت کی لکڑی ہے جو ظلما کاٹا گیا ہے۔

حجاج نے کہا تجھ پر تباہی نازل ہو اے سعید!

سعید نے کہا ویل اور تباہی اس کے لئے ہے جو جنت سے دور کر دیا گیا ہو اور دوزخ میں داخل کر دیا گیا ہو۔

حجاج نے کہا اے سعید! بتاؤ میں تم کو کس طرح قتل کروں؟

سعید نے کہا جس طرح اپنے آپ کو قتل کرنا پسند کرو اس لئے کہ تم نے آج مجھے جس

طرح قتل کیا آخرت میں اسی طرح تم کو قتل کروں گا۔

حجاج نے کہا کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے معاف کر دوں ؟

سعید نے کہا کہ معافی دینے والا تو اللہ ہے۔

حجاج نے کہا کہ اسے لے جاؤ اور قتل کر دو۔

سعید جب دروازے سے باہر نکلے تو ہنس پڑے۔ حجاج کو جب اس کے ہنسنے کی اطلاع دی گئی تو اس نے حکم دیا کہ اسے واپس لے آو۔ جب واپس لایا گیا تو حجاج نے کہا :

کس چیز نے تم کو ہنسایا ہے ؟

سعید نے کہا مجھے اس پر ہنسی آگئی کہ اللہ کے مقابلے میں تیری جرات کتنی زیادہ ہے اور اللہ کا حلم کتنا زیادہ ہے۔

حجاج نے کہا اسے قتل کرو۔

سعید نے کہا :

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝

حجاج نے کہا اس کا رخ قبلے سے دوسری جانب کر دو۔

سعید نے کہا فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ.

حجاج نے کہا اس کا رخ زمین کی طرف کر دو۔

سعید نے کہا مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى.

حجاج نے حکم دیا کہ ذبح کر دو۔

سعید نے کہا گواہ رہو کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو واحد لاشریک لہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ میرا یہ کلمہ شہادت یاد رکھو یہاں تک کہ قیامت کے دن تیری مجھ سے ملاقات ہو جائے۔ اس کے بعد سعید نے

دعا کی کہ اے اللہ میرے بعد اس کو کسی اور پر مسلط نہ کر۔

سعید کی شہادت کے بعد حجاج صرف پندرہ دن زندہ رہے تھے اس کے پیٹ کے اندر ایک پھوڑا نکل آیا تھا جس کے درد کی وجہ سے وہ چیختا رہتا تھا۔ اپنی زندگی کے باقی دنوں میں حجاج کہتا رہتا تھا کہ میرا اور سعید کا معاملہ یہ ہے کہ میں جب بھی سوتا ہوں تو وہ آکر میرا پاؤں پکڑ کر کہتا ہے تو نے مجھے کس جرم میں قتل کیا تھا؟ یعنی سعید مجھے سونے نہیں دیتا۔

حسن بصری کی روایت میں خلفاء کے بارے میں جواب اس طرح نقل ہوا ہے۔

حجاج نے کہا محمد ﷺ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟

سعید نے کہا اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں جو لوگ زمین پر باقی ہیں ان سے بھی بہتر ہیں اور جو گزر چکے ہیں ان سے بھی بہتر ہیں۔

حجاج نے کہا ابوبکرؓ کے متعلق تیری رائے کیا ہے؟

سعید نے کہا وہ صدیق تھے' اللہ کے رسول کے خلیفہ تھے' اس نے ستائش اور سعادت کی زندگی گزاری تھی اور اس نے اپنے نبی ﷺ کے منہاج اور سنت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا تھا۔

حجاج نے کہا عمرؓ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟

سعید نے کہا عمر فاروقؓ اللہ اور اس کے رسول کا پسندیدہ بندہ تھا اس نے قابل ستائش زندگی گزاری تھی اور اس نے اپنے ساتھی یعنی ابوبکرؓ کے منہاج حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

حجاج نے کہا تو عثمانؓ کے متعلق کیا کہتا ہے؟

سعید نے کہا وہ ظلماً قتل ہوئے تھے' جیش عسرت یعنی غزوہ تبوک کے لشکر کے لئے سامان جہاد فراہم کرنے والے تھے' بیر رومہ کے عوض جنت میں گھر خریدنے والے تھے' رسول اللہ ﷺ کے داماد تھے' نبیؐ نے آسمانی وحی کی وجہ سے اپنی دو بیٹیاں اس کے نکاح میں

دی تھیں۔ (ایک کی موت کے بعد دوسری دی تھی)

حجاج نے کہا پھر تم علیؓ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟

سعید نے کہا وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے تھے' سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے' فاطمہ بنت رسول کے شوہر تھے' حسن اور حسین کے باپ تھے۔

حجاج نے کہا کہ معاویہؓ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

سعید نے کہا میں اپنے ذاتی کاموں میں اتنا مشغول ہوں کہ مجھے اس امت کے حالات اور اعمال کا پورا علم حاصل نہیں ہے۔

حجاج نے کہا میرے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟

سعید نے کہا کہ تم اپنے نفس کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔

حجاج نے کہا جو کچھ تجھے معلوم ہے وہ تو بیان کرو۔

سعید نے کہا میرا بیان تجھے برا لگے گا اور خوش نہیں کرے گا۔

حجاج نے کہا اس کے باوجود جو کچھ تجھے معلوم ہے وہ بیان کرو۔

سعید نے کہا کہ مجھے معاف کر دو۔

حجاج نے کہا اگر میں تجھے معاف کروں تو اللہ مجھے معاف نہ کرے۔

سعید نے کہا کہ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تو اللہ کی کتاب کا مخالف ہے۔ تو اپنے خیال میں بعض کاموں کو لوگوں پر رعب جمانے اور ان کو دبانے کا ذریعہ سمجھتا ہے لیکن حقیقت میں وہ تم کو ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں اور کل کے دن تجھے پتہ چل جائے گا۔

حجاج نے کہا میں تم کو ایسے طریقے پر قتل کروں گا کہ اس پر میں نے تجھ سے پہلے کسی کو بھی قتل نہیں کیا اور تیرے بعد بھی اس طریقے پر کسی کو قتل نہیں کروں گا۔

سعید نے کہا جب ایسا کرو گے تو میری دنیا خراب کرو گے اور اپنی آخرت خراب کرو گے۔

خلف بن خلیفہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں اس کا باپ خلیفہ کہتا ہے کہ سعید کے قتل کے وقت میں موجود تھا۔ جب اس کا سر جسم سے الگ ہوا تو اس وقت وہ کہہ رہا تھا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ.(۱)

متلمس اور اس کے ساتھی سعید بن جبیر کی کرامت و استقامت دیکھ کر اس کے گرویدہ تو ہو گئے تھے اور اس سے دعائیں اور معافیاں تو مانگ رہے تھے لیکن باوجود اس کے حجاج کے خوف سے اور اس سے انعامات اور مراعات وصول کرنے کے لئے اسے گرفتار کر کے حجاج کے سامنے پیش کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے مگر سعیدؒ اپنی شہادت کو سعادت سمجھتے تھے اور ظالم و سفاک حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے پر اسے روحانی طور پر بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ سچ فرمایا ہے اللہ نے کہ :

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

مجاہد بن جبر متوفی ۱۰۲ھ :

عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ میں سے مشہور تلمیذ مجاہد بن جبر مکی تھے' اس کا اسم کنیہ ابو الحجاج قرشی ہے' یہ سائب بن ابی السائب القرشی المخزومی کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے اس کو قرشی کہتے ہیں۔ اس کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں ۲۱ھ میں ہوئی تھی اور وفات ۱۰۲ھ میں بمقام مکہ سجدے کی حالت میں ہوئی تھی۔

سعید بن جبیر' طاؤس اور عطاء بن ابی رباح مجاہد کے ہم عصر اور ہم سبق تھے یعنی کلاس فیلو تھے' عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ اس نے سعد بن ابی وقاصؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ' ابو سعید خدریؓ' ابو ہریرہؓ' ام المؤمنین جویریہ بنت حارثؓ' ام المؤمنین عائشہؓ' ام المؤمنین ام سلمہؓ اور ام ہانیؓ بنت ابی طالب سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ فضل بن میمون سے

(۱) تہذیب الکمال للمزی طبع دار الفکر بیروت ۱۹۹٤، ص ۱٤۲ تا ۱٥٤ ج ۷

مروی ہے کہ میں نے مجاہد سے سنا ہے کہ فرماتے تھے:

عَرَضْتُ الْقُرْآنَ عَلٰی ابْنِ عَبَّاسٍ ثَلَاثِیْنَ مَرَّۃً.

"میں نے ابن عباسؓ کی سامنے قرآن کا تیس مرتبہ دور کیا ہے۔"

ابن حجرؒ نے تہذیب میں اس کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ:

قَرَأْتُ الْقُرْآنَ عَلٰی ابْنِ عَبَّاسٍ ثَلَاثَ عَرْضَاتٍ اَقِفُ عِنْدَ کُلِّ آیَۃٍ اَسْأَلُہٗ فِیْمَ نَزَلَتْ وَ کَیْفَ کَانَتْ.

"میں نے ابن عباسؓ کے سامنے قرآن تین مرتبہ اس طرح پڑھا ہے کہ ہر آیت پر میں ٹھہر جاتا اور پوچھتا کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟" اور اس کا مفہوم کیا ہے؟ دونوں اقوال کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ قراءت کا دور تیس مرتبہ کیا تھا اور تفسیر کا دور تین مرتبہ کیا تھا۔"

ذہبی نے کہا ہے کہ امت کا مجاہد کی امامت پر اجماع ہے۔(۱)

عکرمہ مولیٰ بن عباسؓ متوفی ۱۰۴ھ:

اس کو عکرمہ بربری بھی کہا جاتا ہے اس لئے کہ اصل میں یہ بربر میں سے تھا اور حصین بن ابی الحر العنبری کا غلام تھا' عبداللہ بن عباسؓ جب علیؓ کی جانب سے والی اور امیر کی حیثیت سے بصرہ تشریف لائے تو حصین نے عکرمہ اسے بخش دیا' اور عبداللہ بن عباسؓ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے علی بن عبداللہ نے اسے آزاد کر دیا تھا اس لئے یہ مولیٰ ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن عباس چونکہ قرشی اور ہاشمی تھے تو اس کے ساتھ نسبت ولاء کی وجہ سے عکرمہ کو قرشی ہاشمی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ثقہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد اور امام نسائی نے اس سے روایات نقل کی ہیں۔ اس نے عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ جابر بن عبداللہؓ' حسن بن علیؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ' عقبہ

---

(۱) تہذیب الکمال ص ۴۴۰ تا ۴۴۴ ج ۱۷

بن عامر جہنیؓ' علی بن ابی طالبؓ' ابو سعید خدریؓ' ابو قتادہ انصاریؓ' ابو ہریرہؓ' ام المؤمنین عائشہؓ' ام عمارہ الانصاریہؓ' حمنہ بنت جحشؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ سے بھی روایات نقل کی ہیں۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے علم دین کی طلب میں ۴۰ سال لگائے ہیں۔ میں دروازے پر بیٹھ کر فتوے دیا کرتا تھا اور ابن عباس گھر کے اندر بیٹھ کر فتوے دیا کرتے تھے۔ عکرمہ نے یہ بھی کہا ہے کہ طلب علم کے زمانے میں قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے ابن عباس میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دیا کرتے تھے تاکہ یہ بھاگ نہ جائے۔

عامر شعبی کہتے ہیں کہ عکرمہ سے قرآن کو زیادہ سمجھنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔

امام احمدؒ' امام دارمیؒ' یحییٰ بن معینؒ' علی بن المدینیؒ' امام بخاریؒ' امام نسائیؒ اور ابو حاتم رازیؒ نے اسے ثقہ اور قابل قبول راوی تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس پر خارجی ہونے کا الزام لگایا ہے لیکن یہ الزام ثابت نہیں ہے۔ اس کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے تہذیب الکمال للمزی ص ۱۶۳ تا ۱۸۰ ج ۱۳۔ اور تہذیب التہذیب ص ۲۴۰ تا ۲۴۲ ج ۷)

حافظ مزی نے عکرمہ کے نام کے چھ اور نام بھی ذکر کئے ہیں۔

() عکرمہ بن ابی جہل۔ یہ اور اس کا باپ ابو جہل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شدید عداوت رکھتے تھے۔ ابو جہل تو غزوہ بدر میں قتل ہو گیا مگر اس کے بیٹے عکرمہ کو اللہ نے توفیق دی اور وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گیا تھا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں جنگ یرموک میں اسے شہادت بھی نصیب ہو گئی۔

(۲) عکرمہ بن خالد بن عاص' یہ ثقہ تابعی تھے اور ابن عمرؓ سے اس نے سماع کیا تھا۔

(۳) عکرمہ بن خالد المخزومی۔ یہ ایک ضعیف راوی ہیں۔

(۴) عکرمہ بن سلمہ بن ربیعہ۔ یہ ایک مجہول الحال راوی ہیں۔

(۵) عکرمہ بن عبدالرحمٰن بن حارث۔ یہ ثقہ راوی ہیں۔

(۶) عکرمہ بن عمار العجلی۔ یہ اصل میں تو بصری تھے مگر یمامہ میں رہتے تھے بعض کے نزدیک ثقہ ہیں اور بعض کے نزدیک ضعیف ہیں۔ ۱۵۹ھ میں بغداد میں فوت ہوئے تھے۔(۱)

طاؤس بن کیسان الیمانی متوفی ۱۰۶ھ :

اصل میں تو یہ سرزمین فارس سے تعلق رکھتے تھے لیکن چونکہ یہ یمن کے بنو حمیر قبیلے کے ایک شخص کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے اس کو حمیری یمانی بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک طاؤس اس کا لقب ہے اور اسم علمی ذکوان ہے لیکن اسماء الرجال کی کتابوں میں طاؤس ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ابو ہریرہؓ اور ام المؤمنین عائشہؓ سے بھی روایات نقل کی ہیں لیکن ابن عباسؓ سے انہوں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے بلکہ ان کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے۔

ابن حبان نے کہا ہے کہ طاؤس تابعین کے سادات میں شامل تھے اور اس نے چالیس حج کئے تھے۔

طاؤس نے کہا ہے کہ میں نے پچاس صحابہ سے ملاقات کی ہے۔ اس کے ثقہ ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور بخاری و مسلم نے اس کی روایات نقل کی ہیں۔(۲)

عطاء بن ابی رباح متوفی ۱۱۴ھ :

اس کے والد ابی رباح کا نام اسلم ہے اور یہ بھی موالی میں سے ہے مکہ مکرمہ پر حضرت عمرؓ کے عامل بھی رہے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں یمن کے جند مقام پر ۲۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی لیکن اس نے زندگی مکہ میں گزاری ہے اور ۱۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ ثقہ تابعی تھے اور ابو حنیفہ کے شیخ تھے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ :

(۱) تہذیب الکمال ص۱۵۳ تا ۱۶۳ ج ۱۳

(۲) تہذیب الکمال للمزی ص۲۱۳ تا ۲۲۵ ج ۹

مَا رَأَيْتُ فِيمَنْ لَقِيتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِيْ رَبَاحٍ.

''میں جن لوگوں سے ملا ہوں ان میں سے عطاء بن ابی رباح سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا۔''

امام اوزاعیؒ نے کہا ہے کہ عطاء بن ابی رباح جس دن وفات پائے تھے اس دن وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مقبول انسان تھے۔

سلمہ بن کہیلؒ نے کہا ہے کہ میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو صرف اللہ کی رضا کے لئے علم حاصل کرتا ہو سوائے تین افراد کے۔ ایک عطاءؒ دوسرا طاؤسؒ اور تیسرا مجاہدؒ۔

امام ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں کہ میں عبد الملک بن مروان کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا مکہ سے آرہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ اہل مکہ کی قیادت و سیادت ان دنوں کون کررہا ہے؟ میں نے کہا کہ عطاء بن ابی رباح۔ اس نے کہا کہ وہ عرب ہے یا موالی میں سے ہے؟ میں نے کہا موالی میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے یہ مقام کس وجہ سے حاصل کیا ہے؟ میں نے کہا دیانت اور روایت کی وجہ سے۔(۱)

عبد اللہ بن عباسؓ کے یہ وہ مشہور و مقبول تلامذہ ہیں جنہوں نے ان کے علوم کو ہم تک پہنچایا ہے اور یہ پانچوں موالی میں سے تھے لیکن علم کی وجہ سے انہوں نے امت کی قیادت کا مقام حاصل کیا تھا۔

---

(۱) تہذیب الکمال ص ٤٤ تا ٤٥ ج ١٣

مدرسہ تفسیر مدینہ منورہ میں

مدینہ منورہ میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد مقیم تھی جو بوقت ضرورت جہاد یا دعوت و تبلیغ کے لئے دوسرے شہروں اور علاقوں کو دوروں پر جایا کرتے تھے لیکن انہوں نے مستقل رہائش مدینہ ہی میں رکھی تھی اور مسجد نبوی میں قرآن وسنت کی تعلیم دیا کرتے تھے ان کی تعلیمی سرگرمیوں سے مدینہ منورہ میں تفسیر کا ایک مدرسہ بن گیا تھا جس میں مشاہیر صحابہ سے بہت سے تابعین علم حاصل کرتے تھے۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں سے چونکہ مشہور استاد ابی بن کعبؓ تھے اس لئے مدینہ کے مدرسے کو ابی بن کعبؓ کا مدرسہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس مرکز تفسیر میں بہت سے تابعین نے علم حاصل کیا ہے لیکن ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں اور ان سے تفسیری روایات بھی زیادہ مروی ہیں۔

ایک ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی۔

دوسرا ابو حمزہ محمد بن کعب القرظی۔

تیسرا ابو اسامہ زید بن اسلم العدوی۔

ابی بن کعبؓ کے ان تین تلامذہ کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

(۱) ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی متوفی ۹۰ھ:

ریاح بنو تمیم قبیلے کی شاخ ہے اس کو بنو ریاح کی ایک خاتون نے آزاد کیا تھا اس لئے اس کو ریاحی کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ زندہ تھے مگر اسلام نہیں لائے تھے۔ وفات رسول کے دو سال بعد اس نے اسلام قبول کیا اور ابو بکرؓ و عمرؓ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس نے ابی بن کعبؓ' انس مالکؓ' ثوبان مولی رسول اللہ' حذیفہ بن یمانؓ' رافع بن خدیجؓ' علی بن ابی طالبؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عباسؓ' ابو ایوب انصاریؓ' ابو برزہ اسلمیؓ' ابو سعید خدریؓ' ابو موسیٰ اشعریؓ' ابو ہریرہؓ اور عائشہ صدیقہؓ سے

روایات نقل کی ہیں۔

یحیٰ بن معینؒ' ابو زرعہ رازیؒ اور ابو حاتم رازیؒ نے کہا ہے کہ یہ ثقہ تابعی تھے۔ ابو القاسم لالکائی نے کہا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے پر اجماع ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں علی بن المدینی کے سند کے ساتھ ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں تین بار قرآن پڑھا ہے۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور کبار تابعین میں سے ہیں۔ اس کی تاریخ وفات کے بارے مختلف اقوال ہیں لیکن حافظ مزی اور ابن حبان کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ اس کا انتقال ۹۰ھ میں ہوا تھا۔(۱)

(۲) ابو حمزہ محمد بن کعب بن سلیم القرظی متوفی ۱۰۸ھ:

اس کے والد یہود مدینہ کے مشہور قبیلے بنو قریظہ کے قیدیوں میں شامل تھے۔ غزوہ بنو قریظہ کے وقت یہ ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے اس لئے قتل سے بچ گئے تھے۔ محمد بن کعب کی ولادت صحیح قول کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب کی خلافت کے آخری سال یعنی ۴۰ھ میں ہوئی تھی۔ یہ ثقہ تابعی تھے اور اس نے انس بن مالکؓ' براء بن عازبؓ' جابر بن عبد اللہؓ' زید بن ارقم' عبد اللہ بن عباسؓ' عبد اللہ بن عمرؓ' عبد اللہ بن مسعودؓ' علی بن ابی طالبؓ' عمرو بن عاصؓ' فضالہ بن عبیدؓ' کعب بن عجرہؓ' معاویہ بن ابی سفیانؓ' مغیرہ بن شعبہؓ' ابو ایوب انصاریؓ' ابو الدرداءؓ' ابو ذر غفاریؓ' ابو ہریرہؓ اور عائشہؓ سے روایات نقل کی ہیں بعض سے مرسلاً اور اکثر سے متصلاً۔

محمد بن سعدؒ نے کہا ہے کہ یہ ثقہ عالم تھے کثیر الحدیث تھے اور پرہیز گار تھے۔ علی بن المدینی اور ابو زرعہ نے بھی اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ العجلی نے کہا ہے کہ یہ مدنی تابعی تھے' ثقہ تھے اور قرآن کے عالم تھے۔ محمد بن کعب کے کچھ ہم نشین تھے جو قرآن کی تفسیر کا بہت زیادہ علم رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ ربزہ کی مسجد میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے

---

(۱) تہذیب الکمال للمزی ص ۲۲۰۔۲۲۳ ج۶ و تہذیب التہذیب ص ۲۴۷ ج۳

کہ زلزلہ آیا اور مسجد کی چھت ان پر گر پڑی اور اس کے نیچے یہ سب کے سب فوت ہو گئے۔ اس کی وفات کے سال میں بہت سے اقوال ہیں لیکن اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ ۱۰۸ھ میں فوت ہوئے تھے۔(۱)

(۳) ابو اسامہ زید بن اسلم القرشی العدوی متوفی ۱۳۶ھ :

یہ حضرت عمر بن خطاب کے آزاد کردہ غلام تھے اور امام مالک کے استاد تھے اور مدینہ میں اپنے وقت کے بہت بڑے فقیہ تھے اس نے انس بن مالک جابر بن عبداللہ ' ابو ہریرہ اور ام المومنین عائشہ سے روایات نقل کی ہیں۔ امام مالک نے کہا ہے کہ زید بن اسلم کے لئے مسجد نبوی میں ایک حلقہ تھا جس میں ۴۰ بڑے بڑے علماء و فقہاء شرکت کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل' ابو زرعہ' ابو حاتم ابن سعد اور نسائی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور یعقوب بن ابی شیبہ نے کہا ہے کہ زید بن اسلم اہل فقہ اور اہل علم میں سے تھے اور قرآن کی تفسیر کے عالم تھے۔

مدرسہ تفسیر کوفہ میں

عمر فاروقؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو عراق کے مرکزی مقام کوفہ میں معلم کتاب و سنت مقرر فرمایا تھا اور اہل کوفہ کو لکھا تھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علم و فقاہت کا میں خود محتاج ہوں لیکن میں نے ایثار کر کے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے کوفہ میں اکابر صحابہ کی کافی تعداد رہتی تھی جن سے تابعین دین کا علم حاصل کرتے تھے لیکن ابن مسعودؓ کو خلافت کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا اور علمی فضیلت میں بھی ان کو امتیازی مقام حاصل تھا اس لئے اہل عراق کا رجوع عام ان کی طرف زیادہ تھا اور کوفہ کے مدرسے کے استاد اول بھی یہی تھے۔ اس اعتبار سے کوفہ کے مدرسے کو عبداللہ بن مسعودؓ کا مدرسہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے

(۱) تہذیب الکمال ص ۱۷۹ تا ۱۸۳ ج ۱۷

اس مرکز علمی کے مشہور فضلاء کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

(۱)علقمہ بن قیس النخعی الکوفی (۲)مسروق بن اجدع الہمدانی (۳)اسود بن یزید النخعی

(۴)مرہ بن شراحیل الہمدانی (۵)عامر بن شراحیل الشعبی (۶)حسن بن ابی الحسن البصری

(۷)قتادہ بن دعامہ سدوسی

ابن مسعودؓ کے ان ممتاز تلامذہ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۱)علقمہ بن قیس النخعی الکوفی متوفی ۶۲ھ :

یہ اسود بن یزید اور عبدالرحمٰن بن یزید کے چچا تھے اور ابراہیم نخعی کے ماموں تھے۔ ان کے جد اعلیٰ النخع تھے اس لئے ان کو نخعی کہا جاتا ہے۔ علقمہ کی پیدائش نبی کریم ﷺ کی حیوۃ میں ہوئی تھی' اس نے حذیفہ بن یمانؓ' خالد بن الولیدؓ' خباب بن ارتؓ' سعد بن ابی وقاصؓ' عمر بن خطابؓ' ابو بکرؓ' ابوالدرداءؓ' ابو مسعود انصاریؓ' ابو موسیٰ اشعریؓ اور ام المومنین عائشہؓ سے روایات نقل کی ہیں۔ علقمہ ابن مسعودؓ کے علوم کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور ان کے مدرسے میں ان کے جانشین تھے۔ امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں اصحاب رسول کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب میں سے علقمہ' عبیدہ' شریح اور مسروق تھے۔ اس کی ثقاہت اور فقاہت پر ائمہ کا اجماع ہے اور یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔(۱)

(۲)ابو عائشہ مسروق بن الاجدع الہمدانی متوفی ۶۲ھ :

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ چھوٹی عمر میں چوری ہو گئے تھے یعنی اغواء ہو گئے تھے اور پھر بازیاب ہو گئے تھے اس لئے مسروق کے نام سے مشہور ہو گئے ان کے والد اجدع نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے والد کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھا تھا اور سرکاری دیوان (دفتر) میں اس کا نام مسروق بن عبدالرحمٰن لکھا ہوا تھا مگر اسماء الرجال کی کتابوں میں مسروق بن الاجدع ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے ابی بن کعبؓ' خباب بن

(۱)تہذیب الکمال ص۱۸۷تا۱۹۱ج۱۳

ارتؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، عمر بن خطابؓ، ابو بکر صدیقؓ اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایات نقل کی ہیں اور ابراہیم نخعیؒ اور عامر شعبیؒ جیسے اکابر محدثین اس کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ امام شعبیؒ نے فرمایا کہ مسروق فتویٰ دینے میں زیادہ مہارت رکھتے تھے اور شریح کے پاس قضاء کا علم زیادہ تھا۔ شریح مسروق سے مشورہ لیا کرتے تھے مگر مسروق شریح سے مشورہ نہیں لیا کرتے تھے۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ علقمہ کے بعد مسروق پر کسی کو فضیلت نہیں دی جاسکتی۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ ابن مسعودؓ کے شاگردوں میں مسروق پر کسی کو بھی فضیلت نہیں دی جاسکتی۔ العجلی کہتے ہیں کہ یہ کوفہ کے ثقہ تابعی ہیں اور ابن مسعود کے ان شاگردوں میں شامل ہیں جو قرآن پڑھاتے تھے اور فتوے دیا کرتے تھے۔ اس کی بیٹی کا نام عائشہ تھا اس لئے اس کو ابو عائشہ کہا جاتا ہے۔ (۱)

(۳) ابو عمرو اسود بن یزید بن قیس النخعی متوفی ۷۵ھ :

یہ علقمہ کے بھتیجے تھے مگر عمر میں اس سے بڑے تھے اور ابراہیم نخعی کے ماموں تھے۔ اس نے بلال بن رباحؓ، حذیفہ بن یمانؓ، سلمان فارسیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، علی بن ابی طالبؓ، عمر بن خطابؓ، ابو بکر صدیقؓ اور معاذ بن جبلؓ سے روایات نقل کی ہیں۔ یہ ثقہ تھے اور صحاح کے راوی ہیں۔ (۲)

(۴) ابو اسماعیل مرہ بن شراحیل الہمدانی الکوفی متوفی ۷۶ھ :

اس نے حذیفہ بن یمانؓ، زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، علی بن ابی طالبؓ، عمر بن خطابؓ، ابو بکر صدیقؓ، ابو ذر غفاریؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایات نقل کی ہیں۔ ثقہ تابعی ہیں اور صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ (۳)

---

(۱) تہذیب الکمال ص ۴۵۰ تا ۴۵۸ ج ۱۸ (۲) تہذیب الکمال ص ۲۵۱ تا ۲۵۲ ج ۲

(۳) تہذیب الکمال ص ۱۰ ج ۱۸

(۵) ابو عمرو عامر بن شراحیل الشعبی الکوفی المتوفی ۱۰۹ھ :

شعب ہمدان کی نسبت سے شعبی کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے چھٹے سال ان کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ امام ابو حنیفہ کے مشہور استاد ہیں۔ امام شعبی نے فرمایا ہے کہ میں نے پانچ سو اصحاب رسول سے شرف ملاقات حاصل کیا ہے۔ العجلی نے کہا ہے کہ اس کا ۴۸ صحابہ سے سماع بھی ثابت ہے۔ ابو مجلز نے کہا ہے کہ میں نے شعبی سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔ حسن نے کہا ہے کہ شعبی بڑے علم اور حلم والے تھے، مکحول نے کہا ہے کہ میں نے امام شعبی سے زیادہ فقاہت والا کوئی بھی نہیں دیکھا۔ اس کی وفات کے سال کے بارے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں لیکن ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ۱۰۹ھ کو ترجیح دی ہے۔(۱)

(۶) حسن بن ابی الحسن البصری متوفی ۱۱۰ھ :

ابن سعد نے کہا ہے کہ حسن بصری کے والد کا نام یسار تھا اور یہ میسان کے قیدیوں میں سے تھے جسے مدینہ پہنچنے پر رُبَیّع بنت نضر (انس بن مالک کی پھوپھی) نے خرید لیا اور پھر آزاد کر دیا ان کی والدہ کا نام خیرہ تھا جو زوجہ رسول ام سلمہ کی آزاد کردہ کنیز تھی۔ عمر فاروق کی خلافت کے دو سال ابھی باقی تھے کہ حسن بصری کی ولادت مدینہ میں ہوئی۔ ان کی والدہ جب موجود نہ ہوتیں اور یہ روتے تو ام سلمہ اسے خاموش کرانے کے لئے اپنا پستان اس کے منہ میں رکھ لیتیں جسے وہ چوستا تو دودھ اتر آتا۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بصری کی حکمت و فصاحت کا سبب ام سلمہ کے دودھ کی برکت ہے۔ اس نے علی بن ابی طالبؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ اور عائشہؓ کو دیکھا تو تھا مگر ان میں سے کسی سے اس کا سماع ثابت نہیں ہے۔ ابن حجر نے ابن حبان کے حوالے سے لکھا ہے کہ حسن بصری نے ۱۲۰ اصحابہ کو دیکھا تھا۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور کبار تابعین میں سے ہیں۔(۲)

---

(۱) تہذیب الکمال ص۳٤٩ تا ۳٥٦ ج۹ و تہذیب التہذیب ص٥٩ ج٥

(۲) تہذیب الکمال ص۲٩٧ تا ۳۱٧ ج٤ و تہذیب التہذیب ص۲۳٦ ج۲

(۷) قتادہ بن دعامہ سدوسی ابو الخطاب البصری متوفی ۱۱۷ھ :

صحاح ستہ کے راوی ہیں اور جلیل القدر تابعی تھے۔ یہ پیدائشی نابینا تھے مگر اس کے باوجود حافظہ بڑا مضبوط تھا۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ قتادہ تفسیر کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور عربی لغت و ادب میں بھی اس کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ البتہ محدثین نے کہا ہے کہ یہ تدلیس کیا کرتے تھے۔(۱)

مکہ' مدینہ اور کوفہ کے مدارس و مراکز کے یہ پندرہ تابعین تو وہ ہیں جن کو تفسیر میں ممتاز مقام حاصل تھا اور جن سے کتابوں میں تفسیری روایات زیادہ نقل ہوئی ہیں اور یہ دور تابعین کے نمایاں مفسرین تھے لیکن طبقہ تابعین میں سعید بن میسب ۹۱ھ' محمد بن سیرین' نافع مولی عبداللہ بن عمر متوفی ۱۱۷ھ' ابن ابی ملیکہ متوفی ۱۱۷ھ اور متعدد دوسرے تابعین سے بھی تفسیری روایات منقول ہیں۔ دور تابعین کے مفسرین نے صحابہ کی تفاسیر کو محفوظ کرنے اور ہم تک پہنچانے میں بہت بڑا کردار انجام دیا ہے اور خود اپنے فہم و تدبر سے بھی قرآن کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں لیکن چونکہ ان کے دور میں اہل کتاب کے بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے جو اپنے اذہان میں اسرائیلیات اور قصص و حکایات لے کر آئے تھے جن کا تعلق اسلامی احکامات سے نہیں تھا' وہ ان روایات واخبار کا ذکر تابعین کے سامنے کیا کرتے تھے اور ذکر کرنے سے ممانعت رسول اللہ ﷺ نے نہیں کی تھی بلکہ تصدیق کرنے سے ممانعت کی تھی اس لئے صحابہ کے مقابلے میں تابعین سے اسرائیلیات کی روایت و اشاعت بڑی کثرت سے ہوئی ہے۔

---

(۱) تذکرہ الحفاظ للذہبی

اسرائیلیات کی اشاعت کا دارومدار زیادہ تر چار افراد پر ہے

اسرائیلی روایات زیادہ تر درج ذیل چار افراد کے ذریعے پھیلی ہیں۔

ایک ہے عبداللہ بن سلامؓ۔

دوسرا ہے کعب الاحبارؒ۔

تیسرا ہے وہب بن منبہؒ۔

چوتھا ہے عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریجؒ۔

یہ چاروں حضرات نو مسلم تھے ایک صحابی تھا اور دوسرے تین تابعی تھے۔ عبداللہ بن سلام کے مخلص صحابی ہونے میں تو شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ اس کے جنتی ہونے کی بشارت خود رسول اللہ ﷺ نے دی ہے لیکن باقی تین حضرات نے بھی محققین کے نزدیک اخلاص کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اسلام پر ثابت قدم بھی رہے تھے۔ ان چاروں نو مسلم اہل کتاب کا مختصر تعارف پیش کرنا مناسب رہے گا۔

(۱) ابو یوسف عبداللہ بن سلام بن حارث الاسرائیلی الانصاریؓ متوفی ۴۳ھ

یہ عظیم صحابی یوسف بن یعقوب علیہما السلام کی اولاد میں سے تھے لیکن چونکہ مدینہ کے خزرج قبیلے کی شاخ بنو عوف کی حلیف تھے اس لئے اسے خزرجی انصاری بھی کہا جاتا ہے۔ امام بخاری نے مناقب انصار کے ابواب میں سے ایک مستقل باب عبداللہ بن سلام کی منقبت کے لئے بھی قائم کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے اسے انصار کے حلیف ہونے کی وجہ سے انصار میں شمار کیا ہے ورنہ نسلاً تو یہ اسرائیلی تھے۔ نبی کریم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے پر اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ امام بخاری نے باب الہجرۃ میں اس کے اسلام لانے کا قصہ اس طرح نقل کیا ہے:

"جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو عبداللہ بن سلام آپ کے پاس آئے اور کہا کہ

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ دین حق لے کر آئے ہیں۔ یہود جانتے ہیں کہ میں ان کا سردار ہوں اور میرا باپ بھی ان کا سردار تھا' میں ان میں تورات کا بڑا عالم ہوں اور میرا باپ بھی۔ ان کا بڑا عالم تھا۔ پس آپ ان سے میرے اسلام لانے کی خبر ملنے سے پہلے میرے بارے میں پوچھ لیجئے' ان کو جب میرے مسلمان ہونے کا علم ہو جائے تو پھر مجھ پر وہ تہمتیں لگائیں گے جو میرے اندر نہیں ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا اور فرمایا۔ اے یہود! اللہ کا خوف کرو اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں اور سچا دین لے کر آیا ہوں۔ پس اسلام قبول کر لو۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو نہیں جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا تم میں عبداللہ سلام کیسے شخص ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں' ہمارے بڑے عالم ہیں اور بڑے عالم کے بیٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر وہ اسلام لے آئیں تو پھر تم کیا کرو گے؟! انہوں نے کہا پاکی ہے اللہ کے لئے وہ اسلام نہیں لاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات تین بار دہرائی اور انہوں نے بھی اپنی بات تین بار دہرائی۔ آپ نے فرمایا اے سلام کے بیٹے! باہر آجاؤ۔ عبداللہ بن سلام نے باہر آکر ان کے سامنے کہا۔ اے یہود! اللہ کا خوف کرو اللہ کی قسم جس کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور سچا دین لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے دربار سے نکال دیا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ پہلے اس کا نام حصین تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے آپ کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ لیا' بخاری نے مناقب الانصار میں سعد بن ابی وقاصؓ سے نقل کیا ہے کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو زمین پر چلنے والے کسی شخص کے بارے میں یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے ہے سوائے عبداللہ بن سلام کے۔" ظاہر ہے کہ جس شخص کو جنتی ہونے کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے دی ہو اس کے اخلاص اور استقامت

منورہ تشریف لائے اور اسلام قبول کیا اور قرآن وحدیث کا علم صحابہ کرام سے حاصل کیا۔ صحابہ وتابعین نے بھی اس کے علم سے استفادہ کیا تھا بعض کے نزدیک اس نے ابوبکر کے دور میں اسلام قبول کیا تھا لیکن مشہور قول یہی ہے کہ اسے ایمان کا شرف خلافت فاروقی میں نصیب ہوا تھا۔ مدینہ میں رہتے تھے لیکن آخر میں شام کے شہر حمص منتقل ہو گئے تھے اور عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں ۳۲ھ میں حمص ہی میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ ابن حبان کے نزدیک یہ ۳۴ھ میں فوت ہوئے تھے اور وفات کے وقت اس کی عمر ۱۰۴ سال تھی۔(۱)

کعب الاحبار کے حسن اسلام اور اس کی ثقاہت وعدالت کے لئے یہی کافی وشافی شہادت ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ ان سے علم حاصل کیا کرتے تھے' اور امام مسلم نے صحیح مسلم کے کتاب الایمان کے اواخر میں اس کی روایات نقل کی ہیں۔ اسی طرح ابوداؤد' ترمذی اور نسائی نے بھی اس کی روایات کی تخریج کی ہے اور یہ شہادت اس جلیل القدر تابعی پر لگائی گئی تہمتوں کی تردید کے لئے کافی ہے۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی کعب الاحبار تورات اور اہل کتاب کی دوسری روایات وحکایات اپنے احباب کے سامنے بیان کیا کرتے تھے لیکن یہ بیان صرف حکایتا تھا اعتقادا نہیں تھا۔ کعب الاحبار کے بارے میں بخاری کتاب التوحید میں حضرت معاویہؓ کے ایک قول سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس کی وضاحت پیش خدمت ہے۔

بخاری نے ابوالیمان عن شعیب عن الزھری کی سند کے ساتھ حمید بن عبدالرحمٰن کا قول نقل کیا ہے کہ "اس نے حضرت معاویہؓ سے مدینہ میں قریش کی ایک جماعت سے بات کرتے ہوئے سنا ہے کہ کعب الاحبار اہل کتاب کی روایات نقل کرنے میں زیادہ سچے راوی تھے لیکن باوجود اس کے ہم نے اس پر بھی "کذب" کا گمان کیا ہے۔"

مگر ابن حجر نے فتح الباری میں حضرت معاویہؓ کے اس قول میں لفظ "کذب" کی مختلف

---

(۱)تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص۵۲ ج۱ تہذیب الکمال للمزی ص۳۹۹ تا ۴۰۲ ج۱۵

توجیہات بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ کذب صرف قصداً جھوٹ بولنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ غیر ارادی طور پر خطا اور غلطی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی کعب الاحبار سے کبھی کبھی اہل کتاب سے نقل کرنے میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ حضرت معاویہ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ یہ عمداً جھوٹ بولنے والے تھے۔ ابن حبان نے بھی کتاب الثقات میں یہ توجیہ نقل کی ہے اور میرے خیال میں یہی توجیہ صحیح ہے۔ باقی رہی استاد احمد امین کی اپنی کتاب فجر الاسلام کے ص ۱۹۸ پر اور سید رشید رضا کی اپنی تفسیر المنار کے ص ۹ ج ا پر کعب الاحبار پر تنقید و تنقیص تو مذکورہ تحقیق کی روشنی میں اس کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے۔ اگر کعب الاحبار فی الواقع کذاب اور ناقابل اعتبار ہوتے تو مسلم اور دوسرے اکابر محدثین اس کی روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ نہ دیتے البتہ یہ درست ہے کہ کعب الاحبار کی وہ روایات جو انہوں نے اہل کتاب سے نقل کی ہیں حجت شرعیہ نہیں ہے اور انہوں نے ان کو حجت تسلیم بھی نہیں کیا بلکہ باقی مسلمانوں کی طرح اس کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ ماخذ احکام اور حجت صرف قرآن و سنت ہے۔

(۲) وھب بن منبہ متوفی ۱۱۰ھ :

یہ بھی یمنی ہے اور صنعاء میں قضاء کے منصب پر بھی فائز رہا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے اور العجلی نے اسے ثقہ تابعی قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التھذیب میں لکھا ہے کہ وھب بن منبہ صنعانی کو جمہور نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ابو زرعہ اور نسائی نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور بخاری نے بھی اس پر اعتماد کیا ہے۔ اس پر قدریہ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے لیکن اس نے اس سے رجوع کر لی تھی۔ اکابر محدثین اور جمہور اہل علم کی تعدیل و توثیق کے بعد بعض حضرات کی اس پر جرح و نقد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ہمام بن منبہ، معقل بن منبہ اور غیلان بن منبہ کے بھائی تھے ان کے والد منبہ اصل میں افغانستان کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے جسے کسریٰ نے ہرات سے نکال دیا تھا اور وہ یمن چلے گئے تھے۔ وھب بن منبہ کبھی

کبھی حالات معلوم کرنے کے لئے ہرات جایا کرتے تھے۔ وہب نے عہد نبوی میں اسلام قبول کیا تھا مگر شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا۔(۱)

(۴) عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج متوفی ۱۵۰ھ :

یہ بنو امیہ کے مولی تھے اس لئی اس کو القرشی الاموی کہا جاتا ہے۔ ابن سعد نے کہا ہے کہ اس کی ولادت ۸۰ھ میں مکہ میں ہوئی تھی۔ عطاء بن ابی رباح کے شاگرد خاص تھے' ۱۸ سال تک اس کی مجلس میں شریک ہوتے رہے ہیں' طلحہ بن عمر مکی کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم مسائل کس سے پوچھیں تو اس نے ابن جریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نوجوان سے پوچھ لیا کرو اگر یہ زندہ رہا۔ یحیٰ بن سعید قطان' امام احمد بن حنبل اور عبدالرزاق نے اس کی توثیق و تعدیل کی ہے لیکن بعض اہل علم نے اس پر جرح بھی کی ہے اس پر بڑا الزام یہ ہے کہ یہ تدلیس بہت زیادہ کرتے تھے۔ ابن جریر طبری نے ابن جریج سے اسرائیلیات کی کافی تعداد نقل کی ہے۔(۲)

مذکورہ چار حضرات کے علاوہ مشہور صحابی عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے بھی اسرائیلی روایات بڑی تعداد میں نقل ہوئی ہیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ اس نے سریانی زبان سیکھ لی تھی اور اس زمانے میں اہل کتاب کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کو غزوہ یرموک میں اہل کتاب کی اتنی زیادہ کتابیں ملی تھیں کہ ان کو دو اونٹوں پر لادا جاتا تھا اور وہ ان کتابوں سے لوگوں کے سامنے روایات بیان کیا کرتے تھے لیکن ان سے نہ احکام ثابت کرتے تھے اور نہ ان کی تصدیق کرتے تھے۔

---

(۱) تہذیب الکمال للمزی ص۴۸۷ تا۴۸۹ ج۱۹ و تہذیب التہذیب ص۱۶۶۔۱۶۷ ج۱۱

(۲) تہذیب الکمال للمزی ص۵۵ تا۶۲ ج۱۲

کبھی حالات معلوم کرنے کے لئے ہرات جایا کرتے تھے۔ وہب نے عہد نبوی میں اسلام قبول کیا تھا مگر شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا۔(۱)

(۴) عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج متوفی ۱۵۰ھ :

یہ بنو امیہ کے مولی تھے اس لئے اس کو القرشی الاموی کہا جاتا ہے۔ ابن سعد نے کہا ہے کہ اس کی ولادت ۸۰ھ میں مکہ میں ہوئی تھی۔ عطاء بن ابی رباح کے شاگرد خاص تھے' ۱۸ سال تک اس کی مجلس میں شریک ہوتے رہے ہیں' طلحہ بن عمر مکی کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم مسائل کس سے پوچھیں تو اس نے ابن جریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نوجوان سے پوچھ لیا کرو اگر یہ زندہ رہا۔ یحیٰ بن سعید قطان' امام احمد بن حنبل اور عبدالرزاق نے اس کی توثیق و تعدیل کی ہے لیکن بعض اہل علم نے اس پر جرح بھی کی ہے اس پر بڑا الزام یہ ہے کہ یہ تدلیس بہت زیادہ کرتے تھے۔ ابن جریر طبری نے ابن جریج سے اسرائیلیات کی کافی تعداد نقل کی ہے۔(۲)

مذکورہ چار حضرات کے علاوہ مشہور صحابی عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے بھی اسرائیلی روایات بڑی تعداد میں نقل ہوئی ہیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ اس نے سریانی زبان سیکھ لی تھی اور اس زمانے میں اہل کتاب کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کو غزوہ یرموک میں اہل کتاب کی اتنی زیادہ کتابیں ملی تھیں کہ ان کو دو اونٹوں پر لادا جاتا تھا اور وہ ان کتابوں سے لوگوں کے سامنے روایات بیان کیا کرتے تھے لیکن ان سے نہ احکام ثابت کرتے تھے اور نہ ان کی تصدیق کرتے تھے۔

---

(۱) تہذیب الکمال للمزی ص۴۸۷ تا۴۸۹ ج۱۹ و تہذیب التہذیب ص۱۶۶۔۱۶۷ ج۱۱

(۲) تہذیب الکمال للمزی ص۵۵ تا۶۲ ج۱۲

صحابہ و تابعین کی تفاسیر میں اختلاف کی نوعیت

قرآن کی تفسیر کے دوران ہم جب تفاسیر میں صحابہ و تابعین کے اقوال تلاش کرتے ہیں تو ہمیں ایک ہی آیت کی تفسیر میں صحابہ و تابعین کے مختلف اقوال سامنے آتے ہیں اور ان میں سے راجح قول معلوم کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس اشکال کا جواب شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے دیا ہے جس حاصل مفہوم یہ ہے:

"صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے درمیان اختلاف تضاد و تناقض کی قسم کا نہیں ہے تا کہ ایک قول کو صحیح اور دوسرے قول کو غلط قرار دیا جائے بلکہ یہ اختلاف تنوع یا اختلاف تعبیر یا اختلاف تمثیل کے قبیل سے ہے اور ممکن ہے کہ سب اقوال کو صحیح قرار دیا جائے اس لئے کہ آیت کے اصل مفہوم میں سب کا اتفاق ہوتا ہے۔ مثلاً الصراط المستقیم کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے' بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دین اسلام ہے' بعض نے کہا ہے کہ اس سے سنت رسول اور جماعت صحابہ کا راستہ مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عبودیت یعنی توحید کا راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام اقوال میں مسمی اور مفہوم ایک ہے اگرچہ اس کی صفات میں تنوع ہے اور الفاظ و عبارات میں تعدد ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کی ذات ایک ہے مگر محمد' احمد' حاشر' ماحی' عاقب' نبی الرحمہ اور نبی الملحمہ سب آپ کے اسماء ہیں جن میں سے ہر ایک الگ صفت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی ذات واحد ہے مگر اس کے ۹۹ اسماء حسنی ہیں جو اس کی صفات الوہیت پر دلالت کرتے ہیں تو اسماء کا یہ اختلاف ذات اور مسمی کے اختلاف پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صفات کے تنوع پر دلالت کرتا ہے اسی طرح قرآن کریم ایک ہے مگر فرقان' نور' الشفاء' الذکر اور الکتاب سب اس کے نام ہیں جو اس کی مختلف صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح مفہوم واحد کی مثالیں متعدد ہوتی ہیں کوئی مفسر ایک مثال پیش کرتا ہے' کوئی دوسری مثال پیش کرتا ہے اور

کوئی تیسری مثال پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مثالوں کے اختلاف سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ مفہوم مختلف ہو' کلام کی تشریح مفہوم بیان کرنے سے بھی کی جاتی ہے اور مثالوں کے ذریعے بھی کی جاتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَ مِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَات.

"قرآن کے وارثوں میں سے بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں بعض ان میں سے میانہ روی پر قائم ہیں اور بعض ان میں سے نیک کاموں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔"

ظالم وہ ہے جو مامورات کا تارک اور ممنوعات کا فاعل ہو۔ مقتصد وہ ہے جو واجبات کو ادا کرنے والا ہو اور محرمات کو ترک کرنے والا ہو اور سابق وہ ہے جو واجبات اور مستحبات کو ادا کرنے والا ہو اور محرمات و مکروہات دونوں کو ترک کرنے والا ہو۔ اگر کوئی ان کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ظالم وہ ہے جو نماز نہیں پڑھتا یا وضوء نہیں کرتا یا نماز کے ارکان کو پورا نہیں کرتا۔ مقتصد وہ ہے جو وقت پر نماز پڑھتا ہے جیسا کہ اسے حکم دیا گیا ہے اور سابق وہ ہے جو فرض نماز اس کے واجبات اور مستحبات کے ساتھ ادا کرتا ہے اور اس کے ساتھ نوافل بھی پڑھتا ہے ظاہر ہے کہ مثالوں کا یہ اختلاف مفہوم کا اختلاف نہیں ہے۔(۱)

(۵) تفسیر القرآن باللغۃ العربیۃ الفصحیٰ

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے عربی زبان کے علم کے بغیر فہم قرآن ممکن ہی نہیں ہے بلکہ احادیث نبویہ اور آثار صحابہ و تابعین کی روشنی میں بھی قرآن کو عربی لغت کے علم بغیر سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ احادیث و آثار کی زبان بھی عربی ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں فصیح اور کثیر الاستعمال الفاظ بھی ہوتے ہیں اور غیر فصیح و قلیل الاستعمال الفاظ بھی ہوتے

(۱)فتاوی ابن تیمیه ص ۳۸۱تا۳۸٤ج۱۳

ہیں۔ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے جو عربوں کی روزمرہ کی فصیح زبان ہے اس لئے قرآنی الفاظ کے لغوی معانی معلوم کرنے کے لئے عربوں کے عرف عام میں استعمال ہونے والے فصیح محاوروں اور مکالموں سے استفادہ کرنا ہوگا۔ شاذ و نادر قسم کے معانی پر قرآنی الفاظ کو محمول کرنا اور دور دراز کے معانی مراد لینا صحیح طرز تفسیر نہیں ہے۔ علامہ زرکشی نے عربی لغت کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کے بارے میں امام احمد بن حنبل سے دو روایات نقل کی ہیں ایک جواز کی اور دوسری کراہت کی اور فرمایا ہے کہ کراہت کا قول اس صورت کے بارے میں ہے کہ عربی مبین اور لغت فصحیٰ میں لفظ کا جو متبادر معنی ہو اور جس میں وہ لفظ کثیر الاستعمال ہو اسے نظر انداز کرکے دور دراز کا احتمالی معنی مراد لیا جائے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے شاذ و نادر قسم کے اشعار اور محاورات کا سہارا لیا جائے اور جواز کا قول اس صورت کے بارے میں ہے کہ قرآنی کلمات اور جملوں کے معانی و مفاہیم معلوم کرنے کے لئے "لغت فصحیٰ" اور کثیر الاستعمال اور عرف عام میں مروج عربی سے استفادہ کیا جائے۔

امام بیہقی نے اپنی کتاب "شعب الایمان" میں امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ :

لَا اُوْتِی بِرَجُلٍ غَیْرِ عَالِمٍ بلغة العرب یُفَسِّرُ کِتَابَ اللّٰهِ اِلَّا جَعَلْتُهٗ نَکَالًا.

"میرے پاس نہیں لایا جائے گا ایسا شخص جو عربی زبان نہ جانتا ہو اور قرآن کی تفسیر کر رہا ہو مگر میں اسے سزا دوں گا۔"

اسی طرح ابن عباسؓ کے شاگرد مجاہد بن جبر نے فرمایا ہے کہ :

لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ان یَّتَکَلَّمَ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ اِذَا لَمْ یَکُنْ عَالِمًا بِلُغَاتِ العرب.

"کسی شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہو حلال نہیں ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کی تفسیر میں کلام کرے جب کہ وہ عربی لغات کا عالم نہ ہو۔"

جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ مفسر کو جن علوم کی ضرورت پڑتی ہے وہ یہ ہیں :

پہلا عربی لغت کا علم ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے الفاظ مفردہ کے معانی اور مدلولات معلوم ہوتے ہیں جن کے بغیر آیات کا صحیح فہم حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا نحو کا علم ہے جس کے ذریعے اعراب کا علم حاصل ہوتا ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ اعراب کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں۔ حسن بصری سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص عربیت کا علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اچھے طریقے سے بات کر سکے اور اس کی قراءت درست ہو جائے تو اس نے فرمایا کہ اچھا کرتا ہے اس لئے کہ جب ایک شخص آیت پڑھتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو اس کو غلط معنی پر محمول کرتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے یعنی اعراب اور عربیت کے بغیر قرآن کا صحیح مفہوم معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا علم صرف ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے صیغے اور اوزان معلوم ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ جس شخص سے علم صرف رہ گیا ہو وہ بہت بڑے علم سے محروم رہ جاتا ہے۔ جب کسی شخص کو یہ پتہ نہ ہو کہ یہ واحد کا صیغہ ہے یا جمع ہے' ماضی ہے یا مضارع ہے' اسم ہے یا فعل ہے تو وہ لفظی معنی بھی معلوم نہیں کر سکے گا۔ علامہ زمخشری نے اس قسم کی ایک فاش غلطی کی مثال پیش کی ہے کہ بعض لوگوں نے يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (الاسراء ۱۷) کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی ماؤں کے ناموں سے پکارے جائیں گے حالانکہ امام جمع نہیں ہے بلکہ اسم واحد کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں مقتدی اور رہنما۔

چوتھا علم الاشتقاق ہے جس سے صیغوں اور الفاظ کا ماخذ اشتقاق معلوم ہوتا ہے یہ علم اس لئے ضروری ہے کہ مصادر اور ماخذ اشتقاق کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح علم بلاغت کے فنون ثلاثہ یعنی علم معانی' علم البیان اور علم بدیع کے قواعد و ضوابط کو بھی فہم قرآن میں بہت بڑا دخل ہے۔ بہر حال عربی لغات اور ان سے متعلقہ فنون میں

احادیث کو نظر انداز کر کے صرف لغت کی مدد سے اقامت صلوۃ کے معنے اس طرح بیان کئے ہیں۔ "الصلوۃ وہ نظام مملکت ہے جس میں تمام امور جماعت مؤمنین کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوع انسان کی ربوبیت ہے۔" (۱)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

قرآن کریم کی رو سے اقامت صلوۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد معاشرہ قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں۔" ....

نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے ایران کے مجوس اپنے طریق پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہندوپاک میں) آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (۲)

ظاہر ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ کھلی تحریف ہے۔ صلوۃ کا یہ مفہوم لغت سے ثابت کرنا بھی تکلف و تخرص ہے لیکن اقامت صلوۃ کے شرعی معنے ہم صرف لغت سے نہیں بلکہ بخاری مسلم کی کتاب الصلوۃ میں مروی احادیث رسول سے معلوم کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوۃ ایک عبادت ہے پرویز نے زکوۃ اور حج اور دوسرے قرآنی الفاظ کی اسی انداز میں اپنی کتاب لغات القرآن اور مطالب الفرقان میں تحریف کی ہے۔ اسی طرح سرسید احمد خان نے اپنی تفسیر میں معجزات سے متعلق آیات کے لغت سے دور دراز معانی تلاش کر کے تحریفات کی ہیں۔ متجددین کا طریقہ ہی یہ ہے کہ احادیث کو نظر انداز کر کے صرف لغت کی بنیاد پر قرآنی الفاظ و اصطلاحات میں تحریف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس علماء راسخین قرآن فہمی کے لئے لغت کے ساتھ قرآنی نظائر اور احادیث و آثار کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

(۱) مطالب الفرقان طبع طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور ۱۹۹۲، ص ۱۰۰ ج ۱

(۲) مطالب الفرقان ص ۱۲۲ ج ۱

(۲) تفسیر القرآن بالعقل والاجتہاد

تدبر و تعقل اور غور و فکر کے بغیر تو نہ قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کلام کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں تدبر نہ کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور عقل سلیم کی تعریف کی گئی ہے۔ قرآن کی تلاوت اور مطالعہ کرنے والوں کے سامنے عقل و فکر سے کام لینے کا حکم بار بار آتا ہے۔ تفقہ فی الدین کا جو حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ غور و فکر اور استنباط و اجتہاد کے ذریعے دین کا گہرا علم حاصل کیا جائے اور دین کے احکام و معارف اور اسرار و حکم معلوم کئے جائیں اور استنباط کا مطلب ہے کسی خفیہ اور پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنے کے لئے تحقیق اور تفتیش کرنا۔ مجتہد اور فقیہ کا کام یہی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی نصوص سے احکام و قوانین معلوم کریں اور قرآنی علوم و معارف اور اسرار و حکم سے پردہ اٹھائیں۔ یہی وہ تدبر و تفقہ ہے جس کا ذکر دعاء رسول میں اس طرح آیا ہے کہ :

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ.

"یا اللہ ابن عباس کو دین میں گہرا علم عطا فرما اور اسے قرآن کی تفسیر و تاویل کا فہم عنایت فرما۔"

اور یہی وہ فہم ہے جس کا ذکر حضرت علیؓ نے اپنے اس قول میں کیا ہے کہ :

اِلَّا فَھْمًا یُؤتَاہُ الرَّجُلُ فِی الْقُرآن.

"ہمارے پاس کوئی خصوصی علم اور راز کی باتیں موجود نہیں ہیں سوائے فہم قرآن کے جو کسی شخص کو دیا گیا ہو۔"(۱)

یعنی ہم اہل بیت اپنے فہم اور تدبر و تعقل کے ذریعے قرآن سے احکام اور علوم و معارف معلوم کرتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا علم نہیں ہے جو خصوصی طور پر ہم کو بتایا

---

(۱) بخاری فی الدیات

(۲) تفسیر القرآن بالعقل والاجتہاد

تدبر و تعقل اور غور و فکر کے بغیر تو نہ قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کلام کو سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں تدبر نہ کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور عقل سلیم کی تعریف کی گئی ہے۔ قرآن کی تلاوت اور مطالعہ کرنے والوں کے سامنے عقل و فکر سے کام لینے کا حکم بار بار آتا ہے۔ تفقہ فی الدین کا جو حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ غور و فکر اور استنباط و اجتہاد کے ذریعے دین کا گہرا علم حاصل کیا جائے اور دین کے احکام و معارف اور اسرار و حکم معلوم کئے جائیں اور استنباط کا مطلب ہے کسی خفیہ اور پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنے کے لئے تحقیق اور تفتیش کرنا۔ مجتہد اور فقیہ کا کام یہی ہے کہ وہ قرآن و سنت کی نصوص سے احکام و قوانین معلوم کریں اور قرآنی علوم و معارف اور اسرار و حکم سے پردہ اٹھائیں۔ یہی وہ تدبر و تفقہ ہے جس کا ذکر دعاء رسول میں اس طرح آیا ہے کہ :

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ.

”یا اللہ ابن عباس کو دین میں گہرا علم عطا فرما اور اسے قرآن کی تفسیر و تاویل کا فہم عنایت فرما۔“

اور یہی وہ فہم ہے جس کا ذکر حضرت علیؓ نے اپنے اس قول میں کیا ہے کہ :

اِلَّا فَهْمًا يُؤْتَاهُ الرَّجُلُ فِي الْقُرْآنِ.

”ہمارے پاس کوئی خصوصی علم اور راز کی باتیں موجود نہیں ہیں سوائے فہم قرآن کے جو کسی شخص کو دیا گیا ہو۔“(۱)

یعنی ہم اہل بیت اپنے فہم اور تدبر و تعقل کے ذریعے قرآن سے احکام اور علوم و معارف معلوم کرتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا علم نہیں ہے جو خصوصی طور پر ہم کو بتایا

---

(۱) بخاری فی الدیات

گیا ہو کسی اور کو نہ بتایا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل میں فرمایا ہے کہ :

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○
(النحل ٤٤)

"اور ہم نے اتاری ہے تیرے پاس نصیحت (قرآن) تاکہ تو واضح کرے لوگوں کے لئے اس کتاب کو جو ان کے پاس اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ خود بھی غور و فکر کریں۔"

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے بیان کے بعد لوگوں کے فکر کا ذکر بھی ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل واجتہاد اور تعقل و تدبر بھی قرآن فہمی کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر عقل واجتہاد کے ذریعے قرآن کی تفسیر جائز نہ ہوتی تو صحابہ و تابعین کے درمیان آیات کی تفسیر میں آراء کا اختلاف نہ ہوتا لیکن آثار صحابہ و تابعین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر ان کے درمیان صرف تعبیر و تمثیل کا لفظی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ حقیقی اختلاف بھی ہوتا ہے اور مفسرین و مجتہدین کسی ایک رائے کو راجح اور دوسری رائے مرجوح قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف عقل واجتہاد اور غور و فکر کا اختلاف ہے ورنہ حدیث رسول کے خلاف تفسیر کرنے کا تو صحابہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ احادیث و آثار' قرآنی نظائر اور عربی لغات کو نظر انداز کر کے آزادانہ اجتہاد کے ذریعے قرآن کی تفسیر جائز نہیں ہے یہ متجددین و مبتدعین کا طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف کرتے ہیں۔ تعقل و تفکر اور اجتہاد و تدبر مذکورہ اصول تفسیر کی روشنی میں کیا جانا چاہئے ورنہ آزادانہ اجتہاد راہ راست سے بھٹکنے کا ذریعہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ احکام القرآن للجصاص' احکام القرآن لابن العربی' احکام القرآن للقرطبی اور دوسری وہ تفاسیر جو قرآنی آیات سے مسائل و احکام' علوم و معارف اور علمی نکات معلوم کرتے ہیں وہ عقل واجتہاد اور تدبر و تفکر ہی کے ذریعے معلوم کرتے ہیں۔ قرآن کریم علوم و معارف کا ایک بحر زخار اور ناپیدا کنار

سمندر ہے جس کے اسرار و حکم اور حقائق ودقائق کی کوئی انتہا نہیں ہے اور غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ ہر دور کے علماء ربانیین اور مفسرین نے اپنی اپنی فہم اور اپنی اپنی عقل و اجتہاد کے مطابق قرآن سے نئے نئے حقائق ودقائق و اسرار و حکم معلوم کئے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

تفسیر بالرائے کا مفہوم

عقل و اجتہاد اور تدبر و تفکر کے ذریعے قرآن کے علوم و معارف کو سمجھنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ شرعاً مطلوب بھی ہے جیسا کہ عنوان سابق کے تحت ثابت کیا جا چکا ہے اور قرآن و سنت کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے رائے کا استعمال صحابہ و تابعین سے ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل کو اجتہاد بالرائے کی اجازت ہی نہیں دی تھی بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی تھی لیکن اجتہاد بالرائے کی تحسین کرنے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

مَنْ قَالَ فِي الْقُرآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ.

"جس شخص نے قرآن کی تفسیر میں علم کے بغیر کوئی بات کی ہو تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا دے۔"(۱)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ :

مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرآنِ بِرَأيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ.(۲)

"جو شخص قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کوئی بات کرتا ہے تو اگر اس نے صحیح بات معلوم کر لی ہو پھر بھی وہ غلطی پر ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہ و تابعین اور سلف صالحین سے

---

(۱) ابوداؤد کتاب العلم اور ترمذی کتاب التفسیر

(۲) ابوداؤد و ترمذی

آثار مروی ہیں کہ انہوں نے تفسیر بالرائے سے احتراز کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔ اشکال یہ ہے کہ ایک طرف رائے اور عقل و فکر کے استعمال کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کی تحسین و تعریف کی گئی ہے اور دوسری طرف قرآن کی تفسیر بالرائے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے تو آخر اس تضاد و تعارض کے ازالے کی توجیہ کیا ہے؟

حافظ عماد الدین ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے اس مضمون کی احادیث و آثار نقل کرنے کے بعد دونوں قسم کی روایات کے درمیان تطبیق کے بارے میں فرمایا ہے:

فهٰذهِ الْآثارُ الصَّحِيْحَةُ وَ مَا شَاكَلَهَا عَنْ أئِمَّةِ السَّلَفِ مَحْمُوْلَةٌ عَلٰى تحرُّجِهمْ عَنِ الْكَلَامِ فِي التَّفْسِيْرِ بِمَا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِهِ فَاَمَّا مَنْ تَكَلَّمَ بِمَا يَعْلَمُ مِنْ ذالِكَ لُغَةً وَ شَرْعًا فَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ وَ لِهٰذَا رُوِىَ عَنْ هٰؤُلَاءِ وَ غَيْرِهِمْ اَقْوَالٌ فِي التَّفْسِيْرِ وَلَا مُنَافَاةَ لِاَنَّهُمْ تَكَلَّمُوْا فِيمَا عَلِمُوْهُ وَ سَكَتُوْا عَمَّا جَهِلُوْهُ وَ هٰذَا هُوَ الْوَاجِبُ عَلٰى كُلِّ اَحَدٍ.(۱)

"یہ آثار صحیحہ اور ائمہ سلف سے منقول اس طرح کے دوسرے آثار اس پر محمول ہیں کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر کے بارے میں وہ بات کرنے سے احتراز کیا ہے جس کا ان کے پاس کوئی علم نہیں تھا اور جو شخص اس بارے میں وہ بات کرتا ہے جس کا اس کے پاس لغتاً و شرعاً علم موجود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ تفسیر کے بارے میں سلف سے اقوال و آراء منقول ہیں اور اس میں کوئی منافات اور تضاد نہیں ہے اس لئے کہ یہ جس بات کو جانتے تھے اس کا ذکر انہوں نے کیا ہے اور جس بات کو نہیں جانتے تھے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اور ہر شخص پر یہی طریقہ اختیار کرنا واجب ہے۔"

ابن کثیر کی اس توجیہ کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ الفاظ و کلمات کے لغوی اور شرعی معانی کو نظر انداز کر کے اور تفسیر کے مذکورہ بالا اصول ستہ سے آنکھیں بند کر کے دلیل و برہان کے

(۱) تفسیر ابن کثیر مقدمہ

بغیر رائے مجرد اور ہوائے نفس کے مطابق تفسیر کرنا ممنوع ہے اور موجب عذاب ہے اس لئے کہ اس طرز فکر کا مقصد تلاش حق نہیں ہوتا بلکہ اپنے زیغ قلبی اور ہوائے نفس کا ثبوت تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو اگر اس کی بات اتفاقیہ طور پر صحیح بھی ہو پھر بھی وہ غلطی پر ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا ہے کہ محض استحسان عقلی کی بنیاد پر اصول تفسیر کو پس پشت ڈال کر تفسیر کر رہا ہے۔

امام قرطبی متوفی ۶۷۱ھ نے ابن الانباری سے تفسیر بالرائے کا مفہوم اس طرح نقل کیا ہے کہ:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرآنِ قَوْلًا يَعْلَمُ اَنَّ الْحَقَّ غَيْرُه فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَه مِنَ النَّارِ فَحَمَلَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ هٰذَا الْحَدِيْث عَلٰى اَنَّ الرای مَعْنِيٌّ بِهِ الْهَوٰى مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ قَوْلًا يُوَافِقُ هَوَاهُ لَمْ يَاخُذْه عَنْ اَئِمَّةِ السَّلَفِ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ لِحُكْمِهِ عَلَى الْقُرْآنِ بِمَا لَا يعرِفُ اَصْلَه۔

"جس نے قرآن میں ایسی بات کہی ہو جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ حق بات دوسری ہے تو پھر وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنادے..... بعض اہل علم نے یہ حدیث اس پر محمول کی ہے کہ رائے سے مراد ھوئی ہے یعنی جو شخص ایسی بات کرے جو اس کی خواہش نفس کے موافق ہو اور ائمہ سلف سے ماخوذ نہ ہو تو اگر وہ صحیح ہو پھر بھی خطا ہے۔ اس لئے کہ اس نے قرآن کی طرف وہ حکم منسوب کیا ہے جس کی بنیاد اسے معلوم نہیں ہے۔"

قرطبی نے ابن عطیہ غرناطی متوفی ۵۴۱ھ کی توجیہ بھی اسی طرح نقل کی ہے کہ:

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص سے جب قرآن کے کسی معنی کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ علماء کے اقوال اور اور علم نحو و اصول تفسیر میں غور و فکر کئے بغیر جرات کر کے اپنی رائے سے جواب دے۔ اس حدیث کے مفہوم میں لغویین کا لغت کی روشنی میں، نحویین کا نحو کی روشنی میں تفسیر کرنا اور فقہاء و مجتہدین کا معانی و مفاہیم معلوم کرنا شامل نہیں

ہے۔ جو شخص قواعد و ضوابط کے مطابق اجتہاد سے کوئی بات کرتا ہے تو وہ مجرد رائے سے بات کرنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ ابن عطیہ کی یہ توجیہ صحیح ہے اور متعدد علماء نے اسی کو پسند کیا ہے اس لئے کہ جو شخص اپنے وہم و خیال کے مطابق اصول تفسیر پر استدلال کے بغیر قرآن کی تفسیر میں کوئی بات کرتا ہے تو وہ غلطی کرتا ہے اور جو شخص متفقہ اور قطعی اصول کے مطابق معانی و مفاہیم مستنبط کرتا ہے وہ قابل مدح و تحسین ہے۔(۱)

ابن کثیر' ابن الانباری' ابن عطیہ' قرطبی اور دوسرے علماء کی اختیار کردہ اس توجیہ کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ اصول تفسیر کو نظر انداز کر کے دل میں جو بات آئے اس کے مطابق تفسیر کرنا تفسیر بالرای المذموم ہے اس لئے کہ یہ اتباع قرآن نہیں ہے بلکہ اتباع ھویٰ ہے اور اصول تفسیر و اصول اجتہاد کی روشنی میں قرآن کے معانی و مفاہیم اور احکام و معارف معلوم کرنا تفسیر بالعقل والاجتہاد ہے اور قابل مدح و تعریف ہے۔

---

(۱)مقدمه تفسير قرطبى باب ما جاء من الوعيد فى تفسير القرآن بالراى والجراة على ذالك

باب نہم

متجددین
کا
منہج تفسیر

باب نہم

متجددین کا منہج تفسیر

باب ہشتم میں اہل سنت والجماعۃ کا منہج تفسیر اور اصول تفسیر بیان کئے گئے ہیں اور چھ عنوانات کے تحت تفسیر کے چھ اصول اور مآخذ کی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔ ان اصول ستہ کی روشنی میں اہل سنت نے قرآن کے فہم اور تفہیم کے لئے جو منہج اختیار کیا ہے وہ آزاد عقلیت اور شتر بے مہار قسم کی "جدت" کا منہج نہیں ہے بلکہ سنت رسول اور جماعت صحابہ کے اصول تفسیر کا پابند منہج ہے جو "عقلیت سلیمہ" کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ معاشی اور اقتصادی ترقی کے لئے جدید سے جدید تر وسائل اور علوم وفنون کی تخلیق اور ان کا استعمال مفید ہے بلکہ اسلام اس کی ترغیب دیتا ہے لیکن دین اسلام میں جدت اور قدامت کی تقسیم ایک لایعنی قسم کی تقسیم ہے' اس لئے کہ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لئے قرآن اور اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے والے رسول کی تعلیمات ہی بنیادی "ماخذ" ثابت ہو سکتی ہیں جو آپ کے اصحاب کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اس لئے قرآنی آیات کے سیاق و سباق' قرآنی نظائر' عربی الفاظ کے متبادر معانی اور احادیث و آثار سب کو نظر انداز کر کے اور ان سے بالکل آنکھیں بند کر کے صرف "عقلیت" اور "جدیدیت" کا شوق پورا کرنے کے لئے تفسیر کرنا اور سنت رسول و جماعت صحابہ کی جگہ فلسفہ قدیم یا فلسفہ جدید کو ماخذ تفسیر قرار دینا راہ راست سے بھٹکے ہوئے "زائغین" کا منہج ہے "اہل حق" کا منہج نہیں ہے۔ اہل جدت کا منہج حقیقت میں تفسیر قرآن کا منہج نہیں ہے بلکہ تحریف قرآن کا منہج ہے جس کا مقصد اسلام اور قرآن کے نام پر مغرب کے باطل افکار و نظریات کو فروغ دینا ہے۔ برصغیر ہند میں میں فتنہ "تجدد فی الدین" اور اہل سنت کے مقابلے میں "اہل جدت" کے منہج تفسیر کا بانی سر سید احمد خان ہے جو

۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۸ء میں ۸۱ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا جس نے ترقی کر کے بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی' جو دراصل تعلیمی ادارے کے نام پر انگریزی تہذیب کی ترویج کا مرکز تھا۔ سرسید کی زندگی کا اکثر حصہ تو انگریزوں کی ملازمت میں گزرا تھا اور ملازمت کے دوران اس نے انگریزوں کے مفادات کے لئے ایک وفادار ملازم کا کردار ادا کیا تھا اور زندگی کے باقی حصے میں اس کی صلاحیتیں دو قسم کی سرگرمیوں کے لئے وقف رہی ہیں ایک مسلمانوں کو برطانوی سامراج کی اطاعت شعاری اور وفاداری پر آمادہ کرنا اور دوسری اسلام اور قرآن کی ایسی تعبیر و تفسیر کرنا جو مغرب کے مادہ پرستانہ نظریات سے ہم آہنگ ہو اور مادہ پرستوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس کی علمی کاوشوں کا مقصد اسلام اور قرآن کی حقیقی تعلیمات کی اشاعت نہیں تھا بلکہ اسلام اور قرآن کو مغربی تہذیب کے لئے قابل قبول بنانا اس کی کوششوں کا اصل ہدف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی غلامانہ اور معذرت خواہانہ ذہنیت کے ساتھ اسلام کی خدمت تو نہیں کی جاسکتی بلکہ سامراجی تہذیب ہی کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ خدمت خلق اور تعلیم کے میدان میں سرسید نے اچھے اور قابل تعریف کام بھی کئے ہیں لیکن اس نے اسلام اور قرآن کی جو تحریفات کی ہیں وہ اتنا بڑا جرم ہے جس نے اس کی دوسری اچھائیوں اور بھلائیوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید مغربی تہذیب کے پرستاروں میں تو بے حد مقبول ہے لیکن راسخ العقیدہ مسلمانوں اور حق پرستوں میں اسے مقبولیت کا مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس سرسید کے ہم عصر اور کلاس فیلو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی ۱۸۶۷ء میں "مدرسہ دیوبند" قائم کیا تھا جس نے ترقی کر کے آج بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کے قیام کا مقصد قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات کی اشاعت' اسلامی تہذیب کی ترویج اور انگریزی تہذیب کی یلغار سے امت مسلمہ کو

بچانا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے اثرات کو مٹانا اور انگریزی سامراج کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کو از سر نو تیار کرنا بھی مدرسہ دیوبند کے اہداف میں شامل تھا۔ اغراض و مقاصد کے اسی فرق کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے علمبرداروں میں مولانا نانوتویؒ مقبول و محبوب ہیں اور مغربی تہذیب کے پرستاروں میں سرسید مقبول و محبوب ہیں۔ سرسید کے مدرسۃ العلوم نے بھی ایک تحریک برپا کی تھی اور مولانا نانوتویؒ کے مدرسہ دیوبند نے بھی ایک تحریک برپا کی تھی لیکن دونوں تحریکوں کا مقصد اور طریق کار مختلف تھا۔ سرسید کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی سامراج کا وفادار بنانا اور اسلام اور قرآن کی ایسی تعبیر کرنا تھا جو انگریزی تہذیب کے لئے قابل قبول ہو اور اس کا منہج مغربی فلسفہ کے اصول کے مطابق آزادانہ جدت پسندی تھی' اس کے مقابلے میں علامہ نانوتویؒ کا مقصد انگریزی سامراج کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا اور قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات کی اشاعت کرنا تھا اور ان کا منہج سنت رسول اور جماعت صحابہ کے اصول کا پابند تھا۔

برصغیر میں اسلامی تہذیب کی ترویج اور مغربی تہذیب کی تردید کے لئے ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کی قیادت میں بھی ایک فکری اور عملی تحریک برپا ہوئی تھی جو ترقی کر کے آج ایک فعال اور منظم عالمی اسلامی تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مولانا مودودیؒ کی اس تحریک کا مقصد دعوت دین اور اقامت دین کے لئے رسول اللہ ﷺ کے منہج کے مطابق منظم جدوجہد کرنا تھا اور مغربی تہذیب پر تنقید بھی اس تحریک کے لائحہ عمل میں شامل ہے اس لئے کہ "تجدد فی الدین" پر تنقید کرنے کے بغیر اور مادہ پرستانہ تہذیب کے برے اثرات سے مسلمانوں کو باخبر کئے بغیر دعوت دین کا کام بھی نہیں ہو سکتا اور اسلامی معاشرہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ مولانا مودودیؒ کے لٹریچر نے فتنہ جدیدیت اور غیر اسلامی افکار و نظریات کے مقابلے میں مفید ترین اور موثر ترین کردار ادا کیا ہے' تحریک دیوبند اور مولانا مودودیؒ کی تحریک کے علاوہ برصغیر کے دوسرے مدارس دینیہ اور دعوتی تحریکوں نے بھی

سر سید کی "تحریک تجدد" اور "منہج تفسیر" کے خلاف قابل قدر کام کیا ہے۔ اہل حق کی انہی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر کے مسلمان کم از کم فکر و عقیدے کے اعتبار سے اسلام کی صحیح تعلیمات پر اور قرآن و سنت کے صراط مستقیم پر قائم ہیں اور سر سید کے نظریات اور تحریفات کو ماننے والے مسلمانوں میں نفرت کا نشان بنے ہوئے ہیں۔

سر سید احمد خان کے اصول تفسیر

سر سید نے چھ حصوں میں "تفسیر القرآن" کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے جو سورۃ طہٰ کی آیت ۱۳۵ تک لکھی گئی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا اور تفسیر کی تکمیل نہ ہو سکی۔

اس کے حصوں کی تفصیل یہ ہے:

حصہ اول	از فاتحہ تا آل عمران
حصہ دوم	از آل عمران تا الانعام
حصہ سوم	از الانعام تا الانفال
حصہ چہارم	از الانفال تا ھود
حصہ پنجم	از ھود تا بنی اسرائیل
حصہ ششم	از بنی اسرائیل تا طہٰ آیت ۱۳۵

یہ تفسیر چونکہ اہل سنت کے اصول تفسیر کے خلاف لکھی گئی تھی اس لئے اسے کوئی چھاپ کر اپنے آپ کو گناہگار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا لیکن ۱۹۹۸ء میں دوست ایسو سی ایٹس اردو بازار لاہور نے اس کے تمام حصے ایک ہی جلد میں شائع کئے ہیں۔ اس تفسیر کے لکھنے کا باعث سر سید نے خود ابتداء میں بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

غدر کے بعد (۱۸۵۷ء کے جہاد کے بعد جسے سر سید غدر کہا کرتے تھے) مجھے اپنی قوم

کی اصلاح کی فکر ہوئی ایک زمانہ دراز کے غور کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ "علوم وفنون جدیدہ" کی تعلیم کے بغیر مسلمانوں کی دینی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی اور دنیوی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی جب میں نے قرآن میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ قرآن سے جو اصول نکلتے ہیں ان کے مطابق قرآن اور علوم جدیدہ میں کوئی مخالفت نہیں ہے پھر میں نے انہی اصول پر تفسیر لکھنی شروع کی۔ اس کے بعد "تحریر فی اصول التفسیر" کے زیر عنوان پندرہ اصول تحریر کئے ہیں جو دراصل تفسیر کے اصول نہیں ہیں بلکہ سر سید کے نظریات ہیں جن کو اصول تفسیر کا نام دیا گیا ہے۔

ان نظریات بنام اصول تفسیر کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ خالق کائنات موجود ہے۔

۲۔ خالق نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء مبعوث کئے ہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ رسول برحق وخاتم المرسلین ہیں۔

۳۔ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔

۴۔ عام علماء اسلام کا مذہب یہ ہے کہ قرآن جبریل فرشتہ نے آنحضرت تک پہنچایا ہے مگر میرا خاص مذہب یہ ہے کہ ملکہ نبوت نے جسے روح الامین سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضرت کے قلب پر القا کیا ہے۔

اس جگہ تو جبریل کے ذریعے نزول قرآن کو عام علماء اسلام کا مذہب کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے مگر اپنی تفسیر کے صفحہ ۹۱ پر سر سید اس مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذِهٖ هَفْوَاةٌ لَيْسَ لَهَا فِي الْاِسْلَامِ نَصِيْبٌ.

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ بے وقوفوں کی باتیں ہیں جن کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

حالانکہ یہ علماء اسلام کی بات بھی نہیں ہے اور بے وقوفوں کی بات بھی نہیں ہے بلکہ خود

قرآن کی بات ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ. (البقرہ ۹۷)

''کہو کہ جو جبریل کا دشمن ہو (تو غم و غصے سے مر جائے) اس لئے کہ جبریل ہی نے اتارا ہے یہ قرآن تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔''

جب خود اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن میرے حکم سے جبریل نے قلب محمد پر اتارا ہے تو اس بات کو ھفوہ قرار دینے والے کا منہج تفسیر کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ قارئین خود لگالیں ایک کھلی گمراہی کو مزید کھولنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ہے سرسید کا مذہب جسے اس نے الاصل الرابع کا نام دیا ہے۔ جبریل امین کو دوسری آیت میں الروح الامین کہا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ. (الشعراء۱۹۳)

قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ. (النحل۱۰۲)

ان دونوں آیتوں میں روح الامین اور روح القدس سے مراد جبریل ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت میں نام کے ساتھ تصریح کی گئی ہے اور احادیث رسول میں بھی تصریح موجود ہے کہ وحی لانے والا فرشتہ جبریل تھا تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بسنۃ الرسول کے اصول تفسیر کی روشنی میں غور کیا جائے تو کسی ابہام واشتباہ کے بغیر معلوم ہوتا ہے کہ الروح الامین سے مراد جبریل فرشتہ ہے لیکن سرسید اپنے خاص مذہب اور منہج کے مطابق کہتے ہیں کہ روح الامین سے مراد ملکہ نبوت ہے جس نے قلب رسول پر القا کیا ہے۔

وحی اور نبوت کی تشریح کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:

''نبوت کو علماء متقدمین نے ایک عہدہ سمجھا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے یا جس کو منتخب کرتا ہے دیدیتا ہے جیسے بادشاہ اپنے بندوں میں سے کسی کو وزیر، کسی کو دیوان، کسی کو بخشی کردیتا ہے اور وہ کسی منصب کو لے کر وہ کام شروع کرتا ہے اور مبعوث کرنے کے ٹھیک یہی معنے انہوں نے سمجھے ہیں۔ مگر میری سمجھ یہ نہیں ہے میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا

ہوں.... نبوت در حقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیاء میں بمقتضائے اپنی فطرت کے مثل دیگر قوائے انسانی کے ہوتی ہے جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے اور جو نبی ہوتا ہے اس میں وہ قوت ہوتی ہے جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اس کی ترکیب اعضاء' دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں اسی طرح ملکہ نبوت بھی اس سے علاقہ رکھتا ہے۔ یہ بات کچھ ملکہ نبوت پر ہی موقوف نہیں ہے ہزاروں قسم کے جو ملکات انسانی ہیں بعض دفعہ کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اسی کا امام اور پیغمبر کہلاتا ہے' لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے' شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے' ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے اور جس طرح کہ اور قوائے انسانی بمناسبت اس کے اعضاء کے قوی ہوتے جاتے ہیں اسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے اور جب اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضی ہوتا ہے جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبریل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔"(۱)

اس عبارت کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ نبوت کوئی منصب اور عہدہ نہیں ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے دیدیتا ہے بلکہ یہ تو انسانی اخلاق کی تعلیم وتربیت کا ایک فطری ملکہ اور صلاحیت ہے' یہ ملکہ اور قابلیت و صلاحیت جب اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتی ہے اور اس سے وہ اخلاقی تعلیم و تربیت ظہور میں آجاتی ہے جو اس کا مقتضی ہے تو اس کو بعثت کہتے ہیں اور صاحب ملکہ کو نبی مبعوث کہتے ہیں۔ جیسے لوہار' شاعر اور طبیب جب اپنے فن میں کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے

(۱) تفسیر القرآن از سرسید طبع ۱۹۹۸ء لاہور ص ۳۰۔۳۱

فن کا امام اور پیغمبر ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی امراض کا طبیب اور انسانی اخلاق کا معلم بھی جب اپنی تعلیمی اور اصلاحی صلاحیتوں میں درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو وہ امام اور پیغمبر ہو جاتا ہے۔ جس طرح باقی ملکات انسانی اس کے اعضاء اور دل و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح ملکہ نبوت بھی انسانی اعضاء کی ترکیب اور دل و دماغ سے تعلق رکھتا ہے اور وحی باہر سے اندر آنے والی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نبی کے اندر فطری اور طبعی طور پر جو ملکہ موجود ہوتا ہے اسی سے حاصل ہوتی ہے باہر سے نہیں آتی اور اسے باہر سے کوئی لاتا بھی نہیں ہے۔ صفحہ ۳۲ پر سر سید نے خود لکھا ہے کہ :

"خود اسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے بلکہ کلام رسول ہے اور وحی پیغام الٰہی اور تعلیم خداوندی نہیں ہے بلکہ ملکہ نبوت اور قلب رسول سے فوارے کی طرح اٹھ کر اسی کے دل پر نازل ہونے والی تعلیم ہے' اسی طرح نبوت انتخاب الٰہی سے عنایت کردہ کوئی منصب نہیں ہے بلکہ ایک فطری ملکہ ہے جس کا تعلق انسان کے اعضاء اور اس کے دل و دماغ سے ہے۔ یہ تو ہوا سر سید کا خاص مذہب۔ مگر آیئے دیکھیں کہ اللہ و رسول کیا کہتے ہیں؟ اور قرآن و سنت سے ثابت شدہ مذہب کیا ہے؟

اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (الحج ۷۵)

"اللہ چن لیتا ہے اور منتخب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے رسولوں کو اور انسانوں میں سے بھی چن لیتا ہے رسولوں کو۔"

یعنی اللہ فرشتوں میں سے بھی پیغام رسانی کے لئے خود منتخب کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے جیسے جبریل کو وحی پہنچانے کے لئے اس نے چن لیا ہے اور انسانوں میں سے بھی رسالت و نبوت کے لئے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے جیسے ہر دور کے لوگوں کی ہدایت' تعلیم و تربیت اور اصلاح کے لئے اس نے انسانوں میں سے انبیاء و رسل منتخب فرمائے تھے اور آخر میں محمد

رسول اللہ ﷺ کو رسالت اور ختم نبوت کے منصب کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اللہ چونکہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے اس لئے وہ جانتا ہے کہ رسالت اور نبوت کا مستحق کون ہے؟ جیساکہ سورۃ الانعام میں فرمایا ہے کہ :

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. (الانعام ۱۲٤)

''اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں رکھے اپنا پیغام۔''

ان آیات سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ نبوت ورسالت ایک امتحانی منصب ہے اور اللہ جس کو اس منصب کے لئے اہل اور مستحق سمجھتا ہے اسے یہ ذمہ داری سونپ دیتا ہے یہ کوئی کسبی یا فطری منصب نہیں ہے کہ خود محنت سے یا فطری ملکہ کی قوت اور کمال سے کسی کو مل جائے بلکہ یہ خالص عطائی اور وہبی منصب ہے' یہ تو ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نبی کا ظاہر اور باطن اور دل ودماغ نبوت ملنے سے پہلے بھی پاک وصاف ہوتے ہیں اور وہ شرک وکفر اور فواحش وسیئات سے معصوم ہوتا ہے لیکن نبی اسی وقت بنتا ہے جب اس پر وحی آجائے اور اللہ اسے نبوت کی ذمہ داری سونپ دے۔ باقی رہی وحی کی حقیقت تو اس کی بنیادی قسموں کا ذکر سورہ الشوریٰ میں اس طرح ہوا ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۝ (حٰمٓ الشوریٰ ۵۱)

''اور ممکن نہیں ہے کسی بشر کے لئے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بات کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی پیغام لانے والے کو بھیجے اور وہ وحی کرے اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے۔''

اس آیت میں وحی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کے دل میں کسی بات کو ڈال دیا جائے خواہ بیداری کی حالت میں ڈالی جائے یا خواب کی حالت میں ڈال دی جائے۔ دوسری پردے کے پیچھے سے براہ راست بات کرنا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور

پر بات کی گئی تھی یا محمد رسول اللہ ﷺ سے شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس اللہ تعالی نے براہ راست کلام کیا تھا۔ اور تیسری یہ کہ اللہ کے حکم سے پیغام لانے والا آکر پیغام پہنچائے خواہ انسانی شکل میں آئے یا اپنی اصلی شکل میں آئے اور قرآن و سنت کی نصوص میں تصریح موجود ہے کہ یہ پیغام لانے والا فرشتہ تھا جس کا نام جبریل تھا۔ ان تینوں صورتوں میں قلب رسول میں باہر سے وحی آنے کا ذکر ہوا ہے ملکہ نبوت سے وحی کا فوارہ نکلنے اور قلب رسول پر گرنے کی صورت کی طرف اس آیت میں اشارہ تک نہیں کیا گیا اور صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ :

كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَ هُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيَفْصِمُ عَنِّي وَ قَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَ أَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَأَعِي مَا يَقُولُ.(۱)

"آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے ؟ رسول اللہ نے فرمایا کہ کبھی تو میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ صورت مجھ پر سب سے زیادہ سخت اور شاق گزرتی تھی۔ مگر جب یہ آواز بند ہو جاتی تو میں نے سمجھ کر یاد کر لیا ہوتا جو کچھ کہ اللہ نے فرمایا ہوتا اور کبھی فرشتہ میرے سامنے مرد کی شکل میں آتا اور مجھ سے بات کرتا پس میں سمجھ لیتا اور یاد کر لیتا جو کچھ کہ اس نے کہا ہوتا۔"

گھنٹی کی آواز کی صورت آپ پر سخت اور شاق اس لئے گزرتی تھی کہ اس صورت میں چونکہ درمیان میں واسطہ نہیں ہوتا تھا اور پیغام وصول کرنے کے لئے آپ کو اپنے ماحول سے ذہنی طور پر کٹ کر آواز کی طرف متوجہ ہونا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جسم کی حرارت طبیعیہ میں شدت آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ شدید سردی کے موسم میں بھی جب آپ پر وحی آتی تو وحی کے ختم ہونے کے وقت آپ کی پیشانی سے پسینے

---

(۱) صحیح بخاری باب بدء الوحی

کے قطرے ٹپک رہے ہوتے۔ سر سید نے امام رازی کے حوالے سے اس صورت کا ذکر کر کے مذاق اڑایا ہے اور اسے ھفوہ قرار دیا ہے حالانکہ اس صورت کا ذکر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لیکن باوجود اس کے وہ اسے مفسرین کا قول قرار دے کر مذاق اڑاتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ آواز کلام الٰہی کی تھی یا فرشتے کی تھی تو دوسری متعدد احادیث کی بنیاد پر محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ وحی اور کلام الٰہی کی آواز تھی اور "صوت الٰہی" متشابہات میں سے ہے جس پر ایمان لانا تو ضروری ہے مگر اس کی کیفیت معلوم کرنا ضروری نہیں ہے۔

سر سید نے اصل سادس میں تسلیم کیا ہے کہ اللہ کی صفات کی ماہیت کا مِنْ حَیْثُ ھِیَ ھِیَ جاننا مافوق عقل انسانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ دونوں صورتوں میں وحی کے باہر سے اندر آنے کا ذکر ہوا ہے اندر ہی سے نکل کر دل پر اترنے کی جانب اشارہ تک قول رسول میں موجود نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کی انہی نصوص کی روشنی میں علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں وحی کا معنی مصدری یہ بیان کیا ہے کہ :

اِعْلَامُ الشَّرْعِ فِي خفاءٍ.

"شرعی احکام سے پوشیدہ طریقے پر باخبر کرنا اور اطلاع دینا۔"

اور معنی اسمی اس طرح بیان کیا ہے کہ :

هُوَ كَلَامُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلُ عَلٰى نَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَاءِهٖ.

"وحی اللہ کا وہ کلام ہے جو انبیاء میں سے کسی نبی پر اتارا جاتا ہے۔"

وحی اور نبوت کی یہ حقیقت قرآن و سنت کی واضح نصوص سے ثابت ہوتی ہے لیکن سر سید اس کو ھفوات قرار دے کر اپنا "خاص مذہب" یہ بیان کرتے ہیں کہ نبوت ایک فطری چیز ہے اور وحی ملکہ نبوت سے نکلتی ہے باہر سے نہیں آتی۔ سر سید نے یہ مذہب اور منہج کیوں اختیار کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اسلام اور قرآن کی تشریح فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں کرنے کا اصول اپنایا ہے اور فلسفہ جدیدہ میں جو چیز مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آتی ہو

انسے تسلیم کرنا جہالت سمجھی جاتی ہے۔ اسی بنا پر مغربی فلاسفہ فرشتوں کے وجود کو بھی نہیں مانتے اور اللہ کی جانب سے وحی کے نزول کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ذہین اور دانشور انسان تھے جو اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور اس نے جو باتیں کی تھیں وہ اس کے اپنے قلبی واردات تھے جسے وہ اچھے اور خوبصورت الفاظ میں پیش کرتے تھے۔ سر سید کا مقصد چونکہ اسلام اور قرآن کو فلسفہ جدیدہ کے ساتھ ہم آہنگ بنانا تھا اس لئے اس نے قرآن و سنت کی نصوص اور امت مسلمہ کے متفقہ عقیدے کو نظر انداز کر کے وحی اور نبوت کے بارے میں اپنا خاص مذہب اختیار کیا ہے۔

۵۔ قرآن مجید بالکل سچ ہے کوئی بات اس میں غلط یا خلاف واقع مندرج نہیں ہے۔

۶۔ اللہ کی جو صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں سب سچ اور درست ہیں مگر ان صفات کی ماہیت کا جاننا مافوق عقل انسانی ہے۔

۷۔ فلاسفہ کی یہ بات صحیح ہے کہ صفات باری عین ذات ہیں۔

قرآن و سنت کی نصوص اور صحابہ و تابعین کے اجماع سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات تمام صفات الوہیت سے متصف ہے' امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب التوحید میں اور دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں اللہ کی صفات کا اثبات کیا ہے اور قرآن میں بھی اللہ کے علم' قدرت' سمع و بصر' خالقیت' مالکیت' ربوبیت' رازقیت اور دوسری صفات کا ذکر بار بار ہوا ہے باقی رہی یہ بات کہ صفات باری عین ذات ہیں یا نہ عین ہیں اور نہ غیر تو یہ بحث نہ رسول اللہ ﷺ نے کی ہے اور نہ صحابہ و تابعین نے اس کو موضوع بحث بنایا ہے البتہ صفات الٰہی کی نفی معتزلہ کا مذہب ہے جو انہوں نے فلاسفہ کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ سر سید نے صفات کو عین ذات تسلیم کر کے فلاسفہ اور معتزلہ کا مسلک اختیار کیا ہے جو قرآن و سنت کی نصوص اور جماعت صحابہ کے اجماع کے خلاف ہے۔

۸۔ جس طرح کہ اللہ کے وعدوں میں تخلف محال ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے وعدے پورے نہ کرے اور ان کے خلاف کوئی کام کرے اسی طرح قانون فطرت (نیچر لزم) سے تخلف بھی محال ہے اور یہ ناممکن ہے کہ مافوق الفطرت (سپر نیچر لزم) اور مافوق الاسباب کوئی کام ہو جائے اس لئے کہ قانون فطرت اللہ کا عملی وعدہ ہے تو جس طرح قولی وعدہ کی خلاف کوئی کام کرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح عملی وعدہ یعنی قانون فطرت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

۹۔ قرآن مجید میں قانون فطرت کے خلاف کوئی چیز موجود نہیں ہے اور جہاں تک معجزات کا تعلق ہے تو قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی معجزے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں اور میں صرف بشیر و نذیر ہوں اور قرآن میں جہاں بھی "آیات" یا "بینات" کے الفاظ آئے ہیں ان سے معجزات مراد نہیں ہیں بلکہ احکام مراد ہیں۔

سر سید کے منہج تفسیر کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کے مطابق قرآن مجید کی جن آیات میں معجزات اور خوارق العادات کا ذکر ہوا ہے ان کی تکلفی اور من گھڑت تاویلات کر کے ان کو قوانین فطرت کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ نے کائنات کی تمام چیزوں کو الگ الگ طبیعت' فطرت اور خاصیت عطا فرمائی ہے جس کو نیچر کہتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی فطری اور پیدائشی خاصیات کو بدلنے کا ارادہ نہ کرے تو یہ بدل نہیں سکتیں بلکہ ہر چیز پر عادتاً اس کی فطرت اور نیچر کے مطابق اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ آگ جلاتی ہے اور پانی ہر ثقیل چیز کو ڈبوتا ہے عادت جاریہ اور قانون فطرت کے تحت یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ جلانا چھوڑ دے اور گہرا پانی کسی مادی اور ثقیل چیز کو ڈبونا چھوڑ دے۔ اسی طرح پورے عالم کا نظم قوانین فطرت پر چل رہا ہے یعنی عالم اسباب کی فطرت اور خاصیت یہی ہے کہ اسباب پر ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور اسباب کے بغیر

ان کے نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے لیکن جس طرح یہ عالم اور اس کی اشیاء خود بخود وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور کائنات کا نظم بھی خود بخود وجود میں نہیں آیا بلکہ اسے اللہ نے بنایا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اسی طرح اشیاء کی فطرت اور نیچر بھی اللہ ہی کی پیدا کردہ اور عطا کردہ ہے اور مجموعی طور پر پورا عالم جن قوانین فطرت اور قواعد طبیعیہ پر بنایا گیا ہے اور چلایا جا رہا ہے ان کا بنانے والا بھی اللہ ہے اس لئے اشیاء عالم کی فطرت بھی اللہ کے حکم تکوینی اور ارادے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی اور پورے عالم کے قوانین فطرت بھی اس کے حکم کے بغیر اپنے اثرات اور نتائج نہیں دکھا سکتے بلکہ ہر چیز اللہ کے حکم اور ارادے کی تابع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ٥ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ٥ (النحل ۴۸، ۴۹)

"کیا انہوں نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا جن کو اللہ نے پیدا کیا ہے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جھکتے ہیں اللہ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے اور یہ سب چیزیں اللہ کے سامنے عاجزی کرتی ہیں اور اللہ کے لئے سجدہ کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں۔"

ظاہر ہے کہ سایہ دار اشیاء اور زمین و آسمان کی سب چیزوں کا سجدہ انس و جن کی طرح کا سجدہ تو نہیں ہے اس لئے کہ یہ چیزیں اختیار و ارادہ نہیں رکھتیں اور شرعی احکام اور انسانوں کی طرح کے رکوع و سجود کی مکلف بھی نہیں ہیں بلکہ ان کے سجدے سے اللہ کے تکوینی احکام کی متابعت کرنا اور تکوینی طور پر ان کو تسلیم کرنا مراد ہے۔ آگ کا جلانا اور گہرے پانی کا ڈبونا اللہ کے حکم کی متابعت کی وجہ سے ہے جب اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے جسم کو مت جلاؤ تو آگ اس حکم کی تعمیل میں برداً و سلاماً ہو گئی اور جب دریا کو حکم دیا گیا کہ موسیٰ

علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو مت ڈبو نا تو دریا ٹھہر گیا اور بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں چل کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور فرعون جب اپنے لشکر کے ساتھ آیا تو اللہ نے دریا کو حکم دیا کہ ان کو ڈبو دو تو وہ سب کے سب ڈوب گئے۔ معلوم ہوا کہ کائنات کی اشیاء اور ان کی فطرت اللہ کے احکام کی تابع ہے اور جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو فطرت بے اثر ہو جاتی ہے اور معجزات و خوارق عادات ظاہر ہو جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسباب اور اشیاء کی فطرت و طبیعت کی تاثیر اللہ کے حکم کے تابع ہے اور اسی کے سامنے سجدہ ریز اور منقاد ہے فطرت اور نیچر کو اللہ کے قولی وعدے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اللہ نے اعلان کر دیا ہے کہ میں وعدہ خلافی نہیں کرتا اور وعدہ خلافی کی کوئی مثال موجود بھی نہیں ہے لیکن اس نے یہ اعلان نہیں کیا کہ میں قانون فطرت اور نیچر کی خلاف کوئی کام نہیں کرتا بلکہ نیچر اور اسباب کے خلاف بہت سے کام کئے بھی ہیں جن کو معجزات اور کرامات کہا جاتا ہے اور قرآن و سنت میں خرق عادت کے طور پر مافوق الاسباب اور ماورائے نیچر کاموں کی بہت سی مثالیں مذکور ہیں۔ باقی رہیں وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری طرح کے بشر ہیں اور معجزات پیش نہیں کر سکتے تو ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اختیار سے اور اپنی طاقت سے اشیاء کی فطرت اور نیچر کو تبدیل کر کے کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتے۔ معجزہ نبی کے اختیار میں تو نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے معجزہ پیش کر دے بلکہ معجزہ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے اور وہ جب چاہتا ہے نبی کے ہاتھ پر معجزہ پیش کر دیتا ہے۔

سرسید نے اپنے اصل ثامن اور اصل تاسع کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کی وہ آیات پیش کی ہیں جن میں اہل ایمان کے لئے جنت کے وعدے کا ذکر ہوا ہے اور کفار و منافقین کے لئے دوزخ کی وعید کا ذکر ہوا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح اس وعدو وعید کا عدم ایفا ممکن نہیں ہے اسی طرح قانون فطرت کے خلاف بھی کچھ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قانون فطرت عملی

وعدہ ہے لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے اس لئے کہ وعدہ پورا نہ کرنے کی کوئی مثال موجود نہیں ہے اور قانون فطرت کے خلاف معجزات و کرامات کی متعدد مثالیں قرآن و سنت میں بیان کی گئی ہیں۔ اور دوسرے نمبر پر وہ آیات پیش کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ آگ جلاتی ہے' پانی بھاری چیز کو ڈبوتا ہے' زوجین کے نطفے سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور نظام شمسی سے رات اور دن آتے جاتے ہیں لیکن ان میں یہ بات اشاروں میں بھی نہیں کہی گئی کہ قانون فطرت اور نظام شمسی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان آیات سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں جلانے' پانی میں ڈبونے' نطفے میں بچہ بنانے کی صلاحیت اور فطرت موجود ہے جو اللہ نے دی ہے اور وہ جب چاہے اس کو ختم کر سکتا ہے اور تیسرے نمبر پر ان آیات کا حوالہ دیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہو سکتی اور سنت اللہ سے مراد قانون فطرت لیا گیا ہے۔ حالانکہ ان آیات کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت اللہ سے مراد یہ ہے کہ کفار و مشرکین کو سزا دینے کی سنت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ فطرت اور نیچر کے تبدیل نہ ہونے کا ذکر ان آیات میں نہیں ہوا لیکن اگر سر سید سیاق و سباق سے آنکھیں بند کر کے سنت اللہ سے اشیاء کی فطرت اور نیچر مراد لیتا ہے تو پھر بھی اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ فطرت کو دوسرا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا یا تبدیل کرتا نہیں ہے اس لئے کہ فطرت اور نیچر کو تبدیل کرنے کی مثالیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیاق و سباق کی روشنی میں ان آیات کا مفہوم بیان کر دیا جائے تاکہ نیچریوں کے استدلال کا بطلان واضح ہو جائے۔ سنت اللہ کے تبدیل نہ ہونے کا ذکر قرآن کی درج ذیل چار آیات میں ہوا ہے۔

۱۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ (الاسراء ۷۷)

"اور تو ہماری سنت میں ردوبدل نہیں پائے گا۔"

اس آیت سے متصل قبل کہا گیا ہے کہ کفار آپ کو مکہ سے نکال رہے ہیں لیکن آپ کو

نکالنے کے بعد یہ لوگ بھی اس جگہ ٹھہر نہیں سکیں گے مگر تھوڑی مدت اللہ کی یہی سنت رہی ہے۔ ان رسولوں کے بارے میں جو تم سے پہلے ہم نے بھیجے تھے کہ جب ان کی قوموں نے انہیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کیا تو پھر وہ قومیں بھی اللہ کے عذاب سے محفوظ نہ رہیں اور تم ہماری سنت میں کبھی بھی ردوبدل نہ پاؤ گے۔ چنانچہ اہل مکہ کے ساتھ بھی اسی سنت اللہ کے مطابق معاملہ ہوا کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد بدر کے میدان میں وہ ذلت و شکست سے دوچار ہوئے اور آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا۔

اس سیاق میں سنت سے اشیاء کا نیچر مراد لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس جگہ یہی مفہوم متعین ہے کہ اللہ کی سنت اور عادت یہ ہے کہ انبیاء کی ہجرت کے بعد ان کی قومیں عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔

۲۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب ۶۲)

اس آیت سے قبل منافقین مدینہ کو تباہی و بربادی کی وعید سنانے کے بعد کہا گیا ہے کہ اللہ کی یہی سنت پہلے سے چلی آرہی ہے اور تو ہماری اس سنت میں ہرگز تبدیلی نہیں پائے گا۔ اس جگہ بھی سنت سے فطرت مراد لینے کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

۳۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝ (فاطر ۴۳)

اس آیت سے پہلے کفار مکہ کا ذکر ہوا ہے کہ وہ قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر ان کے پاس رسول آیا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور باقی امتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے مگر جب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو یہ استکبار اور سرکشی کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے تو کیا یہ اللہ کی اسی سنت کا انتظار کر رہے ہیں جو پہلی قوموں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ (یعنی تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا معاملہ) پس تو اللہ کے اس دستور کو ہرگز بدلا ہوا نہ پائیں گے اور تم اللہ کی سنت کو ہرگز ٹلتا ہوا بھی نہ پائیں گے۔ اس سیاق و سباق میں بھی سنت اللہ سے مستکبرین کو سزا دینے کا دستور الٰہی

مراد ہے۔ فطرت اور نیچر مراد لینے کی یہاں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔

٤۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِنَا تَبْدِيلًا. (الفتح ۲۳)

اس آیت سے پہلے حدیبیہ میں متوقع جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ کفار جنگ کا راستہ اختیار کرتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور اپنے لئے کوئی مددگار اور دوست نہ پاتے اللہ کا یہی دستور ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے اور تو اللہ کے اس دستور کو ہرگز بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔ اس مقام پر بھی نیچر اور قانون فطرت مراد لینے کی کوئی مناسبت نہیں ہے بلکہ انبیاء کے مقابلے میں آنے والے لوگوں کی ذلت ورسوائی کی سنت اللہ ہی مراد ہے۔

ان آیات کا سیاق میں نے اس لئے ذکر کیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ ان آیات مین سنت سے قانون فطرت مراد لینا صرف تکلف اور سینہ زوری ہے لیکن اگر نیچر کے پجاری سینہ زوری کر کے قانون فطرت مراد لینے پر تلے ہوئے ہیں تو پھر بھی ان کی نیچریت ثابت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ تبدیل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی بھی زور آور اور غالب موجود نہیں ہے جو اللہ کی سنت کو تبدیل کر دے جیسا کہ ابن عطیہ غرناطیؒ نے اپنی تفسیر المحرر الوجیز میں لکھا ہے کہ :

مِنْ غَالِبٍ يَسْتَقِرُّ تَبْدِيْلُه.

"یعنی ایسا کوئی غالب موجود نہیں ہے جو اللہ کی سنت کو تبدیل کر سکے اور اس کی تبدیلی برقرار رہ سکے۔"

باقی رہی سید صاحب کی یہ بات کہ قانون فطرت کے برخلاف قرآن میں کوئی چیز موجود نہیں ہے تو یہ بات حقائق اور واقعات کی خلاف صرف ایک دعویٰ ہے اس لئے کہ قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کا آگ سے سلامتی کے ساتھ نکلنے کا ذکر ہوا ہے' موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا اور سانپ کا پھر لاٹھی کی شکل اختیار کر لینا مذکور ہے' موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کی ضرب سے دریا کے ٹھہر جانے اور پتھر سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ

پڑنے کا ذکر ہوا ہے اور یہ سارے واقعات قانون فطرت کے بر خلاف رونما ہوئے تھے۔ اگر چہ سید صاحب نے قرآن مجید کو فلسفہ جدیدہ کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے قرآن میں مذکور معجزات کو سینہ زوری کر کے اور الفاظ کے حقیقی معانی کو تبدیل کر کے قانون فطرت اور نیچر لزم کے مطابق بنانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن اس قسم کی تحریفات سے حقائق تو بدل نہیں سکتے۔

۱۰۔ قرآن مجید بتمامہ موجود ہے اور اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

۱۱۔ ہر ایک سورۃ کی آیات کی ترتیب منصوص ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ہے۔

۱۲۔ قرآن مجید میں ناسخ منسوخ نہیں ہے یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسرے آیت سے منسوخ نہیں ہوئی

ہم نے نسخ کے باب میں اہل سنت والجماعۃ کا مسلک تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور سر سید صاحب کے نقطہ نظر پر بھی وہاں پر تبصرہ کیا ہے۔

۱۳۔ قرآن مجید دفعۃ واحدۃ نازل نہیں ہوا بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے' وقتاً فوقتاً واقعات کے پیش آنے سے روح القدس یعنی ملکہ نبوت کو انبعاث ہوا اور اس کے سبب سے وحی نازل ہوئی..... قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا وقتاً فوقتاً واقعات کے پیش آنے پر ملکہ نبوت کا انبعاث اور وحی کا نازل ہونا ایک طبعی امر ہے۔ انسان کے دماغ میں متعدد قسم کے علوم وفنون کا ملکہ موجود ہوتا ہے مگر بغیر محرک کے وہ ملکہ تحرک میں نہیں آتا۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ قرآن دفعۃ واحدۃ نازل نہیں ہوا بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے لیکن یہ اللہ کی جانب سے بذریعہ جبریل نازل ہوا ہے جیسا کہ گذشتہ سطور میں قرآن وسنت کی صریح نصوص سے ثابت کیا گیا ہے مگر سید صاحب اپنے اس اصول نمبر ۱۳ میں کہتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً واقعات کے پیش آنے پر ملکہ نبوت کا انبعاث ہوا یعنی اس میں تحرک پیدا ہوا اور وحی

کا نزول ہے، تارہا جس طرح انسان کے دماغ میں مختلف علوم وفنون کا ملکہ اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کہ کوئی محرک پیش آجائے اسی طرح ملکہ نبوت بھی اسی وقت حرکت میں آتا ہے جب کوئی واقعہ پیش آجائے۔ یہ بات وحی اور نبوت کو فلسفہ جدیدہ کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے سرسید کی وہی جدت وبدعت ہے جس پر تفصیل تبصرہ نمبر ۴ میں قلمبند کر دیا گیا ہے۔ مزید افسوس اور حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اس جدت وضلالت کی تائید میں شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر کی عبارت پیش کی گئی ہے حالانکہ شاہ صاحب نے وہی بات کی ہے جو مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ اس عبارت میں نہ ملکہ نبوت کا ذکر ہے اور نہ واقعات پیش آنے پر اس کے تحرک اور انبعاث کا ذکر ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ :

منك علی الاطلاق بر پیغمبر خود برائے ہدایت بندگان بحسب اقتضائے حال سورۃ بعد سورۃ نازل فرمود۔

۱۴۔ موجودات عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ سب مطابق واقع ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا قول اس کی مصنوعات کی مخالف ہو یا مصنوعات اس کے قول کی مخالف ہوں۔

یہ ایک مسلمہ اور متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سچ ہے اور مطابق واقع ہے لیکن قرآن مجید میں مافوق الاسباب اور ماورائے فطرت جن خوارق العادات اور معجزات کا ذکر ہوا ہے وہ بھی سچ ہیں اور مطابق واقع ہیں مگر سید صاحب ان کو مطابق واقع تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ قانون فطرت کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

۱۵۔ قرآن مجید عربی میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کے وہی معنے لئے جائیں گے جو فصیح عربی زبان میں لئے جاتے ہیں لیکن جس طرح کہ انسان استعارہ و مجاز کنایہ و تشبیہ و تمثیل کو کام میں لاتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں بھی استعارہ و مجاز اور کنایہ و تشبیہ و تمثیل سب موجود ہیں...... یہ بات دیکھنی لازم ہے کہ لفظ کے جو معنے قرار دیئے گئے ہوں اس پر کوئی عقلی معارضہ بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ معنے صحیح نہ ہوں گے مثلاً خدا کے عرش پر استوا ہونے میں اور اس کے ہاتھ اور منہ اور ساق ہونے میں اور مثل اس کے اور بہت سے لفظوں کے اصلی معنے اس لئے نہیں لئے گئے کہ دلیل عقلی ان کے بر خلاف تھی پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اور الفاظ کے معنے جو دلیل عقلی سے محال ہیں یا خود اس قانون فطرت کے مخالف ہیں جو خود خدا نے بیان کیا یا تجربہ کے مخالف ہیں چھوڑ کر دوسرے معنے نہ لئے جائیں۔

استعارہ اور مجاز یا تمثیل و تشبیہ پر الفاظ اسی وقت محمول کئے جاتے ہیں جب کہ ان کے حقیقی کثیر الاستعمال اور متبادر معنے مراد لینا ممکن نہ ہوں اور مجازی معنی لینے کے لئے یا تمثیل پر محمول کرنے کے لئے سیاق کلام اور فحوائے کلام میں کوئی قرینہ اور دلیل موجود ہو یا احادیث رسول میں دوسرے معنے بیان کئے گئے ہوں ورنہ قرآنی الفاظ و کلمات کے وہی معنے لئے جائیں گے جو فصیح عربی میں مراد لئے جاتے ہیں لیکن سید صاحب نے تو اپنی تفسیر میں عربی محاورات' سیاق و سباق اور احادیث رسول سب کو پس پشت ڈال کر قرآنی الفاظ کے خود ساختہ معانی لئے ہیں اور قرآنی قصوں کو تمثیلات پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ عنوان کے تحت اس کی چند مثالیں پیش کی جائیں گی۔ باقی رہی عقلی معارضہ کی بات تو قرآن کی کوئی بات بھی عقل سلیم کے خلاف نہیں ہے لیکن قرآن و سنت یعنی اللہ و رسول کی بعض باتوں کو سمجھنے سے عقل انسانی قاصر اور عاجز ہوتی ہے اور ایمان کا تقاضی یہ ہے کہ ایسی باتوں کو بھی مان لیا جائے مثلاً برزخ کا ثواب و عذاب' وزن اعمال' دیدار الٰہی اور موت کے بعد پیش آنے والے دوسرے

واقعات اور حالات عقلاً محال اور ناممکن نہیں ہیں لیکن چونکہ یہ امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے عقل انسانی ان کا ادراک نہیں کر سکتی اور عدم ادراک کی وجہ سے ان کو عقلاً محال یا خلاف عقل نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کو "غیر مدرک بالعقل" کہا جاتا ہے۔ باقی رہی استوء علی العرش 'ید' وجہ اور ساق تو یہ اللہ کی صفات ہیں اور جس طرح منصوص ہیں اسی طرح بغیر تشبیہ کے ان پر ایمان لانا ضروری ہے جیسا کہ سید صاحب نے اصل سادس میں خود کہا ہے کہ "صفات باری کی ماہیت کا جاننا مافوق عقل انسانی ہے۔"

جہاں تک قانون فطرت اور تجربہ سے مخالف ہونے کا تعلق ہے تو اس مخالفت کی وجہ سے الفاظ کے حقیقی اور احادیث رسول سے ثابت شدہ معانی کو چھوڑ کر ایسے معانی تلاش کرنا جو قانون فطرت اور تجربہ کے مطابق ہوں اہل جدت کا طریقہ ہے اہل سنت کا طریقہ نہیں ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں ایسی چیزوں اور ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے جو قانون فطرت اور انسانی تجربے سے مخالف ہیں مگر اللہ کے حکم سے وہ وجود میں آئے تھے۔

سر سید صاحب چونکہ اہل جدت کے امام ہیں اور اہل جدت کا مأخذ تفسیر فلسفہ جدیدہ ہے اور اس فلسفے کا اصول یہ ہے کہ جو چیز قانون فطرت اور تجربہ و مشاہدہ کے خلاف ہو اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا مگر یہ اصول قرآن و سنت کی رو سے باطل ہے۔

یہ وہ پندرہ امور ہیں جن کو سر سید نے اُصول تفسیر کا نام دیا ہے مگر اصل میں یہ ان کے نظریات ہیں جن کو تفسیر کے اول میں ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ تفسیر ان نظریات پر مبنی ہے۔ ان اصول میں تفسیر القرآن بالقرآن' تفسیر القرآن بسنۃ الرسول و آثار الصحابہ والتابعین کا تو ذکر ہی نہیں کیا گیا اور لغۃ عربی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ الفاظ کے جو معانی عقل کے خلاف ہوں یا قانون فطرت اور تجربہ کے خلاف ہوں تو وہ صحیح نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کو مجاز یا تمثیل پر محمول کیا جائے گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تجدد فی الدین کے اس امام کی تفسیر کا مأخذ فلسفہ جدیدہ اور فنون جدیدہ ہیں۔

سر سید کے منہج تفسیر کی چند مثالیں

گذشتہ تین عنوانات کے تحت اہل جدت کے منہج تفسیر اور ان کے اصول کا ذکر ہوا ہے مگر کسی بھی منہج اور اصول کی پوری وضاحت اس کی مثالوں سے ہوتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بر صغیر ہند میں اہل جدت کے امام یعنی سر سید کی تفسیر سے چند مثالیں پیش کر دی جائیں تاکہ اس کے منہج اور طرز تفسیر کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور قارئین کے سامنے اہل سنت اور اہل جدت کے درمیان فرق و امتیاز اچھی طرح واضح ہو جائے۔ ہماری اس کتاب کے صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس کی تحریفات کو بتمامہا نقل کیا جائے اس لئے چند مثالیں بطور نمونہ ذکر کی جائیں گی جن سے اس کی باقی تحریفات و تجددات کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکے گا۔ مثالوں میں سید صاحب کی عبارات کا حاصل مفہوم پیش کیا گیا ہے اور مفہوم کے اخذ کرنے میں کوئی خیانت نہیں کی گئی بلکہ ہر بحث کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھنے کے بعد امانت و دیانت کے ساتھ خلاصہ مفہوم اور سید صاحب کی اصل فکر کو واضح کیا گیا ہے۔

(۱) قصہ آدم و ابلیس کو فرضی قصہ قرار دینا

سر سید صاحب نے آدم علیہ السلام اور ابلیس علیہ اللعن کا قصہ اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۳۲ سے ۱۳۸ تک پورے سات صفحات پر بیان کیا ہے جس کا چند الفاظ میں حاصل مفہوم یہ ہے کہ یہ کوئی حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت اور اس کی قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی یعنی خیر اور شر کی فطری قوتوں کے درمیان کشمکش اور مخاصمت کا بیان ایک دلچسپ قصے کے پیرائے میں کیا گیا ہے جس طرح افسانہ نویس اور ڈرامہ نویس ایک فرضی اور خیالی قصہ بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھتے ہیں جس میں مختلف نام اور کردار ہوتے ہیں لیکن سب کچھ فرضی اور

خیالی ہوتا ہے' سی طرح آدم و ابلیس کا سارا قصہ ایک تمثیل ہے۔ آدم سے مراد کوئی شخص اور فرد نہیں ہے بلکہ نوع انسانی مراد ہے' فرشتوں سے مراد انسان کی قوائے ملکوتی ہیں اور ابلیس یا شیطان سے مراد قوائے بہیمی ہیں' ملائکہ کے سجدہ کرنے میں اشارہ ہے قوائے ملکوتی کی اطاعت پذیری کی جانب اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے میں قوائے بہیمی کی سرکشی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن میں ابلیس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ میں انسان کو چاروں طرف سے گھیر کر صراط مستقیم سے بھکاؤں گا تو سرسید کے نزدیک اس سے قوائے بہیمی کا انسان کو چاروں طرف سے گھیرنا مراد ہے اس لئے کہ ابلیس اور شیطان کے شخصی طور پر وجود سے سید صاحب منکر ہیں۔ آدم کے جنت میں رہنے اور پھر اس سے نکلنے میں انسان کی قبل البلوغ زندگی اور بعد البلوغ زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ حقیقی معنوں میں جنت میں رہنا اور نکلنا مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے۔ انسان کی زندگی کا پہلا حصہ چونکہ قیود سے آزاد ہوتا ہے اور اس دور میں انسان غیر مکلف ہوتا ہے اس لئے اس کو بطور تمثیل جنت کہا گیا ہے اس لئے کہ جنت میں بھی آزادی ہوتی ہے اور رشد و بلوغ اور عقل و تمیز کی عمر کو پہنچنے کے بعد انسان چونکہ مکلف ہوتا ہے اور اپنے افعال و اقوال اور حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور بلوغ سے پہلے کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اس لئے تمثیل کے طور پر اس کو جنت سے نکلنا کہا گیا ہے۔ انسان نہ جنت میں داخل ہوا تھا اور نہ اس سے نکالا گیا تھا بلکہ اسی زمین پر رہتا تھا اور تمثیل و استعارے کے طور پر بلوغ سے قبل کی آزاد زندگی کو جنت کہا گیا ہے اور رشد و بلوغ کے بعد زندگی کو جنت سے نکالنا کہا گیا ہے۔ درخت کا پھل کھانے سے سن رشد و تمیز کو پہنچنا مراد ہے اور درخت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے رشد و بلوغ کے بعد اپنی برائیوں اور بدیوں پر شرمانا اور ان کو لوگوں سے چھپانا مراد ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ انسانی فطرت کے راز کو عام لوگ سمجھنے کے قابل نہ تھے اس لئے خدا نے اس راز کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ میں تو یوں سمجھا ہوں کہ اس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا

بنایا ہے اس کے راز کو بھانمت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے۔

یعنی آدم و ابلیس کا قصہ نعوذ باللہ بھانمتی کا ایک تماشا ہے اور اس میں بھانمت کی تمثیلاتی اور استعاراتی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔

مجددین کے اس امام کی جدت وبدعت اور ضلالت و غوایت کو سمجھنے کے لئے اور اس کی تفسیر کے منہج کو جاننے کے لئے یہی ایک مثال کافی ہے۔ اس لئے کہ قرآن و سنت کی صریح اور قطعی نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم کسی نوع انسانی کا نام نہیں ہے بلکہ انسان اول اور ابوالبشر کا نام ہے اور حواء اسی کے جنس سے پیدا کردہ اس کی بیوی تھی' فرشتے نور سے پیدا شدہ اور انس و جن سے الگ مستقل مخلوق ہیں' ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور مستقل شخصی وجود رکھتا ہے' جنت سے مراد آسمانی جنت ہے جس میں آدم و حواء دونوں کافی مدت تک رہائش پذیر رہے تھے لیکن جب انہوں نے ابلیس کے بھکانے کی وجہ سے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھایا تو ان کو زمین پر اتار لیا گیا اور اس جوڑے سے زمین پر نسل انسانی پیدا ہوئی اور وقت موعود تک پیدا ہوتی رہے گی' فرشتوں کے سجدے سے حقیقی معنوں میں آدم کے سامنے جھکنا اور عاجزی کرنا مراد ہے اور ابلیس کے انکار سے حقیقی معنوں میں اس لعین کا استکبار اور سرکشی مراد ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو ہمارے مفسرین اور علماء اسلام نے اپنی عقل و رائے سے گھڑ کر نہیں لکھیں بلکہ قرآنی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں لیکن سرسید چونکہ قرآن کی تفسیر اور اسلام کی تشریح فلسفہ جدیدہ کے مطابق کرتے ہیں اور جدید فلسفہ نہ آدم کے شخصی وجود کو مانتا ہے' نہ فرشتوں کو مانتا ہے' نہ جنات اور ابلیس کو مانتا ہے اور نہ جنت و دوزخ کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ یہ چیزیں تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آتیں اس لئے سید صاحب اس حقیقی قصے کو ایک فرضی اور افسانوی تمثیل قرار دیتے ہیں اور اسے بھانمتی کا ایک تماشا سمجھتے ہیں تاکہ قرآن اور جدید فلسفے کے درمیان مطابقت پیدا ہو جائے۔ سید صاحب کی یہ

خیالی اور افسانوی باتیں قرآن کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ کھلی تحریف ہیں۔ اعاذنا اللہ منہ

(۲) ﴿اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ کی تاویلِ فاسد

قرآن کریم میں موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے ایک معجزہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل اپنی صحرانوردی کے زمانے میں ایسے مقام پر پہنچے جہاں پر پانی نایاب تھا۔ پیاس سے تنگ آکر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ ہم کو پانی سے سیراب فرما دیجیے۔ اللہ نے وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو، انہوں نے جب لاٹھی ماری تو پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ کر بہنے لگے۔ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ تھے اس لئے ہر قبیلے نے اپنے لئے ایک چشمہ متعین کر لیا۔ سورۃ بقرہ میں اس معجزے کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ (البقرہ ۶۰)

"اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ کر بہنے لگے' ہر گروہ نے اپنا چشمہ معلوم کر لیا۔"

سورہ اعراف میں اس معجزے کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

"اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی جب کہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے' ہر گروہ نے اپنے پانی کی جگہ معلوم کر لی تھی۔"

اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ کے حقیقی اور متبادر معنے یہی ہیں کہ "اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔"

یہی صحابہ و تابعین کی متفقہ تفسیر ہے اور اہل سنت کے اصول تفسیر کے مطابق تفسیر کرنے والے تمام مفسرین نے بھی یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ فَانْفَجَرَتْ اور فَانْبَجَسَتْ کی فا فصیحیہ ہے یعنی فَلَمَّا ضَرَبَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ، فَانْبَجَسَتْ جب اس نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پتھر سے پانی کے چشمے لاٹھی مارنے کے بعد پھوٹ کر بہنے لگے تھے پہلے سے موجود نہیں تھے۔

عربی مبین کے ان الفاظ کے کچھ اور معنے لینا صرف سخن سازی اور سینہ زوری ہے لیکن سرسید اور نیچر کے دوسرے پجاری چونکہ معجزات کو نہیں مانتے اور مافوق الفطرت و ماورائے طبیعت یعنی ہر نیچرل چیزوں کے وجود کو محال و ناممکن سمجھتے ہیں اس لئے نیچریوں کے اس امام نے اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"اپنی لاٹھی کے سہارے اس پہاڑی پر چڑھ چل اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو تورات میں ایلم لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑوں یا چٹانوں کی درازوں میں سے جاری ہوتے ہیں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔"(۱)

عربی زبان میں لفظ ضرب اکثر مارنے کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے لیکن قرائن کی مناسبت سے یہ لفظ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جن میں سے ایک معنی چلنا اور سفر کرنا بھی ہے مگر یہ معنے اسی وقت مراد لئے جاتے ہیں جب کہ اس کے بعد حرف فی آیا ہو مثلاً ضَرَبْتُ فِي الْأَرْضِ أَبْتَغِي الْخَيْرَ مِنَ الرِّزْقِ میں رزق کی تلاش میں زمین میں چل پڑا تھا یعنی تجارتی سفر کیا تھا۔ قرآن کریم کے چھ (۶) مقامات پر یہ لفظ فی کے حرف کے ساتھ چلنے

---

(۱) تفسیر القرآن از سرسید احمد خان ص۱۷۸، ۱۷۹

کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ چھ مقاما حسب ذیل ہیں۔

١ . یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا. (النساء ٩٤)

"اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں چلو اور سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔"

٢ . وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ

(النساء ١٠١)

"اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ نماز میں قصر کرو۔"

٣ . اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ. (المائدہ ١٠٦)

"اگر تم نے زمین میں سفر کیا ہو اور آجائے تم پر موت تو تم غیر مسلموں کو بھی وصی بنا سکتے ہو۔"

٤ . اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ کَانُوْا غُزًّا لَوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا.

(آل عمران ١٥٦)

"جب انہوں نے زمین میں سفر کیا یا وہ غازی تھے اور مر گئے تو منافقین کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔"

٥ . لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِي سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ.

(البقرہ ٢٧٣)

"صدقات ان فقیروں کو دیا کرو جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں اور زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

٦ . وَ آخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ. (المزمل ٢٠)

"اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کے فضل یعنی رزق کی تلاش میں زمین میں سفر کرتے ہیں۔"

ان آیات میں ضَرَبْتُمْ' ضَرَبُوْا' ضَرْبًا اور یَضْرِبُوْنَ کے بعد حرف فی آیا ہے اور

قرآن کی دوسری کسی آیت میں بھی فی کے بغیر یہ لفظ چلنے کے معنوں میں نہیں آیا۔ لغت کی کتابوں میں لسان العرب مستند اور مفصل کتاب ہے۔ اس کتاب میں ضرب کے مادہ کے معانی آٹھ صفحات پر بیان کئے گئے ہیں۔ میں نے یہ تمام بحث توجہ کے ساتھ پڑھی ہے اس میں کلام عرب میں سے کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے جس میں فی کے بغیر ضرب کا لفظ چلنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہو۔(۱)

یہ صاحب کو چونکہ معلوم تھا کہ فی کے بغیر اِضْرِبْ کے معنے چلو نہیں بن سکتے اور اپنے خود ساختہ معنی کو چھوڑنے کے لئے وہ آمادہ بھی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اس نے دعوئ کر لیا کہ یہاں پر حرف فی مقدر ہے۔ یعنی اصل میں اِضْرِبْ بِعَصَاكَ فِي الْحَجَرِ ہے لیکن دعوے سے تو کچھ نہیں بنتا جب تک مقدر ہونے پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ قرینے اور دلیل کے بغیر قرآن میں مقدر الفاظ تلاش کرنا تو ایک غیر معقول طرز تفسیر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فَانْفَجَرَتْ اور فَانْبَجَسَتْ کی فا سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چشمے لاٹھی مارنے پر پھوٹ نکلے تھے اور سید صاحب کہتے ہیں کہ ایلم کے مقام پر یہ چشمے پہلے سے موجود تھے اس پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎ بریں عقل و دانش بباید گریست

ہمیں تو قرآن کریم کی تصریحات کی بنا پر یقین ہے کہ پتھر سے بارہ چشمے نکلے تھے لیکن مولانا عبد الماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ اس معجزے کی تصدیق مسیحی محققین نے بھی کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تفسیر ماجدی میں لکھتے ہیں :

"جارج سیل انگریزی میں قرآن کریم کا قدیم مترجم ہے آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے :

"ایک مسیحی سیاح وہاں ہو آیا ہے بتصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا۔" اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ "چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں جو بآسانی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ۱۲ ایک طرف ہیں اور ۱۲ ان کے

---

(۱) لسان العرب ص ۵۴۳ تا ۵۵۱ ج ۱

مقابل "پادری ڈین اسٹینلی نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ممتاز رکن ہوئے ہیں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بنفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر مستقل تصنیف شائع کی اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے' شگاف اور دراز جابجا پڑے ہوئے ہیں کچھ مٹے ہوئے ہیں' کچھ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے' گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو ۲۰ ہوتے ہیں اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہی شگافوں کی طرف ہے۔"(۱)

عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جایئے صدیاں گزر جانے پر اس کے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق ہو رہی ہے۔ منکرین اور معاندین کی زبان سے۔(۲)

(۳) ﴿اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ کی تاویل فاسد﴾

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تسعہ میں سے دوسرا معجزہ یہ تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کی تعمیل میں بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کے لئے روانہ ہوئے اور بحیرہ قلزم کے ساحل پر پہنچے تو پیچھے سے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کرتے ہوئے قریب پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم تو پکڑ لئے گئے' اس نازک اور خطرناک موقع پر اللہ نے وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی دریا پر مارو' اس نے لاٹھی ماری تو دریا پھٹ گیا اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا۔ جب بنی اسرائیل دوسرے ساحل پر پہنچے اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ

(۱) ص ۳۶،۳۷

(۲) تفسیر ماجدی البقرہ آیت ۶۰ حاشیہ نمبر ۲۰۴

ان کے پیچھے اسی راستے پر چل پڑا تو دریا کے دونوں کنارے آپس میں مل گئے اور فرعونی لشکر بمعہ فرعون کے غرق ہو گیا۔ قرآن کریم نے اس معجزے کا ذکر اس طرح کیا ہے :

وَ اَوْحَيْنَا اِلَى مُوْسٰى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِo (الشعراء۶۳)

"اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کے پاس کہ اپنی لاٹھی دریا پر مارو اس نے جب لاٹھی ماری تو دریا پھٹ گیا اور دونوں طرف سے بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔"

سورہ طٰہٰ میں فرمایا گیا ہے کہ :

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَا اِلَى مُوْسٰى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰىo (طٰہٰ۷۷)

"اور بے شک ہم نے وحی بھیجی تھی موسیٰ علیہ السلام کے پاس کہ تورات کو میرے بندوں کو لے چل اور بنا لے ان کے لئے دریا میں خشک راستہ' نہیں ڈرے گا تو پکڑنے سے' اور نہیں ڈرے گا تو ڈوبنے سے۔"

ان دونوں آیتوں میں بھی معجزے کا ذکر ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی مارنے سے دریا پھٹ گیا اور اس کے دونوں حصے بڑے پہاڑ کی طرح دونوں جانب کھڑے ہو گئے لیکن سر سید احمد خان اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ :

"اپنی لاٹھی کے سہارے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے' یعنی پایاب ہو رہا ہے۔"(۱)

ایک تو چلنے کے معنے اسی وقت لئے جاتے ہیں جب کہ ضرب کے لفظ کے بعد حرف فی موجود ہو جیسا کہ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے اور یہاں پر فی موجود نہیں ہے لیکن سید صاحب اِضْرِبْ کے معنے چلنا لیتے ہیں جو لغت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کی متفقہ

(۱) تفسیر القرآن از سرسید احمد خان ص ۱۵۲

تفسیر کے بھی خلاف ہے' دوسری بات یہ ہے کہ فَانْفَلَقَ کی فافصیحیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری تو دریا پھٹ گیا پہلے سے پھٹا ہوا نہیں تھا مگر سید صاحب کہتے ہیں کہ وہ پھٹا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے جو عربی مبین کے متبادر معنوں کے خلاف ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فَكَانَ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دریا کا پانی دونوں جانب سے بڑے پہاڑ کی طرح رک کر کھڑا ہو گیا۔ اگر پہلے سے دریا عبور کرنے کی جگہ پایاب تھی اور پانی کم ہونے کی وجہ سے اس میں چلنا آسان تھا تو پھر كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ کا مطلب کیا ہے اس لئے کہ پایاب ہونے کی صورت میں تو دریا رک کر پہاڑ کی طرح کھڑا نہیں ہوتا بلکہ رواں دواں ہوتا ہے البتہ پانی کم ہونے اور پایاب ہونے کی وجہ سے عبور کرنا آسان ہوتا ہے بہر حال یہ اہل جدت کے اس امام کا ایک خیال اور تصور ہے جس کو زبردستی قرآن کی آیات سے نکالنے کے لئے سینہ زوری کی گئی ہے جو تفسیر نہیں ہے بلکہ کھلی تحریف ہے۔

(۴) عصائے موسیٰ سے سانپ بننے کی تاویل فاسد

موسیٰ علیہ السلام کے ۹ معجزوں میں سے ایک معجزہ یہ تھا کہ وہ جب اپنی لاٹھی زمین پر پھینکتے تو اللہ کے حکم سے وہ سانپ بن جاتی اور جب اٹھاتے تو وہ پھر لکڑی کی لاٹھی بن جاتی' فرعون کے جادوگروں نے جب موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ان کے سحر کی وجہ سے وہ چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں' مگر اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس سے اژدھا بن گیا اور اس نے جادوگروں کی جھوٹی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل لیا۔ اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام

کی لاٹھی سے حقیقی معنوں میں ایک بڑا سانپ بن گیا تھا جو معجزہ تھا اور جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں میں جادو کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کو لاٹھیاں اور رسیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں جیسے مسمریزم والے کرتب دکھاتے ہیں۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے عصا سے حقیقی معنوں میں سانپ بننا معجزہ ہے چنانچہ وہ ایمان لے آئے۔ سورہ اعراف میں فرمایا گیا ہے کہ :

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَo فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هُوَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌo (الاعراف ۱۰۶، ۱۰۷)

"فرعون نے کہا اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اسے سامنے لے آؤ اگر تم سچے ہو پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈالی تو اچانک اس سے صاف اور واضح اژدھا بن گیا۔"

ثعبان کہتے ہیں بڑے اور موٹے سانپ کو اور مبین کے معنے ہیں واضح اور صاف۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی خیالی اژدھا نہیں تھا بلکہ حقیقی معنوں میں سانپ تھا اور اللہ تعالیٰ نے لکڑی کی ماہیت تبدیل کر دی تھی' اس کے مقابلے میں فرعون کے جمع کیے گئے جادوگروں نے جو کرتب دکھایا تھا وہ تخیل' شعبدہ بازی اور جادو تھا اور موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اژدھے نے آکر سب کچھ نگل لیا۔ جادوگروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ یعنی انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر لیا تھا اور عصائے موسیٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ فَاِذَا هُوَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ یعنی وہ واضح طور پر اژدھا تھا۔ اس تقابل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جادوگروں نے شعبدہ بازی کی تھی اور خیالی کرتب دکھایا تھا اور موسیٰ کے ہاتھ پر اللہ نے معجزہ دکھایا تھا لیکن سر سید احمد خان چونکہ معجزات سے منکر ہیں اس لئے وہ عصائے موسیٰ سے سانپ بننے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ :

"حضرت موسیٰ علیہ السلام میں از روئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے

اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدھا دکھائی دی یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا وہ لکڑی لکڑی ہی تھی اس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔"(۱)

سید صاحب کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی فطری و جبلی قوت نفس سے یہ منظر دکھایا تھا اور یہ خیالی سانپ تھا کوئی معجزہ نہیں تھا۔ اس پر سوال آتا ہے کہ پھر جادوگروں کے کرتب اور موسیٰ علیہ السلام کے دکھائے گئے منظر کے درمیان فرق کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہیں کہ ساحروں کی قوت نفس کسبی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی قوت فطری تھی۔ حقیقت میں ساحروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بنی تھیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام کی۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خان کی تاویل فاسد اور باطل ہے بلکہ کھلی تحریف ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

سر سید احمد خان اور معجزات کے دوسرے منکرین کے منہج تفسیر کو سمجھنے کے لئے یہی چار مثالیں کافی ہیں۔ اسی طرز پر اس نے معجزات سے متعلق دوسری آیات کی بھی تاویلات کی ہیں اور ان تاویلات میں نہ عربی لغت کو ملحوظ رکھا گیا ہے' نہ قرآن کے سیاق و سباق پر غور کیا گیا ہے اور نہ احادیث رسول پر توجہ دی گئی ہے بلکہ آیات کا اردو ترجمہ کرنے کے بعد اپنے خیالات تحریر کیے ہیں اور ان کو آیات کی تفسیر قرار دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ تمام مفسرین اور سارے علماء اسلام ان آیات کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکے ہیں اور میں نے سمجھ لیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ سید صاحب عربی لغت' صرف' نحو' بلاغت' منطق' فلسفہ' علم الکلام اور علم فقہ سے واقفیت رکھتے تھے اور یہ علوم و فنون انہوں نے پڑھے بھی تھے لیکن انسان کے فکر و نظر کا رخ جب تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی تمام علمی قوت اور صلاحیت و ذہانت اسی فکر کے لئے استعمال ہوتی ہے' چونکہ ان کا یہ نظریہ بن چکا تھا کہ قرآن کی تفسیر اور اسلام کی تشریح

(۱) تفسیر القرآن از سرسید احمد خان ص۷۲۷ سورہ اعراف (۲) ص ۷۲۹

ایسے انداز میں کی جانی چاہیے کہ فلسفہ جدیدہ اور مغربی مفکرین کے لئے قابل قبول ہو اس لئے انہوں نے اپنی ذہانت اور تقریر و تحریر کی بہترین صلاحیت قرآن کی تحریف کے لئے استعمال کی ہے۔

غلام احمد پرویز بھی چونکہ احادیث اور سنت رسول کا منکر تھا' معجزات کو بھی نہیں مانتا تھا اور قرآن کی تشریح فلسفہ جدیدہ کے اصول پر کرتا تھا اس لئے اس کا منہج تفسیر بھی وہی ہے جو سر سید کا ہے بلکہ یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اس نے مطالب الفرقان' لغات القرآن اور مفہوم القرآن اسی منہج پر لکھی ہیں۔

مصر میں جدیدیت اور آزاد عقلیت کے امام شیخ محمد عبدہ تھے

اہل سنت کے اصول اور منہج کے مقابلے میں جدیدیت اور آزاد عقلیت کے اصول اور منہج کے داعی ہر دور میں اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دور قدیم میں معتزلہ' ابن سینا' فارابی اور فلسفہ یونان کے دوسرے پرستاروں نے آزاد عقلیت کا منہج اپنایا تھا اور دور جدید میں جدید فلسفے کے محبین نے یہی منہج جدید انداز میں اختیار کیا ہے۔ سنت اور جدت اور تصلب فی الدین و تجدد فی الدین کی یہ کشمکش ہر دور میں اور ہر ملک میں برپا رہی ہے۔ ہمارے اس دور جدید میں جن ممالک پر برطانوی استعمار کا تسلط رہا ہے۔ ان ممالک میں فطری طور پر مغربی افکار اور نظریات کی اشاعت بھی دوسرے ممالک سے زیادہ ہوتی رہی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر جدیدیت اور آزاد عقلیت کے منہج پر قرآن اور اسلام کی جدید تعبیر کرنے والے مفکرین بھی ان ممالک میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ برصغیر ہند پر بھی برطانوی استعمار کا تسلط رہا ہے اور مصر پر بھی برطانوی سامراج کی حکومت رہی ہے اور دونوں ممالک میں تجدد فی الدین کے داعی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ برصغیر ہند میں اس مکتب فکر کی امامت و قیادت سر سید احمد خان نے کی تھی جس کے نظریات اور تحریفات کی مثالیں پہلے بیان ہو چکی ہیں اور مصر میں اس مکتب فکر

بڑے امام شیخ محمد عبدہ تھے۔ اس کے تجدد کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں لیکن شیخ محمد عبدہ کے افکار اور نظریات اتنے زیادہ گمراہ کن نہیں تھے جتنے سر سید کے تھے بلکہ ان کی بعض تحریروں اور تقریروں میں بڑے اچھے علمی نکات بھی موجود ہیں۔ البتہ اس کا منہج تفسیر وہی ہے جو سر سید احمد خان کا ہے اور بعض امور میں دونوں کا نقطہ نظر یکساں ہے۔

شیخ محمد عبدہ المولود ۱۸۴۸ء المتوفی ۱۹۰۵ء کا تعارف

شیخ محمد عبدہ بن حسن کی ولادت ۱۲۶۵ھ کے اواخر میں ہوئی تھی قرآن کی قراءت کا علم دس سال کی عمر میں اپنے والد سے حاصل کیا تھا اور پھر دو سال میں قرآن کریم حفظ کیا تھا اس کے بعد طنطا کی مسجد احمدی میں ڈیڑھ سال تک تجوید پڑھتے رہے اور اس کے بعد شوال ۱۲۸۲ھ میں جامعہ ازہر منتقل ہو گئے۔ جامعہ ازھر کے شیوخ سے ۵ سال تک علم حاصل کرتے رہے اور ہر سال کے آخر میں محلہ نصر جا کر اپنے والد کے ماموں شیخ درویش کے دروس سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ شیخ درویش اس سے پوچھتے کہ تم نے منطق پڑھی ہے؟ اور تم نے حساب اور ہندسہ پڑھا ہے؟ اور وہ واپس قاہرہ آکر ان علوم کو اساتذہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ محرم ۱۲۸۷ھ میں سید جمال الدین افغانی تشریف لائے اور شیخ محمد عبدہ نے اس سے ریاضی' فلسفہ اور کلام کے علوم پڑھے' منطق میں قطبی اور سلم العلوم' فلسفہ میں الاشارات اور حکمۃ الاشراق' عقائد میں عقائد جلال الدوانی؟ علم اصول میں توضیح تلویح' ریاضی میں چغمینی اور تذکرہ طوسی اور جدید ریاضی میں ایک کتاب جمال الدین افغانی سے پڑھی اور ان کی مجالس میں التزام کے ساتھ شریک ہوتے رہے اور دوسرے طلبہ کو بھی علامہ افغانی سے علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس نے مذکورہ علوم میں مہارت حاصل کر لی تو پھر جامعہ ازہر میں طلبہ کو منطق اور کلام کی وہ کتابیں

پڑھانی شروع کر دیں جو ازہر کے نصاب میں شامل نہیں تھیں' طلبہ کی بڑی تعداد ان کے درس میں شریک ہونے لگی اور ان کے علم کی بڑی شہرت ہونے لگی۔ شیخ محمد علیش ایک نیک اور دنیوی اغراض سے دامن بچانے والے عالم تھے ان کو اطلاع ملی کہ محمد عبدہ ازہر میں معتزلہ اور متکلمین کی کتابیں پڑھاتا ہے اور ان کے مذہب کو ترجیح دیتا ہے۔ شیخ موصوف چونکہ بدعات اور فرق مبتدعہ سے نفرت کرتے تھے اس لئے اس پر یہ بات سخت ناگوار گزری کہ کوئی ازہر میں اس قسم کی کتابیں پڑھائے چنانچہ شیخ علیش اور محمد عبدہ کے درمیان مناظرہ و مناقشہ ہوا جس سے نزاع اور جھگڑا پیدا ہو گیا اور شیخ محمد عبدہ نے ازہر میں تدریس چھوڑ دی۔ ۱۲۹۴ھ میں شیخ نے جامعہ ازہر کی امتحانی کمیٹی کو شہادۃ العالیہ کے لئے امتحان دیا اور کامیاب ہونے پر اسے شہادۃ العالیہ کی ڈگری مل گئی مگر اس کے بعد بھی وہ اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے۔ شیخ کی طالب علمی کے تین مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ ہے ازہر کے طریقے پر علم حاصل کرنا۔

دوسرا مرحلہ سید جمال الدین افغانی کے طرز پر علم حاصل کرنا۔

اور تیسرے مرحلے میں اس نے انگریزی علوم کے ترجمے پڑھے تھے اور فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔(۱)

شیخ محمد عبدہ جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص تھے اور ان کے افکار کے داعی اور امین تھے' جمال الدین اپنے نام کے ساتھ افغانی کا لاحقہ لگاتے تھے اس لئے یہ افغانی مشہور ہو گئے ہیں لیکن اس کا افغانی ہونا یقینی اور اتفاقی نہیں ہے بعض کے نزدیک اس کی ولادت افغانستان کے اسعد آباد میں ۱۸۳۸ھ میں ہوئی تھی اور بعض کے نزدیک اس کی ولادت ایران کے اسد آباد میں ہوئی تھی۔ ایرانی ہونا یا افغانی ہونا اتنی اہمیت نہیں رکھتا لیکن یہ افغانی کے نام ہی سے

---

(۱)منہج المدرسة العقلية الحديثة فى التفسير از ڈاکٹر فهد بن عبدالرحمن طبع بيروت ۱٤۰۷ھ ص۱۲٤تا۱۲٦

مشہور ہے اور اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں اس کے والد نے اپنی نگرانی میں اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ۱۸ سال کی عمر میں علوم عربیہ' علوم شرعیہ' علوم عقلیہ یعنی منطق' فلسفہ' ریاضی اور علم طب کی تحصیل مکمل کرلی اور اس کے بعد ہندوستان کے شہر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں پر یورپ کے کچھ علوم پڑھے اور ان کا طرز تعلیم سیکھا۔ ہندوستان میں اس کا قیام ایک سال تک رہا اور پھر ۱۸۵۷ء میں فریضہ حج ادا کرنے کے بعد افغانستان آکر امیر دوست محمد خان کی حکومت سے منسلک ہو گئے' دوست محمد خان کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوئی تو جمال الدین افغانی محمد اعظم کے طرفدار ہو گئے مگر فتح اس کے بھائی شیر علی کو ملی اور جمال الدین ۱۸۶۹ء میں دوبارہ ہندوستان تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ ان کا ارادہ ہندوستان میں مستقل رہائش کا تھا لیکن برطانوی استعمار نے ایک ماہ کے قیام کے بعد اسے مصر بھیج دیا' مصر میں ۴۰ دن قیام کے بعد ترکی چلے گئے اور وہاں ایک مکان میں رہنے لگے' خلافت عثمانی کے ایک وزیر کو جب ان کے تشریف لانے کا علم ہوا تو اسے "مجلس المعارف" کا رکن مقرر کر دیا' ۱۲۸۷ھ کے رمضان میں جمال الدین افغانی نے "دار الفنون" میں صنعت اور معیشت کے موضوع پر ایک خطاب کیا اور فرمایا کہ انسانی معیشت ایک زندہ جسم کی طرح ہے اور صنعتیں اس کے اعضاء ہیں اور اس جسم کی روح یا نبوت ہے یا حکمت اور فلسفہ اس لیکچر کے بعد شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی اور بعض دوسرے علماء نے ان پر الزام لگایا کہ اس نے نبوت کو صنعت قرار دیا ہے اور مساجد میں ان کے خلاف تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (میرے خیال میں یہ اعتراض تو اتنا وزنی نہیں تھا البتہ ان کے لکچر میں قابل اعتراض بات یہ تھی کہ نبوت اور فلسفے کو برابر قرار دیا گیا تھا حالانکہ دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ نبوت کی تعلیمات وحی الٰہی سے حاصل ہوتی ہیں اور حکمت و فلسفے کا ماخذ عقل انسانی ہے جو غلطی سے معصوم نہیں ہے۔ گوہر رحمٰن) چنانچہ اسے دار الخلافت سے نکلنے کا حکم دیا گیا اور وہ ۱۸۷۱ء کے اول میں دوبارہ مصر

چلے گئے اس مرتبہ مصری حکومت نے ان کا استقبال کیا اور اخراجات کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ انہوں نے مصر میں قیام کے دوران ادب' منطق' توحید' فلسفہ' تصوف اور فلکیات کے موضوعات پر دروس دیئے اور اخبارات و مجلات میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کو بڑی شہرت ملی اور مصر کے بڑے لوگوں کے ساتھ انہوں نے تعلقات قائم کر لئے۔ مختلف علاقوں کی سیاست میں بھی اس کے اثرات تھے۔ چونکہ مصر کی سیاست پر برطانوی استعمار کا قبضہ تھا اور علماء ازہر بھی ان کے بعض فلسفیانہ آراء کی وجہ سے انہیں پسند نہیں کرتے تھے اس لئے آخر کار اسے مصر چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا اور وہ ۱۸۷۹ء میں پھر ہندوستان کے شہر حیدر آباد چلے گئے۔ مصری حکومت نے اس کا جرم یہ بتایا تھا کہ :

"اس نے جوشیلے نوجوانوں کی ایک خفیہ جمعیت بنائی ہے جو دین اور دنیا دونوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔"

اس کے بعد جمال الدین افغانی لندن' یورپی ممالک' روس' ایران اور بصرہ کے دورے کرتے ہوئے آخری مرتبہ ۱۸۹۲ء میں ترکی کے دارالخلافت پہنچے اور ۱۸۹۷ء میں دار الخلافت ہی میں انہوں نے وفات پائی۔(۱)

سید جمال الدین افغانی نے اگر چہ علمی اور تحقیقی کام بھی کیا ہے لیکن ان کی زیادہ تر سرگرمیاں سیاست سے تعلق رکھتی تھیں اور غالباً اسی وجہ سے ان کو کسی ملک میں بھی اطمینان کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی بعض آراء بھی اہل سنت کے اصول کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھیں جن کی وجہ سے اہل علم بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کی دعوت کا مرکزی نکتہ امت مسلمہ کا اتحاد اور ایسی عالمی اسلامی حکومت کا قیام تھا جس میں تمام اسلامی ممالک شامل ہوں اس مقصد میں اگر چہ جمال الدین افغانی کامیاب تو نہیں ہو سکے لیکن اس کے لئے انہوں نے جو کام کیا ہے اس سے امت مسلمہ

(۱)منہج المدرسۃ العقلیہ از ڈاکٹر فہد ص۷۶تا۸۳

کی زعماء اور دعاۃ الاسلام استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت میرا موضوع ان کی دعوت کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شیخ محمد عبدہ ان کے شاگرد خاص تھے اور اسی مناسبت سے شیخ محمد عبدہ کے تعارف کے ضمن میں ان کا تعارف بھی قلمبند کر دیا گیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے شیخ جمال الدین افغانی سے تحصیل علم اور ازہر سے علیمیہ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مختلف سرگرمیوں میں مصروف زندگی گزارنے لگے اور تعلیم، صحافت اور سیاست تینوں میدانوں میں اپنے مخصوص منہج کے مطابق جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی کہ سب سے بڑا اہم کام یہ ہے کہ اسلام، مسیحیت اور یہودیت تینوں بڑے مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے چنانچہ انہوں نے مجلہ "العروۃ الوثقی" کے بند ہونے پر بیروت آکر ایک سیاسی اور دینی خفیہ جمعیت بنائی جس میں اسلام، یہودیت اور مسیحیت تینوں مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ شیخ محمد عبدہ اس کے رئیس تھے اور مرزا باقر مسیحی اس کے سیکرٹری تھے۔ اس تنظیم کے ارکان نے اپنے اخبارات اور رسائل میں "تقریب الادیان" اور "اتحاد بین الادیان" پر مضامین لکھے اور تینوں مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں شیخ محمد عبدہ نے پادری اسحاق کے نام ایک خط لکھا تھا جس کا عربی متن ڈاکٹر فہد نے اپنی کتاب منہج المدرسۃ العقلیہ میں مستند حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس خط کا ترجمہ یہ ہے:

"میں یہ خط اس شخص کو بھیج رہا ہوں جو "ملہم بالحق اور ناطق بالصدق" ہے یعنی اس کو حق کا الہام ہوتا ہے اور جو سچ بولتا ہے۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ ہمیں خوشی ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ عرفان کامل کا نور غالب آجائے گا، غفلت کے اندھیرے چھٹ جائیں گے، مسیحیت اور اسلام ایک دوسرے کو پہچان لیں گے، دونوں ایک دوسرے کو دوستی کا ہاتھ دیں گے اور باہمی محبت کا معانقہ کریں گے تو پھر جنگ کی تلواریں رکھ دی جائیں گی جس نے ملت مسیحیہ اور ملت اسلامیہ دونوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ خط میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ

تورات' انجیل اور قرآن عنقریب ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں گی جن کو دونوں مذاہب والے پڑھیں گے' اللہ کا نور مکمل ہو جائے گا اور دین حق ہر باطل دین پر غالب آجائے گا۔"

یہ ہے وہ خط جو تقریب بین الادیان کے لئے جدیدیت کے اس امام نے مسیحیت کے ایک امام کے نام بھیجا ہے جس میں ایک مشرک کو ملہم بالحق اور ناطق بالصدق کہا گیا ہے اور اس کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ عنقریب اسلام اور مسیحیت متحد ہو جائیں گے اور تورات' انجیل' قرآن تینوں آپس میں متفق ہو جائیں گے اور اس صورت حال کو اللہ کے نور کا اتمام اور دین حق کا غلبہ قرار دیا گیا ہے حالانکہ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص سب کچھ مانتا ہو مگر وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو نہ مانتا ہو تو وہ کافر ہی رہے گا اور اللہ نے اپنے رسول کو فرمایا ہے کہ :

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى. (البقرہ ۱۲۰)

"اور ہرگز خوش نہ ہوں گے تم سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک کہ تم ان کے مذہب کے تابع نہ ہو جاؤ کہہ دو کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ (اسلام) ہی صحیح راستہ ہے۔"

اس خط کے مقابلے میں اس خط کو بھی پڑھیے جو رسول اللہ ﷺ نے مسیحیت کے امام اور رومیوں کے بادشاہ ہرقل کو بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ :

"میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کر لو تو بچ جاؤ گے اور اللہ تم کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تم نے اعراض کیا تو تمہارے ملک کے کاشتکاروں یعنی تیری رعایا کے انکار کا گناہ بھی تم پر پڑے گا۔ (کیونکہ وہ تیری وجہ سے انکار کریں گے' اے کتاب والو! آجاؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اللہ کے سوا ایک دوسرے کو رب (حاکم اور شارع) نہیں بنائیں گے پس اگر انہوں نے

اعراض کیا تو کہو کہ گواہ رہو' ہم تو مسلمان ہی ہیں۔"(۱)

شیخ محمد عبدہ کو چاہئے تھا کہ وہ عیسائی پادری اور اس کے متبعین کو اسلام کی دعوت دیتے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود مدینہ اور نصارائے نجران کو یہودیت' مسیحیت اور اسلام کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور موافقت بین الادیان کی دعوت نہیں دی تھی بلکہ اسلام کی دعوت دی تھی اس حکمت عملی میں دین اسلام کا فائدہ ہوتا تو آپ ضرور یہ حکمت عملی اختیار کرتے لیکن اسلام اور کفر" توحید اور شرک اور حق وباطل کے درمیان موافقت اور مفاہمت تو نہیں ہو سکتی البتہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری' حسن سلوک اور حسن اخلاق کا رویہ اختیار کیا جائے' ان کی دل آزاری نہ کی جائے' اور ان کے ساتھ اچھے معاشرتی تعلقات قائم کیے جائیں' ان کے نادار اور تنگدست لوگوں کی مالی امداد کی جائے' ان کے مریضوں کی عیادت اور تیمارداری کی جائے۔ اسی طرح غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی' سفارتی اور معاشرتی تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں اور معاشی واقتصادی اور صنعتی امور میں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہودیت' مسیحیت اور اسلام کے درمیان مفاہمت وموافقت پیدا کر کے تینوں سے دین واحد بنانے کی کوئی تحریک چلانا دراصل دشمنان اسلام کی سازش ہے۔ جس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن سے جہاد کا جذبہ نکال دیا جائے' ظاہر ہے کہ جب ذہن یہ بنایا جائے کہ تینوں ادیان حق ہیں اور تینوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دین واحد بنانا چاہئے تو جہاد کا تصور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سر سید احمد خان کا حلقہ اور مصر میں محمد عبدہ کا حلقہ جہاد کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

مصر کی ایک پارٹی "الحزب الوطنی" کا منشور شیخ محمد عبدہ نے مرتب کیا تھا جس کی دفعہ

---

(۱) بخاری باب بدء الوحی

۵ میں کہا گیا ہے کہ حزب وطنی ایک لادین (سیکولر) سیاسی پارٹی ہے اس پارٹی کے ارکان مختلف عقائد اور مذاہب کے لوگ ہیں' تمام یہود اور نصاریٰ اس کے ارکان بن سکتے ہیں اور جو بھی مصر کی زمین پر رہتا ہے اور مصر کی زبان بولتا ہے وہ اس پارٹی میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس پارٹی کی دعوت عرب قومیت کی طرف تھی اور شیخ محمد عبدہ بھی عرب قومیت کا داعی تھا اس کا قول ہے کہ :

اِنَّ خَیْرَ اَوْجُہِ الْوَحْدَۃَ اَلْوَطَنُ لِاِمْتِنَاعِ الْخِلَافِ وَالنِّزَاعِ فِیْہِ.

"اتحاد کا بہترین ذریعہ وطن ہے اس لئے کہ اس میں اختلاف اور جھگڑا ممکن نہیں ہے۔"

تعجب ہے کہ شیخ کے ذہن سے یہ حقیقت کس طرح نکل گئی کہ وحدۃ اور اتحاد کا بہترین ذریعہ دین واحد ہے اور اوطان تو مختلف ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے مختلف علاقوں میں بھی تعصبات ہوتے ہیں' اسی قوم پرستانہ ذہن کی وجہ سے ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کے قائل تھے۔ برطانوی استعمار اور انگریزی سامراج کے ساتھ شیخ محمد عبدہ کے تعلقات بھی مشکوک تھے۔ ڈاکٹر فہد بن عبدالرحمٰن رومی نے ان کے ایک ایسے بیانات اور مکاتیب نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے برطانوی سامراج کے ساتھ تعلقات خیر خواہی کے تھے۔(۱)

شیخ محمد عبدہ نے اپنے قلم سے تو صرف تیسویں پارے کی تفسیر لکھی ہے لیکن انہوں نے اپنے شاگرد سید رشید رضا کی درخواست پر ازہر میں تفسیر قرآن کے دروس کا سلسلہ شروع کیا تھا جو محرم ۱۳۱۷ھ میں شروع ہوا تھا اور ۱۳۲۳ھ میں سورۃ النساء کی آیت ۱۲۵ پر ختم ہوا تھا ان کی وفات کے بعد سید رشید رضا نے اپنے استاد کے سلسلہ تفسیر کو جاری رکھا مگر محرم ۱۳۵۴ھ میں سورہ یوسف کی آیت ۵۲ تک پہنچے تھے کہ ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ

(۱) منہج المدرسۃ العقلیہ الحدیثۃ فی التفسیر ص ۱۲۴ تا ۱۶۹

مطابق ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ان کا بھی انتقال ہو گیا اور تفسیر مکمل نہ ہو سکی یہ تفسیر چونکہ رشید رضا کے مجلہ المنار میں شائع ہوتی تھی اس لئے اس کا نام المنار رکھا گیا ہے۔ یہ تفسیر بیروت سے ۱۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے مگر سید رشید کا منہج تفسیر اپنے استاد کے طرز تفسیر سے زیادہ مفید ہے اس لئے کہ یہ آیت سے متعلق احادیث بھی نقل کرتے ہیں۔ آیت کے شواہد بھی مختلف سورتوں سے نقل کرتے ہیں' مفردات اور جملوں کی لغوی تحقیق بھی کرتے ہیں' اور علماء و فقہاء کے درمیان اختلافی مسائل کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ علامہ سید رشید رضا اگرچہ شیخ محمد عبدہ کے تلمیذ خاص تھے' ان کے بے حد معتقد تھے' بالعموم ان سے اتفاق کرتے تھے اور ان کی آراء کا دفاع بھی کرتے تھے لیکن باوجود اسکے اس کے منہج میں اس کے شیخ کے مقابلے میں سنت اور سلفیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے یہ فرق ایک تو اس کے طرز تفسیر میں دکھائی دیتا ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بسنۃ الرسول کا رنگ غالب ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے "مطبعۃ المنار" سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ' حافظ ابن قیمؒ اور شیخ محمد عبدالوہاب کی کتابیں چھاپتے تھے اور ان کا دفاع بھی کرتے تھے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ اس کے خیالات انگریزی استعمار کے بارے میں علامہ افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی طرح مشکوک نہیں تھے بلکہ وہ برطانوی استعمار' فرانسیسی استعمار اور اطالوی استعمار سب کے خلاف کھل کر لکھتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے منصوبوں اور سازشوں سے خبردار کرتے رہتے تھے' چوتھا فرق یہ ہے کہ سید رشید رضا ترکوں کی جمعیت الاتحاد والترقی اور مصطفیٰ کمال اتاترک کے شدید مخالف تھے' خلافت عثمانیہ کے سقوط پر بہت زیادہ غمگین تھے اور اس کے اعادے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے تلامذہ میں سے استاد محمد حسین ہیکل' شیخ عبدالعزیز جاویش اور استاد محمد فرید وجدی نے ان پر شدید تنقید کی ہے اور ان کے خلاف اپنے رسالوں اور مجلوں میں مضامین لکھتے تھے اس مخالفت اور قلمی جنگ کی وجہ یہ تھی کہ ہیکل' جاویش اور وجدی اپنے استاد محمد عبدہ کے منہج کے پابند اور اس کی آراء کے مقلد تھے مگر استاد رشید رضا اپنے شیخ سے

محبت رکھتے تھے اور اس کے منہج کو اس نے کلی طور پر ترک بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کی تقریروں، تحریروں اور سرگرمیوں پر جدیدیت کا رنگ ہی چھایا ہوا نہیں تھا بلکہ ان میں سلفیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ شیخ محمد عبدہ کی فکر اور اس کی جدیدیت کی وضاحت اور اشاعت کرنے والے ان کے شاگرد تھے جن میں سے مشہور اور ممتاز شاگردوں یا اس مکتب فکر کے ممتاز ارکان کے نام درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	نام	المولود	المتوفی
۱۔	سید محمد رشید رضا	۱۸۶۵ء	۱۹۳۵ء
۲۔	محمد مصطفیٰ المراغی	۱۸۸۱ء	۱۹۴۵ء
۳۔	محمد فرید وجدی	۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۸ء کے درمیان	۱۹۵۴ء
۴۔	محمود شلتوت	۱۸۹۳ء	۱۳۸۳ھ
۵۔	عبدالعزیز جاویش	۱۸۷۶ء	۱۹۲۹ء
۶۔	عبدالقادر المغربی	۱۲۸۴ء	۱۳۷۵ھ ۱۹۵۶ء
۷۔	احمد مصطفیٰ المراغی مصنف تفسیر مراغی یہ محمد مصطفیٰ المراغی کے بھائی تھے۔	۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء	۱۹۵۲ء

شیخ محمد عبدہ کے تلامذہ اور علمی وارثوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس کے متاثرین کی تعداد تو اور زیادہ ہے لیکن مذکورہ سات شاگردوں نے اس کے افکار اور تجددات و تفردات کی تائید اور توضیح و تشریح میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

شیخ محمد عبدہ کی جدیدیت اور عقلیت کی چند مثالیں

جس طرح ہم نے سر سید احمد خان کی جدیدیت اور آزاد عقلیت کی چند مثالیں پیش کی تھیں۔ اسی طرح شیخ محمد عبدہ کے تعارف کے بعد ان کی جدیدیت و عقلیت اور منہج تفسیر کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں تاکہ اس مکتب فکر کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

(۱) وحی کی جدید تعریف : قرآن و سنت کی نصوص کی روشنی میں اہل سنت والجماعت نے وحی کی تعریف یہ کی ہے کہ اِعْلَامُ الشَّرْعِ فِيْ خَفَاءٍ شرعی احکام پر خفیہ طور پر مطلع کرنا یعنی وحی نبی کے دل سے ازخود نہیں نکلتی بلکہ اللہ کی جانب سے نبی کے دل پر اترتی ہے لیکن شیخ محمد عبدہ اس تعریف کے مقابلے میں اپنے منہج کے مطابق وحی کی جدید تعریف اس طرح کرتے ہیں :

وَ قَدْ عَرَّفُوْهُ شَرْعًا اَنَّهُ' اِعْلَامُ اللّٰهِ تعالى لِنَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَاءِهٖ بِحُكْمٍ شَرْعِيٍّ اَمَّا نَحْنُ فَنُعَرِّفُهُ' عَلٰى شَرْطِنَا بِاَنَّهُ' عِرْفَانٌ يَجِدُهُ الشَّخْصُ مِنْ نَفْسِهٖ مَعَ الْيَقِيْنِ بِاَنَّهُ' مِنْ قِبَلِ اللّٰهِ.

”علماء نے وحی کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ اللہ کا اپنے انبیاء میں سے کسی نبی کو حکم شرعی پر مطلع کرنا ہے مگر ہم اپنی شرط کے مطابق اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ وحی ایک عرفان اور معرفت ہے جسے کوئی شخص اپنے نفس کے اندر پاتا ہوا اس یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔“(۱)

اس تعریف کے دو اجزاء ہیں ایک یہ کہ وحی باہر سے نہیں آتی بلکہ نفس کی اپنی معرفت ہے حالانکہ وحی نفس کی جانب سے نہیں آتی بلکہ اللہ کی جانب سے براہ راست یا بواسطہ ملک نبی کے دل پر اتاری جاتی ہے اس کے دلائل پہلے بیان ہو چکے ہیں اور دوسرا جزء یہ ہے کہ اس

(۱) رسالہ التوحید از محمد عبدہ ص۱۰۸

یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ مگر بعض نفوس کو یقین ہوتا ہے کہ مجھے جو عرفان حاصل ہوا ہے یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے جیسے الہام شیطانی اپنے شیخ کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے سید رشید رضا لکھتے ہیں :

اِنَّ هٰذَا الْقَوْلَ يَشْمَلُ مَا يُسَمِّيْهِ بَعْضُهُمْ بِالْوَحْيِ النَّفْسِيِّ اَوِ الْاِلْهَامِ الْفَائِضِ مِنْ اسْتِعْدَادِ النَّفْسِ الْعَالِيَةِ وَ قَدْ اَثْبَتَهُ عُلَمَاءُ الْاِفْرَنْجِ لِنَبِيِّنَا كَغَيْرِهٖ.(۱)

"یہ قول اس وحی کو شامل ہے جس کو بعض لوگ "وحی نفسی" یا نفس عالی کی استعداد سے ڈالے گئے "الہام" کا نام دیتے ہیں اور فرنگی علماء نے ہمارے نبی کے لئے اس قسم کی وحی تسلیم کیا ہے جیسا کہ دوسروں کے لئے تسلیم کیا ہے۔"

فرنگی علماء تو دشمنان اسلام ہیں' محمد ﷺ کو اللہ کا بھیجا ہوا رسول تسلیم نہیں کرتے اور قرآن کو اللہ کی نازل کردہ وحی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ قرآن محمد ﷺ کے نفس عالی کی استعداد سے اس کے دل پر اترا ہے' نفس عالی کی استعداد کو سرسید احمد خان "ملکہ نبوت" کہتے ہیں۔جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس پر تبصرہ بھی کر دیا گیا ہے مگر شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا کو کیا مجبوری پیش آگئی ہے کہ وہ وحی کی ایسی تعریف کرتے ہیں جو قرآن و سنت کی نصوص اور صحابہ و تابعین کے اقوال کے خلاف ہو اور فرنگی علماء کے قول کے مطابق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ وحی جبریل لاتا تھا اور فرنگی علماء کہتے ہیں کہ وحی محمد کے نفس عالی کی جانب سے آتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ "وحی نفسی" ایک غلط اور مہمل اصطلاح ہے اور "وحی الٰہی" صحیح اصطلاح ہے اور وحی "عرفان نفس" کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ کی جانب سے نازل کردہ پیغام کا نام ہے جو نبی کے قلب پر اترتا ہے اور جمع ہوتا رہتا ہے اور نبی اپنی زبان سے اسے لوگوں تک پہنچاتا رہتا ہے۔ قصہ آدم و ابلیس' معجزات' ملائکہ اور جن کے بارے میں شیخ محمد عبدہ کے مکتب فکر کے خیالات اہل سنت والجماعت کے اصول و عقائد کے خلاف ہیں اور جدیدیت و

(۱)الوحی المحمدی از رشید رضا ص ۳۹

آزاد عقلیت کے اصول و نظریات پر مبنی ہیں۔ ان امور کے بارے میں وارد شدہ آیات میں تحریفات سر سید احمد خان نے کی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے انہی سے ملتی جلتی تاویلات فاسدہ شیخ محمد عبدہ اور اس کے تلامذہ نے بھی کی ہیں البتہ دونوں کی توجیہات و تاویلات میں تنوع ہے مگر اہل سنت کے اصول و عقائد کی مخالفت میں دونوں مکاتب فکر میں یکسانیت ہے۔(۱)

(۲) ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تاویل فاسد﴾

سورہ بقرہ کی آیات ۶۷ تا ۷۱ میں بنی اسرائیل کی ایک بری عادت کا ذکر ہوا ہے کہ وہ اطاعت حکم میں پس و پیش کرتے تھے اور اللہ کے حکم سے جان چھڑانے کے لئے بہانے تلاش کرتے تھے جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو کہا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو انہوں نے کہا کیا تو ہم سے ہنسی مذاق کرتا ہے؟ آپ نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ ہو جاؤں جاہلوں میں سے' انہوں نے کہا پھر ہمارے لئے اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ گائے کیسی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب کہتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہے اور نہ جوان ہے بلکہ درمیانی عمر کی ہے پس اب پورا کرلو وہ حکم جو تم کو دیا گیا ہے' انہوں نے کہا ہمارے لئے اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں بتادے کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا رب کہتا ہے کہ وہ گائے ایسے تیز چمکیلے زرد رنگ والی ہے کہ دیکھنے والے کو خوش کر لیتی ہے' انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے اپنے رب سے مزید درخواست کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ اس لئے کہ اس گائے کے بارے میں ہم اشتباہ میں پڑ گئے ہیں اور انشاء اللہ ہم ہدایت پالیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا رب کہتا ہے کہ وہ گائے محنت مشقت کرنے والی نہیں ہے کہ

(۱) ملاحظہ کیجئے منہج المدرسة العقلیه الحدیثة فی التفسیر از ڈاکٹر فہد البناء الرابع

زمین جوتتی ہو اور نہ کھیتوں کو سیراب کرتی ہے' وہ بیماریوں سے محفوظ ہے اور اس میں کوئی داغ دھبہ نہیں ہے' انہوں نے کہا کہ اب تم لے آئے ہو پوری وضاحت پس انہوں نے گائے ذبح کر ہی لی ورنہ وہ تو اس حکم پر عمل کرنے کے قریب نہ تھے۔"

گائے ذبح کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کے ذہن سے گائے کا تقدس نکل جائے اور گاؤ پرستی یا گوسالہ پرستی کی ذہنیت کا خاتمہ ہو جائے۔ صدیوں تک مصر والوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بہت سے مشرکانہ عقائد اور رسوم بنی اسرائیل میں پھیل چکے تھے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گاؤ پرستی موجود تھی اور گائے کی عظمت اور تقدیس ان کے ذہنوں اور دلوں میں داخل ہو چکی تھی اس لئے انہوں نے پہلے تو اس حکم کو ایک مذاق سمجھا اور جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں دین کے احکام کے بارے میں مذاق نہیں کرتا یہ تو جاہلوں کا کام ہے تو پھر غیر ضروری سوالات کر کے گاؤ کشی کے حکم کو ٹالنے کی کوشش کرتے رہے' اس ٹال مٹول اور پس و پیش سے حکم تو واپس نہ لیا گیا مگر ان کے غیر ضروری سوالات کی وجہ سے آسان حکم کو قیود و شروط لگا کر مشکل بنا دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل پر یہ لوگ آمادہ تو نہیں ہو رہے تھے مگر آخر کار انہوں نے درمیانی عمر اور شوخ زرد رنگ کی تندرست اور بے داغ گائے کہیں سے حاصل کر کے ذبح کر دی اور ان کو معلوم ہو گیا کہ گائے پرستش اور تقدیس و تعظیم کی مستحق نہیں ہے اگر اس میں تقدس اور معبودیت کی کوئی صفت ہوتی تو وہ اپنے آپ کو ذبح ہونے سے بچا لیتی یا اس کے ذبح کرنے کی وجہ سے ہم پر کوئی آفت نازل ہو جاتی۔ یہ تو ایک مستقل حکم تھا جو گاؤ پرستی کی ذہنیت کو نکالنے اور مٹانے کے لئے دیا گیا تھا لیکن اس کے بعد آیت ۷۲ اور ۷۳ میں ایک دوسرے واقعے کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ:

وإذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيها وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ ببعْضِها كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ آيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

"اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا پھر تم اس کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے تھے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اسے جس کو تم چھپا رہے تھے تو ہم نے کہا کہ مارو اس پر اس کے ایک حصے کو' اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور دکھاتا ہے وہ تم کو اپنی نشانیاں تاکہ تم سمجھ لو۔" (کہ اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے)

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کو کسی نے قتل کر کے ایک جگہ پھینک دیا تھا اور قریبی بستیوں کے لوگ اس قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگاتے تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے' اللہ کی عام سنت تو یہ ہے کہ قاتل کے تعین کے لئے نہ تو وحی بھیجتا ہے اور نہ مقتول کو زندہ کرتا ہے لیکن بعث بعد الموت کی ایک نشانی اور اپنی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ دکھانے کے لئے اللہ نے حکم دیا کہ "مارو اس پر اس کے ایک حصے کو" کس پر کس کے ٹکڑے کو مارو؟ آیت کے الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میت پر میت کے ایک عضو کو مارو اور عضو کا تعین نہیں کیا گیا اس لئے اسے مبہم ہی رہنے دیا جائے' باقی رہا یہ سوال کہ نفس کی طرف اضربوہ میں مذکر کی ضمیر راجع کی گئی ہے اور ببَعْضِهَا میں مؤنث کی ضمیر راجع کی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ نفس مؤنث سماعی ہے جس کی طرف مؤنث اور مذکر دونوں کی ضمیریں راجع کی جا سکتی ہیں۔ یہی مفہوم متبادر بھی ہے اور میری رائے میں قوی اور راجح بھی ہے مگر اکثر مفسرین کے نزدیک ببَعْضِهَا کی ضمیر بقرہ کی طرف راجع ہے اور مطلب یہ ہے کہ میت پر ذبح شدہ گائے کے ایک ٹکڑے کو مارو۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرنے کا حکم قتل نفس کے واقعے کے بعد دیا گیا تھا لیکن اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ مستقل حکم ہے صرف ضمنی طور پر مقتول پر مارنے کے لئے نہیں دیا گیا تھا۔ بہر حال دونوں معنے لئے جا سکتے ہیں اور میت پر میت کے ایک عضو کو یا گائے کے ایک عضو کو جب مارا گیا تو مقتول زندہ ہو گیا اور اٹھ کر کہنے لگا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے چنانچہ قاتل کو پکڑ کر قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ مردہ زندہ ہو گیا تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرب سے اللہ تعالیٰ نے خرق عادت اور معجزے کے طور پر مردے کو عارضی طور پر زندہ کر دیا تھا اگر زندہ نہ ہوا ہوتا تو کذالک کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ احیاء الموتی کی تشبیہ مردوں کے ساتھ تو نہیں دی جا سکتی بلکہ مردے زندہ کرنے کے ساتھ ہی دی جا سکتی ہے۔ قیامت کے روز مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے اٹھانے کے نظائر و شواہد کے طور پر سورہ بقرہ ہی میں پانچ مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ کوہ طور پر بنی اسرائیل کے ستر سرداروں کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا تھا ان کے بارے میں آیت ۵۶ میں فرمایا گیا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ. دوسری مثال یہی واقعہ ہے۔ تیسری مثال آیت نمبر ۲۴۳ میں ان ہزاروں لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو موت کے خوف سے گھروں سے نکل بھاگے تھے مگر اللہ نے کہا تھا کہ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ. چوتھی مثال آیت ۲۵۹ میں اس شخص کی بیان ہوئی ہے جس نے ایک ویران بستی پر گزرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ اس ویران بستی کو دوبارہ کیسے آباد کرے گا؟ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ. باقی رہا یہ سوال کہ دوسری آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں کوئی بھی واپس نہیں آسکتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان لانے اور عمل کرنے کے لئے نہیں آسکتا عارضی طور پر زندہ ہو کر پھر مر جانے کی نفی کسی آیت میں بھی نہیں کی گئی۔

مردوں کا زندہ ہونا ماورائے طبیعت، مافوق الاسباب اور خارق العادت معجزہ ہے جو وقتاً فوقتاً اللہ نے ظاہر کیا ہے تاکہ اس کی قدرت کاملہ اور اختیار مطلق کی علامت اور نمونہ لوگوں کے سامنے آجائے لیکن سر سید کے مکتب فکر کی طرح شیخ محمد عبدہ کا مکتب فکر بھی معجزات کو شرح صدر کے ساتھ تسلیم نہیں کرتا اور جن آیات میں معجزات کا ذکر ہوا ہے ان میں رکیک اور تکلفی قسم کی تاویلات کرتا ہے بلکہ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ :

وَلَوْ لَا حِكَايَةُ الْقُرْآنِ لِآيَاتِ اللّٰهِ الَّتِيْ اَيَّدَ بِهَا مُوْسٰى وَ عِيْسٰى عليهما السلام لَكَانَ اِقْبَالُ اَحْرَارِ الْاِفْرَنْجِ عَلَيْهِ اَكْثَرَ وَ اِهْتِدَاءُ هُمْ بِهٖ اَعَمَّ وَ اَسْرَعَ لِاَنَّ اَسَاسَهٗ قَدْ

بُنِيَ عَلَى الْعَقْلِ وَالْعِلْمِ وَ مُوَافَقَةِ الْفِطْرَةِ الْبَشَرِيَّةِ وَ تَزْكِيَةِ اَنْفُسِ الْاَفْرَادِ وَ تَرْقِيَةِ مَصَالِحِ الْاِجْتِمَاعِ وَ اَمَّا آيَتُهُ الَّتِيْ احْتَجَّ بِهَا عَلَى كَوْنِهِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تعالى هِيَ الْقُرْآنُ وَ اُمِّيَّةُ مُحَمَّدٍ ﷺ فَهِيَ آيَةٌ عِلْمِيَّةٌ تدرك بالعقل والحِسِّ وَالْوِجْدَان.(۱)

"اگر قرآن میں ان معجزات کی حکایت نہ ہوتی جن کے ذریعے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کی تھی تو فرنگیوں کے آزاد خیال لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف زیادہ ہوتی اور قرآن کے ذریعے ان کا ہدایت پانا زیادہ عام ہوتا اور زیادہ سرعت کے ساتھ ہوتا اس لئے کہ قرآن کی بنیاد عقل اور علم پر رکھی گئی ہے اور یہ انسانی فطرت' تزکیہ نفوس اور اجتماعی مصالح کی ترقی کے مطابق ہے۔ جہاں تک اس معجزے کا تعلق ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے رسول ہونے پر بطور حجت پیش کیا تھا تو وہ قرآن ہے اور محمد ﷺ کا امی ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ایک علمی معجزہ ہے جو عقل' احساس اور وجدان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔"

حیرت اور تعجب ہے کہ رشید رضا جیسے فاضل نے یہ بات کیسے لکھدی؟ اور انہوں نے سوچا نہیں کہ یہ تو اسی طرح کی بات ہے جو مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ قرآن میں اگر ہمارے بتوں کے خلاف اور ہمارے باپ دادا کے مذہب کے خلاف باتیں نہ ہوتیں تو ہم اس پر ایمان لے آتے۔ مغرب کے آزاد خیال دانشوروں اور فلسفیوں کا مذہب یہ ہے کہ فطرت اور نیچر کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ اپنی قدرت کاملہ کے اظہار کے لئے خوارق العادات اور معجزات دکھاتا رہا ہے اور ان کا ذکر قرآن میں اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن کو ماننے والے فلسفیوں کی جھوٹی باتیں نہ مانیں اور یقین کرلیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب قرآن علمی معجزہ ہے اور اپنی صداقت اور محمد ﷺ کی رسالت پر قطعی برہان ہے تو معجزات کی حکایت بھی سچی ہے پھر

---

(۱) تفسیر المنار طبع دار المعرفہ بیروت ص ۲۰۵ ج ۱۱

یہ فرنگی دانشور معجزات کو کیوں نہیں مانتے اور رشید رضا ان کے ماننے میں کیوں تذبذب کا شکار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی فلاسفہ اور فرنگی احرار نہ قرآن کو معجزہ مانتے ہیں اور نہ باقی خوارق العادات کو مانتے ہیں بلکہ وہ نیچر اور اسباب پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے ان کے انکار معجزات پر ہم کو تعجب نہیں ہوتا مگر شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا کے تذبذب پر ہمیں ضرور تعجب ہوتا ہے اس لئے کہ یہ قرآن کو تو معجزہ مانتے ہیں مگر قرآن کے بیان کردہ معجزات کو تسلیم کرنے میں ان کو مشکل پیش آرہی ہے اور تاویلات رکیکہ کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں مثلاً ذبح بقرہ اور اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تاویل میں شیخ اور تلمیذ نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"گائے ذبح کرنے کا طریقہ قاتل معلوم کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے زمانے میں مروج تھا یہ کسی خاص واقعے میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ نہیں تھا' تورات میں یہ حکم منصوص ہے کہ جب کوئی شخص قتل ہو جائے اور اس کا قاتل معلوم نہ ہو تو واجب ہے کہ ایک وادی میں ایسی گائے ذبح کی جائے جو کام کرنے والی نہ ہو اور جہاں پر قتل ہوا ہو اس کی قریبی بستی کے سب سردار آکر اس گائے کے اوپر اپنے ہاتھ دھوئیں جس کی گردن وادی میں کاٹی گئی ہو اور ہاتھ دھونے کے بعد کہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے اس کا خون نہیں بہایا۔ یا اللہ اپنی قوم اسرائیل کو بخش دے اور دوسری دعائیں پوری کردیں جو اس عمل میں شامل ہوتا وہ بری ہو جاتا اور جو یہ کام نہ کرتا تو وہ قاتل سمجھا جاتا اور اس عمل کا مقصد قتل و خونریزی کا انسداد اور لوگوں کی جانوں کی حفاظت تھی۔ تورات کی اس نص سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ عمل قتل کے مقدمات کے فیصلوں کے لئے کیا جاتا تھا جب کہ مقتول کسی بستی کے قریب پایا گیا ہو اور قاتل معلوم نہ ہوتا کہ مجرم معلوم کیا جائے۔ پس جو ذبح کردہ گائے کے اوپر ہاتھ دھوتا اور اس کے لئے ان کی شریعت میں مقررہ رسم پوری کرتا وہ قتل کے

الزام سے بری ہو جاتا اور جو ایسا نہ کرتا اس پر جرم ثابت ہو جاتا اور كَذَالِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے احکام کے ذریعے اللہ لوگوں کی جانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یعنی جب اس عمل کے ذریعے قاتل معلوم ہو جائے اور اسے سزا دی جائے تو لوگ ڈر کے مارے قتل نہیں کریں گے اور امن قائم ہو جائے گا اور وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تم کو اپنے احکام بتاتا ہے تاکہ تم ان کے مطابق فیصلے کر کے فتنوں اور دشمنوں کا مقابلہ کر سکو۔"(۱)

قرآن میں گائے ذبح کرنے کا حکم تو مذکور ہے مگر قاتل معلوم کرنے کے لئے ذبح شدہ گائے کے اوپر ہاتھ دھو کر دعائیں کرنے کا ذکر قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ كَذَالِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے معنے حقیقی طور پر زندہ کرنا ہیں مجازی معنی مراد لینے کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ کا مفہوم اس سیاق کلام میں آنکھوں سے نشانیاں دکھانا ہے دور دراز کی تکلفی تاویلات کر کے اور حقیقی و متبادر معانی کو چھوڑ کر سیاق کلام کے خلاف مجازی معانی لے کر موسیٰ علیہ السلام کے ایک معجزے سے انکار کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ فرنگی اور مغربی دانشوروں کے خیالات باطلہ کے ساتھ قرآن کی مطابقت پیدا کرنا تو کوئی ضرورت نہیں ہے وہ تو نہ قرآن کو مانتے ہیں اور نہ رسول کو بلکہ نیچر ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی یہ لوگ کیا تاویل کریں گے؟

انہی وجوہات کی بنا پر اسی مکتب فکر کے ایک ممتاز فرد اور شیخ محمد عبدہ کے دوسرے شاگرد شیخ محمود شلتوت نے اس تاویل پر شدید تنقید کی ہے اور اس واقعے کو موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ قرار دیا ہے۔

(۱) تفسیر المنار از رشید رضا ص ۳۴۷ تا ۳۵۱ ج ۱

(۲) تفسیر القرآن الکریم از شیخ محمود شلتوت ص ۴۴۔۴۵

(۳) ﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ﴾ کی تاویل فاسد

سورۃ آل عمران کی آیات ۴۵۔۴۶۔۴۷ میں عیسیٰ بن مریم کی پیدائش کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ:

"جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تم کو خوشخبری دیتا ہے اپنے ایک کلمے کی (بیٹے کی جو اللہ کے حکم سے پیدا ہوگا) جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا اور جو دنیا و آخرت دونوں میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا اور جو لوگوں سے باتیں کرے گا گہوارے میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور وہ اللہ کے نیک بندوں میں سے ہوگا۔ مریم علیہا السلام نے کہا اے میرے رب! کس طرح ہوگا میرے لئے بچہ حالانکہ مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا؟ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے کسی چیز کا تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔"

اس جگہ تو اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ کا لفظ آیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے یعنی جب فرشتوں نے کہا لیکن سورہ مریم میں آیا ہے کہ:

فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا.

"پس ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے پورے اور مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔"

روح سے جبریل مراد ہے جو ایک معزز و مقرب فرشتہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بیٹے کی بشارت ایک فرشتے نے دی تھی فرشتوں کی جماعت نے نہیں دی تھی مگر سورہ آل عمران میں الملائکہ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بشارت فرشتوں کی جماعت نے دی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جمع کا صیغہ کبھی جنس کے معنوں میں آتا ہے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ جائز

فِي كَلَامِ الْعَرَبِ اَنْ تُخْبِرَ عَنِ الْوَاحِدِ بِالْجمع کلام عرب میں یہ جائز ہے کہ واحد سے جمع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کی جائے۔

ان آیات کا مفہوم سیاق کلام' احادیث رسول' آثار صحابہ و تابعین اور عربی مبین کی روشنی میں یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور مریم علیہا السلام کے رحم میں بغیر نطفے کے اللہ کے حکم سے حمل ٹھہر گیا تھا اور یہ اللہ کی قدرت کاملہ کی نشانی تھی اور ایک خارق العادت معجزہ تھا۔ اس مفہوم پر نہ کوئی عقلی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ کوئی شرعی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ عقل سلیم کا فیصلہ تو یہ ہے کہ کائنات کا خالق اللہ ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے مافوق الاسباب اور ماورائے طبیعت کام بھی کر سکتا ہے اور ماتحت الاسباب کام بھی کر سکتا ہے وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ اسباب اپنی تاثیر میں اس کے محتاج ہیں باقی رہی شریعت تو شریعت نام ہے قرآن و سنت کا اور قرآن و سنت میں ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہونا بھی ثابت ہے جیسے آدم علیہ السلام اور باپ کے بغیر صرف ماں سے پیدا ہونا بھی ثابت ہے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں صورتوں کے امکان اور وقوع پر ایمان لانا فرض ہے اور انکار کرنا ایمان کے منافی ہے۔ سید رشید رضا اور احمد مصطفیٰ مراغی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے انکار کرنا صرف عادت پر جمود ہے ورنہ اس کے عقلاً محال ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور غیر معتاد ہونا کوئی دلیل نہیں ہے۔ مغرب کے علماء اور فلاسفہ اس بات پر متفق ہیں کہ حیوان کا حیوان کے بغیر پیدا ہونا یا جمادات سے پیدا ہونا ممکن ہے اور اس کے ثبوت کے لئے وہ ریسرچ اور تجربے کر رہے ہیں۔ جب جمادات سے حیوان کا تولد ممکن ہے تو حیوان کا صرف ایک حیوان سے تولد بطریق اولی ممکن ہے۔(۱)

لیکن اس اعتراف کے باوجود کہ خلاف عادت ہونا عدم امکان اور عدم وقوع کی دلیل نہیں ہے سید رشید رضا نے اس واقعے کو خرق عادت سے نکالنے اور مطابق عادت بنانے کے

---

(۱) المنار ص۳۰۸، ۳۰۹ ج۳

لئے تکلفی تاویلات تلاش کرنے کے لئے ذھنی ورزش اور سینہ زوری کی ہے اور فرمایا ہے کہ:

''اس آیت الٰہیہ کو کائنات کے نظام میں معروف و معتاد سنن کے قریب لانے کے لئے دو توجیہات ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ جب دل میں کسی چیز کا قوی اعتقاد اور مضبوط یقین پیدا ہو جاتا ہے اور یہ یقین و اعتقاد انسان کے اعصاب پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتا ہے تو اس یقین و اعتقاد سے خلاف عادت آثار ظاہر ہو جاتے ہیں مثلاً کبھی ایک تندرست اور صحت مند شخص یقین کر لیتا ہے کہ میرے اندر فلاں بیماری پیدا ہو گئی ہے حالانکہ اس کے جسم میں اس بیماری کے جراثیم میں سے ایک جرثومہ بھی موجود نہیں ہوتا لیکن اس کے دل و دماغ اور اعصاب پر اس اعتقاد و یقین کے تسلط کی وجہ سے اس مرض کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ شخص اسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا اس نے پہلے سے یقین کر لیا تھا یا مثلاً بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص نے خالص اور صاف و شفاف پانی پیا ہے مگر اس نے پختہ یقین کر لیا تھا کہ یہ زہر ہے اور اس پر اس اعتقاد و یقین کی وجہ سے صاف پانی نے زہر ہی کا اثر کیا ہے اور وہ مر گیا ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت ہیں جن کو تجربے نے ثابت کر دیا ہے' ولادت مسیح کے واقعے کو ہم اس طرح کے واقعات پر قیاس کر کے کہہ سکتے ہیں کہ مریم کو جب بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی قدرت سے بیٹا دے گا اور مریم کے دل میں اس بشارت کی وجہ سے قوی اعتقاد اور مضبوط یقین پیدا ہو گیا کہ کسی مرد سے ملنے کے بغیر بھی مجھے اللہ بیٹا دے گا اور اس اعتقاد کی وجہ سے اس کا مزاج اتنا متاثر ہوا کہ اس کے رحم میں حمل ٹھہر گیا اور وہ حاملہ ہو گئی جس طرح کہ کبھی کبھی صحت مند شخص کو اس کا اعتقاد مریض بنا دیتا ہے اور مریض کو اس کا اعتقاد صحت مند بنا دیتا ہے۔''(۱)

مقصد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اور مریم علیہا السلام کا بغیر مرد

(۱) المنار ص ۳۰۹ ج ۳

کے حاملہ ہونا کوئی خارق العادت اور غیر معتاد واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ مریم کا قوی اعتقاد اور پختہ یقین تھا جس سے اس کا مزاج متاثر ہوا اور وہ حاملہ ہو گئی' ظاہر ہے کہ یہ توجیہ ایک تصوراتی اور خیالی بات ہے جس سے حقیقت نفس الامری تبدیل نہیں ہو سکتی۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ کے تکوینی حکم سے مریم حاملہ ہوئی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے البتہ اس قسم کی تصوراتی اور خیالی تاویل سے بدکار عورتوں کے لئے ایک آسان راستہ کھل جاتا ہے کہ جب زناکاری کی وجہ سے وہ حاملہ ہو جائیں اور دعویٰ کریں کہ ہم نے یقین کر لیا تھا اور ہمارے دل میں قوی اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ ہم کو بچہ دے گا اور اسی اعتقاد کی وجہ سے ہمارا حمل ٹھہر گیا ہے ورنہ ہم نے کوئی بدکاری نہیں کی تو سید رشید رضا ان کے اس دعوے کو کس بنیاد پر جھوٹا دعویٰ کہیں گے جب کہ اس کے نزدیک یہ کوئی خرق عادت نہیں ہے بلکہ ایسا ہوتا رہتا ہے مگر جب اس واقعے کو خرق عادت تسلیم کر لیا جائے تو بدکار عورتوں کے دعوے کو ہم اس بنیاد پر جھوٹا کہیں گے کہ مریم علیہا السلام تو خلاف عادت اللہ کے تکوینی حکم سے حاملہ ہوئی تھی جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے اس لئے ہم اسے مانتے ہیں اور مریم کو پاکباز سمجھتے ہیں مگر تمہارے خلاف عادت اور بغیر مرد کے حاملہ ہونے کا ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں ہے اس لئے شوہر کے بغیر تمہارا حمل ٹھہرنا تمہاری زناکاری کا واضح ثبوت ہے۔ کیونکہ خلاف عادت اور ماورائے نیچر دعوے کو ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ صرف اعتقاد و یقین اور وہم و خیال کی وجہ سے تندرست انسان کے مریض بن جانے اور مریض کے تندرست بن جانے کے واقعات تو بقول آپ کے بہت ہیں لیکن مرد کے ساتھ مباشرت کے بغیر صرف یقین و اعتقاد کی وجہ سے حاملہ ہونے کی تو سوائے مریم علیہا السلام کے تاریخ میں اور کوئی مثال مذکور نہیں ہے اور یہ تجربے سے بھی ثابت نہیں ہے اس لئے اس واقعے کو کس طرح خرق عادت اور خلاف عادت سے نکالا جا سکتا ہے؟

دوسری جو توجیہ رشید رضا نے بیان کی ہے اور اسے دقیق مگر اقرب الی الحق قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ :

"مخلوقات دو قسم کی ہیں ایک اجسام کثیفہ اور دوسری ارواح لطیفہ۔ لطیف چیزیں کثیف چیزوں میں نمو اور تحریک پیدا کرتی ہیں۔ اگر ہوا نہ ہوتی تو یہ زندہ چیزیں زندہ نہ رہ سکتیں اور ہوا روح لطیف ہے' پانی جس سے ہر چیز زندگی حاصل کرتی ہے روح لطیف کے قریب ہے' بجلی ارواح لطیفہ میں سے ہے اور وہ بڑے بڑے اجسام کو حرکت میں لاتی ہے۔ یہ چیزیں جن کو ہم نے ارواح کا نام دیا ہے کائنات میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کرتی ہیں جن کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے اس زمانے میں ان ارواح لطیفہ کے وہ اسرار دیکھے ہیں جن کا قدیم فلاسفہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور ہمارے علماء (سائنسدان) کہتے ہیں کہ مستقبل میں ان سے بھی بڑے اسرار ظاہر ہونے والے ہیں۔ جب ان ارواح کی تاثیر یہ ہے جن کے اندر عقل وادراک اور ارادے کے وجود پر ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو ان ارواح کی تاثیر تو اور زیادہ ہوگی جو عقل و ارادہ بھی رکھتی ہیں۔ اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ کائنات میں پھیلے ہوئے ارواح میں سے اللہ نے کسی روح کو مریم علیہا السلام کے پاس بھیجا تھا جس نے انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اس میں پھونک ماری اور اس پھونک سے عیسیٰ علیہ السلام کا حمل اس کے رحم میں ٹھہر گیا۔ کیا اس پھونک نے اس کے رحم میں کوئی مادہ بھی ڈالا تھا یا نہیں؟ تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔

باقی رہی یہ بحث کہ ملائکہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو اگر میں زندہ رہا اور اللہ نے توفیق دی تو فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۷) کی تفسیر میں اس پر کلام کروں گا۔ ہمارے استاد امام محمد عبدہ نے اس بحث کی طرف تعرض نہیں کیا۔"(۱)

(۱) المنار ص ۳۰۹۔۳۱۰ ج ۳

استاد نے تعرض نہیں کیا اور شاگرد سورہ مریم تک پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے ہیں لیکن اہل سنت کے اصول تفسیر کے مطابق تفسیر کرنے والے مفسرین نے احادیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین کی بنیاد پر ثابت کیا ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا شدہ اجسام نورانیہ ہیں جو مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہونے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں اور مریم علیہا السلام کے سامنے جو روح انسانی شکل میں ظاہر ہوئی تھی اور اس کے گریبان میں پھونک ماری تھی وہ جبریل علیہ السلام تھے۔ سید رشید رضا اپنے استاد امام محمد عبدہ کی متابعت میں ملائکہ کے الگ اور مستقل اجسام نورانیہ ہونے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے اور اس بات کو بھی احتمال اور امکان کے درجے میں تسلیم کرتے تھے کہ ملائکہ سے "قوائے طبیعیہ" یعنی اشیاء کی فطرت اور نیچر مراد ہو یا انسانوں کی "قوائے ملکیہ" مراد ہوں۔(۱)

اسی تذبذب کی وجہ سے سید رشید رضا نے تصریح نہیں کی کہ جبریل بشر کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے بلکہ مبہم انداز میں لکھا ہے کہ کائنات میں پھیلے ہوئے ارواح لطیفہ میں سے کسی روح کو اللہ نے مریم کے پاس بھیجا تھا۔ رشید رضا اور اس کے شیخ محمد عبدہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے کھل کر انکار نہیں کیا لیکن مادہ پرستوں اور اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنے والوں کے اذہان و عقول چونکہ خوارق العادات اور مافوق الفطرت واقعات کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ولادت عیسیٰ اور اس نوع کے دوسرے واقعات کی تاویلات کرتے ہیں تاکہ مادیت اور نیچریت کے پجاریوں کے لئے یہ واقعات قابل قبول بن جائیں مگر جس شکل میں یہ لوگ ان واقعات کو پیش کرتے ہیں اس شکل میں قرآن نے پیش نہیں کئے اس لئے یہ قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ تجدد فی التفسیر ہے اور آزاد عقلیت ہے جو قابل ستائش نہیں ہے بلکہ قابل مذمت ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے تفسیر المنار ص ۲۶۷ تا ۲۷۴ ج ۱

(۴) ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ کی تاویل فاسد

عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے انھوں نے بنی اسرائیل کو توحید کی دعوت دی' اللہ کی عبادت کی طرف بلایا' یہودی علماء نے تورات کے جن احکام کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا تھا یا بدل دیا تھا ان کو اصلی شکل میں کھول کر بیان کیا اور ان کے برے کردار اور گندے اخلاق سے پردہ اٹھایا تو یہودی علماء ان کے دشمن بن گئے' ان پر ساحر' مرتد اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیدیا اور قیصر روم کی طرف سے شام و فلسطین کے گورنر پیلاطس کے ذریعے ان کو قتل کروانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پیلاطس نے اشتباہ کی وجہ سے ایک دوسرے شخص کو عیسیٰ بن مریم سمجھ کر پھانسی دلوادی اور اصلی عیسیٰ بن مریم کو اللہ نے آسمان پر اٹھالیا' قیامت کے قریب زمانے میں آسمان سے اتارے جائیں گے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کے طور پر شریعت محمدی کے مطابق امت مسلمہ کی قیادت کریں گے لیکن یہودی کہتے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو سولی دلوا کر قتل کروا دیا ہے۔ دوسری طرف پولوس متوفی ۶۵ء کی تقلید میں مسیحی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے تھے یا خود خدا تھے جس نے مجسم ہو کر صلیب پر جانکنی کی تکلیفیں اٹھائیں اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا یعنی یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ واجب القتل تھے اور ہم نے اسے قتل کروادیا ہے اور مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا تھے یا خدا کے بیٹے تھے جس نے سولی پر اپنی جان دے کر بہت بڑی قربانی دی ہے اور سب کی طرف سے کفارہ ادا کیا ہے۔

قرآن کریم نے دونوں کی تردید اور تکذیب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء ۱۵۷۔۱۵۸)

"اور انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور سولی پر چڑھایا بھی نہیں ہے بلکہ ان پر شبہ ڈال دیا گیا تھا (اشتباہ میں پڑ گئے تھے) اور بے شک جو لوگ عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ ان کے بارے میں شک وشبہے میں پڑے ہوئے ہیں نہیں ہے ان کے پاس کوئی علم سوائے گمان کی پیروی کے 'اور یہ قطعی اور یقینی بات ہے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے اور قتل کروانے کی بات شک وشبہے پر مبنی ہے کسی علمی تحقیق اور دلیل پر مبنی نہیں ہے اور یقینی و قطعی بات یہی ہے کہ وہ نہ قتل ہوئے ہیں اور نہ سولی پر چڑھائے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ اٹھالئے گئے ہیں۔ آیات کے اسی مفہوم پر رسول اللہ ﷺ کی احادیث دلالت کرتی ہیں جو تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری کی کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" میں حیاۃ و نزول مسیح پر ایک سو سے زائد احادیث صحاح ستہ اور دوسری کتب حدیث کے حوالے سے جمع کی گئی ہیں اور یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ لیکن شیخ محمد عبدہ احادیث متواترہ' صحابہ و تابعین کے اجماع' امت مسلمہ کے متفقہ عقیدہ سب کو نظر انداز کر کے اپنی جدید رائے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ :

"رفع عیسیٰ و نزول عیسیٰ کے بارے میں وارد شدہ حدیث کی دو توجیہات کی جاسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور اعتقادی امور کے لئے قطعی دلیل چاہئے جو موجود نہیں ہے اس لئے کہ اس بارے میں حدیث متواتر نہیں ہے' اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ نزول عیسیٰ اور حکومت عیسیٰ سے اس کے ظاہری معنے مراد نہیں ہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور شریعت کا غلبہ مراد ہے' اسی طرح قتل دجال سے بھی اس کے ظاہری معنے مراد نہیں ہیں بلکہ دجل، فریب اور خرافات کے زوال اور استیصال کی طرف اشارہ ہے۔ شیخ کے شاگرد محمود

شلتوت انہی دو توجیہات کے بیان کے بعد اپنے استاد کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

لَيسَ فِي الْاَحَادِيْثِ الَّتِي اَوْرَدُوْهَا فِيْ شَانِ نُزُوْلِ عِيْسٰى آخِرَ الزَّمَانِ قَطْعِيَةٌ ما لَا مِنْ نَاحِيَةِ وُرُوْدِهَا وَلَا مِنْ دَلَالَتِهَا. (۱)

نزول عیسیٰ کے بارے میں جو احادیث انہوں نے ذکر کی ہیں ان میں کسی قسم کی قطعیت نہیں ہے نہ ورود اور روایت کے اعتبار سے اور نہ دلالت کے اعتبار سے۔ سید رشید رضا نے اپنے شیخ کی تاویل کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ احادیث کے الفاظ سے یہ تاویل معلوم نہیں ہو سکتی لیکن اس تاویل کی تائید میں کہا ہے کہ اکثر احادیث کی طرح یہ احادیث روایت بالمعنی کے طور پر نقل ہوئی ہیں یعنی راوی نے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد کچھ اور ہو اور راوی نے کچھ اور سمجھ لیا ہو۔ باقی رہی وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی تاویل تو شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا دونوں کے نزدیک اس سے رفع روحانی اور رفع رتبی مراد ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی روح اٹھائی گئی تھی اور ان کا درجہ اور رتبہ بلند کیا گیا تھا۔ (۲)

رفع و نزول عیسیٰ اور قتل دجال کی یہی تاویلات مرزا غلام احمد قادیانی نے کی ہیں البتہ مرزا نے پہلے دعویٰ کیا تھا کہ میں ہی مسیح موعود ہوں اور بعد میں دعویٰ کیا تھا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہوں اس لئے اس کی اور اس کو ماننے والوں کی تکفیر کی گئی ہے اور اس کی تکفیر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا ختم نبوت کے قائل ہیں اور انہوں نے مسیح موعود ہونے یا نبی ہونے کے دعوے بھی نہیں کئے تھے مگر حیوۃ و نزول عیسیٰ سے انکار کرنے میں یہ دونوں مرزا غلام احمد قادیانی کے ہم نوا ہیں اور یہ بھی بہت بڑا تجدد و تفرد ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہو گئے تھے۔ جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ نزول عیسیٰ کے

---

(۱) فتاوی، شیخ شلتوت ص ۷۹

(۲) منار ۳۱۷

بارے میں احادیث متواتر نہیں ہیں تو جو حدیث سو سے زائد صحابہ سے مروی ہو اس کے تواتر سے انکار کرنا ایک امر بدیہی سے انکار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن جریر طبری' ابن کثیر' ابن حجر عسقلانی اور دوسرے اکابر محدثین نے نزول مسیح کی حدیث کو متواتر قرار دیا ہے۔(۱)

علوم الحدیث کے ممتاز اور اکابر ماہرین کی مدلل بات کے مقابلے میں شیخ محمد عبدہ کے تجدد و تفرد اور محض دعویٰ و تحکم کی بنیاد پر آخر ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ یہ حدیث متواتر نہیں ہے ؟ لیکن اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے تو حدیث مرفوع صحیح الاسناد اگر خبر واحد ہو پھر بھی وہ قرآن کی تفسیر میں پیش کی جاسکتی ہے اور آیت کا جو مفہوم اس سے ثابت ہوتا ہو اس کے خلاف دوسرا مفہوم قابل قبول نہیں ہو سکتا اور رفع عیسیٰ کا جو مفہوم اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ عیسیٰ آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے تھے اور اپنے وقت پر اتریں گے اور خلافت علی منہاج النبوۃ قائم کریں گے اس لئے یہ حدیث اگر متواتر نہ بھی ہو پھر بھی اس کے خلاف متجددین کی تاویلات قابل التفات نہیں ہیں اس کے علاوہ حیوۃ و نزول مسیح پر صحابہ کا اجماع بھی ثابت ہے اور خبر واحد صحیح الاسناد کے مفہوم پر جب صحابہ نے اجماع کر لیا ہو تو وہ مفہوم قطعی ہو جاتا ہے۔ رشید رضا نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت بالمعنی ہے تو اس کی دلیل کیا ہے کہ راوی نے مفہوم کے اخذ کرنے میں غلطی کی ہے ؟ اگر کسی دوسری حدیث میں یہ تصریح موجود ہوتی کہ فوت ہو چکے ہیں اور دوبارہ اس زمین پر تشریف نہیں لائیں گے تو یہ تصریح اس بات کی دلیل ہوتی کہ نزول مسیح کی احادیث روایت بالمعنی ہیں اور راویوں سے غلطی ہو گئی ہے لیکن جب اس کے مقابلے میں کوئی حدیث موجود نہیں ہے تو آخر کس بنیاد پر اسے روایت بالمعنی پر اور راوی کی غلطی پر محمول کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ میں تم کو وفات دینے والا ہوں تو جواب یہ ہے کہ تَوَفِّیْ کا لفظ موت کے معنوں میں صریح الدلالت اور قطعی الدلالت نہیں ہے بلکہ یہ لفظ مشترک

(۱) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ص ٦٢ تا ٦٥

ہے جو تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک موت دوسرا نیند اور تیسرا کسی چیز کو مکمل طور پر پوری طرح لے لینا۔ اَخْذُ الشَّيْءِ وَافِيًا اس جگہ نزول مسیح کے بارے میں احادیث مرفوعہ صحیحہ کی وجہ سے تیسرے معنے مراد ہیں اور موت کے معنے یہاں پر مراد نہیں لئے جا سکتے اس لئے کہ نزول کی احادیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام واپس اس زمین پر آکر جہاد کریں گے اور خلافت کا نظام چلائیں گے اور موت کے بعد کوئی شخص جہاد اور دوسرے اعمال کے لئے دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ بلکہ ابن جریر نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ

اِنَّ عِیْسٰی لَمْ یَمُتْ وَ اِنَّهٗ رَاجِعٌ اِلَیْکُمْ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ .

بے شک عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے اور وہ تمہارے پاس قیامت کے دن سے پہلے واپس آجائیں گے۔"

امام المفسرین ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے مُتَوَفِّیْكَ کے تین معانی بیان کرتے کے بعد لکھا ہے کہ :

وَ اَولٰی هٰذِهِ الْاَقْوَالِ بِالصِّحَّةِ عِنْدَنَا قَوْلُ مَنْ قَالَ معنٰی ذَالِكَ اِنِّیْ قَابِضُكَ مِنَ الْاَرْضِ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ لِتَوَاتُرِ الْاَخْبَارِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ یَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ فَیَقْتُلُ الدَّجَّالَ ثُمَّ یَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ مُدَّةً ذَکَرَهَا اِخْتَلَفَ الرِّوَایَةُ فِیْ مَبْلَغِهَا ثُمَّ یَمُوْتُ فَیُصَلِّیْ عَلَیْهِ الْمُسْلِمُوْنَ وَ یَدْفِنُوْنَهٗ .(۱)

"ہمارے نزدیک ان لوگوں کا قول بہترین اور صحیح ترین قول ہے جو کہتے ہیں کہ مُتَوَفِّیْكَ کے معنے ہیں میں تم کو زمین سے واپس لیتا ہوں اور تم کو اپنی طرف اٹھاتا ہوں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ یہ احادیث مروی ہیں کہ عیسیٰ بن مریم اترے گا' دجال کو قتل کرے گا' زمین پر کچھ مدت تک رہے گا جس کی مقدار میں روایات مختلف ہیں' پھر

(۱)تفسیر ابن جریر سورۃ آل عمران آیت ۵۵

وفات پائیں گے' مسلمان ان پر نماز جنازہ پڑھیں گے اور قبر میں دفن کریں گے۔

ابن جریر نے احادیث متواترہ پر استدلال کرتے ہوئے اَخْذُ الشَّيْءِ وَافِيًا کے معنوں کو ترجیح دی ہے اور میرے فہم کے مطابق بھی یہ بہترین توجیہ ہے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر نے توفی کے معانی ثلاثہ میں سے نوم کے معنوں کو ترجیح دی ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں تم کو سلا دینے والا ہوں اور نیند ہی کی حالت میں تم کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔

تَوَفِّی کا لفظ نیند کے معنوں میں قرآن و حدیث دونوں میں استعمال ہوا ہے سورۃ الانعام میں اللہ نے فرمایا ہے کہ وَهُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ اور وہی ہے جو تم کو سلا دیتا ہے رات کو اور حدیث میں نیند سے بیدار ہونے کا ذکر یہ بتایا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم کو موت کے بعد زندہ کیا ہے یعنی نیند سے بیدار کیا ہے۔

ابن کثیر نے بھی موت کی بجائے نوم کے معنوں کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ احادیث متواترہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم ابھی تک فوت نہیں ہوئے بلکہ نزول کے بعد فوت ہوں گے۔ باقی رہی رفع و نزول اور قتل دجال کی وہ تاویلات جو مرزا غلام احمد قادیانی اور شیخ محمد عبدہ نے کی ہیں تو ان پر میرا تبصرہ یہی ہے کہ قرآن و حدیث کے الفاظ کے حقیقی اور متبادر معنی کو چھوڑ کر بغیر کسی قرینے اور دلیل کے مجازی اور استعاراتی معانی لینا تفسیر نہیں ہے بلکہ تحریف ہے جو فرقہ باطنیہ کا طریقہ رہا ہے علماء راسخین کا طریقہ نہیں رہا۔

(۵) مسافر کے لئے پانی ملنے کے باوجود جواز تیمّم کا متجددانہ فتویٰ

سورۃ مائدہ میں نماز کے لئے وضوء اور غسل جنابت کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ:

وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ. (المائدہ ٦)

"اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم نے اپنی بیویوں سے جماع کیا ہو اور تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو! یعنی اس مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔"

دور نبوی سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے متجددین کے دور تک تمام مفسرین بمعہ صحابہ و تابعین کے اس بات پر متفق ہیں کہ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً کی قید کا تعلق آیت میں ذکر کردہ چاروں حالات سے ہے 'مرض اور سفر کی حالت میں بھی تیمّم کے جواز کے لئے پانی کا نہ ملنا شرط ہے اور مقیم ہونے کی حالت میں بھی تیمّم کے جواز کے لئے پانی کی نایابی شرط ہے اسی طرح حدث اصغر کی حالت میں بھی تیمّم تب جائز ہو گا کہ پانی موجود نہ ہو اور حدث اکبر کے لئے بھی تیمّم اسی وقت جائز ہو گا کہ پانی نہ ملے گا البتہ احادیث صحیحہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اگر مریض کے لئے پانی کا استعمال نقصان دہ ہو یا وہ پانی کے استعمال کی قدرت ہی نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے پانی کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں اور وہ پانی کے ہوتے ہوئے بھی تیمم سے نماز پڑھ سکتا ہے لیکن سفر کی حالت میں پانی ملنے کے باوجود تیمّم کی اجازت اس آیت سے بھی معلوم نہیں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث میں بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ

اس آیت کا تو شان نزول ہی سفر کی وہ حالت ہے جس میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے لوگ پریشان تھے کہ نماز قضا ہو رہی ہے۔

صحیح بخاری میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی ساتھ ایک سفر سے مدینہ واپس آرہے تھے کہ بیداء کے مقام پر مجھ سے ہار گر گیا جس کی تلاش میں قافلہ رکا یہاں تک کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا اور اس جگہ پر پانی موجود نہیں تھا اور لوگوں کے پاس بھی پانی ختم ہو گیا تھا۔

فَالْتُمِسَ الْمَاءُ فَلَمْ يُوْجَدْ فَنَزَلَتْ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ اِلٰى آخِرِ الْآيَةِ

پانی تلاش کیا گیا مگر مل نہ سکا تو وضوء اور تیمم کی آیت نازل ہوئی۔(۱)

اس حدیث میں تصریح موجود ہے کہ پانی موجود بھی نہیں تھا اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا تھا اور اس حالت کے بارے میں تیمم کا حکم نازل ہوا تھا۔ شان نزول کی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر کی حالت میں بھی تیمم اسی وقت جائز ہے کہ پانی تلاش کے باوجود مل نہ سکے۔

عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک شخص کو دیکھا کہ لوگوں سے الگ بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا اے فلاں! تجھے قوم کے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا تھا؟ اس نے کہا کہ میں جنابت میں ہوں اور پانی نہیں ہے کہ غسل کر لوں۔ آپ نے فرمایا تیرے لئے مٹی سے تیمم کافی ہے۔(۲)

اس حدیث میں بھی تصریح ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ نے تیمم

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ المائدہ

(۲) بخاری باب التیمم

کو کافی قرار دیا ہے' اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری عمر میں ایک بار بھی پانی کی موجودگی میں تیمم سے نماز نہیں پڑھی نہ سفر کی حالت میں اور نہ حضر کی حالت میں۔ حالانکہ آپ کی عادت تھی کہ جو کام واجب نہ ہوتا تو بعض اوقات اس کام کو چھوڑ دیتے تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ یہ کام واجب نہیں ہے۔ اگر مسافر کے لئے پانی دستیاب ہونے کی حالت میں بھی تیمم جائز ہوتا اور وضوء فرض نہ ہوتا بلکہ صرف مستحب ہوتا تو کبھی کبھی تیمم پر اکتفا فرما لیتے اور وضوء کو ترک کر دیتے لیکن آپ نے تو ایک بار بھی ایسا نہیں کیا۔ شان نزول کی حدیث اور تعامل رسول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سفر اور حضر دونوں حالتوں میں جواز تیمم کے لئے پانی کا دستیاب نہ ہونا شرط ہے اور حدیث رسول' تعامل رسول اور تعامل صحابہ کے خلاف آیت تیمم کی دوسری تاویل کرنا "تفسیر بالرائے المذموم" ہے 'تجدد ہے اور اصول تفسیر و اصول دین سے آزاد عقلیت اور شتر بے مہار قسم کی جدیدیت ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ مرض اور سفر کی ساتھ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً کی قید کیوں نہیں لگائی گئی؟ تو جواب یہ ہے کہ قید تو مرض و صحت اور سفر و حضر چاروں حالات کے ساتھ آخر میں لگا دی گئی ہے البتہ مرض و سفر کے ساتھ الگ سے مستقل طور پر یہ قید نہیں لگائی گئی اس کے لئے کوئی نکتہ اور وجہ معلوم کرنے کے لئے غور و فکر کرنا چاہئے روح المعانی میں اسی نکتے کے اعتبار سے آیت کو معضل کہا گیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے مگر سید رشید رضا نے المنار میں صاحب روح المعانی اور دوسرے مفسرین پر طنز کیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور آیت کو معضل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ روح المعانی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تیمم کی آیت سفر کی اس حالت کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ پانی موجود نہ ہو لہذا پانی دستیاب ہونے کی حالت میں مسافر کے لئے بھی تیمم جائز نہیں ہے اور شیخ محمد عبدہ نے جن ۲۵ تفاسیر کا حوالہ دیا ہے ان میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے بلکہ تمام تفاسیر نے اسی طرح لکھا ہے اور یہ ان کا شخصی مذہب نہیں ہے بلکہ حدیث رسول' تعامل رسول اور تعامل صحابہ

سے ثابت شدہ مذہب ہے۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً کی قید کے مستقل طور پر ذکر نہ کرنے کی کوئی وجہ اگر معلوم ہو جائے تو فبھا لیکن اگر ہمارا ذہن یہ وجہ معلوم نہ کر سکے تو اس سے آیت کے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ مفہوم حدیث رسول سے ثابت ہے جسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض نکتہ رس محققین نے لکھا ہے کہ چونکہ مرض کی حالت میں اکثر پانی کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے اور سفر کی حالت میں اکثر دستیاب نہیں ہوتا خاص طور پر صحراؤں اور بیابانوں کے سفر میں اس لئے مرض اور سفر کے ساتھ مستقل طور پر پانی نہ ملنے کی قید نہیں لگائی گئی اور بستیوں میں رہائش رکھنے والوں کے پاس اکثر پانی موجود ہوتا ہے اور شاذ و نادر طور پر کبھی کبھی مفقود ہو جاتا ہے اس لئے مقیمین کے لئے تصریح کر دی گئی کہ اگر بستیوں میں بھی پانی نہ مل سکے تو پھر تیمم کر لیا کرو مگر شیخ محمد عبدہ اور اس کے تلامذہ چونکہ دین میں بھی جدت پسند واقع ہوئے ہیں اور پوری امت یا اس کی اکثریت سے الگ تنہا پرواز میں ان کو بڑا لطف محسوس ہوتا ہے اس لئے تعامل رسول' تعامل صحابہ اور شان نزول کی حدیث کو نظر انداز کر کے رشید رضا اپنے شیخ کی تفسیر اس طرح نقل کرتے ہیں :

اَلْمَعْنٰی اَنَّ حُکْمَ الْمَرِیْضِ وَالْمُسَافِرِ اِذَا اَرَادَ الصَّلٰوۃَ کَحُکْمِ الْمُحْدِثِ حَدَثًا اَصْغَرَ اَوْ مُلَامِسِ النِّسَاءِ وَلَمْ یَجِدِ الْمَاءَ فَعَلٰی کُلٍّ ھٰؤُلَاءِ التَّیَمُّمُ فقط ھٰذَا مَا یَفْھَمُہُ الْقَارِیُ مِنَ الْاٰیَۃِ نَفْسِھَا اِذَا لَمْ یُکَلِّفْ نَفْسَہٗ حَمْلَھَا عَلٰی مَذْھَبٍ مِنْ وَّرَآءِ الْقُرْاٰنِ یَجْعَلُھَا بِالتَّکَلُّفِ حُجَّۃً لَہ مُنْطَبِقَۃً عَلَیْہِ وَ قَدْ طَالَعْتُ فِی تَفْسِیْرِھَا خَمْسَۃً وَّ عِشْرِیْنَ تَفْسِیْرًا فَلَمْ اَرَ فِیْھَا غِنَاءً وَلَا رَاَیْتُ قَوْلًا فِیْھَا یَسْلَمُ مِنَ التَّکَلُّفِ ثُمَّ رَجَعْتُ اِلَی الْمُصْحَفِ وَحْدَہٗ فَوَجَدْتُ المعنی وَاضِحًا جَلِیًّا.(۱)

''اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مریض اور مسافر جب نماز کا ارادہ کریں تو ان کے لئے اسی طرح کا حکم ہے جو حدث اصغر والوں اور عورتوں سے جماع کرنے والوں کا ہے جب کہ ان کو پانی نہ مل سکے ان میں سے ہر ایک پر صرف تیمم لازم ہے۔ یہ وہ مفہوم ہے جسے ہر قاری نفس

(۱) تفسیر المنار ص۱۱۹ ج۵

آیت سے سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ اس نے اپنے آپ کو قرآن کے علاوہ کسی اور مذہب کا مکلف نہ بنایا ہو جس کے لئے وہ تکلف کر کے آیت کو حجت بناتا ہو اور اسے اس مذہب پر منطبق کرتا ہو میں نے اس آیت کی تفسیر کے دوران ۲۵ تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے مگر میں نے ان میں کوئی مفید بات نہیں پائی اور نہ ان میں تکلف سے خالی کوئی قول دیکھا ہے اس کے بعد میں نے صرف مصحف کی طرف رجوع کیا تو اس میں میں نے کھلا اور واضح مفہوم پالیا۔" (کہ مسافر کے لئے پانی کے ہوتے ہوئے بھی تیمم جائز ہے)

جس قاری کا ذہن تجدد فی الدین کے جراثیم سے پاک وصاف ہو اور وہ تنہا پرواز کا شوقین نہ ہو وہ تو آیت سے یہی سمجھے گا اور یہی سمجھتا رہا ہے کہ مسافر اور مقیم دونوں کے لئے حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں حالتوں میں تیمم اسی وقت جائز ہے کہ پانی موجود نہ ہو اس لئے کہ آخر میں ذکر شدہ شرط تمام سابقہ جملوں سے متعلق ہوتی ہے الا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو اور یہاں پر نہ صرف یہ کہ مانع موجود نہیں ہے بلکہ اس بات کی دلیل موجود ہے کہ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً کی شرط مسافر اور مقیم دونوں سے متعلق ہے اور وہ دلیل ہے تعامل رسول اور تعامل اصحاب رسول شیخ محمد عبدہ کا مکتب فکر تقلید کا شدید مخالف ہے لیکن تعجب ہے کہ سید رشید رضا اور شیخ محمود شلتوت اپنے شیخ کی انفرادی رائے کی تقلید کرتے ہوئے اس کا دفاع کرتے ہیں اور احادیث و آثار کی روشنی میں مفسرین و محدثین اور ائمہ مجتہدین کی قائم کردہ رائے کو بڑی دلیری اور سینہ زوری کے ساتھ یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب لوگ مقلدین ہیں۔

اس باب میں متجددین کے تجدد کی چند مثالیں اس لئے پیش کی گئی ہیں اور ان پر مختصر سا تبصرہ اس لئے تحریر میں لایا گیا ہے تاکہ میرے احباب اور اصحاب اور میری اس کتاب کے قارئین متجددین کے فتنہ تجدد سے باخبر ہو سکیں اور ان کی تحریریں پڑھنے سے قبل ان کی بگڑی ہوئی ذہنیت سے واقفیت حاصل کرلیں اور عامۃ المسلمین کو فتنہ و تجدد کے جراثیم سے بچانے کی کوشش کر سکیں۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

باب دھم

مدون تفاسیر
اور
تعارف مفسرین

مدون تفاسیر اور تعارف مفسرین

تدوین تفسیر اور مدون تفاسیر کا آغاز بنو امیہ کے دور اخیر اور بنو عباس کے دور اول میں ہوا تھا اس سے قبل قرآن کی تفسیر اور تفہیم نقل وروایت کے ذریعے ہوتی تھی۔ صحابہ تفسیری روایات واحادیث رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بتاتے اور سمجھاتے تھے اور تابعین تفسیر سے متعلق احادیث و آثار صحابہ سے نقل کرتے تھے اور ایک دوسرے سے سمجھنے اور سیکھنے کی کوشش کرتے تھے مگر تعلیم و تعلم اور فہم و تفہیم کا یہ سارا سلسلہ زبانی تھا اور سننے سنانے پر مبنی تھا۔ اگرچہ دور صحابہ و تابعین میں تفسیری روایات کے صحیفے بھی لکھے گئے تھے لیکن پورے قرآن کی تفسیر آیات اور سور کی ترتیب کے مطابق مدون نہیں ہوئی تھی جس طرح کہ احادیث رسول کی کتابت تو دور نبوی میں شروع ہو گئی تھی اور صحابہ و تابعین نے احادیث کے مجموعے اور صحیفے بھی لکھے تھے لیکن باقاعدہ کتب اور ابواب کی شکل میں تدوین حدیث کا آغاز بعد میں ہوا تھا اسی طرح تدوین تفسیر کا کام بھی بعد میں شروع ہوا تھا۔ صحابہ اور تابعین کے مراکز تفسیر اور مشہور مفسرین کا تعارف اس کتاب کے آٹھویں باب میں کروادیا گیا ہے' اہل سنت کے اصول تفسیر اور منہج تفسیر کی تفصیل بھی اسی باب میں بیان ہو چکی ہے اور اہل سنت کے مقابلے میں اہل جدت کا منہج تفسیر نویں باب میں بتادیا گیا ہے اب اس کتاب کے دسویں اور آخری باب میں مدون تفاسیر اور ان کے مصنفین کا تعارف کروایا جارہا ہے اور قدر و قیمت اور افادیت کے اعتبار سے ان تفاسیر پر تبصرے بھی بقدر ضرورت تحریر کئے جائیں گے تاکہ تفسیر کے طالب علم ان کا مطالعہ کرتے وقت متنبہ رہیں۔ مگر اس باب میں انہی مفسرین اور ان کی تفاسیر کا تعارف کروایا گیا ہے جو باب ہشتم میں بیان کردہ اصول تفسیر کی پابندی کرتے تھے خواہ وہ احادیث و آثار کی روشنی میں تفسیر کرتے

تھے یا عقل واجتہاد کے ذریعے قرآن کریم سے احکام و قوانین کا استخراج کرتے تھے یا عربیت اور بلاغت کے قواعد کی روشنی میں علمی نکات بیان کرتے تھے۔ خوارج' معتزلہ' روافض اور دوسرے مبتدعین و متجددین کی تفاسیر کا تذکرہ ارادتاً نہیں کیا گیا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی کوئی افادیت نہیں ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل جدت واہل بدعت کا منہج تفسیر نویں باب میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے قارئین سمجھ لیں گے کہ ان کی تفاسیر آزاد عقلیت اور سنت کے مقابلے میں جدت وبدعت فی الدین کے منہج پر مبنی ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ غیر ضروری طور پر کتاب کی ضخامت بڑھ جائے گی۔ مستقل طور پر تدوین تفسیر کے آغاز سے پہلے محدثین احادیث کی کتابوں میں کتاب التفسیر یاابواب التفسیر کے عنوان کے تحت تفسیر سے متعلق احادیث و آثار نقل کرتے تھے لیکن ان کی حیثیت مستقل کتاب کی نہیں تھی بلکہ احادیث کی کتابوں کے ایک حصے کی تھی۔ تفسیر سے متعلق یہ ابواب احادیث کی متداول کتابوں میں آج بھی موجود ہیں اور بہت بڑی افادیت کے حامل ہیں مثلاً صحیح بخاری' سنن ترمذی' سنن نسائی اور دوسری کتابوں کے تفسیر سے متعلق ابواب اور مباحث کی تدریس کو دینی مدارس میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے مگر پورے قرآن کی مستقل طور پر مدون تفسیر لکھنے کا آغاز جن مفسرین نے کیا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) ابن ماجہؒ ---المولود ۲۰۷ھ--- المتوفی ۲۷۵ھ :

ابو عبداللہ محمد بن یزید الربعی القزوینی الشہیر بابن ماجہ۔ یہ عرب کے مشہور قبیلے بنو ربیعہ کے مولی تھے اس لئے اس کو ربعی کہا جاتا ہے' قزوینی نسبت ہے قزوین کی طرف جو آذربائیجان کے علاقے میں مشہور شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد شاہ پور ذوالاکتاف نے رکھی تھی۔ یہ شہر ۲۴ھ میں خلافت عثمانی کے دور میں براء بن عازب کی قیادت میں فتح ہوا تھا۔ ماجہ ان کے والد یزید کا لقب تھا اس لئے یہ ابن ماجہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ماجہ فارسی لفظ ماہ یا ماجہ سے معرب ہے جن کے معنی ہیں چاند۔ بعض کے نزدیک یہ اس کی والدہ کا

لقب تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس کے دادا کا لقب تھا لیکن امام نووی نے تہذیب الاسماء و اللغات میں ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اور ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ یہ دونوں قول صحیح نہیں ہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ ماجہ ان کے والد کا لقب تھا۔ حدیث میں تو اس کی کتاب سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہے لیکن انہوں نے قرآن کی مستقل تفسیر بھی لکھی تھی۔

(۲) ابن جریر طبریؒ --- المولود ۲۲۴ھ --- المتوفی ۳۱۰ھ :

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد الطبری، طبرستان کے مرکزی شہر آمل میں پیدا ہوئے تھے اور بغداد میں وفات پائی تھی۔ اس کی تفسیر دار الفکر بیروت نے ۱۹۸۸ء میں ۳۰ اجزاء اور ۱۵ جلدوں میں چھاپی ہے اور معروف و متداول تفسیر ہے۔ ابن جریر کا تفصیلی تعارف بعد میں پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ

(۳) ابن المنذر النیشاپوری --- المتوفی ۳۱۸ھ :

ابو بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری شیخ الحرم۔ نیشاپور مشہور شہر ہے اس کی نسبت سے اسے نیشاپوری کہا جاتا ہے مگر اس نے نقل مکانی کر کے مکہ مکرمہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اس لئے یہ شیخ الحرم کے لقب سے مشہور ہیں۔ ابو اسحاق شیرازی نے تو کہا ہے کہ اس کی وفات مکہ میں ۳۰۹ھ میں ہوئی تھی لیکن حافظ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ محمد بن یحیی بن عمار نے ۳۱۶ھ میں ان سے ملاقات کی تھی اور سماع بھی کیا تھا، ابن القطان فاسیؒ نے اس کا سال وفات ۳۱۸ھ بتایا ہے۔ یہ حافظ اور فقیہ تھے فقہ میں اس نے المبسوط کے نام سے ایسی کتاب لکھی ہے جس کی مثال نہیں ملتی اور اختلافی مسائل میں ان کی کتاب "الاشراف فی اختلاف العلماء" بڑی مفید کتاب ہے۔ یہ کسی امام کے مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد تھے لیکن ابو اسحاق شیرازیؒ نے اس کو فقہاء شافعیہ میں شمار کیا ہے(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ للذہبی طبع حیدر آباد دکن ص ۷۸۲ ج ۳

تاج الدین سبکی متوفی ۷۷۱ھ نے لکھا ہے کہ محمد بن نصر' محمد بن جریر' محمد بن خزیمہ اور محمد بن منذر چاروں اجتہاد مطلق کے درجے پر فائز تھے لیکن ان کی اجتہادی آراء امام شافعی کی آراء کے موافق تھیں اس لئے یہ فقہاء شافعیہ میں شمار ہوتے ہیں۔(۱)

حافظ شمس الدین داؤدی متوفی ۹۴۵ھ نے لکھا ہے کہ اس نے قرآن کی ایسی تفسیر لکھی تھی جس کی مثال نہیں تھی۔(۲)

(۴) ابن ابی حاتم رازیؒ ---المولود ۲۴۰ھ---المتوفی ۳۲۷ھ :

شیخ الاسلام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی۔

ان کے والد ابو حاتم کے اسم کنیہ سے مشہور ہیں مگر اس کا نام محمد بن ادریس تھا اور ایران کے مشہور شہر "رَیّ" کی نسبت سے رازی کہلائے جاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور ان کے والد ابو حاتم دونوں باپ بیٹے حافظ الحدیث تھے اور اپنے دور میں دینی امامت کے منصب پر فائز تھے۔ ان سے مروی ہے کہ ۲۵۵ھ میں میرے والد مجھے لے کر سفر پر روانہ ہوئے تاکہ مجھے بڑے بڑے محدثین اور علماء سے ملائے اور مجھے ان سے براہ راست احادیث سننے کی سعادت نصیب ہو جائے۔ ہم جب ذو الحلیفہ (اہل مدینہ کا میقات ہے) پہنچے تو میں بالغ ہو گیا اس پر میرے والد بہت خوش ہوئے کہ میں اب فرضی حج ادا کر سکوں گا۔ اگر بلوغ کو نہ پہنچا ہوتا اور ذو الحلیفہ سے احرام باندھ کر حج کر لیتا تو یہ نفلی حج شمار ہوتا اور فرض حج میرے ذمے باقی رہتا۔ اس سفر میں انہوں نے وقت کے اکابر محدثین اور فقہاء کی مجالس میں شرکت کر کے "اسانید عالیہ" حاصل کئے' ۵ سال بعد ۲۶۰ھ میں انہوں نے دوبارہ اپنے والد کے ہمراہ حج کیا اور مختلف اہل علم سے شرف تلمذ حاصل کیا' اس کے دو سال بعد ۲۶۲ھ میں علم کی طلب میں شام اور مصر کا سفر کیا اور ۲۶۴ھ میں مشہور علمی مرکز اصبہان تشریف لے گئے اور پھر علم و

(۱)طبقات الشافعية الكبرى للسبكي ص۱۰۲ ج۳

(۲)طبقات المفسرين طبع بيروت ص٥٦ ج۲

تحقیق اور تدریس و تصنیف کا کام جاری رکھتے ہوئے محرم ۳۲۷ھ میں وفات پائی۔ ان کے والد ابو حاتم رازیؒ اور ابو زرعہ رازیؒ ممتاز ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں اور ان دونوں کے پاس جتنا علم تھا وہ اس نے ان سے حاصل کر لیا تھا۔ ابن ابی حاتم ابن جریر طبری اور صحاح ستہ کے مصنفین کے ہم عصر تھے اور تدوین تفسیر و تدوین حدیث کا زیادہ کام اسی دور میں ہوا تھا۔

یہ علوم اور رواۃ الحدیث کے بارے میں معلومات کا ایک سمندر تھے جس کا ثبوت اس کی مشہور کتاب الجرح والتعدیل ہے۔ بہت بڑے عابد اور زاہد تھے ان کے والد کہا کرتے تھے کہ عبدالرحمٰن کی طرح عبادت کون کر سکتا ہے؟ مجھے معلوم نہیں ہے کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہو' انہوں نے فقہ' اختلاف الصحابۃ والتابعین کے موضوعات پر بہترین کتابیں لکھی تھیں اور کئی جلدوں میں قرآن کی تفسیر لکھی تھی جس کا نام ہے "تفسیر القرآن العظیم مسند عن الرسول والصحابة والتابعين."(۱)

ان کی تفسیر کے بارے میں حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں :

وَ لَهُ التَّفْسِيْرُ الْحَافِلُ الَّذِیْ اِشْتَمَلَ عَلَى النَّقْلِ الْكَامِلِ الَّذِیْ يَرْبُوْ فِيْهِ عَلٰى تفسير ابن جرير الطبرى وَ غَيْرِهٖ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ اِلٰى زَمَانِنَا.(۲)

"ابن ابی حاتم نے ایک جامع تفسیر لکھی ہے جو کامل نقل و روایت پر مشتمل ہے جو احادیث و آثار کے نقل کے بارے میں ابن جریر طبری کی تفسیر پر فوقیت رکھتی ہے اور ہمارے زمانے تک دوسرے مفسرین کی تفاسیر پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔"

اس میں احادیث رسول' آثار صحابہ' آثار تابعین' آثار تبع تابعین اور تبع تابعین کے تلامذہ کے آثار بڑی کثرت کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں یہاں تک کہ قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر کے بارے میں بھی اگر اسے کوئی روایت مل جائے تو اسے بھی نقل کر دیتے ہیں۔ ابن

(۱) تذكرة الحفاظ للذهبی ص۸۲۹تا۸۳۱ج۳

(۲) البدايه والنهايه لابن كثير ص ۱۹۱ ج۱۱ طبع مكتبة المعارف بيروت ۱۹۶۶

کثیرؒ نے کثرت روایات کے اعتبار سے اسے ابن جریر پر فوقیت دی ہے ورنہ دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ابن جریر کا مقام بہت بلند ہے' شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی اس سے اپنی کتابوں میں روایات نقل کی ہیں' ابن حجر فتح الباری میں اور علامہ عینی عمدۃ القاری میں بھی اس تفسیر سے روایات نقل کرتے ہیں اور تفسیر ابن کثیر اور تفسیر درمنثور کی روایات کا تو بہت بڑا ماخذ یہی تفسیر ہے لیکن اس میں ضعیف اور غریب احادیث و آثار بھی بڑی تعداد میں نقل ہوئے ہیں۔

اس کی دو ضخیم جلدیں جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے ڈاکٹر احمد عبداللہ العماری کی تخریج اور تحقیق کے ساتھ دار طیبہ ریاض نے ۱۴۰۲ھ میں بہترین کتابت اور طباعت کے ساتھ اعلیٰ کاغذ پر چھاپ کر شائع کی ہیں۔ یہ دو جلدیں سورہ فاتحہ' سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کی تفسیر پر مشتمل ہیں اور یہ دونوں جلدیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں مگر باقی جلدوں کے بارے میں مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ چھپ چکی ہیں یا زیر طباعت ہیں یا ان کے مخطوطے ملے ہی نہیں ہیں۔

(۵) ابن مردویہؒ ---المولود ۳۲۳ھ --- المتوفی ۴۱۰ھ :

حافظ ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ الاصبھانی۔

ایران کے قدیم علمی مرکز اصبہان کی نسبت سے اصبہانی کہلایا جاتا ہے اور مردویہ ان کے دادا کا نام ہے جس کی نسبت سے یہ ابن مردویہ کے نام سے مشہور ہیں اور اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں' مردویہ فارسی نام ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری پر مستخرج بھی لکھی ہے اور تفسیر بھی لکھی ہے جس کے حوالے سے ابن کثیر' درمنثور اور دوسری تفاسیر میں روایات نقل کی گئی ہیں۔(۱)

مذکورہ پانچ مفسرین میں سے صرف ابن جریر کی تفسیر دستیاب ہے اور متداول ہے باقی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۵۰ ج ۳

نایاب ہیں مگر انہوں نے چونکہ علم تفسیر کو مستقل فن کا درجہ دینے اور پورے قرآن کی مدون و مرتب تفاسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا اس لئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اب آئندہ عنوانات کے تحت ان تفاسیر کا تعارف کرایا جائے گا جو مطبوعہ ہیں اور دستیاب ہیں۔ لیکن تمام تفاسیر کا بالاستیعاب تعارف ضروری بھی نہیں ہے اور میرے لئے ممکن بھی نہیں ہے صرف مشہور تفاسیر کا تعارف کرایا جائے گا۔

لغت اور اعراب بیان کرنے والی تفسیریں

لغت اور اعراب کا بقدر ضرورت بیان تو تمام مفسرین کرتے ہیں اس لئے کہ اس کے بغیر آیات کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن بعض علماء نے اس کے لئے مستقل تفسیریں لکھی ہیں جن میں مشکل اور غریب الفاظ کے معانی بیان کئے گئے ہیں اور نحوی قواعد کی روشنی میں اعراب کی وضاحت کی گئی ہے' اس عنوان کے تحت انہی تفاسیر کا ذکر کیا جائے گا جن کا موضوع ہی لغوی معانی اور اعراب کا بیان ہے۔

(۱) معانی القرآن للفراء متوفی ۲۰۷ھ

فراء نحوی علم نحو کے بہت بڑے امام تھے' قواعد عربیت کے بارے میں کوفہ کے نحویین اور بصرہ کے نحویین کے درمیان اختلافات بھی تھے۔ فراء کوفہ کے نحویین کے امام تھے۔ فراء کا نام یحیٰی بن زیاد تھا لیکن یہ فراء کے نام سے مشہور ہیں اور اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ ایک احتمال تو یہ ہے کہ فراء پوستین بنانے والے اور پوستین فروخت کرنے والے کو کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس کا یا اس کے خاندان کا یہ پیشہ ہو لیکن بعض اہل علم کا قول ہے کہ پوستین بافی یا پوستین فروشی کا کام اس نے بھی نہیں کیا تھا اور

اس کے خاندان میں بھی کسی نے نہیں کیا تھااور فراء کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑے عجیب وغریب اور حسین اسلوب میں باتیں کرتے تھے کہ سننے والا اس کے حسن کمال سے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتا تھا' یہ توجیہ ایک عربی محاورے سے ماخوذ ہے جسے ازہری متوفی ۳۷۰ھ نے تہذیب اللغۃ میں اور ابن الفارس متوفی ۳۹۵ھ نے مقاییس اللغۃ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ :

فُلَانٌ يَفْرِى الفَرِىٓ اے يَاتِىْ بالعَجَبِ.(۱)

"فلاں عجیب کام یا عجیب باتیں کرتا ہے۔"

قرآن کریم میں بھی فَرِیٌّ کا لفظ عجیب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ولادت عیسیٰ کے سلسلے میں آیا ہے کہ :

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (مریم ۲۷)

"پس وہ عیسیٰ کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں' اس کی قوم نے کہا اے مریم! تم تو عجیب چیز لے کر آئی ہو۔"

یعنی شوہر کے بغیر بیٹا لے آنا ایک عجیب حرکت ہے جو تم نے کی ہے۔ اس توجیہ کے اعتبار سے فراء مبالغہ کا صیغہ ہے اور ہمزہ یاء کا بدل ہے واو کا بدل نہیں ہے یعنی فَرْوٌ سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ فَرْیٌ سے ماخوذ ہے۔ اس قول میں مجھے تکلف سا محسوس ہوتا ہے اور بادی النظر میں پہلی توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے جس کے نظائر بھی موجود ہیں مثلاً کپڑے کا کاروبار کرنے والے کو بزاز' عطر فروش کو عطار اور شیشے کا کاروبار کرنے والے کو زجاج کہا جاتا ہے۔ بہر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو یہ عظیم امام عربیت فراء نحوی کے نام ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ۱۴۴ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے تھے یہ زمانہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کی حکومت کا تھا اور کوفہ بہت بڑا علمی مرکز تھا جس میں مختلف علوم وفنون کے ائمہ اور شیوخ رہتے تھے۔ فراء

---

(۱) تہذیب اللغۃ ص ۱۷۳ ج ۱۵ + مقاییس اللغۃ ص ۸۱۵

نے سب سے پہلے کوفہ کے شیوخ سے علوم وفنون حاصل کیے اور پھر بغداد میں رہائش اختیار کرلی اور بغداد ہی میں ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک مکہ سے واپس آتے ہوئے راستے میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ مشہور حنفی فقیہ امام محمد بن حسن شیبانی فراء کی خالہ کے بیٹے تھے یعنی ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ مشہور نحوی عالم ثعلب کا قول ہے کہ لَوْلَا الْفَرَّاءُ لَسَقَطَتِ الْعَرَبِيَّةُ "اگر فراء نہ ہوتے تو عربی زبان گر جاتی۔" امیر المؤمنین مامون نے فراء کو حکم دیا کہ ایسی کتاب لکھو جس میں علم نحو کے اصول اور عربیت کے قواعد بیان کیے گئے ہوں' چونکہ علمی اور تحقیقی کام کے لئے یکسوئی اور تنہائی ضروری ہوتی ہے اس لئے سرکاری خرچ پر اس کی ضروریات اور حوائج پوری کرنے کے لئے خدمت گار مقرر کر دیئے گئے' یہاں تک کہ نماز کے وقت کی اطلاع دینے کے لئے بھی ایک خادم مقرر تھا تاکہ اسے کسی قسم کی ذہنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور لکھنے والے بھی مقرر کر دیئے گئے تھے جو اس کے بیانات کو قلمبند کرنے کے لئے ہر وقت تیار بیٹھے رہتے تھے۔ چنانچہ اس نے چند سالوں میں "الحدود" کے نام سے بطریق املاء ایک کتاب مرتب کروادی جس میں عربی زبان کے ۶۰ قواعد بیان کئے گئے تھے۔ مامون نے فراء کو اپنے دو بیٹوں کو نحو کی تعلیم و تربیت دینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایک روز یہ کسی کام کے لئے مجلس سے اٹھے تو یہ دونوں شاگرد جوتیاں اٹھانے پر آپس میں لڑ پڑے اور آخر کار اس پر دونوں کی صلح ہوگئی کہ ہر ایک ایک ایک جوتی اٹھائے گا۔ مامون کو جب اس کی اطلاع ملی تو فراء کو دربار میں بلا کر پوچھا کہ ہمارے شہر میں سب سے زیادہ معزز شخص کون ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے تو امیر المؤمنین سے زیادہ معزز شخص معلوم نہیں ہے۔ مامون نے کہا سب سے بڑا معزز شخص تو وہ ہے جس کی جوتیاں اٹھانے پر امیر المومنین کے دو بیٹے جو ولی عہد بھی ہیں آپس میں لڑتے ہیں۔ فراء نے کہا میں نے ان کو روکنے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ ان کی دل شکنی ہو جائے گی اور یہ ایک شرف سے محروم ہو جائیں گے۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک روز اس نے حسن

حسین کی سواری کی رکاب پکڑی تو ایک شخص نے کہا کہ تم ان لڑکوں کی رکاب کیوں تھام رہے ہو حالانکہ تم ان سے عمر میں بڑے ہو؟ ابن عباسؓ نے کہا خاموش رہو اے جاہل! صاحب فضل و شرف کا مقام وہی شخص پہچان سکتا ہے جو خود بھی فضل و شرف کا حامل ہو' مامون نے کہا اگر تم نے ان کو جوتیاں اٹھانے سے روکا ہوتا تو میں اسے تیری غلطی سمجھتا۔ میرے بیٹوں کے اس عمل سے ان کی شان میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔ کوئی شخص اگر بڑا ہو پھر بھی وہ اپنے امیر اور اپنے والد اور اپنے استاد سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد مامون نے خوش ہو کر بیٹوں کو ۲۰ ہزار دینار دیئے اور اچھی تربیت پر فراء کو ۱۰ ہزار دینار کا تحفہ دیا۔

ابن الانباری متوفی ۵۷۷ھ نے فرمایا ہے کہ :

وَلَوْ لَمْ يَكُنْ لِاَهْلِ بَغْدَادَ وَ الْكُوْفَةِ مِنْ عُلَمَاءِ الْعَرَبِيَّةِ اِلَّا الْكِسَائِيُّ وَالْفَرَّاءُ لَكَانَ لَهُمْ بِهِمَا الْاِفْتِخَارُ عَلٰى جَمِيْعِ النَّاسِ اِذِانْتَهَتِ الْعُلُوْمُ اِلَيْهِمَا وَ كَانَ يُقَالُ اَلنَّحْوُ الْفَرَّاءُ وَالْفَرَّاءُ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي النَّحْوِ.

"اگر کوفہ اور بغداد والوں کے پاس عربیت کے علماء میں سے کسائی اور فراء کے علاوہ اور کوئی نہ ہوتا تو پھر بھی وہ ان کی وجہ سے تمام لوگوں پر فخر کر سکتے تھے اس لئے کہ سارے علوم ان پر ختم ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ نحو تو فراء ہی کا نام ہے اور نحو میں فراء امیر المؤمنین ہے۔"

فراء کی کتابوں میں "معانی القرآن" کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ امام بخاری نے بھی بعض مقامات پر اس کے حوالے دیئے ہیں اور ابن جریر نے تو اس کے حوالے بار بار دیئے ہیں۔ یہ کتاب بھی "الحدود" کی طرح بطریق املاء لکھوائی گئی تھی۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ جس مجلس میں معانی القرآن پر بیان ہوتا تھا اس میں بے شمار لوگ شرکت کرتے تھے جن میں ۸۰ علماء وہ تھے جو مختلف علاقوں کے قاضی تھے' معانی القرآن لکھنے والے

تو بہت تھے لیکن محمد بن جہم سمری لکھنے اور مرتب کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے اور ہر وقت حاضر رہتے تھے اس لئے اس کتاب کا راوی یہی ہے اور اس کے نسخے سے دوسرے لوگوں نے نقول تیار کی ہیں۔ سمر بصرے اور واسط کے درمیان ایک شہر ہے یہ اس کی طرف منسوب ہے ان کی ولادت ۱۸۸ھ میں ہوئی تھی اور ۲۷۷ھ میں وفات پائی تھی۔ اس نے فراء سے علم نوجوانی کی عمر میں حاصل کیا تھا' فراء کی موت کے وقت اس کی عمر ۱۹ سال تھی۔(۱)

اس کتاب میں نحو اور عربیت کے اعتبار سے بڑے دقیق مباحث موجود ہیں' یہ مکمل تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر سورہ کی مخصوص و منتخب آیات کی تفسیر کی گئی ہے اور اشکالات حل کئے گئے ہیں مگر علم کی جولانی کی وجہ سے بعض غیر ضروری بحثیں بھی آگئی ہیں مثلاً الحمد للہ کی اعراب بیان کرتے ہوئے رفع' نصب اور جر تینوں کی نحوی توجیہات بیان کی گئی ہیں حالانکہ متواتر قراءت رفع ہے اور نصب یا جر کی نحوی توجیہ اگرچہ ہو سکتی ہے لیکن جب یہ متواتر قراءت نہیں ہے اور مصحف عثمانی کے مطابق نہیں ہے تو اس کی توجیہات بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

معانی القرآن للفراء تہران سے تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) مجاز القرآن لابی عبیدہ معمر بن مثنیٰ متوفی ۲۱۰

علم بلاغت میں تو مجاز کے معنے ہیں کسی لفظ کو اس کے معنی موضوع لہ کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنا جس کی کوئی نہ کوئی مناسبت معنی حقیقی کے ساتھ پائی جاتی ہو لیکن ابو عبیدہ نے اپنی کتاب میں مجاز کے لفظ کو مفہوم' معنی اور تاویل کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ میں نے جب اس کی تفسیر کے مختلف مقامات پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ الفاظ کی

(۱) تاریخ بغداد ص ۱٤۹ تا ۱۵۵ ج ۱٤

تشریح کرتے ہوئے کبھی "معناہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی "مجازہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں معلوم ہوا کہ اس کی ذاتی اصطلاح میں مجاز' معنی اور مفہوم ہم معنی الفاظ ہیں وَلَا مُنَاقَشَةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ تو مجاز القرآن کے معنے ہیں معانی القرآن۔ ابو عبیدہ چونکہ عربی لغت کے امام تھے' عربوں کے اشعار اور محاورات پر اسے عبور حاصل تھا اور نظم اور نثر دونوں کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے ذہن میں محفوظ تھا اس لئے اس نے قرآنی الفاظ و کلمات کے معانی بیان کرنے کے علاوہ تفسیر کے دوسرے پہلوؤں پر بہت کم توجہ دی ہے مثلاً شان نزول" قصص کی تفصیلات' استنباط احکام اور دوسرے امور پر اس کتاب میں قارئین کو معلومات نہیں ملیں گی لیکن لغوی اور ادبی معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب فراء کی معانی القرآن کی طرح بڑی افادیت رکھتی ہے۔ مگر بعض مقامات پر غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور خالص لغوی اور ادبی معلومات رکھنے والوں کا قرآن کی تفسیر میں غلطیوں کا شکار ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے اس لئے کہ قرآن کی تفسیر میں بنیادی حیثیت احادیث رسول اور آثار صحابہ کو حاصل ہے۔

یہ کتاب ابن جریر طبری کے زیر نظر بھی رہی ہے اور ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود تھا جس سے انہوں نے کتاب التفسیر میں بعض الفاظ کے لغوی معانی نقل کئے ہیں۔ یہ کتاب مؤسسۃ الرسالہ بیروت نے ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر محمد فؤاد سزکین کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کی ہے اور میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ کا تعارف

ابو عبیدہ کا نام معمر بن مثنیٰ ہے اس کی ولادت بصرہ میں ۱۱۰ھ میں اس رات کو ہوئی تھی جس میں مشہور تابعی حسن بصری کا انتقال ہوا تھا زندگی کا اکثر حصہ اس نے بصرہ میں گزارا ہے اور بصرہ کے نحویین کی امامت و قیادت کرتے رہے ہیں مگر ہارون الرشید کے دور حکومت میں ۱۸۸ھ میں بغداد منتقل ہو گئے اور بغداد کے علماء میں سے علی بن المغیرہ الاثرم' امام محمد کے شاگرد ابو عبید قاسم بن سلام' ابو حاتم سجستانی' اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ اور بہت سے دوسرے اہل علم نے اس سے علوم حاصل کئے اور روایات نقل کیں' اس کے سال وفات کے بارے میں ۲۰۹ھ '۲۱۰ھ '۲۱۱ھ اور ۲۱۳ھ کے چار اقوال مروی ہیں لیکن مشہور قول یہ ہے کہ اس کا انتقال بصرہ میں ۲۱۰ھ کو ہوا تھا اور اس نے سو سال عمر پائی تھی۔ مشہور ادیب اصمعی اور مشہور نحوی فراء نے ابو عبیدہ کی کتاب مجاز القرآن پر تنقید کی ہے کہ اس میں تفسیر بالرای کی گئی ہے اور متعدد دوسرے امور میں بھی ان کی ٹھنیں چلتی رہتی تھیں۔(۱)

ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے لکھا ہے کہ:

"ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ عربوں کے ایام جاہلیت کے حالات زیادہ بیان کیا کرتے تھے اور عربی کے غریب الفاظ کے معانی بیان کرنے میں بڑے ماہر تھے لیکن اس علم و معرفت کے باوجود شعر پڑھنے میں غلطی کر لیتے تھے اور وزن شعری کا خیال نہیں رکھتے تھے' ناظرہ قرآن پڑھتے وقت بھی تلفظ میں غلطی کرتے تھے' عربی سے بغض رکھتے تھے اور عربوں کی مذمت میں اس نے مستقل کتاب بھی لکھی تھی وَ كَانَ يَرىٰ رَأىَ الْخَوَارِج وَ مَاتَ سنة عشر وَ مِائَتَينِ خوارج کے مسلک کو پسند کرتے تھے اور اس کی وفات ۲۱۰ھ میں ہوئی تھی۔"(۲)

(۱) تاریخ بغداد ص ۲۵۲ تا ۲۵۵ ج ۱۳

(۲) کتاب المعارف لابن قتیبہ طبع نور محمد کراچی ۱۹۷۶ء ص ۲۳۶
وفیات الاعیان لابن خلکان ص ۲۳۵ ج ۵

ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہ کی زبان کے شر سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا ہر ایک کی دل آزاری کرنا اس کی عادت بن چکی تھی اصمعی جب مسجد جانا چاہتے تو پوچھ لیتے کہ دیکھو ابو عبیدہ تو موجود نہیں ہے وہ اس کی زبان سے ڈرتے تھے۔ ایک روز شرفاء میں سے کسی نے ابو عبیدہ سے پوچھا کہ تم لوگوں کی بہت زیادہ عیب چینی کرتے ہو یہ تو بتاؤ کہ تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باپ نے اپنے باپ سے یعنی میرے دادا سے نقل کیا ہے کہ وہ باجروان شہر کا یہودی تھا۔ ابو عبیدہ کا جب انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں کوئی بھی شریک نہیں ہوا تھا اس لئے کہ اس کی زبان سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔(۱)

بہر حال ابو عبیدہ کے حالات بیان کرنے والوں کا بیان یہی ہے کہ یہ اپنے دور میں لوگوں کا مبغوض تھا محبوب نہیں تھا' اس کا نسب بھی مشکوک تھا' اس پر خارجی ہونے کا الزام بھی ہے اور اس پر گھناؤنے اخلاقی عیب کا الزام بھی لگایا گیا ہے لیکن ان ساری کمزوریوں کے باوجود یہ عربیت اور عربی ادب کے بڑے امام تھے اور اس کی کتاب "مجاز القرآن" سے اس کی خارجیت معلوم نہیں ہوتی بلکہ لغت اور ادب میں اس کی مہارت معلوم ہوتی ہے۔

(۳) ﴿معانی القرآن للاخفش الاوسط متوفی ۲۲۱ھ﴾

ابو الحسن سعید بن مسعدہ بلخی اخفش اوسط بنو مشاجع بن دارم کے مولی تھے اور بلخ کے رہنے والے تھے مگر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس نے امام سیبویہ متوفی ۱۸۰ھ سے علم نحو میں اس کی "الکتاب" پڑھی تھی اور اس کتاب کے راوی بھی یہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اخفش نہ ہوتا تو سیبویہ کی الکتاب ضائع ہو جاتی۔ یہ اگرچہ عمر میں سیبویہ سے بڑے تھے مگر اس کے خاص شاگرد تھے۔ اخفش نے کوفہ جا کر نحو کے کبار علماء کو "الکتاب" کا درس دیا تھا جن میں فراء اور کسائی بھی شامل تھے اس کے نام کے ساتھ الاوسط کا لاحقہ اس لئے لگایا جاتا

(۱) وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان طبع قم ایران ص ۲٤۰ ج ۵

ہے کہ اخفش کے نام سے نحو کے دو دوسرے علماء بھی گزرے ہیں ایک ان سے بڑے تھے جو اخفش اکبر کے نام سے مشہور تھے اور دوسرے اس سے چھوٹے تھے جو اخفش اصغر کے نام سے مشہور تھے۔ اخفش اکبر کا نام عبدالحمید بن عبدالمجید تھا اور کنیہ ابو الخطاب تھا۔ یہ امام سیبویہ کے استاد تھے' دیندار اور پرہیزگار شخص تھے اور عربیت کے امام تھے اور اخفش اصغر کا نام علی بن سلیمان تھا اور یہ مبرد کے شاگرد تھے اور اس کی کتاب الکامل کے راوی تھے۔ اس کتاب کے محقق ڈاکٹر عبدالامیر نے لکھا ہے کہ اخفش اوسط نے ۱۹ کتابیں لکھی تھیں مگر چار کے علاوہ سب نایاب ہیں اور جن چار کا ایک ایک مخطوطہ ملا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) القوافی : ترکی کے حسین چلپی کے کتب خانے میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو ڈاکٹر عزت حسن کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں دمشق سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔

(۲) العروض : اس کا ایک مخطوطہ جامعہ طنطا کے سید احمد بدوی کے کتب خانے میں موجود ہے جس کے کل ۴ اوراق اور ۲۷ صفحے ہیں۔

(۳) ابیات المعانی : یہ ایک ناقص مخطوطہ ہے جس کے کل ۴ اوراق دستیاب ہیں۔

(۴) معانی القرآن : اس کا ایک مخطوطہ ایران کے شہر مشہد کے ایک کتب خانے میں پایا جاتا ہے اس کے ۱۸۷ ورقے اور ۳۷۳ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں' اس مخطوطے کے آخر میں لکھا ہے کہ ابو عبداللہ یزید کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب اول سے آخر تک محرم ۲۵۳ھ کے آغاز میں ابو جعفر احمد بن محمد یزیدی کے سامنے پیش کی تھی یعنی اسے سنائی تھی اور ابو جعفر کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب اس کے مصنف اخفش کو سنائی تھی' اس مخطوطے کو ڈاکٹر عبدالامیر کی تحقیق کے ساتھ بیروت کے نشریاتی ادارے عالم الکتب نے ۱۹۸۵ء میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور ہمارے ادارے میں موجود ہے' زجاج نحوی متوفی ۳۱۱ھ نے اپنی کتاب معانی القرآن میں اخفش کی اس کتاب کی طرف متعدد مقامات پر اشارہ کیا ہے۔

فراء کی معانی القرآن اور ابو عبیدہ کی مجاز القرآن کی طرح اخفش کی معانی القرآن بھی قرآن کی

مکمل تفسیر نہیں ہے بلکہ ہر سورت کی مخصوص آیات کی لغوی تحقیق تک محدود ہے' بعض ناقدین نے کہا ہے کہ یہ کتاب ابو عبیدہ کی مجاز القرآن اور فراء کی معانی القرآن کی دوسری شکل ہے۔ اخفش نے ان کتابوں میں ردوبدل یا کمی بیشی کر کے اپنے نام سے کتاب بنالی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اخفش کی اپنی کتاب ہے اور اس نے اپنے خاص منہج کے مطابق لکھی ہے البتہ ابو عبیدہ کی طرح اس نے بھی تفسیر کے دوسرے پہلوؤں پر توجہ نہیں دی بلکہ لغت اور اعراب ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اور آیات کے معانی بیان کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اخفش اوسط کا سال ولادت یقینی طور پر تو معلوم نہیں ہے مگر اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دوسری صدی ہجری کے تیسرے عشرے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے سال وفات میں چار اقوال منقول ہیں ۲۱۰ھ' ۲۱۵ھ' ۲۲۱ھ اور ۲۲۵ھ۔

(۴) معانی القرآن واعرابہ للزجاج متوفی ۳۱۱ھ

زجاج کا نام ابراہیم بن السَّری ابن سہل ہے اور کنیہ ابواسحاق ہے مگر یہ شیشے جوڑنے کا کسب کرتے تھے اور نحو کے بہت بڑے عالم تھے اس لئے اہل علم میں زجاج نحوی کے نام سے مشہور ہیں۔ خطیب بغدادی اور ابن کثیر دونوں نے لکھا ہے کہ:

كَانَ مِنْ اَهْلِ الْفَضْلِ والدِّيْنِ حَسَنَ الْاِعْتِقَادِ جَمِيْلَ الْمَذْهَبِ.

"زجاج فضیلت والے تھے' دیندار تھے' صحیح عقیدے والے تھے اور اچھے مذہب والے تھے۔"

فقہی امور میں یہ امام احمد بن حنبل کے مسلک کو پسند کرتے تھے' زجاج ثعلب نحوی کے بھی شاگرد تھے جو کوفہ کے نحویین کے امام تھے اور مبرد کے بھی شاگرد تھے جو بصرہ کے نحویین کے امام تھے مگر اس کا زیادہ تعلق مبرد کے ساتھ تھا اور مبرد نحویت میں ثعلب پر فوقیت بھی رکھتے تھے اس لئے کہ اس نے سیبویہ کی الکتاب اساتذہ سے پڑھی تھی اور ثعلب

نے اپنے مطالعے سے سیکھی تھی۔ یہ دونوں بغداد میں رہتے تھے اور دونوں کے درمیان منافست اور رقابت بھی جاری رہتی تھی اور کبھی کبھی مناظروں کی گرمیاں اور تلخیاں بھی آجاتیں لیکن زجاج آخر تک مبرد ہی سے منسلک رہے تھے اور ان سے اپنا تعلق اور تلمذ ختم نہیں کیا تھا' مبرد فصاحت اور بلاغت میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور ثعلب بلاغت میں کمزور تھے۔

زجاج کہتے ہیں کہ مجھے نحو کا علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا اس لئے میں نحو سیکھنے کے لئے مبرد کے پاس گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تیرا پیشہ کیا ہے؟ میں نے کہا میرا پیشہ شیشے جوڑنا ہے اور میں روزانہ ایک درہم یا ڈیڑھ درہم کماتا ہوں' مبرد اجرت کے بغیر نہیں پڑھاتے تھے اور جو طالب علم زیادہ اجرت دیتا تھا اس کو زیادہ وقت دیتے تھے اور پڑھانے میں زیادہ محنت کرتے تھے اور جو کم اجرت دیتا تھا اس کو وقت بھی کم دیتے تھے اور محنت بھی کم کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے تعلیم دینے میں زیادہ محنت کریں اور میں ایک درہم روزانہ آپ کو ہمیشہ دیا کروں گا۔ یہاں تک کہ موت ہم کو ایک دوسرے سے جدا کر دے' میں وعدے کے مطابق روزانہ ایک درہم بھی دیا کرتا تھا اور اس کے علاوہ اس کی مزید خدمت بھی کرتا تھا اور وہ مجھے پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے یہاں تک کہ میں علم میں خود کفیل ہو گیا اور اس کا محتاج نہ رہا۔ اس دوران صراۃ سے مبرد کے پاس بنو مارقہ کا خط آیا کہ ہمیں اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک نحوی عالم چاہئے' مبرد نے مجھے بھیجا اور میں نے جا کر ان کے بچوں کو تعلیم دینی شروع کر دی۔ ہر ماہ تیس درہم مبرد کو دینے کے علاوہ اپنی توفیق کے مطابق اس کی مزید خدمت بھی کرتا تھا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد عبید اللہ بن سلیمان وزیر نے اپنے بیٹے قاسم کی تعلیم و تربیت کے لئے مبرد سے ایک عالم طلب کیا اس نے کہا کہ مجھے تو آپ کے بیٹے کو تعلیم دینے کے لئے کوئی موزون شخص معلوم نہیں ہے سوائے شیشے کا کام کرنے والے ایک شخص کے جو صراۃ میں بنو مارقہ کے بچوں کو پڑھا رہا ہے۔ عبید اللہ نے بنو مارقہ کو خط لکھا اور انہوں نے

مجھے فارغ کر دیا۔ عبیداللہ نے مجھے بلا کر اپنے بیٹے قاسم کو میرے حوالے کر دیا اور یہ قاسم میرے غنا کا سبب بن گیا۔ میں مبرد کو ایک درہم روزانہ دیا کرتا تھا اور مزید خدمت بھی کرتا تھا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے۔

زجاج کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز اپنے شاگرد قاسم بن عبیداللہ کو کہا کہ اگر تو اپنے باپ کے منصب کو پہنچ گیا اور تم نے وزارت حاصل کر لی تو میرے ساتھ کیا احسان کرو گے؟ اس نے کہا جو تجھے پسند ہو وہی کروں گا۔ میں نے کہا وعدہ کرو کہ اگر تم وزیر بن گئے تو مجھے بیس ہزار درہم دو گے۔ اس وقت میری بڑی آرزو یہی تھی کہ مجھے بیس ہزار درہم مل جائیں۔ چند سال بعد قاسم وزیر بن گیا اور میں اس کا ندیم یعنی درباری بن گیا' میرے دل میں آیا کہ اسے وعدہ یاد دلاؤں لیکن اس کی ہیبت کی وجہ سے خاموش رہا' وزارت کا منصب سنبھالنے کے تیسرے روز اس نے خود کہا کہ اے ابو اسحاق تو نے تو مجھے میرا وعدہ یاد نہیں دلایا۔ میں نے کہا کہ وزیر کو اس کا وعدہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اگر معتضد باللہ کا خوف نہ ہوتا تو میں تمہیں بیس ہزار یکمشت ادا کر دیتا لیکن مجھے خوف ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے کہیں کسی مسئلے کا سامنا نہ کرنا پڑے اس لئے مہربانی فرما کر یہ رقم تھوڑی تھوڑی قسطوں میں وصول کیجئے۔ میں نے کہا ایسا ہی کر لو۔ اس نے کہا کہ تم لوگوں کی بڑی بڑی ضروریات و حوائج کی درخواستیں میرے سامنے پیش کیا کرو اور اس پر لوگوں سے اجرت لیا کرو یہاں تک کہ وعدے کے مطابق بیس ہزار وصول کر لو۔ اس طرح میں نے ۲۰ ہزار سے دگنی رقم وصول کر لی اور پھر یہ کام چھوڑ دیا لیکن قاسم نے کہا کہ یہ اب تیرا ذریعہ معاش بن گیا ہے اس لئے یہ کام جاری رکھو۔ چنانچہ میں قاسم کی وفات تک اجرت پر لوگوں کے کام کرواتا رہا جس کی وجہ سے میں نے بہت مال جمع کر لیا اور مالدار ہو گیا۔

زجاج نحوی نے جمادی الثانی ۳۱۱ھ میں وفات پائی تھی۔(۱)

---

(۱) تاریخ بغداد ص۸۹ تا ۹۳' البدایه والنهایه لابن کثیر ص۱۴۸ ج۱۱

زجاج کی کتاب کے نام "معانی القرآن واعرابہ" ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع قرآن کے الفاظ و کلمات کے لغوی معانی بیان کرنا اور اعراب کی وضاحت کرنا ہے' نے صفحہ ۱۸۵ پر لکھا ہے کہ ہم اعراب کے ساتھ معنی اور تفسیر بھی بیان کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ .

"کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ؟"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے غور و فکر اور تدبر کی ترغیب دلائی ہے لیکن قرآن میں عربی لغت اور اہل علم کے اقوال کی روشنی میں غور کرنا چاہئے۔ زجاج نے یہ کتاب ۱۶ سال میں مکمل کی تھی۔ ۲۸۵ میں اس نے اس کا آغاز کیا تھا اور وفات سے ۱۰ سال پہلے ۳۰۱ھ میں اسے مکمل کیا تھا اور اپنی زندگی میں اس نے اس کتاب کو خود بار بار شاگردوں کو پڑھایا تھا۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے ابن جریر اپنی تفسیر میں اس کے حوالے دیتے ہیں اور کبھی کبھی اس کی اصل عبارت بھی نقل کر دیتے ہیں۔ بیروت کے ادارے عالم الکتب نے ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر عبدالجلیل کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں یہ کتاب شائع کر دی ہے اور ہمارے ادارے تفہیم الاسلام کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۵) اعراب القرآن لابی جعفر النحاس متوفی ۳۳۸ھ

نحاس کا نام احمد بن محمد بن اسماعیل تھا اور اسم کنیہ ابو جعفر تھا۔ اس کے والد تانبے کا کام کرتے تھے اس لئے یہ نحاس یا النحاس کے نام سے مشہور ہیں۔ مصر میں پیدا ہوئے تھے اور مصر ہی میں فوت ہوئے تھے۔ تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہے مگر اندازہ یہی ہے کہ دوسری صدی ہجری کے نصف میں کسی سال پیدا ہوئے ہوں گے اور ۵ ذی الحجہ ۳۳۸ھ میں انہوں نے وفات پائی تھی' ان کی موت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ایک روز یہ دریائے نیل کے ساحل پر

کچھ اشعار پڑھ رہے تھے کہ عوام میں سے کسی نے کہا کہ یہ دریائے نیل پر جادو کر رہا ہے تا کہ اس کے پانی میں اضافہ نہ ہو اور پاؤں سے دھکا دے کر اسے دریا میں گرا دیا اور وہ ڈوب گئے' نحاس نے اخفش صغیر علی بن سلیمان متوفی ۳۱۵ھ 'ابو اسحاق زجاج نحوی متوفی ۳۱۱ھ اور ابو بکر الانباری متوفی ۳۲۸ھ سے نحو کا علم حاصل کیا تھا۔ اخفش صغیر اور زجاج تو مبرد کے شاگرد تھے دونوں نے سیبویہ کی الکتاب ان سے پڑھی تھی اور ابو بکر ابن الانباری ثعلب کے شاگرد تھے۔ نحاس نے مشہور محدث امام نسائی متوفی ۳۰۳ھ سے حدیث پڑھی تھی اور امام طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ بھی ان کے شیخ تھے۔(۱)

ابو جعفر نحاس کا مبرد سے بلاواسطہ تلمذ ثابت نہیں ہے اس لئے کہ یہ حصول علم کے لئے جب بغداد پہنچے تو اس سے تھوڑی مدت پہلے ۲۸۵ھ میں مبرد وفات پا چکے تھے لیکن اس وقت بغداد میں مبرد اور ثعلب کے شاگردوں کی کافی تعداد موجود تھی جن سے نحاس نے عربیت اور نحو کا علم حاصل کیا اور پھر واپس مصر آکر تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ نحاس نے اعراب القرآن سے قبل معانی القرآن کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں صرف معانی اور مفاہیم کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے اعراب کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور اعراب القرآن میں پوری توجہ اعراب اور قراءات پر مرکوز کی گئی ہے لیکن جو قراءات عربیت کے قواعد کے خلاف ہوں یا اجماعی اور متواتر قراءت کے خلاف ہوں یا مصحف عثمانی کے خلاف ہوں ان کی تردید کی ہے یا ان کو متواتر قراءت کی تفسیر قرار دیا ہے' زجاج اور فراء نے اپنی کتابوں میں معانی اور اعراب دونوں کو جمع کر دیا ہے مگر نحاس نے ہر ایک کے لئے مستقل کتاب لکھی ہے اس کی معانی القرآن تو ابھی تک چھپی نہیں ہے مگر اعراب القرآن چھپ چکی ہے جس کی تحقیق ڈاکٹر زہیر غازی نے کی ہے اور آغاز میں بڑا تحقیقی اور تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اعراب القرآن میں امام سیبویہ کی الکتاب اور زجاج کی معانی القرآن سے

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ ص۹۹۔۱۰۰ ج ۱

بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور بصرہ کے نحویین کے ممتاز ائمہ و اساتذہ کے حوالے بھی کثرت کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ نحاس کے بعد جن مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اعراب اور لغت سے متعلق مباحث کی طرف تعرض کیا ہے انہوں نے اس کی کتاب اعراب القرآن کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً مکی بن ابی طالب متوفی ۴۳۷ھ نے اپنی کتاب "مشکل اعراب القرآن" میں نحاس کی اعراب القرآن کے حوالے دیئے ہیں اور بعض مقامات پر ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اسی طرح ابو البرکات ابن الانباری متوفی ۵۷۷ھ نے بھی اپنی کتاب "البیان فی غریب اعراب القرآن" میں نحاس کے اقوال کو بطور استشہاد پیش کیا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔

ابو حیان اندلسی متوفی ۷۴۵ھ نے "البحر المحیط" میں' ابو عبداللہ قرطبی متوفی ۶۷۱ھ نے "الجامع لاحکام القرآن" میں اور علامہ زرکشی متوفی ۷۹۴ھ نے "البرہان فی علوم القرآن" میں بھی اعراب القرآن للنحاس کو زیر مطالعہ رکھا تھا اور اپنی تفاسیر لکھتے وقت اس پر اعتماد کیا تھا۔ ان کی تفاسیر میں ہم کو نحاس کے حوالے جگہ جگہ ملتے ہیں۔

اکابر مفسرین کا اس کتاب پر اعتماد کرنا اور اس سے استفادہ کرنا نحاس کی عربیت اور نحویت میں مہارت کی بہت بڑی شہادت ہے۔ یہ اعراب القرآن للنحاس بیروت کے نشریاتی ادارے عالم الکتب نے ۱۹۸۵ء میں پانچ جلدوں میں شائع کی ہے۔

(۶) البیان فی غریب اعراب القرآن لابن الانباری متوفی ۵۷۷ھ :

ابن الانباری کا نام عبدالرحمٰن بن محمد ہے اور کنیہ ابو البرکات ہے اور لقب کمال الدین ہے لیکن انبار کی طرف نسبت کی وجہ سے یہ ابن الانباری کے نام سے مشہور ہیں۔ انبار دریائے فرات کے مشرقی ساحل پر ایک شہر کا نام ہے جس میں کھجوروں' زرعی اجناس اور دوسرے پھلوں کی پیداوار کثرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے اس شہر میں ایران کا بادشاہ کسریٰ غلے کے انبار جمع کرتا تھا اور اس میں گندم اور جو کے بڑے بڑے مخازن اور سٹورز بنے

ہوئے تھے اس لئے یہ شہر انبار کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔ انبار نیز بکسر النون و سکون الباء کی جمع ہے جس کے معنے ہیں غلے کا مخزن۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو سب سے پہلے سابور بن ھرمز نے آباد کیا تھا' دولت عباسیہ کے پہلے خلیفہ ابو العباس سفاح نے اس کو دوبارہ آباد کر کے اپنی حکومت کا مرکز بنالیا مگر منصور نے جب بغداد آباد کیا تو پھر مرکز انبار سے بغداد منتقل ہو گیا۔ انبار کو ابو بکر صدیق کے دور خلافت میں (۱۲ھ میں) خالد بن ولیدؓ نے فتح کیا تھا۔ انبار ایک دوسرے شہر کا نام بھی ہے جو بلخ اور مرو کے قریب ایک پہاڑ پر آباد کیا گیا ہے۔(۱)

لیکن زیر بحث ابن الانباری عراق کے انبار کی طرف منسوب ہے۔ ابن الانباری کے نام سے ایک دوسرے نحوی عالم بھی مشہور ہیں جو ابو جعفر نحاس کے استاد تھے مگر اس کا کنیہ ابو بکر ہے اور وہ ۳۲۸ھ میں فوت ہوئے تھے اور البیان فی غریب اعراب القرآن کے مصنف کا کنیہ ابو البرکات ہے اور اس کا انتقال ۵۷۷ھ میں ہوا تھا۔ ابن الانباری کی ولادت ربیع الثانی ۵۱۳ھ میں ہوئی تھی اور انتقال ۹ شعبان ۵۷۷ھ میں ہوا تھا' اس کی زندگی بچپن سے موت تک بغداد ہی میں گزری تھی۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم بھی حاصل کی تھی اور اس میں مدرس کے فرائض بھی انجام دیئے تھے' یہ عظیم نحوی عالم عراق میں شیخ الادب کے نام سے مشہور تھے' فقہ میں امام شافعی کی آراء کو ترجیح دیتے تھے اور بڑے زاہد' پرہیزگار اور عبادت گزار عالم تھے۔

امیر المؤمنین المستفی بامر اللہ متوفی ۵۷۵ھ نے اس کو ۵۰۰ دینار بطور تحفہ بھیجے تھے مگر اس نے واپس کر دیئے۔ کسی نے کہا کہ اپنے بیٹے کو دیجئے اس نے جواب دیا کہ اگر بیٹا میرا ہے تو اس کے رزق کا انتظام بھی میں کروں گا۔ آخر عمر میں اپنے گھر ہی پر علم اور عبادت میں مشغول رہتے تھے اور اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی' زاہد اور فقیہ شیخ ابو النجیب سہروردی متوفی ۵۶۳ھ کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کتب تراجم نے ان کی ۷۳

---

(۱) معجم البلدان للحموی ص ۲۰۷۔۲۰۸ ج ۱

تصنیفات کا ذکر کیا ہے مگر غالباً اس کی آخری کتاب "البیان فی غریب اعراب القرآن" ہے۔ اس کتاب کا نام کتب تراجم میں "غریب اعراب القرآن" یا "اعراب القرآن" بتایا گیا ہے مگر کشف الظنون میں اس کا نام "البیان فی غریب اعراب القرآن" لکھا گیا ہے اور جس مخطوطے سے یہ کتاب چھاپی گئی ہے اس میں بھی "کتاب البیان فی غریب اعراب القرآن" لکھا ہوا پایا گیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع اعراب بیان کرنا ہے جیسا کہ مصنف نے آغاز میں خود لکھا ہے کہ :

و بعد فقد لخصت فی ھذا المختصر غریب اعراب القرآن علی غایة من البیان توخّیا للتفھیم و اللہ تعالی ینفع و ھو البر الرحیم.

"میں نے اس مختصر کتاب میں قرآن کی ان آیات کے اعراب کی پوری وضاحت کی ہے جن کے اعراب میں غرابت ہو' میرا مقصد لوگوں کو قرآن سمجھانا ہے اور اللہ ہی اس کتاب سے لوگوں کو نفع پہنچائے گا کیونکہ وہی احسان کرنے والا ہے اور بڑا مہربان ہے۔"

یہ کتاب ڈاکٹر طہٰ عبدالحمید کی تحقیق کے ساتھ قم ایران کے نشریاتی ادارے انتشارات الہجرۃ نے ۱۴۰۲ھ میں دو جلدوں میں شائع کی ہے اور ڈاکٹر عبدالحمید نے ابتداء میں مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں کتاب اور مصنف کتاب دونوں کے بارے میں بڑی مفید معلومات دی گئی ہیں۔

لغت اور اعراب پر جدید طرز میں لکھی گئی کتابیں

لغت اور اعراب بیان کرنے والی جن ۶ کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے وہ قدیم طرز پر لکھی گئی ہیں جن میں لغت اور اعراب کے بارے میں توجیہات کثیرہ اور اقوال مختلفہ بیان کئے گئے جو اگرچہ افادیت سے خالی نہیں ہیں لیکن ان کی وجہ سے قاری کا ذہن الجھن کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے اس دور جدید کا طرز تحریر اور اسلوب تصنیف تفہیم و تعلیم کے لئے

زیادہ آسان اور سہل ہے۔ اس اسلوب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بات کو تنقیح و تحقیق کے ساتھ مرتب انداز میں مختصر مگر جامع اور سہل الفہم اسلوب بیان میں پیش کیا جاتا ہے البتہ جو لوگ زیر بحث فن میں رسوخ اور مہارت نہیں رکھتے ان کی تحریریں آسان اور جامع الفاظ پر تو مشتمل ہوتی ہیں مگر ان میں عدم رسوخ کی وجہ سے فنی کمزوریاں اور قواعد و ضوابط کے اعتبار سے غلطیاں بھی رہ جاتی ہیں۔ مگر جن علماء نے فن میں رسوخ اور مہارت حاصل کیا ہو ان کی جدید طرز پر مرتب کردہ کتابیں قدیم طرز پر لکھی گئی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ افادیت رکھتی ہیں۔ لغت اور اعراب پر جدید اسلوب تحریر میں لکھی گئی دو کتابیں میرے زیر مطالعہ رہی ہیں اور ہمارے ادارے کے کتب خانے میں موجود ہیں ان کا مختصر تعارف کروانا بھی مفید ہے۔

(۷) اعراب القرآن الکریم وبیانہ للاستاذ محی الدین الدرویش :

یہ حمص شام کے ایک ماہر فن عالم محی الدین درویش کی تصنیف ہے جس کی تکمیل تو ۱۹۸۰ء میں ہو گئی تھی مگر حمص کے دار الارشاد نے اسے ۱۰ جلدوں میں بہترین کتابت اور طباعت کے ساتھ ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے۔ مصنف نے اس کے چند سطور پر مشتمل مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ قرآن کے اعراب اور اس کے بیان پر مشتمل ایک کتاب ہے جس کی طلب تو بہت زیادہ تھی مگر اس کے ظہور میں کافی تاخیر ہو گئی ہے' شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں اعراب کے ساتھ علم بیان کے قواعد کی روشنی میں بھی کافی اور جامع بیان موجود ہے اور یہ میرا بیان نہیں ہے بلکہ علم بیان کے ائمہ سے ماخوذ ہے اور جو شخص قرآن میں علم بیان کے نکات معلوم کرنے کا شوق رکھتا ہو وہ اس کتاب میں کافی معلومات پائے گا۔ میں اپنی اس کتاب کے بارے میں اور کچھ نہیں کہتا اس لئے کہ ۔

وَالْمِسْكُ مَا قَدْ شَفَّ عَنْهُ ذَاتُه   لَا مَا غَدَا يَنْعَتُه بَايِعُه

"مشک وہی ہے جس کی ذات سے خود خوشبو پھیلتی ہو' وہ نہیں جس کی تعریف بیچنے والا

کرتا ہو۔"

میں نے جب اس کتاب کا خود مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ لغت 'اعراب' بلاغت اور آیات سے ثابت ہونے والے فوائد سب پر مشتمل ایک جامع کتاب ہے اور اس کے مصنف کو عربیت سے متعلق تمام فنون پر عبور حاصل ہے۔ کتاب کا منہج یہ ہے کہ :

سب سے پہلے الفاظ کے لغوی معانی بیان کئے جاتے ہیں' صرفی قواعد کے مطابق اوزان بیان کئے جاتے ہیں اور اعلال کی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اعراب کی مکمل اور تفصیلی تشریح کی جاتی ہے' پھر علم بلاغت کی روشنی میں نکات بیان کئے جاتے ہیں اور آخر میں وہ فوائد اور علمی نکات بیان کئے جاتے ہیں جو زیر غور آیت سے معلوم ہوتے ہوں۔ یہ کتاب صرف' نحو اور بلاغت کی اصطلاحات سے واقف طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے بڑی مفید کتاب ہے' اس میں توجیہات کثیرہ اور اقوال مختلفہ کی بھرمار بھی نہیں ہے' اس کی زبان بھی سلیس' آسان اور سہل الفہم ہے اور مضامین کی ترتیب بھی بہترین ہے۔

(۸) الجدول فی اعراب القرآن وصرفہ از علامہ محمود صافی :

یہ کتاب جدید طرز پر شام کے ایک عالم استاد محمود صافی نے لکھی ہے' اس میں پورے قرآن کے اعراب کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے' ہر لفظ کا اعراب بیان کیا گیا ہے خواہ اسم ہو یا فعل ہو یا حرف ہو اور تمام الفاظ کی صرفی تحقیق بھی کی گئی ہے مگر معانی لغویہ کی طرف تعرض نہیں کیا گیا اس لئے کہ کتاب کا موضوع اعراب اور صرفی تحقیقات تک محدود ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے مقدمہ میں کتاب کے منہج کی وضاحت خود کی ہے جس کا حاصل مفہوم یہ ہے :

"قرآن کی تفسیر اور اعراب کے بارے میں ابوحیان اندلسی کی مشہور کتاب البحر المحیط کے بعد میری یہ کتاب ایک جدول صغیر ہے جو قرآن کے اعراب اور صرفی تحقیقات پر مشتمل ہے' اس میں میں نے قراءات سبعہ میں سے صرف ایک قراءت کو لیا ہے جو حفص بن سلیمان کی قراءت ہے جسے اس نے عاصم بن ابی النجود اسدی سے اخذ کیا ہے

تاکہ دوسری قراءات سے متعلق اعراب میں مبتدی کا ذہن الجھ نہ جائے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر حفص ہی کی قراءت میں تلاوت کی جاتی ہے لیکن اس ایک قراءت میں بھی بعض اوقات کسی لفظ کے اعراب میں متعدد وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں۔ ایسی صورت میں اس اعراب کو ترجیح دوں گا جو واضح اور ظاہری معنی کے اعتبار سے مناسب ہو' اعراب بیان کرنے کے لئے میں نے اصطلاحات جدیدہ اختیار کی ہیں جو ہمارے مدارس اور جامعات میں مروج ہیں' اس طرح اعراب کے بیان میں میں نے عام قواعد پر انحصار کیا ہے اور قرآنی اعراب اور نحوی قواعد کے درمیان اگر تعارض آجائے تو میں نے اس توجیہ کو ترجیح دی ہے جو قرآن کے مفہوم کے مطابق ہو اگرچہ فن نحو کے خلاف ہو اس لئے کہ ہم قرآن کو لغت اور نحو کے قواعد پر حکم بناتے ہیں ان قواعد کو قرآن پر حکم نہیں بناتے جیسا کہ ڈاکٹر صبحی صالح نے "مباحث فی علوم القرآن" میں لکھا ہے۔ طالب علموں کے فائدے کے لئے میں نے ہر آیت کے کلمات کی صرفی اور اشتقاقی تحقیقات بھی لکھ دی ہیں تاکہ جو طلبہ اور متعلمین اعلال' ابدال' حذف' وزن اور دوسرے صرفی واشتقاقی امور جاننا چاہیں تو یہ کتاب ان کی مدد کر سکے اور جو کلمات بار بار مکرر آئے ہوں تو میں قاری کو اس آیت کا حوالہ دوں گا جس میں ان کلمات کی پہلی بار صرفی تحقیقات کی گئی ہوں۔"

اس کتاب کے مصنف استاد محمود صافی نے تکمیل کے بعد نشریاتی ادارے دار الرشید کو مسودہ طباعت کے لئے دیا تو اس کی تھوڑی مدت کے بعد ۱۹۸۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی کتاب کو مطبوعہ صورت میں دیکھ نہ سکے۔ دمشق کے دار الرشید نے ۱۳ جلدوں اور ۳۱ اجزاء میں یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے اور ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔

مشکلات القرآن اور غریب القرآن پر لکھی گئی کتابیں

قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جن کو سمجھنے میں قاری کو اشکال و اشتباہ پیش آتا ہے اس قسم کی آیات کو مشکل القرآن یا مشکلات القرآن کہا جاتا ہے۔ اس نوع کی آیات کی تفسیر ان مفسرین نے بھی کی ہے جنھوں نے پورے قرآن کی سورت' سورت اور آیت' آیت کے اعتبار سے تفسیریں لکھی ہیں لیکن بعض ائمہ نے مشکل القرآن کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور اشکالات کے ازالے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے زیادہ مقبول و معروف کتاب ابن قتیبہ دینوری کی تاویل مشکل القرآن ہے جس کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۹) تاویل مشکلات القرآن لابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ :

ابن قتیبہ کا نام عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ ہے مگر اپنے دادا کی نسبت سے ابن قتیبہ کے نام سے مشہور ہیں' ان کے والد فارسی النسل تھے اور مرو میں رہتے تھے اس لئے اسے ابن قتیبہ مروزی بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کی مشہور نسبت دینوری ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کافی مدت تک مشہور شہر دینور میں قاضی رہے ہیں۔ ابن قتیبہ کی ولادت تو ۲۱۳ھ میں ہوئی تھی مگر مقام ولادت میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک بغداد میں پیدا ہوئے تھے اور بعض کے نزدیک کوفہ میں پیدا ہوئے تھے' خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

"عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ ابو محمد دینوری اور بعض کے نزدیک مروزی ہیں لیکن اس نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی' اسحاق بن راھویہ' محمد بن زیاد زیادی' ابو الخطاب زیاد بن یحی حسانی اور ابو حاتم سجستانی سے اس نے احادیث سنی تھیں' وکان ثقة دیّنا فاضلا اور یہ ثقہ' دیندار اور فاضل عالم تھے۔ یہ معروف و مشہور کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً غریب القرآن' غریب الحدیث' مشکل القرآن' مشکل الحدیث' ادب الکتاب' عیون الاخبار اور کتاب

المعارف ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے والد مروزی ہیں لیکن یہ خود بغداد میں پیدا ہوئے ہیں اور موت تک بغداد ہی میں رہے ہیں۔ دینوری میں کچھ مدت تک اس نے قیام کیا تھا اس لئے اسے دینوری کہا جاتا ہے' ابن قتیبہ نے ذوالقعدہ ۲۷۶ھ میں وفات پائی تھی۔(۱)

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں :

وَ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُسْلِم بن قتيبة الدينوری قاضيها النحوی اللغوی صاحب المصنفات الْبَدِيْعَةِ الْمُفِيْدَةِ الْمُحْتَوِيَةِ على عُلُوْمٍ جُمَّةٍ نَافِعَةٍ اِشْتَغَلَ بِبَغْدَادَ وَ سَمِعَ بِهَا الْحَدِيْثَ على اسحٰق بن راهويه و طَبَقَتِهٖ وَ اَخَذَ اللُّغَةَ عَنْ اَبِيْ حَاتِمِ السِّجِسْتَانِيْ وَ ذَوِيْهِ.(۲)

"عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری دینور کے قاضی تھے' نحوی اور لغوی عالم تھے' عجیب اور مفید تصنیفات کے مصنف تھے جو بہت سے علوم نافعہ پر مشتمل تھیں' یہ بغداد میں مشغول رہا ہے' اسحاق بن راہویہ اور اس طبقے کے محدثین سے حدیث کا سماع کیا ہے اور لغت کا علم ابو حاتم سجستانی اور اس کے متعلقین سے حاصل کیا ہے۔"

ابن کثیر نے آگے بقی بن مخلد کے ترجمے میں ضمناً ابن قتیبہ کا ذکر اس طرح کیا ہے :

وَ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُسْلِم بن قُتَيْبَةَ الدِّيْنَوَرِيُّ ثُمَّ الْبَغْدَادِيُّ اَحَدُ الْعُلَمَاءِ وَ الْاُدَبَاءِ وَالْحُفَّاظِ الْاَذْكِيَاءِ وَ قَدْ تَقَدَّمَتْ تَرْجَمَتُهٗ وَ كَانَ ثِقَةً نَبِيْلًا.(۳)

"عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری اور بغدادی علماء میں ایک عالم تھے' ادیبوں میں ایک ادیب تھے اور ذکی اور ذہین حفاظ میں سے ایک حافظ تھے' اس کا ترجمہ پہلے ہو چکا ہی اور یہ ثقہ اور شریف عالم تھے۔"

(۱) تاریخ بغداد ص ۱۷۰ ج ۱۰

(۲) البدایه والنهایه ص ۴۸ ج ۱۱

(۳) البدایه ص ۵۷ ج ۱۱

ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے اپنی کتاب المنتظم میں لکھا ہے کہ :

وَ كَانَ عَالِمًا ثِقَةً دَيِّنًا فَاضِلًا.

"ابن قتیبہ ثقہ اور دین کے پابند عالم اور فاضل تھے۔"

ابن حزم متوفی ۴۵۶ھ نے بھی کہا ہے کہ :

"ابن قتیبہ اپنے دین اور علم میں ثقہ اور قابل اعتماد تھے۔"

ابن خلکان نے بھی لکھا ہے کہ :

"ابن قتیبہ ثقہ عالم تھے اور ان کی تصانیف مفید ہیں۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے سورہ اخلاص کی تفسیر میں لکھا ہے کہ :

وَابْنُ قُتَيْبَةَ مِنَ الْمُنْتَسِبِيْنَ اِلٰى اَحْمَدَ وَ اِسْحٰق بن رَاهويه وَالْمُنْتَصِرِيْنَ لِمَذَاهِبِ السُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ وَلَهٗ فِيْ ذَالِكَ مُصَنَّفَاتٌ مُتَعَدِّدَةٌ.

"ابن قتیبہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نسبت امام احمد اور امام اسحاق بن راھویہ کی طرف کی گئی ہے یعنی وہ ان سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے متبع تھے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جو سنت مشہورہ سے ثابت شدہ آراء اور مذاہب کی نصرت اور تائید کرتے ہیں۔ اس بارے میں اس کی متعدد تصنیفات موجود ہیں۔"

"التحدیث بمناقب اہل الحدیث" کے مصنف نے کہا ہے کہ ابن قتیبہ اہل سنت کے لئے ایسے تھے جیسا کہ معتزلہ کے لئے جاحظ تھے۔ یہ اہل سنت کے خطیب تھے جیسا کہ جاحظ معتزلہ کے خطیب تھے۔"

مذکورہ اکابر ائمہ حدیث کی توثیق کے برعکس دار قطنی اور بیہقی نے ابن قتیبہ پر یہ تہمت لگائی ہے کہ یہ تجسیم اور تشبیہ کی طرف مائل تھے۔

یعنی یہ اللہ کے لئے جسم ثابت کرتے تھے اور اللہ کے ید، استواء علی العرش اور نزول الی السماء الدنیا اور اس طرح کے دوسرے صفات کو انسانوں کی صفات کے ساتھ تشبیہ دیتے

تھے۔ لیکن اس الزام کے صحیح نہ ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "كتاب الاختلاف في اللفظ والرد على الجهمية والمشبّهة" اس کتاب میں مجسمہ اور مشبہ کے مسلک کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ابن قتیبہ اللہ کی مذکورہ صفات میں تاویل نہیں کرتے تھے جیسا کہ متکلمین تاویل کرتے ہیں' ان کا عقیدہ اس بارے میں سلف صالحین اور ائمہ حدیث کے مطابق تھا کہ ان صفات کو تو تسلیم کیا جائے اس لئے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہیں لیکن اس کی تشبیہ مخلوق کی صفات کے ساتھ ہر گز نہ دی جائے اور اس کی ماہیت اور حقیقت معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا جائے بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ کے ید' ساق' استواء اور نزول کی ماہیت وہی ہے جو اللہ کی شان کے مناسب ہے۔

دراصل یہ صفات متشابہات میں سے ہیں جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ محکمات اور متشابہات کی بحث میں ہم نے اس بات کی وضاحت کی ہے۔ یہ مسلک صحابہ و تابعین' ائمہ اربعہ اور محدثین کا ہے اور یہی اصح اور احوط مسلک ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اس قسم کی صفات میں تاویل کیا کرتے تھے لیکن اس کی کتاب "الابانہ" میں وہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے جو سلف صالحین اور محدثین کا ہے یعنی تاویل کی بجائے تفویض' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا تھا۔ ابن تیمیہ پر بھی ترک تاویل کی وجہ سے مجسمہ اور مشبہہ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے حالانکہ اس نے "العقیدہ الواسطیہ" اور اپنی دوسری کتابوں میں تجسیم اور تشبیہ کی بڑی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ پر بھی یہ الزام ترک تاویل کی وجہ سے لگایا گیا ہے ورنہ انہوں نے اپنی کتاب "الرد علی الجہمیہ" میں مجسمہ اور مشبہہ پر سخت تنقید کی ہے' سید احمد نے تاویل مشکل القرآن کے "مقدمے" میں ابن قتیبہ کی کتاب "الرد علی الجہمیہ" کے حوالے سے ان کا عقیدہ اس طرح نقل کیا ہے کہ :

وَ عَدْلُ الْقَوْلِ فِيْ هٰذِهِ الْاَخْبَارِ اَنْ نُّؤْمِنَ بِمَا ثَبَتَ مِنْهَا بِنَقْلِ الثِّقَاتِ لَهَا

فَنُؤْمِنَ بِالرُّؤْيَةِ وَ اَنَّهُ يَنْزِلُ اِلَى السَّمَاءِ وَ اَنَّهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى وَ بِالنَّفْسِ وَالْيَدَيْنِ مِنْ غَيْرِ اَنْ نَّقُوْلَ فِيْ ذَالِكَ بِكَيْفِيَّةٍ فَنَرْجُوْا اَنْ نَّكُوْنَ فِيْ ذَالِكَ الْقَوْلَ وَالْعَقْدِ عَلٰى سَبِيْلِ النَّجَاةِ غَدًا ان شاء الله تعالى.(۱)

''اس قسم کی احادیث کے بارے میں عدل و توازن کا قول یہ ہے کہ ہم ان صفات پر ایمان لائیں جو ثقہ راویوں سے بسند صحیح ثابت ہوں' ہم اللہ کی رؤیت پر ایمان لائیں اور اس پر ایمان لائیں کہ اللہ تعالی آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے اور وہ عرش پر مستوی ہے' اسی طرح اللہ کے نفس اور یدین پر بھی یقین کر لیں بغیر کیفیت بیان کرنے کے' مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ہمارے اس قول اور عقیدے میں کل ہمارے لئے نجات کا راستہ ہے۔''

ابن قتیبہ پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ یہ اہل بیت کی شان اور مقام سے منحرف تھے لیکن اس الزام کے غلط ہونے کے لئے ابن قتیبہ کا اہل بیت اور ان کے مخالفین کے بارے میں وہ مسلک نقل کرنا کافی ہے جسے تاویل مشکل القرآن کے مقدمے میں سید احمد صقر نے ابن قتیبہ کی کتاب ''الرد علی الجہمیہ'' کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس مسلک کا خلاصہ یہ ہے:

''میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ جنہوں نے جب حضرت علی کی محبت میں روافض کا یہ غلو دیکھا کہ انہوں نے حضرت علی کو ان صحابہ پر بھی مقدم سمجھ لیا ہے جن کو رسول اللہ ﷺ نے ان پر مقدم قرار دیا تھا اور ان کا یہ دعوی دیکھا کہ حضرت علی نبی ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک تھے اور اولاد علی میں سے جو ائمہ ہیں وہ غیب کا علم رکھتے ہیں' یہ اقوال جہالت اور غباوت کی انتہا ہے اور ان لوگوں نے جب دیکھا کہ روافض سلف میں سے بہترین لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں' ان سے بغض رکھتے ہیں اور ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں تو انہوں نے اس غلو کا مقابلہ دوسرے غلو سے کیا کہ حضرت علی کی شان اور اس کے حق کو مؤخر کر دیا' ان کی شان میں نامناسب باتیں کیں' اس کے خلاف ناحق خونریزی کی' ان پر یہ

(۱) مقدمہ تاویل مشکل القرآن ص ۵۷

الزام لگایا کہ اس نے عثمان کے قتل میں مدد کی تھی' انہوں نے اپنی جاہلت کی وجہ سے ان کو ائمہ ھدیٰ سے نکال کر ائمہ فتن میں شامل کر دیا' ان کی خلافت سے تو انکار کیا اور یزید بن معاویہ کی خلافت کو تسلیم کیا اور دلیل یہ دی کہ حضرت علی کی خلافت میں لوگوں کا اختلاف تھا اور یزید کی خلافت پر لوگوں کا اتفاق تھا' انہوں نے ان لوگوں پر بھی تہمت لگائی جو حضرت علی کا ذکر خیر کرتے تھے حالانکہ ان کی فضیلت میں صحیح احادیث موجود ہیں اور انہوں نے حضرت علی کے بیٹے حسین علیہ السلام کو خارجی یعنی باغی قرار دیا اور اس پر مسلمانوں کی جماعت میں پھوٹ ڈالنے کا الزام لگایا' اگر کوئی کہتا کہ حضرت علی رسول اللہ ﷺ کے بھائی تھے اور ان کے نواسوں یعنی حسن اور حسین کے باپ تھے یا اگر کوئی کہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کمبل کے نیچے اپنے ساتھ حضرت علی' حضرت فاطمہ' حسن اور حسین کو جمع کیا تھا تو ان کے چہروں اور آنکھوں کا رنگ بدل جاتا ہے اور ان کے سینوں کا بغض و غضب ظاہر ہو جاتا ہے' اسی طرح اگر کوئی کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جن کا میں مولیٰ ہوں تو حضرت علی بھی ان کا مولیٰ ہے اور اے علی تیرا میرے ساتھ وہی تعلق ہے جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا تو یہ لوگ ان احادیث کے لئے ضعیف سند تلاش کرتے ہیں تاکہ حضرت علی کی شان کو کم کر سکیں و ھٰذا ھو الجھل بعینہ یہ عین جہالت ہے۔ تیرے لئے سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ تو حضرت علی کی محبت میں بھی غلو کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال اور اس سے بغض اور نفرت کر کے بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں حضرت علی کا جو مقام اور مرتبہ تھا اس کا اعتراف کر۔ یہ مرتبہ ان کو اس لئے ملا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تربیت کی تھی' وہ آپ کے بھائی تھے' آپ کے داماد تھے' وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دشمنان رسول کے مقابلے میں جہاد اور جنگوں میں ثابت قدم رہے تھے اور وہ علم میں' دین میں اور فضل و شرف میں بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ تیرے لئے سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ تو حضرت علی کے بارے میں اس مقام سے تجاوز نہ کر جو سلف صالحین نے ان

کے لئے مقرر کیا ہے وہ حضرت علی کی شان کو بھی ہم سے زیادہ جانتے تھی اور دوسرے صحابہ کی شان کو بھی ہم سے زیادہ جانتے تھے' سلف صالحین (قرون ثلاثہ) نے جس بات پر اتفاق کیا ہو وہ ایسی واضح حقیقت ہوتی ہے جس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔(۱)

ابن قتیبہ کی اس عبارت میں حضرت علی کے بارے میں اعتدال پر مبنی وہی مسلک بیان کیا گیا ہے جو اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے' انہوں نے حضرت علی کے بارے میں روافض کے غلو کو بھی جہالت قرار دیا ہے اور ان کے مخالفین کے غلو کو بھی جہالت کہا ہے۔ ابن قتیبہ کی اپنی کتاب میں بیان کردہ مسلک کے خلاف کسی دوسرے مسلک کو ان کی طرف منسوب کرنا یا تو غلط فہمی پر مبنی ہے یا تعصب پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

ابن قتیبہ کثیر التصانیف تھے مشکل القرآن کے مقدمے میں ۴۶ ان کتابوں کا ذکر ہوا ہے جو معلوم ہو سکی ہیں۔ ان کتابوں میں سے تاویل مشکل القرآن اور غریب القرآن متداول ہیں اور اہل علم کے زیر مطالعہ رہتی ہیں' مشکل القرآن میں ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے جن کو سمجھنے میں اشکال پیش آسکتا ہے۔ اشکالات کے ازالے اور مفہوم واضح کرنے کے علاوہ اس کتاب میں علمی اور ادبی نکات بھی جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں جو بحث و تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑی افادیت رکھتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے اپنی اس کتاب میں منکرین قرآن کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں' یہ کتاب دار الکتب العلمیہ بیروت نے سید احمد صقر کے تفصیلی اور تحقیقی مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۱ء میں شائع کی ہے اور مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

(۱۰) غریب القرآن لابن قتیبہ دینوری :

ابن قتیبہ نے یہ کتاب مشکل القرآن کے بعد لکھی ہے اس لئے کہ اس میں جگہ جگہ مشکل القرآن کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اللہ کے ان اسماء کی

(۱) مقدمہ تاویل مشکل القرآن ص ۵۸ تا ۶۰ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۸۱ء

تشریح کی گئی ہے جن کا مفہوم سمجھنا مشکل ہے' ان اسماء کی تشریح کے دوران اشتقاق سے متعلق بہت سے مفید نکات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان الفاظ و کلمات کے معانی کی تشریح کی گئی ہے جو قرآن میں کثرت کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں مثلاً جن' انس' ملائکہ' شیطان وغیرہ اور سورتوں کی ترتیب کے مطابق ہر سورت کے غریب اور مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ غریب القرآن بھی دار الکتب العلمیہ بیروت نے سید احمد صقر کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۸ء میں شائع کی ہے۔

الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ کی تصنیف نہیں ہے

"الامامۃ والسیاسۃ" ابن قتیبہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اور ان کی طرف اس کتاب کی نسبت بڑی مشہور ہے لیکن ابن قتیبہ کی کتاب "المعارف" کے مقدمے میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ المعارف کی تصحیح تو محمد اسماعیل عبداللہ صاوی نے کی ہے مگر اس کے آغاز میں تفصیلی اور تحقیقی مقدمہ ثروت عکاشہ نے لکھا ہے اور یہ کتاب نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی نے ۱۹۷۶ء میں شائع کی ہے۔ ثروت عکاشہ نے پانچ دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ کی تصنیف نہیں ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ جن کتابوں میں ابن قتیبہ کا ترجمہ اور تعارف لکھا گیا ہے ان میں ابن قتیبہ کی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا گیا سوائے قاضی ابو عبداللہ توزی ابن الشباط کے کہ اس نے اپنی کتاب "صلۃ السمط" کے ۳۴ ویں باب کے فصل ثانی میں ابن قتیبہ کی تصنیفات میں الامامۃ والسیاسۃ کا ذکر کیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں لکھا گیا ہے کہ اس کے مصنف دمشق میں تھے حالانکہ ابن قتیبہ سوائے دینور کے اور کسی جگہ نہیں گئے بلکہ دینور میں کچھ مدت قیام کے علاوہ اپنی ساری زندگی بغداد میں گزاری تھی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں ابن ابی لیلی سے روایت نقل کی گئی ہے حالانکہ ابن ابی لیلی کوفہ میں ۱۴۸ھ میں قاضی تھے اور ابن قتیبہ اس سے ۶۵ سال قبل پیدا ہوئے تھے تو اس نے آخر کس طرح ابن ابی لیلی سے سماع کیا اور روایت نقل کی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں فتح اندلس کا واقعہ ایک عورت سے نقل کیا گیا ہے جو فتح کے وقت موجود تھی حالانکہ اندلس کی فتح ابن قتیبہ کی پیدائش سے ۱۲۰ سال پہلے ہوئی تھی' جب فتح اندلس کے وقت ابن قتیبہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے تو اس کی خبر کس طرح دے سکتے ہیں؟

پانچویں دلیل یہ ہے کہ کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے شہر مراکش فتح کرنے کے لئے جہاد کیا تھا حالانکہ اس شہر کو سلطان المرابطین یوسف بن تاشفین نے ۴۵۵ھ میں آباد کیا تھا اور ابن قتیبہ اس سے ۱۷۹ سال پہلے ۲۷۶ھ میں وفات پا چکے تھے۔

ان دلائل میں سے چار دلائل تو صراحتاً دلالت کرتے ہیں کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کی نہیں ہے بلکہ کسی نے لکھ کر ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دی ہے اور پہلی دلیل بھی خاصا وزن رکھتی ہے اس لئے کہ ابن قتیبہ کے حالات بیان کرنے والے اکثر مصنفین نے ان کی کتابوں میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا سوائے ابن الشباط کے تو یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس کتاب کی نسبت ابن قتیبہ کی طرف مشکوک ہے۔(۱)

تاویل مشکل القرآن کے محقق سید احمد صقر نے بھی لکھا ہے کہ الامامۃ والسیاسۃ کی نسبت ابن قتیبہ کی طرف عقلاً ناقابل قبول ہے اور اس کے لئے صرف ایک دلیل کافی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں لکھا ہوا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے ہارون الرشید کے زمانے میں مراکش فتح کرنے کے لئے حملہ کیا تھا حالانکہ ابن قتیبہ ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۷۶ھ میں اس نے وفات پائی تھی اور مراکش ۴۵۴ھ میں سلطان المرابطین یوسف بن تاشفین نے آباد کیا تھا۔ دوسرے قرائن اور ادلہ بھی اس نسبت کے باطل ہونے پر دلالت کرتے ہیں لیکن ان سے قطع نظر یہ ایک دلیل ہی کافی ہے۔(۲)

---

(۱) مقدمہ المعارف ص ٥٦ (۲) مقدمہ مشکل القرآن ص ۳۲

احادیث اور آثار کی روشنی میں تفسیر کرنے والے مفسرین اور ان کی تفسیریں

قرآن کی تفسیر کرنے والے تمام مفسرین بقدر ضرورت لغت اور اعراب کا بیان بھی کرتے ہیں' غریب القرآن اور مشکل القرآن کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث والآثار کے اصول کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اہل سنت ہوں اہل جدت نہ ہوں اس لئے کہ ان تمام اصولوں کو ملحوظ رکھے بغیر قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھا بھی نہیں جاسکتا اور سمجھایا بھی نہیں جاسکتا' لیکن بعض ائمہ تفسیر آیات کی تفسیر میں احادیث و آثار کو بڑی کثرت کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور ان کی تفاسیر کے اساسی مآخذ احادیث رسول اور اقوال صحابہ و تابعین ہوتے ہیں۔ آیات کا جو مفہوم لغت سے یا سیاق و سباق سے یا اپنی اجتہادی بصیرت سے اخذ کرتے ہیں اس کے ثبوت میں نقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ یہ مفسر کی انفرادی اور شخصی رائے نہیں ہے بلکہ یہ حدیث رسول سے اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے بھی ثابت ہے' اس طرز تفسیر کو "تفسیر بالماثور" کہا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تفسیر کے دوسرے مآخذ کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ لغت اور اعراب' سیاق و سباق اور نظائر کو مد نظر رکھنا فہم قرآن کے لئے ضروری ہے بلکہ تفسیر بالماثور کا مطلب یہ ہے کہ اصل مآخذ احادیث و آثار ہوتے ہیں اور باقی مآخذ کو تائید کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت تفسیر بالماثور کرنے والے مفسرین میں سے بعض ممتاز ائمہ تفسیر اور ان کی تفاسیر کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) جامع البیان عن تاویل آی القرآن لابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ :

ابن جریر طبری کو "امام المفسرین" اور اس کی تفسیر کو "ام التفاسیر" کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس کے بعد جو تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں ان کا بنیادی ماخذ یہی تفسیر رہی ہے۔ یہ تفسیر بلا مبالغہ حقیقی معنوں میں "ام التفاسیر" کہلانے کی مستحق ہے' اس میں پورے قرآن کی تفسیر میں احادیث اور آثار کا اتنا زیادہ مواد جمع کر دیا گیا ہے کہ بعد میں آنے والا ہر مفسر اس سے استفادہ کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اس لئے کہ اتنا زیادہ مواد اس کو کسی دوسری کتاب میں یکجا نہیں مل سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تفسیر میں جامعیت ہے شاید ہی کوئی ایسی آیت ہو کہ جس کی تفسیر میں آثار پیش نہ کئے گئے ہوں' اسی طرح لغوی اور نحوی تحقیقات کے سلسلے میں بھی اس تفسیر میں کافی مواد موجود ہے جس سے بعد میں آنے والوں نے استفادہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ یہ تفسیر اگرچہ صرف آیات الاحکام کی تفسیر نہیں ہے بلکہ پورے قرآن کی سورت' سورت اور آیت' آیت کے اعتبار سے مکمل اور جامع تفسیر ہے لیکن آیات سے ثابت ہونے والے احکام کی تحقیق و تنقیح سے بھی یہ تفسیر خالی نہیں ہے۔

ابن جریر کا منہج تفسیر یہ ہے کہ پہلے آیت کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے اور بقدر ضرورت لغوی تحقیق بھی کر دی جاتی ہے اور پھر اخذ کردہ مفہوم کے ثبوت میں احادیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین پیش کئے جاتے ہیں' اس کے بعد دوسرے اہل علم کے اقوال اور ان کے ثبوت میں احادیث و آثار نقل کئے جاتے ہیں اور پھر قاری کو آزاد نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس قول کو چاہے پسند کر لے بلکہ وَ اَولی الْاَقْوَال بالصواب کے الفاظ کے ساتھ اپنی رائے پیش کی جاتی ہے کہ ان اقوال ماثورہ میں صحیح قول یہ ہے اور پھر اس کے صحیح اور راجح ہونے کی دلیل پیش کی جاتی ہے۔ یعنی آیت سے متعلق صرف آثار کثیرہ اور اقوال متنوعہ جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ترجیح فی الآراء کا فرض بھی انجام دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ابن جریر نے جس رائے کو پسند کیا ہو وہ حتمی ہو اور جس قول کو اختیار کیا ہو وہ قول فیصل ہو

اس لئے کہ تنقید سے بالاتر اور معصوم عن الخطا سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی بھی نہیں ہے اور ہر ایک کی بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔ لیکن مفسر ہونے کی حیثیت سے ان کی جچی تلی رائے تو منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور بحث و تحقیق کرنے والوں کے لئے آسانی ہوتی ہے کہ وہ دلائل کی رُوشنی میں اس رائے سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں۔ بعض اہل علم اور اہل تفسیر اقوال کثیرہ اور آراء متنوعہ پیش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور قاری کو اقوال کے اس جنگل میں حیران و پریشان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ قاری الجھن اور کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ کدھر جاؤں اور کدھر نہ جاؤں؟ یہ طرز تفسیر مناسب نہیں ہے' ابن جریر بھی کبھی کبھی ترجیح بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن ایسے مقامات آپ کو شاذ و نادر ہی ملیں گے جن میں کوئی فیصلہ نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تفسیر ابن جریر میں جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ سب کی سب سند کے اعتبار سے صحیح ہوں بلکہ بعض روایات ضعیف بھی ہو سکتی ہیں اور دلیل کی بنیاد پر ان کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابن جریر نے یہ التزام کیا ہے کہ وضاعین اور کذابین کی روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ نہیں دیں گے۔ تفسیر ابن جریر میں طوالت زیادہ ہے' کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں یہ تفسیر ۳۰ ہزار ورقوں پر مشتمل تھی ان کے اصحاب نے کہا کہ اس کو پڑھنے میں تو عمریں ختم ہو جائیں گی تو پھر ابن جریر نے اسے مختصر کر کے تقریباً ۳ ہزار ورقے بنا دیا۔(۱)

اس طوالت کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایک قول کے متعدد اسانید ذکر کئے گئے اور اسی کثرت اسانید کی وجہ سے طوالت آگئی ہے لیکن اسانید و طرق کی کثرت' حدیث اور اثر کی صحت اور ثبوت کی دلیل ہوتی ہے اور بحث و تحقیق کرنے والوں کے نزدیک یہ عیب نہیں ہے بلکہ خوبی ہے اگر کوئی تلخیص کرنا چاہے تو اسانید کو حذف کر کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے

---

(۱) تاریخ بغداد ص ۱۶۳ ج ۲

اقوال کو اور ان میں سے ابن جریر کے اختیار کردہ قول کو چند سطور میں پیش کر سکتا ہے۔ میں نے بعض مقامات کی تلخیص کرنے کا خود تجربہ بھی کیا ہے۔ میں تفسیر پڑھانے کے دوران اور تصنیف و تالیف کے دوران ابن جریر کی تفسیر سے استفادہ کرتا رہتا ہوں جس کی بنا پر میں کہا کرتا ہوں کہ یہ واقعی ام التفاسیر ہے۔ اس تفسیر کے بارے میں بعض اکابر علماء و فقہاء کی آراء ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں لَمْ یُصَنَّفْ مِثْلُهٗ' اس جیسی تفسیر کسی نے بھی نہیں لکھی۔

۲۔ مشہور فقیہ ابو حامد اسفرائینی نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص ابن جریر کی تفسیر حاصل کرنے کے لئے چین تک کا سفر کرے یعنی بڑا لمبا سفر کرے تو یہ کوئی زیادہ محنت نہیں ہو گی۔

۳۔ ابو بکر بن خالویہ کہتے ہیں کہ مشہور محدث محمد بن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ نے مجھے کہا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے محمد بن جریر سے اس کی تفسیر سن کر لکھی ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں میں نے لکھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ مکمل تفسیر لکھی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں میں نے پوری تفسیر لکھی ہے۔ فرمایا کس سال میں لکھی ہے میں نے کہا ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ تک کے آٹھ سالوں میں لکھی ہے۔ ابن خزیمہ نے یہ تفسیر عاریتاً لے کر کئی سالوں تک زیر مطالعہ رکھی اور پھر واپس لوٹاتے ہوئے فرمایا:

قَدْ نَظَرْتُ فِیْهِ مِنْ اَوَّلِهٖ اِلٰی آخِرِهٖ وَ مَا اَعْلَمُ عَلٰی اَدِیْمِ الْاَرْضِ اَعْلَمَ مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَرِیْرٍ وَ لَقَدْ ظَلَمَتْهُ الْحَنَابِلَةُ.

"میں نے اس کتاب کو اول سے آخر تک غور و فکر کے ساتھ پڑھ لیا ہے اور مجھے زمین کی سطح پر محمد بن جریر سے بڑا عالم معلوم نہیں ہے۔ حنابلہ نے اس پر ظلم کیا ہے۔"

بغداد میں بعض حنابلہ ابن جریر کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے اور لوگوں کو ان کے پاس جانے سے روکتے تھے۔ ابن خزیمہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی مخالفت کو ظلم

کیا ہے۔ حسین بن علی تمیمی کہتے ہیں کہ میں جب بغداد سے نیشاپور آیا تو ابن خزیمہ نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے بغداد میں کن کن علماء سے علم حاصل کیا ہے۔ میں نے ان علماء کا ذکر کیا جن کے خطابات اور دروس میں نے سنے تھے۔ فرمایا کیا تم نے محمد بن جریر سے بھی کچھ سنا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جی نہیں اس لئے کہ بغداد میں حنابلہ کی مخالفت کی وجہ سے لوگ اس کے پاس نہیں جاتے تھے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر تم نے ان سے کچھ سنا ہوتا تو وہ ان تمام باتوں سے بہتر ہوتا جو تم نے دوسروں سے سنی ہیں۔(۱)

۳۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ :

وَ اَمَّا التَّفَاسِیْرُ الَّتِیْ فِی اَیْدِی النَّاسِ فَاَصَحُّھَا تَفْسِیْرُ مُحَمَّد بْن جَرِیْر الطبری فانه یَذْکُرُ مَقَالَاتِ السَّلَفِ بِالْاَسَانِیْدِ الثَّابِتَةِ وَ لَیْسَ فِیْهِ بِدْعَةٌ وَلَا یَنْقُلُ عَنِ الْمُتَّھمِیْنَ کَمُقَاتِلِ بْنِ بُکَیْرٍ والْکَلْبِیِّ.(۲)

"جو تفاسیر لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے صحیح ترین محمد بن جریر طبری کی تفسیر ہے اس لئے کہ یہ سلف کے اقوال صحیح اسانید کے ساتھ نقل کرتا ہے' اس میں بدعت بھی نہیں ہے اور یہ ان لوگوں سے روایات نقل نہیں کرتے جن پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی ہو جیسے مقاتل بن بکیر اور کلبی۔"

جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

فَاِنْ قُلْتَ فَاَیُّ التَّفَاسِیرِ تُرْشِدُ اِلَیْهِ وَ تَاْمُرُ النَّاظِرَ اَنْ یُعَوِّلَ عَلَیْهِ؟ قُلْتُ تَفْسِیْرُ الْاِمَامِ اَبِیْ جَعْفَرِ بْنِ جَرِیْرِ الطَّبَرِی الَّذِیْ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ الْمُعْتَبَرُوْنَ عَلٰی اَنَّه لَمْ یُؤَلَّفْ فِی التَّفْسِیْرِ مِثْلُه' قَالَ النووی فِی تَھْذِیْبِه کتاب ابن جریر فی التَّفْسِیر لَمْ یُصَنِّفْ اَحَدٌ مِّثْلَه'.(۳)

---

(۱)تاریخ بغداد ص۱۶۳۔۱۶٤ج۲

(۲)مقدمہ تفسیر فتاوی ابن تیمیه ص۳۸٥ج۱۳

(۳)الاتقان فی علوم القرآن طبع دار ابن کثیر دمشق بیروت ۱۹۸۷ء ص۱۲۳۷ج۲

"اگر تم کہو کہ آپ کس تفسیر کی جانب راہنمائی کرتے ہیں اور تفاسیر دیکھنے والے کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس پر اعتماد کرے؟ تو میں کہوں گا کہ ابن جریر طبری کی تفسیر وہ تفسیر ہے جس کے بارے میں معتبر علماء کا اتفاق ہے کہ تفسیر میں اس طرح کی کتاب تصنیف نہیں کی گئی' امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں فرمایا ہے کہ ابن جریر کی تفسیر کی مثل کسی نے بھی تصنیف نہیں کی۔"

ابن جریر کی تفسیر کے تعارف کے بعد اب اس کے مصنف یعنی محمد بن جریر کا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

محمد بن جریر طبری کا تعارف

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری مفسر' محدث' مورخ' فقیہ تھے اور اکابر ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے تھے' ان کی ولادت طبرستان کے مرکز آمل میں ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی' کوفہ کے قاضی احمد بن کامل شجری متوفی ۳۵۰ھ نے ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ میں نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا' آٹھ سال کی عمر میں میں نے لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی تھی اور نو سال کی عمر میں میں نے حدیث سنی اور لکھنی شروع کر دی تھی' سب سے پہلے انہوں نے آمل میں محدثین سے احادیث کا سماع کیا تھا اور پھر علم کے طلب کے لئے شمالی ایران کے مشہور شہر "رَی" تشریف لے گئے۔ امام احمد بن حنبل سے سماع حدیث اور اخذ علم کے لئے بغداد کا سفر کیا تھا مگر ان کے پہنچنے سے تھوڑی مدت قبل ۲۴۱ھ میں امام احمد کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے ان سے تلمذ کا شرف تو حاصل نہ کر سکے مگر بغداد کے دوسرے محدثین اور فقہاء سے علوم کثیرہ حاصل کئے' اس کے بعد عراق کے شہر واسط اور کوفہ چلے گئے' پھر شام کا سفر اختیار کیا اور بیروت میں کچھ مدت قیام فرما کر قاری عباس بن ولید بیروتی سے

شامیین کی روایت کے مطابق قراءت کا علم حاصل کیا' ۲۵۳ھ میں مصر منتقل ہو گئے اور فسطاط میں کچھ مدت تک قیام کیا' پھر شام چلے گئے' ۲۵۶ھ میں پھر مصر آ گئے اور ربیع بن سلیمان مرادی سے فقہ شافعی کا علم حاصل کیا اور امام مزنی کے ساتھ کچھ مناقشے بھی کئے' اس کے بعد واپس بغداد لوٹ آئے اور کچھ مدت گزارنے کے بعد اپنے آبائی وطن طبرستان چلے گئے مگر آخری بار بقیہ عمر گزارنے کی نیت سے واپس بغداد آئے اور بغداد ہی میں ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

خطیب بغدادی نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

محمد بن جریر بن یزید طبری نے محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب سے' اسحاق بن اسرائیل سے' احمد بن منیع بغوی سے' محمد بن حمید رازی سے' محمد بن بشار سے' محمد بن مثنی سے اور عراق' شام' مصر میں اس طرح کے دوسرے محدثین سے احادیث سنی تھیں اور ان سے حدیث نقل کرنے والوں میں قاضی احمد بن کامل' محمد بن عبداللہ الشافعی اور مخلد بن جعفر جیسے اہل علم شامل ہیں'...... طبری نے بغداد کو اپنا وطن بنالیا تھا اور وفات تک یہیں پر قیام فرمایا تھا وہ علماء کے ائمہ میں سے تھے اس کے علم و فضل کی وجہ سے اس کے قول پر فیصلے کئے جاتے تھے اور اس کی رائے معلوم کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جاتا تھا' اس نے اتنے زیادہ علوم حاصل کئے تھے کہ اس کے معاصرین میں سے کوئی بھی ان علوم میں اس کا ہم رتبہ موجود نہیں تھا' قرآن کے حافظ تھے' قراءات کو جانتے تھے' قرآن کے معانی میں بصیرت کے حامل تھے' قرآن کے احکام میں فقاہت رکھتے تھے' احادیث کے عالم تھے' ان کے طرق و اسانید' صحیح اور ضعیف اور ناسخ و منسوخ کا علم بھی رکھتے تھے' احکام اور حلال و حرام کے مسائل کے بارے میں صحابہ' تابعین اور ان کے بعد آنے والوں کے اقوال کو جانتے تھے اور تاریخی واقعات اور اخبار کے عالم تھے۔ "تاریخ الامم والملوک" کے نام سے اس کی کتاب معروف ہے' تفسیر میں اس کی کتاب کی مثل موجود نہیں ہے' حدیث میں اس کی کتاب کا نام تہذیب

الآثار ہے اور اس نوعیت کی دوسری کتاب میں نے نہیں دیکھی مگر یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکی تھی' اصول فقہ اور فروع فقہ میں انہوں نے کتابیں لکھی ہیں' فقہاء کے اقوال میں انہوں نے بعض کو بعض پر ترجیح دی ہے اور بعض ایسے مسائل بھی ان سے منقول ہیں جن میں وہ منفرد تھے' علی بن عبداللہ سمسانی سے مروی ہے کہ ابن جریر نے ۴۰ سال تک تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے اور روزانہ ۴۰ ورقے لکھا کرتے تھے۔(۱)

امام شمس الدین ذہبیؒ متوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں :

مُحَمَّدُ بْنُ جَرِیر بْنِ یَزِید الامام العَلَمُ الْفَرْدُ الْحَافِظُ اَبُوْ جعْفر الطَّبرِیُّ اَحَدُ الْاَعْلَامِ وَ صَاحِبُ التَّصَانِیْفِ مِنْ اَهْلِ آمُلَ طَبَرِسْتَان اَكْثَرَ التَّطْوَافَ.

"محمد بن جریر ممتاز امام تھے' حافظ تھے' علم کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ تھے' صاحب تصانیف تھے' طبرستان کے شہر آمل کے رہنے والے تھے اور طلب علم کے لئے انہوں نے مختلف علاقوں کے بہت زیادہ دورے کئے تھے۔"

اس کے بعد ذہبی نے خطیب بغدادی کی وہی عبارت نقل کی ہے جس کا ترجمہ ابھی ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔(۲)

محمد بن جریر' محمد بن خزیمہ' محمد بن نصر مروزی اور محمد بن ہارون رویانی چاروں ہم نام بھی تھے' ہم عصر بھی تھے' ہم سبق بھی تھے اور انتہائی خوددار بھی تھے۔ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے کسی انسان سے سوال نہیں کرتے تھے' خطیب بغدادی نے ان کی خودداری کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے کہ :

"رحلت علمی یعنی علمی سفر نے ایک مرتبہ ان چاروں کو مصر میں اکٹھا کر دیا اور تنگدست ہو گئے' بھوک نے ان کو پریشان کر دیا تھا اور کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا' جس گھر

(۱) تاریخ بغداد ص۱۶۲۔۱۶۳ ج۲ البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۱۴۵۔۱۴۶ ج۱۱

(۲) تذکرۃ الحفاظ للذہبی طبع حیدر آباد دکن ص ۷۱۰۔۷۱۱ ج ۲

میں یہ رہتے تھے اس میں چاروں رات کو مشورے کے لئے جمع ہوئے اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ قرعہ اندازی میں جس کا نام نکل آئے وہ اپنے ساتھیوں کے لئے کسی سے کھانا مانگے گا۔ (کیونکہ بھوک مٹانے کے لئے سوال جائز ہے) قرعہ محمد بن خزیمہ کے نام نکلا اس نے کہا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں وضو کر کے نماز پڑھ لوں' ابن خزیمہ تو ان سے الگ ہو کر نماز میں مشغول ہو گئے اور والی مصر کے قاصد نے دروازے پر دستک دی۔ باقی ساتھیوں نے دروازہ کھولا اور قاصد نے سواری سے اتر کر پوچھا کہ تم میں سے محمد بن نصر کون ہے؟ کہا گیا کہ وہ یہ ہے اس نے ایک تھیلی نکالی جس میں پچاس دینار تھے اور اسے دیدی' پھر پوچھا کہ تم میں محمد بن جریر کون ہے؟ کہا گیا کہ وہ یہ ہے اس نے دوسری تھیلی نکالی جس میں پچاس دینار تھے اور اس کے ہاتھ میں پکڑا دی' پھر پوچھا تم میں محمد بن ہارون کون ہے؟ جواب دیا گیا کہ وہ یہ ہے۔ اس نے تیسری تھیلی نکالی جس میں پچاس دینار تھے اور اس کے حوالے کر دی' پھر پوچھا کہ تم میں محمد بن اسحاق بن خزیمہ کون ہے؟ جواب ملا کہ وہ یہ ہے جو نماز پڑھ رہا ہے اس نے چوتھی تھیلی نکالی جس میں پچاس دینار تھے اور جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس کی خدمت میں پیش کر دی اور کہا کہ امیر کل دوپہر کے وقت قیلولہ فرما رہے تھے کہ خواب میں اسے کوئی کہہ رہا ہے کہ محمد نام والوں نے بھوک کی وجہ سے اپنے پہلو لپیٹ لئے ہیں یعنی ان کے پیٹ خوراک سے خالی ہیں اس لئے یہ تھیلیاں بھیجی ہیں اور وہ تم کو قسم دیتا ہے کہ جب یہ ختم ہو جائیں تو کسی کو بھیج دو میں اور بھیج دوں گا۔" (۱)

یہ ان کی خودداری اور صبر و قناعت کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے ان کو وہاں سے رزق بھجوا دیا جہاں سے کچھ ملنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی' ضرورت بھی پوری ہو گئی اور دین کے یہ طالب علم سوال کی ذلت سے بھی بچ گئے۔ محمد بن جریر ان سب ساتھیوں میں زیادہ خوددار تھے۔ ان کے شاگرد مخلد بن جعفر دقاق کہتے ہیں کہ ابن جریر نے ہم کو اپنے یہ اشعار سنائے تھے ۔

---

(۱) تاریخ بغداد ص ۱۶۵ ج ۲

اِذَا اَعْسَرْتُ لَمْ یَعْلَمْ رَفِیْقِیْ وَ اَسْتَغْنِیْ فَیَسْتَغْنِیْ صَدِیْقِیْ

"جب میں تنگدست ہو جاتا ہوں تو میرے ساتھی کو بھی علم نہیں ہوتا' اور جب میں غنی ہو جاتا ہوں تو میرا دوست بھی غنی ہو جاتا ہے۔"

حَیَائِیْ حَافِظٌ مَاءَ وَجْھِیْ وَ رِفْقِیْ فِیْ مُطَالَبَتِیْ رَفِیْقِیْ

"میری حیاء میرے چہرے کی آبرو کی محافظ ہے' اور اپنے ساتھی سے اپنا حق مانگنے میں نرمی بھی میری آبرو کی محافظ ہے۔"

وَلَوْ اَنِّیْ سَمَحْتُ بِبَذْلِ وَجْھِیْ لَکُنْتُ اِلَی الْغِنٰی سَھْلَ الطَّرِیْقِ

"اگر میں اپنے چہرے کی آبرو خرچ کرنے کی سخاوت کرتا' تو مالدار بننے کا آسان طریقہ اختیار کر لیتا۔"

خُلُقَانِ لَا اَرْضٰی طَرِیْقَھُمَا بَطَرُ الْغِنٰی وَ مَذَلَّةُ الْفَقْرِ

"دو عادتیں ہیں کہ میں ان کے راستے کو بھی پسند نہیں کرتا' ایک مالداری پر اترانا اور دوسری فقر میں اپنے آپ کو ذلیل کرنا یعنی سوال کرنا۔"(۱)

امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے ابن جریر کی قناعت اور خودداری کی دو مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ مکتفی باللہ کی خواہش تھی کہ کوئی عالم مجھے ایسی کتاب لکھ کر دے جس میں وقف کے بارے میں تمام علماء کے اجماعی مسائل بیان کئے گئے ہوں' اس کام کے لئے ابن جریر اس کے دربار میں حاضر کئے گئے اور اس نے اس قسم کی کتاب بطریقہ املا مرتب کروا دی جب اس کے سامنے عطیہ پیش کیا گیا تو اس نے قبول نہ کیا اسے کہا گیا کہ کوئی نہ کوئی حاجت تو پوری کروانی پڑے گی' اس پر ابن جریر نے کہا کہ میری درخواست یہ ہے کہ امیر المؤمنین جمعے کے دن لوگوں کو سوال کرنے سے روک دے اور امیر نے یہ درخواست منظور فرما کر سوال کرنے کو ممنوع قرار دیدیا۔ دوسری مثال یہ بیان کی ہے کہ وزیر نے ابن جریر سے

---

(۱) تاریخ بغداد ص ۱۶۵ ج ۲

درخواست کی کہ میرے لئے فقہ میں ایک کتاب لکھ دیجئے۔ انہوں نے کتاب لکھ کر پیش کر دی' وزیر نے بطور عطیہ ایک ہزار دینار خدمت میں پیش کئے مگر انہوں نے واپس کر دیئے۔

پہلی مثال ابن کثیر نے بھی پیش کی ہے مگر نام مکتفی باللہ کی بجائے مقتدر باللہ کا ذکر کیا ہے۔(۱)

ابن جریر پر شیعیت اور رفض کا الزام بے بنیاد ہے

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ ابن جریر کا علمی مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ابن جریر کی وفات اتوار کی شام کو ۲۸ شوال ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی' ان کی عمر ۸۵ یا ۸۶ سال سے متجاوز تھی لیکن سر اور داڑھی کے بالوں میں سیاہ بال کافی تعداد میں موجود تھے' اپنے گھر میں رات کے وقت دفن کئے گئے تھے اس لئے کہ حنابلہ کے بعض عوام اور بے وقوف لوگوں نے دن کے وقت دفن کرنے سے منع کر دیا تھا اور ان پر رفض کا الزام لگایا تھا بلکہ جاہلوں نے تو اس پر الحاد تک کا الزام لگایا تھا اور وہ ان سب الزامات سے پاک تھے بلکہ قرآن و سنت کے علم اور عمل کے اعتبار سے ائمہ اسلام میں سے ایک امام تھے اور حنابلہ کے عوام ان کی مخالفت فقہ ظاہری کے امام ابن داؤد ظاہری کی تقلید کی وجہ سے کرتے تھے جو اس کے خلاف باتیں کرتا تھا اور اس پر رفض اور بڑے بڑے الزامات اور تہمتیں لگاتا تھا۔ ابن جریر جب وفات ہوئے تو بغداد کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوئے اور ان کے گھر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی اور گھر ہی میں دفن کر دیئے گئے اور کئی مہینوں تک لوگ آکر ان کی قبر پر نماز جنازہ یا دعا کرتے تھے۔ میں نے دو ضخیم جلدوں میں اس کی ایک کتاب دیکھی ہے جس میں غدیر خم کی احادیث جمع کی گئی ہیں' ان کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ وضوء میں پاؤں پر مسح کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور پاؤں دھونے کو واجب نہیں سمجھتے تھے اور ان کے بارے میں یہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۷۱۱ ج ۲' البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص ۱۴۶ ج ۱۱

بات مشہور ہو گئی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ابن جریر کے نام سے دو افراد مشہور ہیں ایک شیعہ ہے جس کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے اور دوسرا سنی ابو جعفر طبری۔ ہم طبری کو اس قسم کی باتوں سے پاک سمجھتے ہیں' انہوں نے اپنی تفسیر میں جس بات پر اعتماد کیا ہے وہ تو یہ ہے کہ وضوء میں پاؤں کا دھونا واجب ہے اور دھونے کے ساتھ ہاتھوں سے پاؤں کو ملنا بھی واجب ہے لیکن اس نے دلک کو مسح سے تعبیر کیا ہے' بہت سے لوگ ان کے مقصد کو سمجھ نہیں سکے ہیں اور جو سمجھ سکے ہیں انہوں نے ان کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک پاؤں کا دھونا اور ملنا دونوں واجب ہیں۔ واللہ اعلم۔(۱)

ابن کثیر کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ابن جریر طبری ائمہ اسلام میں سے تھے اور حنابلہ کے عوام ان کے بارے میں جو سوقیانہ باتیں کرتے تھے اور ان کو رفض کی جانب منسوب کرتے تھے تو یہ ابن داؤد ظاہری کی تقلید کی وجہ سے کرتے تھے' ابن جریر طبری مجتہد تھے اور داؤد ظاہری مجتہدین کے مخالف تھے اور مسح القدمین کے جواز کی نسبت ان کی جانب غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اس کا مسلک تو یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاؤں کا دھونا واجب ہے بلکہ ان کو ملنا بھی واجب ہے۔ باقی رہی غدیر خم کی احادیث کو ایک کتاب میں جمع کرنا تو یہ شیعیت کی علامت نہیں ہے اس لئے کہ غدیر خم کی حدیث کو اہل سنت والجماعۃ بھی قابل قبول سمجھتے ہیں۔ البتہ شیعہ حضرات اس حدیث کا جو غلط مفہوم بیان کرتے ہیں اہل سنت اسے تسلیم نہیں کرتے۔ خطیب بغدادی اور امام ذہبی جیسے ممتاز ائمہ حدیث کے بیانات بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک بھی ابن جریر اہل سنت والجماعۃ کے امام تھے شیعہ نہیں تھے۔ البتہ ابن جریر کے نام سے ایک دوسرے مفسر بھی گزرے ہیں جو شیعہ تھے۔

آخر میں حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کا ابن جریر کے بارے میں تبصرہ نقل کیا

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۱۴۶۔۱۴۷ ج۱۱ طبع مکتبۃ المعارف بیروت ۱۹۶۶ء

جاتا ہے جو عدل و توازن پر مبنی ہے اور ابن کثیر' ذہبی' ابن تیمیہ اور خطیب بغدادی کی آراء کی تائید کرتا ہے:

"محمد بن جریر بن یزید طبری عظیم امام تھے' مفسر تھے' اس کا کنیہ ابو جعفر تھا' بہترین کتابوں کے مصنف تھے' ۳۱۰ھ میں وفات پائی تھی' ثقہ تھے اور سچ بولنے والے تھے البتہ اس میں تھوڑا سا تشیع تھا جو نقصان دہ نہیں ہے۔ حافظ احمد بن علی سلیمانی نے اس کے بارے میں سخت بات کی ہے کہ یہ روافض کے لئے جھوٹی حدیثیں بناتا تھا سلیمانی نے ایسا ہی کہا ہے مگر یہ ظن کاذب ہے۔ ابن جریر کبار اور معتمد ائمہ اسلام میں سے تھے ہم اس کے بارے میں خطاء سے معصوم ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتے لیکن ہمارے لئے یہ بھی حلال نہیں ہے کہ ہم جھوٹ اور نفسانیت پر مبنی باتوں کے ذریعے ان کو تکلیف پہنچائیں اور ان کی توہین کریں۔ علماء نے ایک دوسرے کے بارے میں جو باتیں کی ہوں ان میں اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہئے اور ان کے بیان کرنے میں احتیاط کرنا چاہیے۔ بالخصوص جب کہ وہ باتیں ایک امام کے بارے میں کہی گئی ہوں' شاید سلیمانی کی مراد وہ ابن جریر ہے جس کا ذکر بعد میں آرہا ہے' بلکہ اگر میں قسم اٹھا کر کہوں کہ سلیمانی کا اشارہ اس ابن جریر کی جانب ہے جس کا ذکر بعد میں آرہا ہے تو میں حانث نہیں ہوں گا۔ سلیمانی متقن حافظ تھے اور جو باتیں اس کے دماغ سے نکلتی تھیں ان کو جانتے تھے۔ میں اس کے بارے میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ ابن جریر جیسے امام پر یہ جھوٹی تہمت لگائیں گے اور ہم نے ان کی جانب تھوڑے سے تشیع کی نسبت اس لئے کی ہے کہ انہوں نے "غدیر خم" کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے' ہمارے شیخ الشیوخ ابو حیان بھی سلیمانی کی بات سے دھوکہ کھا گئے ہیں کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں الصراط المستقیم کی تشریح میں ابو جعفر طبری کو **امام من ائمہ الامامیہ** کہہ دیا ہے' میں نے یہ تنبیہ اس لئے کی ہے کہ لوگ سلیمانی کی اس بات کی وجہ سے دھوکے میں نہ پڑ جائیں۔ اس لئے کہ ابن جریر کے معاصرین اور بعد میں آنے والے ائمہ نے ان کے بارے میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا' دراصل

اسے اشتراک اسمی نے نقصان پہنچایا ہے۔ ایک دوسرا مفسر گزرا ہے جس کا نام بھی محمد تھا' اس کے باپ کا نام بھی جریر تھا' اس کا کنیہ بھی ابو جعفر تھا' وہ اس کے ہم عصر بھی تھے اور وہ بھی اس کی طرح کثیر التصانیف تھے۔ خطیب بغدادی نے ایسا ہی کہا ہے اور حقیقت حال کا علم تو اللہ کے پاس ہے' ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ ایک مجلس میں ابو جعفر طبری کے سامنے حضرت علی کا ذکر خیر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ جو شخص کہتا ہے کہ ابو بکر اور عمر ہدایت کے امام نہیں تھے وہ کیا چیز ہے؟ کسی نے کہا کہ وہ مبتدع ہے۔ طبری نی اس شخص کی نرم بات پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا:

مُبْتَدِعٌ مُبْتَدِعٌ هٰذَا يُقْتَلُ مَنْ قَالَ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ وَّ عُمَرَ لَيْسَا بِاِمَامَيْ هُدًى يُقْتَلُ يُقْتَلُ.

''ایسا شخص مبتدع ہے' مبتدع ہے اور وہ قتل کیا جائے گا جو شخص بھی کہے کہ ابو بکر اور عمر ہدایت کے امام نہیں تھے تو وہ قتل کیا جائے قتل کیا جائے گا۔''(۱)

ابن حجر نے بعد میں ذکر ہونے والے جس ابن جریر کا حوالہ دیا تھا اس کا ذکر انہوں نے لسان المیزان کے ترجمہ نمبر ۳۴۵ میں اس طرح کیا ہے:

محمَّدُ بْنُ جَرِيْرِ بْنِ رُسْتم ابو جعفر الطبری رافِضِيٌّ لَه' تَوالِيْفُ مِنْهَا كِتَابُ الرُّوَاةِ عَنْ اَهْلِ الْبَيْتِ رَمَاه بِالرَّفْضِ عبدالعزيز الكتانی. (۲)

''محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر طبری رافضی تھے اس کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے ایک کتاب الرواۃ عن اہل البیت ہے' عبدالعزیز کتانی نے اسے رافضی کہا ہے۔''

سنی ابن جریر اور رافضی ابن جریر کے درمیان فرق دادا کے نام سے ہوتا ہے کہ اہل سنت کے امام ابن جریر کے دادا کا نام یزید تھا اور روافض کے امام ابن جریر کے دادا کا نام رستم

(۱) لسان المیزان طبع حیدر آباد دکن ۱۳۲۱ھ ص ۱۰۰۔۱۰۱ ج۵

(۲) لسان المیزان ص ۱۰۳ ج۵

تھا۔ عام طور پر لوگ دادا کا نام نہیں لیتے اس لئے سلیمانی کو اور بعض دوسرے لوگوں کو اشتباہ پیش آگیا' ابن حجر نے ابن عساکر کے حوالے سے ابو بکر و عمر کو امام ہدایت نہ ماننے والے کے بارے میں ابن جریر کے جذبات اس لئے نقل کئے ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ یہ امام اہل سنت ہیں اور رافضی نہیں ہیں۔ باقی رہی ابن حجر کی یہ بات کہ فیہ تشیع یسیر لا تضر اس میں تھوڑی سی شیعیت ہے جو نقصان دہ نہیں ہے تو شاید اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت علی کو حضرت عثمان پر افضل سمجھتے تھے اگر چہ خلافت میں ان کو عثمان سے موخر مانتے تھے اور اس نوع کی شیعیت ضرر رساں نہیں ہے جیسا کہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے اوائل میں لکھا ہے۔

ابن حجر نے اپنے شیخ الشیوخ ابو حیان کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ اس نے سلیمانی کے قول سے دھوکہ کھا کر ابو جعفر طبری کو امامیہ کا امام لکھا ہے تو میرے خیال ابن حجر کو غلط فہمی ہو گئی ہے اس لئے کہ ابو حیان کی تفسیر البحر المحیط میں ابو جعفر طوسی کا لفظ آیا ہے طبری کا لفظ نہیں آیا۔(۱)

(۲) بحر العلوم تفسیر سمر قندی متوفی ۳۷۵ھ :

اس تفسیر کا نام تو بحر العلوم ہے لیکن تفسیر سمر قندی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مصنف مشہور حنفی فقیہ نصر بن محمد بن ابراہیم الخطاب السمر قندی ہیں جس کا کنیہ "ابو اللیث" ہے اور لقب "الفقیہ" اور "امام الھدیٰ" ہے مگر ان کا کنیہ اسم علمی پر غالب آگیا ہے اور یہ "ابو اللیث سمر قندی" یا "الفقیہ ابو اللیث" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے والد محمد بن ابراہیم توذی بھی فقیہ تھے اور بڑے پرہیز گار تھے اور ان کے ابتدائی استاد بھی یہی تھے مگر ان کے مشہور استاد مشہور حنفی فقیہ ابو جعفر ہندوانی بلخی تھے۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے بارے میں کوئی متفقہ قول تو موجود نہیں ہے لیکن اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کی ولادت ۳۰۱ھ اور ۳۱۰ھ کے درمیان ہوئی تھی اور وفات کے بارے میں شمس الدین داؤدی نے

(۱) البحر المحیط ص۲۵ بحث الصراط

طبقات المفسرین ص ۳۴۶ ج ۲ پر لکھا ہے کہ جمادی الاخری ۳۹۳ھ میں فوت ہوئے تھے۔ مگر مشہور ۳۷۵ھ ہے۔

تفسیر سمرقندی میں احادیث اور آثار نقل ہوئے ہیں لیکن ان میں اسرائیلیات اور ضعیف روایات بھی موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سند کی صحت یا عدم صحت معلوم کرنے کا یہ الفقیہ کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے البتہ الفاظ اور کلمات کے لغوی معانی بڑے آسان الفاظ میں بیان کرتے تھے اور ابن قتیبہ' اصمعی' زجاج' فراء اور خلیل نحوی کے اقوال بھی جگہ جگہ نقل کرتے ہیں۔

یہ تفسیر دار الکتب العلمیہ بیروت نے تین جلدوں میں ۱۹۹۳ء میں شائع کی ہے اور اس کی تحقیق جامعہ ازہر کے تین فضلاء نے کی ہے۔

شیخ علی محمد معوض' شیخ عادل احمد عبد الموجود اور ڈاکٹر زکریا عبد المجید۔

(۳) النکت و العیون تفسیر الماوردی متوفی ۴۵۰ھ :

ماوردی کا نام ہے علی بن محمد بن حبیب اور کنیہ ابو الحسن ہے۔ ماورد مخفف ہے "ماء الورد" سے جس کے معنے ہیں عرق گلاب۔ ان کے والد عرق گلاب بناتے تھے اور اس کی تجارت بھی کرتے تھے اس لئے یہ ماوردی کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کی ولادت بصرہ میں ۳۶۴ھ میں ہوئی تھی۔ یہ دولت عباسیہ کے عروج کا دور تھا اور اس دور میں علوم و فنون کی درس و تدریس' تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی ترقی بھی عروج پر تھی۔ ابتدائی علوم بصرہ میں ابو القاسم صیمری متوفی ۳۸۶ھ سے حاصل کئے تھے جو اس وقت بصرہ کے ممتاز عالم تھے اور فقہ شافعی کے ممتاز فقیہ تھے۔ اس کے بعد بغداد منتقل ہو گئے اور مختلف اساتذہ سے حدیث اور فقہ کا سماع کرتے رہے مگر آخر مین فقہ شافعی کے حافظ اور ممتاز امام ابو حامد اسفرائینی متوفی ۴۰۶ھ کے حلقہ درس سے منسلک ہو گئے' اسفرائینی کا تعارف ابن کثیر نے اس طرح کرایا ہے کہ :

۳۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے' ۳۶۴ھ میں بغداد چلے گئے تھے اور بغداد میں علوم متنوعہ کی تحصیل میں ترقی کر کے امام الشافعیہ فی زمانہ کا مقام حاصل کر لیا تھا اور فقہ شافعی کی ریاست اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ عوام اور سلطان دونوں کی نگاہوں میں بڑے عظیم اور وجیہ تھے وکان فقیھا اماما جلیلا نبیلا فقیہ تھے' امام تھے اور عظیم و شریف عالم تھے۔ خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک کی مسجد میں درس دیتے تھے اور میں اس کی مجلس تدریس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کی مجلس تدریس میں ۷۰۰ فقہاء شامل ہوتے تھے' لوگ کہتے تھے کہ اگر امام شافعی اسے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے' حنفیہ کے مشہور امام ابوالحسن قدوری نے کہا ہے کہ میں نے شافعیہ میں ابوحامد اسفرائینی سے بڑا فقیہ اور کوئی نہیں دیکھا۔(۱)

ماوردی نے بھی اسفرائینی کے تلمذ کی وجہ سے فقہاء شافعیہ میں ممتاز مقام حاصل کیا تھا مختلف علاقوں کے قاضی رہے تھے اور ۴۲۹ھ میں اس کو قاضی القضاۃ کا لقب دیا گیا تھا بعض علماء نے اعتراض کیا تھا کہ کسی عالم کو قاضی القضاۃ کہنا جائز نہیں ہے لیکن اس اعتراض کے باوجود وفات تک اسی نام سے یاد کئے جاتے تھے اور وفات کے بعد بھی اسی لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ تفسیر کے علاوہ الاحکام السلطانیہ' ادب الوزیر اور ادب القاضی بھی اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کا انتقال ربیع الاول ۴۵۰ھ میں ہوا تھا۔ خطیب بغدادی ماوردی کے شاگرد تھے انہوں نے اپنے شیخ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"علی بن محمد بن حبیب ابوالحسن بصری جو ماوردی کے نام سے معروف ہیں۔ فقہاء شافعیہ کے ممتاز علماء میں شامل تھے' اصول فقہ' فروع فقہ اور دوسرے موضوعات پر اس نے متعدد تصنیفات کی ہیں۔ بہت سے شہروں میں قاضی رہے تھے' یہ ثقہ عالم تھے' ربیع الاول ۴۵۰ھ کے آغاز میں فوت ہوئے تھے اور شہر کی جامع مسجد میں میں نے خود اس کی نماز جنازہ

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۳۰۲ ج ۱۲

پڑھائی تھی اور اس کی عمر ۸۶ سال کو پہنچ گئی تھی۔"(۱)

ماوردی آیت کی تفسیر میں سلف اور خلف یعنی صحابہ و تابعین کے تمام اقوال نقل کرتا ہے 'لغوی تحقیقات کرتا ہے اور مفردات کا بڑا دقیق تجزیہ کرتا ہے۔ قراءات اور فقہی احکام کا ذکر بھی کرتا ہے اور ترجیح فی الاقوال کی کوشش بھی کرتا ہے۔ آثار صحابہ و تابعین کے بارے اس کا بڑا مرجع اور مصدر تفسیر ابن جریر ہے لغوی و نحوی تحقیقات میں فراء' اخفش' ثعلب' مبرد' زجاج اور ابو عبیدہ کی کتابوں سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں اور خلیل و سیبویہ کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں اور فقہی احکام بیان کرنے میں امام شافعی کے اقوال کو تو بڑی اہمیت دیتا ہے مگر امام مالک' امام ابو حنیفہ اور امام داؤد ظاہری کی آراء کا ذکر بھی کرتا ہے۔

انہوں نے تفسیر کے آغاز میں اپنا منہج اس طرح بیان کیا ہے:

وَلَمَّا كَانَ ظَاهِرُ الْجَلِيِّ مَفْهُوْمًا بِالتِّلَاوَةِ وَ كَانَ الْغَامِضُ الْخَفِيُّ لَا يُعْلَمُ اِلَّا مِنْ وَجْهَيْنِ نَقْلٍ وَ اجْتِهَادٍ جَعَلْتُ كِتَابِيْ هٰذَا مَقْصُوْرًا عَلَى تَاوِيْلِ مَا خَفِيَ عِلْمُه وَ تَفْسِيْرِ مَا غَمَضَ تَصَوُّرُه' وَ فَهْمُه' وَ جَعَلْتُه' جَامِعًا بَيْنَ اَقَاوِيْلِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ وَ مُوْضِحًا عَنِ الْمُؤْتَلَفِ وَالْمُخْتَلَفِ وَ ذَاكِرًا مَا سَنَحَ بِهِ الْخَاطِرُ مِنْ مَعْنًى يَحْتَمِلُ عَبَّرْتُ عَنْهُ بِاَنَّه' مُحْتَمِلٌ لِيَتَمَيَّزَ مَا قِيْلَ مِمَّا قُلْتُه' وَ يُعْلَمَ مَا اسْتُخْرِجَ مِمَّا اسْتَخْرَجْتُه' وَ عَدَلْتُ عَمَّا ظَهَرَ مَعْنَاهُ مِنْ فَحْوَاهُ اِكْتِفَاءً بِفَهْمِ قَارِئِهٖ وَ تَصَوُّرِ تَالِيْهِ.

"جب ظاہری اور جلی مفہوم تلاوت ہی سے معلوم ہو جاتا ہے اور پوشیدہ اور خفی کا علم حاصل نہیں ہو سکتا مگر دو طریقوں سے ایک نقل اور دوسرا اجتہاد اس لئے میں نے اپنی اس کتاب میں انہی آیات کی تاویل و تفسیر پر اکتفا کیا ہے جن کے علم و فہم میں کچھ خفا اور اشکال ہو' میں نے اس کتاب میں سلف اور خلف کے اقوال کو جمع کر دیا ہے اور اتفاقی و اختلافی امور کی وضاحت بھی کر دی ہے' میرے دل میں جو احتمالی معنی آیا ہے اس کا ذکر میں نے "محتمل" کے

(۱) تاریخ بغداد ص۱۰۲۔۱۰۳ ج۱۲

لفظ کے ساتھ کیا ہے تاکہ نقل کردہ اقوال اور میرے اپنے قول کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ اور منقول اور مستنبط کے درمیان فرق معلوم ہو سکے اور جن آیات کا مفہوم سیاق کلام کی روشنی میں واضح ہو اس کے بیان کی جانب میں نے توجہ نہیں دی بلکہ ان کو سمجھنے کے لئے قاری کے اپنے فہم پر انحصار کیا ہے۔"

ماوردی کی یہ تفسیر دار الکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۹۲ء میں ٦ جلدوں میں شائع کی ہے جس پر سید بن عبدالمقصود بن عبدالرحیم نے تفصیلی تعلیق لکھی ہے۔

(٤) معالم التنزيل للبغوي متوفي ٥١٦ھ:

بغوی کا نام حسین بن مسعود تھا لیکن فراء بغوی کے نام سے مشہور ہیں۔ فراء پوستین باف اور پوستین فروش کو کہتے ہیں چونکہ پوستین بنانا اور فروخت کرنا ان کا خاندانی پیشہ تھا اس لئے فراء کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور بغوی کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ "بغشور" "ھرات" اور "مروروذ" کے درمیان ایک شہر کا نام ہے جو ان کا مولد یعنی مقام ولادت ہے۔ ہرات تو افغانستان کا مشہور شہر ہے اور آج کل بھی اسی نام سے مشہور ہے اور مروروذ مرو صغریٰ کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ یہ مشہور شہر "مروالشاہجہان" سے ١٦٠ میل کے فاصلے نہر مرغاب کے کنارے پر آباد تھا اور شمالی افغانستان میں ترکستان کی حدود میں شامل تھا۔ خراسان کا یہ علاقہ عثمان بن عفان کے دور خلافت میں ٣٢ھ میں احنف بن قیس نے فتح کیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں مرو کو بہت بڑی شہرت حاصل ہے اس لئے کہ پہلی صدی ہجری سے لے کر چھٹی صدی ہجری تک یہ شہر بڑے بڑے علماء کا مرکز رہا ہے۔ امام بغوی بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے اس لئے خلاف القیاس انہیں بغوی کہا جاتا ہے۔ کب پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں کتب تراجم میں تصریح تو موجود نہیں ہے لیکن اس بات پر سوائے ابن خلکان کے سب کا اتفاق ہے کہ ان کی وفات ٥١٦ھ میں ہوئی تھی اور عمر ٨٠ سال سے کچھ اوپر تھی' ابن خلکان کے نزدیک ٥١٠ھ میں فوت ہوئے تھے اس حساب سے غالباً ان کی ولادت پانچ یں

صدی ہجری کے عشرہ رابع کے اوائل میں ہوئی تھی اور یاقوت حموی نے معجم البلدان میں تصریح کی ہے کہ ۴۳۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان فقہ شافعی کا متبع تھا اس لئے ان کی تعلیم و تربیت بھی فقہ شافعی کے مطابق ہوئی تھی۔ مگر تفسیر' حدیث اور فقہ تینوں میں ان کو امامت اور قیادت و ریاست کا مقام حاصل تھا۔ تفسیر میں "معالم التنزیل" حدیث میں "شرح السنۃ" اور فقہ میں "التہذیب" ان کی کتابیں ہیں جو مصادر اور مراجع میں شمار ہوتی ہیں' اہل علم کے درمیان متداول ہیں اور مستند و معتمد کتابیں سمجھی جاتی ہیں' بغوی نے تفسیر' حدیث اور فقہ میں بہت سے علماء سے علم حاصل کیا تھا لیکن ان کے مشہور اور ممتاز استاد خراسان کے "فقیہ" اور "شیخ الشافعیہ" قاضی حسین بن محمد مروزی متوفی ۴۶۲ھ تھے۔ قاضی حسین کے بارے میں ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ لکھتے ہیں کہ :

"یہ مسلک شافعی کے امام کبیر تھے' امام الحرمین نے اپنی کتاب "نہایۃ المطلب" میں اور امام غزالی نے اپنی کتاب "الوسیط" اور "البسیط" میں جہاں بھی "قال القاضی" کہا ہو تو ان کی مراد قاضی حسین ہوتی ہے۔ اس نے فقہ کا علم ابو بکر القفال مروزی سے حاصل کیا تھا' اصول و فروع اور اختلافی مسائل میں انہوں نے تصنیفات کی تھیں' لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے' تدریس کرتے تھے اور فتوے دیا کرتے تھے' ممتاز علماء کی ایک جماعت نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا تھا جن میں التہذیب اور شرح السنہ کے مصنف فراء بغوی بھی شامل ہیں اور فراء بغوی کا تعارف ابن خلکان نے اس طرح کرایا ہے کہ :

فقہ شافعی کے فقیہ تھے' محدث تھے' مفسر تھے اور بحر العلوم یعنی علوم کا سمندر تھے۔(۱)

حافظ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں کہ بغوی امام تھے' حافظ تھے' فقیہ تھے' مجتہد تھے' سنت رسول کا احیاء کرنے والے تھے اور معالم التنزیل' شرح السنہ' التہذیب' مصابیح السنہ اور دوسری کتابوں کے مصنف تھے' انہوں نے فقہ قاضی حسین سے حاصل کی تھی اور

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان ص ۱۳۶٬۱۳۴ ج ۲

اس سے احادیث بھی نقل کی تھیں۔(۱)

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ فرماتے ہیں :

كَانَ علَّامة زمانه فِيْهَا كَان دَيِّنًا ورِعًا زاهِدًا عَابِدًا صَالِحًا تُوُفِّى فِىْ شوَّال منها و قِيْلَ فِىْ سَنَةِ عَشرٍ فَاللّٰهُ اَعْلَمُ و دُفِنَ مع شَيْخِه الْقَاضى حُسَيْن بِالطَّالقَان.(۲)

"بغوی علوم میں علامہ زمان تھے اور دیندار' پرہیزگار' زاہد' عابد اور صالح عالم تھے۔ شوال ۵۱۶ھ میں وفات پائی تھی' بعض کے نزدیک ۵۱۰ھ میں فوت ہوئے تھے اور طالقان میں اپنے شیخ قاضی حسین کی قبر کے پاس دفن ہوئے تھے۔"

امام بغوی کی معالم التنزیل تفسیر بالماثور کے طرز پر لکھی گئی تفاسیر میں سے مختصر مگر جامع تفسیر ہے' آیات سے متعلق احادیث اور آثار نقل کرنے میں صحت اسانید و طرق کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں چونکہ بہت بڑے محدث ہیں اور محی السنہ کے لقب سے ملقب ہیں اس لئے ان کی نقل کردہ روایات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ہے کہ :

فَاَسْلَمُها مِنَ الْبِدْعَة والْاَحادِيْثِ الضَّعِيْفَةِ الْبَغوى.(۳)

"بدعت اور ضعیف احادیث سے محفوظ تفسیر بغوی کی تفسیر ہے۔"

بغوی سب سے پہلے مختصر اور آسان الفاظ میں آیت کی تفسیر کرتے ہیں اور پھر غریب الفاظ کے معانی کی وضاحت کرتے ہیں اور آیات کے درمیان مطابقت بھی بیان کرتے ہیں۔ اہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان اختلافی مسائل میں اہل سنت کی رائے کی تائید میں دلائل بیان کرتے ہیں اور اہل بدعت کی تردید کرتے ہیں مثلاً لَاتُدْرِكُهُ الْاَبصَارُ

---

(۱)تذکرة الحفاظ ص۱۲۵۷ج۴

(۲)البدایه والنهایه ص۱۹۳ج۱۲

(۳)مقدمه تفسیر فتاوی ص۳۸٦ج۱۳

(الانعام ۱۰۳) کی تفسیر و توجیہ میں دوسری آیات اور احادیث کی روشنی میں "رویت الٰہی" کے مسئلے میں اہل سنت کے عقیدے کی تائید کی ہے اور معتزلہ کے نظریئے کی تردید کی ہے۔ اسی طرح اللہ کے اسماء و صفات کے بارے میں بغوی معتزلہ اور جہمیہ کی تردید کرتے ہیں اور اہل سنت کے اس عقیدے کا اثبات کرتے ہیں کہ قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر ہوا ہے مثلاً نفس' وجہ' عین' ید' رجل' اتیان نزول الی السماء الدنیا' استواء علی العرش' ضحک' فرح اور اس قسم کی دوسری صفات پر بغیر تاویل کے اور بغیر تشبیہ کے ایمان لانا ضروری ہے' جس طرح اللہ کی ذات مخلوق کی ذوات کے ساتھ مشابہ نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات بھی مخلوق کی صفات کے ساتھ مشابہ نہیں ہیں۔ اس مسلک پر امت کے سلف اور علماء اہل سنت کے اقوال اور دلائل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔(۱)

آیات الاحکام کی تفسیر میں فقہاء کی آراء بیان کرتے ہیں۔ اکثر مسائل میں امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں مگر بعض مقامات پر بغیر ترجیح کے گزر جاتے ہیں۔ بغوی کی تفسیر اسرائیلیات اور روایات ضعیفہ سے بالکل خالی تو نہیں ہے بلکہ محمد بن سائب کلبی کوفی متوفی ۱۴۶ھ جیسے مجروح راوی کی روایات بھی انہوں نے کافی تعداد میں نقل کی ہیں لیکن اس قسم کی روایات پر انہوں نے استدلال نہیں کیا اور مجموعی طور پر یہ تفسیر بڑی افادیت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر متعدد بار شائع ہوئی ہے لیکن ۱۴۰۹ھ میں دار طیبہ ریاض نے احادیث کی تخریج اور تحقیق کے ساتھ بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہے۔

(۵) زاد المسیر لابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ :

ابن جوزی کا نام عبدالرحمٰن بن ابی الحسن ہے اور کنیہ ابوالفرج ہے لیکن ان کے جد اعلیٰ جعفر جوزی کے نام سے مشہور تھے اس لئے یہ ابن جوزی کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ جوز اخروٹ کے درخت کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بصرہ کی نہر کے داہنے پر ایک جگہ کا نام

(۱) شرح السنہ ۱۶۸۔۱۷۱ ج ۱

"فرضۃ الجوزہ" تھا جس کی طرف جعفر منسوب تھے' بعض کے نزدیک بصرہ کے ایک محلے کا نام جوزہ تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ واسط میں ان کے گھر میں اخروٹ کا درخت تھا اور واسط میں اور کہیں بھی اخروٹ کا درخت موجود نہیں تھا۔ ابن جوزی کا قول ہے کہ مجھے اپنی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں ہے لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے والد ۵۱۴ھ میں فوت ہوئے تھے اور میری والدہ کہتی تھی کہ اس وقت میری عمر تین سال تھی اس حساب سے ان کی ولادت کی تاریخ ۵۱۱ھ یا ۵۱۲ھ بنتی ہے۔ ان کی ولادت بغداد میں ہوئی تھی' کفالت اور تربیت والدہ اور پھوپی نے کی تھی اور انتقال ۱۲ رمضان المبارک ۵۹۷ھ کو ہوا تھا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی ان کی موت کی خبر پر بغداد کے سارے بازار بند ہو گئے تھے اور بغداد کے تقریباً سب لوگ جنازے کی نماز میں شریک ہوئے تھے۔

ابن جوزی نے ہر فن کے ممتاز اور مشاہیر علماء سے علوم حاصل کیے تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ اور دوسرے علوم و فنون میں انہوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں اور ان کا شمار ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے واعظ بھی تھے اور ان کی مجالس وعظ میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے تھے۔

ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ فرماتے ہیں :

كَانَ عَلَّامَةَ عَصْرِهِ وَ اِمَامَ وَقْتِهِ فِي الْحَدِيْثِ وَصَنَاعَةِ الْوَعْظِ صَنَّفَ فِيْ فُنُوْنٍ عَدِيْدَةٍ.(۱)

"ابن جوزی علامہ زمان تھے' حدیث اور فن خطابت میں اپنے دور کے امام تھے اور انہوں نے متعدد فنون میں تصنیفات کی ہیں۔"

ابن جوزی کی تفسیر زاد المسیر میں بھی آیات کی تفسیر میں احادیث و آثار نقل کی جاتی ہیں اور نقل روایات کے سلسلے میں ان کا بڑا مصدر تفسیر ابن جریر ہے لیکن یہ اقوال میں ترجیح نہیں

---

(۱) وفیات الاعیان ص ۱۴۰ ج ۳

دیتے بلکہ نقل کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح ضعیف روایات اور اسرائیلیات سے بھی یہ تفسیر خالی نہیں ہے لیکن باوجود ان خامیوں کے یہ تفسیر بڑی افادیت رکھتی ہے۔ مکتب اسلامی بیروت نے یہ تفسیر ۱۹۶۴ء میں پہلی مرتبہ تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع کی ہے۔

(۶) المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز لابن عطیہ غرناطی متوفی ۵۴۱ھ :

ابن عطیہ کا نام عبدالحق بن غالب تھا اور اسم کنیہ ابو محمد تھا لیکن ان کے جد اعلیٰ کا نام عطیہ تھا اور سب سے پہلے یہی اندلس میں داخل ہوئے تھے اس لئے ان کی نسبت کی وجہ سے یہ ابن عطیہ کے نام سے مشہور ہیں' اندلس کے مشہور شہر غرناطہ کی نسبت سے اس کو غرناطی کہا جاتا ہے' نسب کے اعتبار سے یہ خالص عرب تھے اس لئے کہ عطیہ کے جد اعلیٰ زید بن محارب مضر بن نزار کی نسل میں سے تھے جو عرب کا مشہور قبیلہ ہے' ان کی ولادت ۴۸۱ھ میں ہوئی تھی اور تاریخ وفات میں تھوڑا سا اختلاف ہے لیکن صحیح قول کے مطابق ان کا انتقال ۲۵ رمضان ۵۴۱ھ کو ہوا تھا۔ ابن عطیہ کی تربیت علمی گھرانے' علمی خاندان اور علمی ماحول میں ہوئی تھی۔ غرناطہ اس وقت علوم و فنون کا مرکز تھا اور ان کا خاندان غرناطہ کے ممتاز افراد پر مشتمل تھا۔ نسب اور علم دونوں کی کرامت و شرافت اس گھرانے کو حاصل تھی۔ ان کے والد حافظ ابو بکر غالب بن عطیہ فقیہ' محدث اور زاہد تھے جس نے اندلس کے مشاہیر اور ممتاز علماء سے علم حاصل کیا تھا لوگ علم حاصل کرنے کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور ابن عطیہ چھوٹی عمر میں اس علمی ماحول سے متاثر ہوتے تھے اور اس علمی فضا میں اس کی تربیت ہوئی تھی' ان کے والد نے ان کی تعلیم کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا تھا اور خود بھی ان کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لی تھی' اسی علمی ماحول اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اثرات تھے کہ ابن عطیہ ذہانت' ذکاوت' فطانت اور دانشمندی کے بلند مقام پر فائز تھے اور علوم و معارف کے حصول اور علمی کتابوں کا ذخیرہ جمع کرنے کا بہت زیادہ شوق رکھتے تھے۔ اسی شوق اور علمی پیاس کی وجہ سے انہوں نے اندلس کے بڑے بڑے علمی مراکز کا سفر کیا تھا اور وقت کے

نامور علماء سے علوم حاصل کیے تھے یہاں تک کہ اندلس میں اہل سنت والجماعت کے افاضل علماء میں انہوں نے نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اندلس کے شہر مُریہ بروزن غنیہ یا مَرِیَّۃ بروزن غَنِیَّۃ میں کافی مدت تک قاضی رہے تھے اس لئے قاضی ابن عطیہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور تفسیر میں جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اکثر کہتے ہیں قال القاضی ابو محمد' ابن عطیہ نے باطل کے مقابلے میں جہاد بالعلم کے ساتھ جہاد بالسیف میں بھی حصہ لیا تھا' اس دور میں دشمنان دین کے مقابلے میں جنگ و قتال کے معرکے بھی ہر وقت برپا رہے تھے اور ابن عطیہ تلوار لے کر کافی مدت تک گھر سے غائب رہتے اور ان معرکوں میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے اس لئے کہ یہ جہاد دشمنان اسلام کے خلاف تھا اور ابن عطیہ اسے بہت بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے امراء کے نام مختلف خطوط بھی لکھے تھے جن میں ان کو بلاد اسلامیہ کو کفار سے آزاد کرانے اور مسلمانوں کو ظالموں کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس عظیم مفسر' محدث اور فقیہ کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی طلب علم بھی جہاد ہے' تعلیم و تفہیم دین اور دعوت دین بھی جہاد ہے' امراء اور حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنا بھی جہاد ہے' مسلمانوں اور حکمرانوں کے اندر جذبہ جہاد بیدار کرنا بھی جہاد ہے اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں غلبہ اسلام کے لئے اور مسلمانوں کو کفار سے آزادی دلانے لڑنا بھی جہاد ہے اور ابن عطیہ غرناطی نے جہاد کے ان تمام میدانوں میں شرکت کی تھی۔

فجزاه الله خير الجزاء و رضى الله عنه و ارضاه آمين يا رب العالمين.

ابن عطیہ کی تفسیر کو ہم نے تفسیر بالماثور کے زیر عنوان اس لئے ذکر کیا ہے کہ آیات کی تفسیر میں احادیث و آثار کو یہ دوسرے مآخذ تفسیر پر فوقیت دیتے ہیں لیکن غیر ضروری قصص و حکایات کا ذکر نہیں کرتے اور اسرائیلیات کے ذکر سے بھی بالعموم اعراض کرتے ہیں اگر چہ بعض مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے مگر ان کی عادت اور منہج یہ ہے کہ تفسیر کو اسرائیلی روایات اور

غیر ضروری حکایات کے ذکر سے طول نہ دیا جائے اور میرے نزدیک یہ اس تفسیر کی بڑی خوبی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس تفسیر پر بڑا جامع تبصرہ کیا ہے :

وَ تَفْسِیْرُ ابْنِ عَطِیَّةَ خَیْرٌ مِنْ تَفْسِیْرِ الزَّمَخْشَرِیِّ وَ اَصَحُّ نَقْلًا وَ بَحْثًا وَ اَبْعَدُ مِنَ الْبِدَعِ وَ اِنِ اشْتَمَلَ عَلٰی بَعْضِھَا بَلْ ھُوَ خَیْرٌ مِنْه بِکَثِیْرٍ بَلْ لَعَلَّه اَرْجَحُ ھٰذِهِ التَّفَاسِیْرِ لٰکِنْ تَفْسِیْرُ ابْنِ جَرِیْرٍ اَصَحُّ مِنْ ھٰذِهِ کُلِّھَا.(۱)

"ابن عطیہ کی تفسیر زمخشری کی تفسیر سے بہتر ہے' اس کی نقل اور بحث زیادہ صحیح ہوتی ہے اور بدعات سے دور ہوتی ہے اگرچہ بعض بدعات اس میں بھی آگئی ہیں بلکہ یہ زمخشری کی تفسیر سے بہت سے پہلوؤں کے اعتبار سے بہتر ہے بلکہ شاید یہ ان تمام تفاسیر سے بہتر ہے لیکن ابن جریر کی تفسیر ان سب سے زیادہ صحیح تفسیر ہے۔"

ابن خلدون اپنے مقدمے میں لکھا ہے :

لَمَّا رَجَعَ النَّاسُ اِلَی التَّحْقِیْقِ وَالتَّمْحِیْصِ وَ جَاءَ اَبُوْ مُحَمَّد عَبْدُ الْحَقِّ ابْنُ عَطِیَّه مِنَ الْمُتَاخِّرِیْنَ بِالْمَغْرِبِ فَلَخَّصَ التَّفَاسِیْرَ کُلَّھَا وَ تَحَرّٰی مَا ھُوَ اَقْرَبُ اِلَی الصِّحَّةِ مِنْھَا.

"جب لوگوں کا رجحان تحقیق اور اختصار کی طرف ہونے لگا اور متاخرین میں سے ابو محمد عبدالحق ابن عطیہ مغرب (اندلس) میں تشریف لائے تو سب تفاسیر کا خلاصہ اپنی تفسیر میں پیش کیا اور ان تفاسیر کو تلاش کیا جو ان میں سے صحت کے زیادہ قریب تھیں۔"

ابن عطیہ چونکہ عربی لغت اور صرف و نحو میں بھی مہارت اور رسوخ رکھتے تھے اس لئے اس کی تفسیر میں لغت' اعراب اور اشتقاق سے متعلق بھی بڑی اہم مباحث پائی جاتی ہیں۔

احادیث و آثار میں ابن عطیہ نے زیادہ تر اعتماد ابن جریر کی تفسیر پر کیا ہے' لغت اور نحو سے متعلق مباحث میں انہوں نے اکثر خلیل نحوی' سیبویہ' مبرد' ثعلب' فراء' زجاج اور ابو عبیدہ معمر بن مثنی کے اقوال سے استفادہ کیا ہے اور فقہی مسائل میں انہوں نے مؤطا مالک

(۱) مقدمہ تفسیر فتاوی ابن تیمیہ ص۳۸۸ ج۱۳

اور فقہ مالکی کی دوسری کتابوں پر اعتماد کیا ہے اس لئے کہ فقہی اور اجتہادی امور میں ابن عطیہ مالکی تھے۔ ابن عطیہ سے بعد میں آنے والے مفسرین میں سے تین مفسرین نے ان کی کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور جگہ جگہ اس کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔

ایک ہے ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی متوفی ۶۷۱ھ۔ اس کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منہج تفسیر وہی ہے جو ابن عطیہ کا ہے البتہ احادیث قرطبی میں زیادہ نقل کی گئی ہیں اور فقہی احکام کی تفصیلات بھی انہوں نے زیادہ بیان کی ہیں لیکن اسرائیلیات کا ذکر قرطبی میں ابن عطیہ کی تفسیر کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہوا ہے۔

دوسرے ابو حیان محمد بن یوسف غرناطی متوفی ۷۴۵ھ ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر البحر المحیط کے مقدمے میں لکھا ہے کہ میں نے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے زمخشری اور ابن عطیہ کی تفسیروں پر زیادہ اعتماد کیا ہے اس لئے کہ علم تفسیر میں تصنیف کرنے والوں میں سے یہ دونوں اجل اور افضل ہیں' ابو حیان چونکہ عربیت کے ماہر تھے اور اپنی تفسیر میں انہوں نے لغوی' صرفی اور نحوی مباحث زیادہ بیان کی ہیں اور زمخشری اور ابن عطیہ بھی عربیت کے امام تھے اس لئے ادبی ذوق میں یک رنگی کی وجہ سے اس نے ان دونوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے لیکن لغوی اور نحوی امور میں ابو حیان نے ابن عطیہ کے اقوال پر تنقید بھی کی ہے بلکہ بعض مقامات پر تنقید میں غیر ضروری طوالت بھی آگئی ہے۔

تیسرے مفسر ہیں شیخ ابوزید عبدالرحمن بن محمد بن مخلوف الثعالبی الجزائری متوفی ۸۷۵ھ' اس کی تفسیر "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" تو دراصل ابن عطیہ کی تفسیر کا خلاصہ ہے جیسا کہ اس نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں خود لکھا ہے کہ میری یہ تفسیر ابن عطیہ کی تفسیر کے اہم مباحث پر مشتمل ہے اور کچھ فوائد دوسرے ائمہ کی کتابوں سے بھی لئے گئے ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ بعض مسائل میں ابن عطیہ معتزلہ کی طرف مائل نظر آتے

ہیں اور اس کی مثال یہ پیش کی ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ وزیادۃ کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے اللہ کی رؤیت مراد ہے جو اہل ایمان کو نصیب ہوگی اسے جمہور کا قول قرار دیا اور اس کے ثبوت میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا حوالہ دیا ہی اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے حسنات کا اجر سات سو تک بڑھانا مراد ہے اور پھر فرمایا ہے کہ اگر پہلے قول کے قائلین کی عظمت اور کثرت نہ ہوتی تو دوسرے قول کو ترجیح دی جاسکتی تھی۔ لیکن زیادۃ کی تفسیر میں دوسرے قول کا نقل کرنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ابن عطیہ رؤیت الٰہی سے انکار کرنے میں معتزلہ کے ہم نوا ہیں کیونکہ انہوں نے اس قول کو ترجیح نہیں دی بلکہ جمہور کے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کے لئے حدیث رسول کا حوالہ دیا ہے۔ دوسرا قول ابن عباس، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ سے بھی مروی ہے تو کیا صرف اس قول کی وجہ سے ہم ان کو منکرین رؤیت میں شمار کر سکتے ہیں؟ لفظ "زِيَادَةٌ" کا لغوی مفہوم عام ہے یعنی ان کو مزید نعمت بھی دی جائے گی اور مزید سے رؤیت خداوندی بھی مراد لی جاسکتی ہے اور "تضعیف الحسنات" یعنی نیکیوں کا اجر بڑھانا بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور دونوں میں کوئی تضاد اور منافات بھی نہیں ہے بلکہ دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ کی رؤیت بھی مل جائے اور حسنات کا اجر بھی سات سو تک بڑھادیا جائے لیکن زیادۃ کا پہلا مفہوم دیدار الٰہی ہی ہے اس لئے کہ احادیث رسول میں یہی معنے بیان ہوئے ہیں اور دوسری آیات سے بھی رؤیت خداوندی ثابت ہے۔ اس کے علاوہ ابن عطیہ نے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اور وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی تفسیر کرتے ہوئے رؤیت باری تعالیٰ کے اثبات میں اور انکار رؤیت کی تردید میں تفصیلی بحث کی ہے اور متعدد دوسرے مسائل میں بھی جگہ جگہ معتزلہ کی تردید کی ہے۔

ابن عطیہ کی یہ تفسیر پہلی مرتبہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۷ء میں دولت قطر کے امیر شیخ خلیفہ بن حمد آل ثانی کے خرچ پر اور شؤن دینیہ کے انچارج شیخ عبداللہ بن ابراہیم انصاری کے زیر اہتمام ۱۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۷) جامع احکام القرآن للقرطبی متوفی ۶۷۱ھ

اس تفسیر کو ہم نے تفسیر بالماثور کی قسم میں اس لئے شمار کیا ہے کہ اس میں آیات کی تفسیر میں احادیث و آثار کثرت کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اور ان کو دوسرے مآخذ پر فوقیت دی گئی ہے ورنہ اس تفسیر میں لغوی اور نحوی مباحث بھی بقدر ضرورت بیان ہوئے ہیں اور احکام و قوانین کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں لیکن ہم نے اس تفسیر کو احکام القرآن میں اس لئے شمار نہیں کیا کہ یہ مکمل قرآن کی تفسیر ہے صرف آیات الاحکام کی تفسیر نہیں ہے مگر فقہی آراء اور احکام و قوانین کی تفصیلی جزئیات اور ان کے دلائل معلوم کرنے کے لئے یہ تفسیر بہترین مرجع و مصدر ہے اور بحث و تحقیق کرنے والوں کو اس میں کافی معلومات مل سکتی ہیں۔

قرطبی کا نام محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح ہے نسب کی اعتبار سے انصاری اور خزرجی تھے اور فقہی مسلک کے اعتبار سے مالکی تھے' اس کا اسم کنیہ ابو عبداللہ تھا لیکن اندلس کے مشہور شہر قرطبہ کے رہنے والے تھے اس لئے قرطبی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تفسیر بھی قرطبی کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ یاقوت حموی رومی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ لکھتے ہیں کہ

"قرطبہ قاف کے پیش' راء کے سکون' طاء کے پیش اور باء کے زبر کے ساتھ میرے خیال میں عجمی اور رومی لفظ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ عربی لفظ "قرطبہ" (قاف اور طاء کے زبر ساتھ) سے ماخوذ ہو جس کے معنے ہیں اَلْعَدْوُ الشَّدِیْد یعنی تیز دوڑنا۔ یہ بلاد اندلس کے وسط میں ایک بڑے شہر کا نام ہے جو اس علاقے کے بادشاہ کا دارالسلطنت رہا ہے' بنو امیہ کے ملوک اسی شہر میں رہتے تھے اور یہ شہر بڑے بڑے علماء' فضلاء اور شرفاء کا مرکز رہا ہے اس کے اور سمندر کے درمیان ۵ روز کی مسافت ہے۔"(۱)

(۱) معجم البلدان للحموی طبع دارالتراث العربی بیروت ۱۹۷۹، ص ۳۲۴ ج ۴

قرطبی کے نام سے ایک دوسرے عالم بھی مشہور ہیں جس نے صحیح مسلم کی شرح لکھی تھی اس کا نام ابو العباس احمد بن عمر قرطبی تھا لیکن وہ تفسیر قرطبی کے مصنف کے استاد تھے۔

حافظ شمس الدین داودی متوفی ۹۴۵ھ تفسیر قرطبی کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

"محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری' خزرجی' مالکی مشہور تفسیر کے مصنف ہیں۔ یہ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے' اور ان علماء میں شامل تھے جن کو اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے' جو پرہیزگار ہوتے ہیں' جن کے دلوں میں دنیا کی حرص و محبت نہیں ہوتی یعنی وہ زاہد ہوتے ہیں' جو آخرت کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور جن کے اوقات توجہ الی اللہ' عبادت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں' اس نے ۱۵ جلدوں میں قرآن کی تفسیر میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے جس کا نام رکھا ہے۔

"جَامِعُ اَحْکَامِ الْقُرْآن وَالْمُبَیِّنُ لِمَا تَضَمَّنَ مِنَ السُّنَّةِ وَ آیِ الْفُرْقَان"

یہ فائدے کے اعتبار سے اعلیٰ اور عظیم ترین تفسیر ہے اس میں غیر ضروری قصے اور تاریخی واقعات کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے اور ان کی جگہ قرآنی احکام اور ان کے دلائل' اعراب' قراءات اور ناسخ منسوخ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ انہوں نے اسماء حسنیٰ کی شرح میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "الْکِتَابُ الْاَسْنٰی فِی شَرْحِ اَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰی" اذکار کے موضوع پر اس نے "التَّذْکَار فِی اَفْضَلِ الْاَذْکَار" کے نام سے کتاب لکھی ہے اور آخرت کے امور کے بارے میں "التَّذْکِرَة فِی اَحْوَالِ الْمَوْتٰی وَ اُمُوْرِ الْآخِرَة" کے نام سے کتاب لکھی ہے' امام ذہبی نے کہا ہے کہ یہ راسخ اور ثقہ امام تھے اور متبحر عالم تھے ان کی بڑی مفید تصانیف ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا اور وہ امامت اور فضیلت کے مقام پر فائز تھے۔ ان کی وفات ۹ شوال ۶۷۱ھ میں ہوئی تھی۔(۱)

---

(۱) طبقات المفسرین از داودی ص ۶۹ ج ۲

(۸) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ

ابن کثیر کا نام اسماعیل بن عمر بن کثیر تھا' لقب عماد الدین اور کنیہ ابو الفداء تھا لیکن اپنے دادا کثیر کی نسبت سے ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں اور اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے والد دمشق کے مضافات میں بصریٰ کے رہنے والے تھے مگر ان کی والدہ بصریٰ کے پاس "مجدل" نام کی ایک بستی سے تعلق رکھتی تھیں' ان کے والد مجدل کی مسجد کے خطیب تھے اور بہترین واعظ اور فقیہ تھے۔ ابن کثیر اسی مجدل میں ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے تھے' والد کی وفات کے وقت ان کی عمر ۳ سال تھی مگر ۷۰۷ھ میں ابن کثیر کا خاندان ان کے بڑے بھائی کمال الدین عبد الوہاب کی زیر نگرانی دمشق منتقل ہو گیا تھا اور ان کی تعلیم دمشق ہی میں اپنے بھائی کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں خود لکھا ہے کہ:

تُوُفِّيَ وَالِدِيْ فِيْ شَهْرِ جَمَادِي الْاُوْلٰى سَنَة ثَلاثٍ وَّ سَبْعِ مِاْةٍ فِي قَرْيَةِ مَجيْدَلْ وَ دُفِنَ بِمَقْبَرَتِهَا الشَّمَالِيَّةِ عِنْدَ الزَّيْتُوْنِ وَ كُنْتُ اِذ ذَاكَ صَغِيْرًا اِبْنَ ثَلَاثِ سِنِيْنَ اَوْ نَحْوِهَا ثُمَّ تَحَوَّلْنَا مِنْ بَعْدِهِ فِي سَنَة سَبْعٍ وَّ سَبْعِ مِأَة اِلَى دِمَشْقَ صُحْبَةَ كَمَالِ الدِّيْن عَبْدِالوَهَّابِ وَ قَدْ كَانَ لَنَا شَقِيْقًا وَ بِنَا رَفِيْقًا شَفُوْقًا وَ قَدْ تَاَخَّرَتْ وَفَاتُه اِلٰى سَنة خَمْسِيْنَ فَاشْتَغَلْتُ عَلٰى يَدَيْهِ فِي الْعِلْمِ فَيَسَّرَ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْهُ مَا يَسَّرَ وَ سَهَّلَ مِنْهُ مَا تَعَسَّرَ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.(۱)

"میرے والد جمادی الاولیٰ ۷۰۳ھ کو قریہ مجیدل (یا مجدل) میں فوت ہوئے تھے اور میں اس وقت تین سال کا بچہ تھا' والد کی وفات کے بعد ہم لوگ ۷۰۷ھ میں کمال الدین عبد الوہاب کی زیر نگرانی دمشق منتقل ہو گئے جو ہمارا سگا بھائی تھا اور ہم سے محبت اور شفقت رکھتا تھا' میرے اس بھائی کی وفات ۷۵۰ھ تک مؤخر ہو گئی تھی اس لئے میں اس سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گیا تو اللہ نے ان کے ذریعے ہم کو آسانیاں عنایت فرمائیں اور

---

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۳۲ ج ۱۴

ہماری مشکلیں ہٹا کر سہولتیں فراہم کردیں۔واللہ اعلم"

دمشق میں ابن کثیر کے خاندان نے "مدرسہ نجیبیہ" میں رہائش اختیار کی تھی جو شافعیہ کا مدرسہ تھا اور اسے امیر جمال الدین نجیبی نے وقف کیا تھا۔ابن کثیر نے ۷۱۱ھ میں گیارہ سال کی عمر میں قرآن تجوید اور قراءت کے ساتھ حفظ کیا تھا اور اپنے بھائی کے علاوہ وقت کے کبار اور ممتاز علماء سے علوم دینیہ حاصل کئے تھے لیکن ان کا تعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ سے اور حافظ جمال الدین مزی متوفی ۷۴۲ھ سے زیادہ رہا ہے' یہ ان دونوں کے شاگرد خاص تھے اور حافظ مزی کے تو داماد بھی تھے۔شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ حران کے ایک علمی خاندان میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے تھے ان کے دادا ابو البرکات مجد الدین ابن تیمیہ مسلک حنبلی کے کبار علماء میں شامل تھے اور ان کے والد شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ حنبلی مسلک کے عالم' محدث اور فقیہ تھے۔درس دیا کرتے تھے اور فتوے بھی دیتے تھے اور تقی الدین احمد ابن تیمیہ خود بھی بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔انہوں نے تجدید دین اور اشاعت توحید و سنت کے میدان میں بہت زیادہ کام کیا تھا اور اس راستے میں کافی تکلیفیں اٹھائی تھیں' قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں اور بہت سی دوسری آزمائشوں سے بھی دوچار ہوئے تھے۔ابن کثیر ان کی تجدیدی اور دعوتی کارکردگی سے اور ان کے صبر و استقامت سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے اور انہی کے طرز پر دعوتی اور اصلاحی جدوجہد کو اپنا مشن بنا دیا تھا' ابن کثیر نے اپنے شیخ ابن تیمیہ کے علمی مقام کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ :

"ابن تیمیہ ذکی اور ذہین شخص تھے' ان کے حافظے میں بہت زیادہ معلومات محفوظ تھیں' تفسیر اور اس سے تعلق رکھنے والے علوم میں امام تھے' فقہ میں بڑی معرفت اور مہارت رکھتے تھے' علماء اور فقہاء کے درمیان اختلافی مسائل کو جانتے تھے۔اصول و فروع' نحو و لغت اور دوسرے نقلی اور عقلی علوم کے عالم تھے' کسی بھی فن کا کوئی فاضل شخص جب ان سے بات

کرتا تو اس کو اس فن کا ماہر پاتا اور کہتا کہ یہ تو اسی کا فن ہے' میں نے اس کو حدیث کا بہت بڑا حافظ پایا تھا جو صحیح اور ضعیف میں تمیز کر سکتا تھا اور راویوں کے حالات جاننے میں اس کو بڑا تجربہ حاصل تھا۔"(۱)

اور حافظ مزی کا نام یوسف بن عبدالرحمٰن دمشقی تھا' لقب جمال الدین اور کنیہ ابوالحجاج تھا لیکن چونکہ ان کی تربیت مزہ شہر میں ہوئی تھی اور زندگی کا زیادہ حصہ بھی یہیں پر گزارا تھا اس لئے اہل علم میں حافظ جمال الدین مزی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ مزہ دمشق کے قریب ایک شہر کا نام ہے یاقوت نے لکھا ہے کہ یہ دمشق کے باغات کے وسط میں واقع ہے اور دمشق سے نصف فرسخ یعنی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔(۲)

مگر آج تو آبادی کی کثرت کی وجہ سے دمشق کا ایک حصہ ہے ان کی ولادت ربیع الثانی ۶۵۴ھ میں ہوئی تھی اور صفر ۷۴۲ھ میں انہوں نے وفات پائی تھی' چھوٹی عمر میں قرآن حفظ کیا تھا اور چھوٹی عمر ہی میں فقہ اور عربیت کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ ۶۷۴ھ میں ۲۰ سال کی عمر میں علم حدیث کا آغاز کیا تھا اور مختلف مراکز حدیث میں کبار ائمہ حدیث سے حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کی تحصیل کے بعد امامت فی الحدیث کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ فقہی اور اجتہادی مسائل میں حافظ مزی شافعی المسلک تھے مگر اعتقادی مسائل میں سلف صالحین یعنی صحابہ و تابعین کے طریقے پر قائم تھے اور اللہ کے اسماء و صفات میں تاویلات نہیں کرتے تھے' ابن تیمیہ کے ساتھی تھے اور دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے' ابن تیمیہ کے ساتھ رفاقت اور صحبت کی وجہ سے ان کو بھی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں' حافظ ابن حجر نے "الدرر الکامنہ" میں لکھا ہے کہ ۷۰۵ھ میں "قصر ابلق" میں ایک روز حافظ مزی صفی ہندی اور ابن زملکانی کے ساتھ کسی اعتقادی مسئلے میں بحث کر رہے تھے کہ دوران بحث حافظ مزی

---

(۱)البدایہ والنہایہ ص۱۳۷ ج۱۴

(۲)معجم البلدان ص۱۲۲ ج۵

نے امام بخاری کی کتاب "خلق افعال العباد" پڑھنی شروع کر دی اس کتاب میں ایک فصل جہمیہ کے رد میں بھی ہے۔ اس موقع پر حاضرین مجلس میں بعض لوگ غصے میں آگئے اور کہنے لگے کہ تیرا مقصد یہ ہے کہ ہم جہمیہ ہیں۔ یہ بات قاضی کو پہنچ گئی اور اس نے حافظ مزی کو جیل میں ڈال دیا مگر ابن تیمیہ کی کوششوں سے رہا کر دیئے گئے۔ دوبارہ جیل بھیج دیئے گئے اور دوبارہ رہا بھی ہو گئے۔ یہ آزمائش ان پر ابن تیمیہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے آئی تھیں۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حافظ مزی کی زوجہ محترمہ عائشہ بنت ابراہیم بن صدیق بڑی نیک خاتون تھیں' قرآن کی حافظہ تھیں اور عالمہ بھی تھیں اور ان کی بیٹی زینب بھی عالمہ تھی اور میرے نکاح میں تھی۔(۱)

حافظ مزی کی دو کتابیں بہت زیادہ مشہور ہیں اور اہل علم میں بے حد مقبول اور متداول ہیں ایک ہے "اطراف الکتب الستۃ" اور دوسری ہے "تہذیب الکمال فی اسماء الرجال"۔

ابن کثیر کی ثقاہت اور فضیلت کے لئے حافظ ابن تیمیہ اور حافظ مزی جیسے اکابر ائمہ حدیث کا تلمذ بھی کافی ثبوت ہے لیکن حافظ شمس الدین داوودی متوفی ۹۴۵ھ نے ابن کثیر کے شیخ حافظ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ سے ان کے علم و فضل پر جو تبصرہ نقل کیا ہے وہ بڑا جامع ہے:

فَقِيْهٌ مُتَفَنِّنٌ وَ مُحَدِّثٌ مُتْقِنٌ وَ مُفَسِّرٌ نَقَّادٌ.(۲)

"دین کی مختلف فنون میں فقیہ تھے' پختہ علم والے محدث تھے اور نقد و تحقیق کرنے والے مفسر تھے۔"

تفسیر' حدیث اور فقاہت (یعنی قرآن و حدیث سے احکام معلوم کرنے کی صلاحیت) دین اسلام کے یہی تین اصول ہیں اور جو شخص ان تینوں میں وسیع اور پختہ معلومات رکھتا ہو وہ

---

(۱) البدایہ والنہایہ ص۱۹۲ ج۱٤

(۲) طبقات المفسرین ص۱۱۲ ج۱

امت مسلمہ کی دینی اور فکری قیادت کا اہل ہوتا ہے اور یہ تینوں صفات اللہ تعالیٰ نے حافظ ابن کثیر کو عطا فرمائی تھیں۔ وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

ابن کثیر کی تفسیر القرآن العظیم کو اگر ابن جریر کی تفسیر کی تلخیص کہا جائے تو بے جانہ ہوگا اس لئے کہ اس کی نقل کردہ احادیث و آثار کا بڑا ماخذ ابن جریر ہے 'بڑا ماخذ میں نے اس لئے کہا ہے کہ ابن کثیر کی تفسیر میں صحاح ستہ 'مسند احمد اور دوسری کتابوں سے بھی روایات نقل کی گئی ہیں اور تلخیص کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ابن جریر ہر حدیث اور اثر کے متعدد طرق اور اسانید بیان کرتے ہیں اور ابن کثیر نے اختصار کے لئے اسانید کو اکثر مقامات پر حذف کر دیا ہے البتہ کسی علمی اور سندی نکتے کے بیان کے لئے بعض روایات کی سند بھی نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن ابن کثیر کی چار امتیازی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کی افادیت ابن جریر سے زیادہ ہے ایک یہ کہ یہ آیات کی تفسیر میں دوسری سورتوں سے نظائر پیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے زیر غور آیت کا مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے یعنی اس کی تفسیر میں تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے' دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نقل کردہ روایات کی صحت اور عدم صحت پر اکثر بحث کرتے ہیں اور راویوں کی ثقاہت اور عدم ثقاہت پر بالعموم روشنی ڈالتے ہیں' تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کو اکثر تو نقل ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے ضعف کی طرف اشارہ کر کے آگے نکل جاتے ہیں اور جہاں پر نقل کرتے ہیں تو ان پر تنقید کرتے ہیں اور قاری کو بتا دیتے ہیں کہ آیت کی تفسیر ان روایات کی محتاج نہیں ہے اور ان کو آیت کی تفسیر قرار نہیں دیا جا سکتا اور چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جن امور کو قرآن نے مبہم چھوڑ دیا ہو اور رسول اللہ ﷺ سے سند صحیح کے ساتھ اس کی وضاحت بھی مروی نہ ہو اور آیت جس مقصد کے لئے نازل ہوئی ہو اس کے اعتبار سے ابہام کا ازالہ ضروری بھی نہ ہو تو ایسے امور کو مبہم ہی رہنے دیتے ہیں اور غیر ضروری تحقیق نہیں کرتے۔

(۹) الجواھر الحسان فی تفسیر القرآن للثعالبی متوفی ۸۷۵ھ :

ثعالبی کا نام عبد الرحمٰن بن محمد بن مخلوف ہے اور کنیہ ابو زید ہے' ان کی ولادت الجزائر شہر کے قریب ایک مقام پر ۷۸۴ھ میں ہوئی تھی اور ۸۷۵ھ میں الجزائر میں فوت ہوئے تھے اور یہیں پر دفن ہوئے تھے' طلب علم کے لئے انہوں نے سب سے پہلے الجزائر کے شہر "بجایہ" کا سفر کیا تھا اور اس شہر کے کبار علماء سے علم حاصل کیا تھا' اس کے بعد تونس کے ممتاز علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آخر میں مصر تشریف لے گئے اور "الفیہ فی علوم الحدیث" کے مصنف حافظ زین الدین عراقی متوفی ۸۲۶ھ سے حدیث نبوی اور اس سے متعلق دوسرے علوم حاصل کئے' مصر سے حج کے لئے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہاں پر کبار علماء سے مختلف علوم حاصل کئے اور حدیث بیان کرنے کی اجازت حاصل کی اور پھر واپس الجزائر آکر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ ثعالبی اپنے احباب اور اصحاب میں "ولی اللہ" سمجھے جاتے تھے اور امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کا مطالعہ بہت زیادہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تفسیر کا منہج مقدمے میں خود بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

"اے میرے بھائی! اللہ تعالیٰ میرے دل کو اور تیرے دل کو ایمان و یقین کے انوار سے منور فرمائے اور مجھ کو اور تم کو اپنے متقی اولیاء میں شامل کر دے۔ میں نے اپنے لئے اور تیرے لئے اس مختصر تفسیر میں وہ باتیں جمع کر دی ہیں جو میری اور تیری آنکھوں کو دونوں جہانوں میں ٹھنڈی کر دیں گی۔ میں نے اس تفسیر میں ابن عطیہ کی تفسیر کی اہم ترین اور ضروری باتیں جمع کر دی ہیں اور دوسرے ائمہ کی کتابوں سے بھی بہت سے فوائد اکٹھے کر دیئے ہیں' میں نے جس کتاب سے بھی اقتباس نقل کیا ہے تو اس کے مصنف کے اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے اور جو بات میں نے اپنی رائے سے لکھی ہے تو اس کے لئے ت کا نشان لگا دیا ہے جسے تم قلت بھی پڑھ سکتے ہو۔ بخاری و مسلم' ابو داؤد اور ترمذی کے علاوہ جو صحاح یا حسان احادیث نقل کی گئی ہیں تو وہ نووی کی الاذکار' منذری کی ترغیب و ترہیب' قرطبی کی

کتاب التذکرۃ اور بغوی کی مصابیح السنہ سے لی گئی ہیں۔"

مصنف کے اپنے بیان سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب دراصل ابن عطیہ کی تفسیر "المحرر الوجیز" کی تلخیص ہے اور اس میں دوسرے ائمہ تفسیر کی تفاسیر سے بھی بعض ضروری فوائد اور نکات نقل کئے گئے ہیں اور لغت اور اعراب سے متعلق اکثر نکات ابو حیان کی تفسیر سے لئے گئے ہیں۔ ہم نے اس کی تفسیر کو تفسیر بالماثور کی قسم میں اس لئے شامل کیا ہے کہ اس میں احادیث و آثار کی کافی تعداد موجود ہے اور اکثر صحاح یا حسان ہیں ضعاف بہت ہی کم ہیں۔ اسی طرح اسرئیلیات کا ذکر بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور شاذ نادر اگر ذکر ہوا بھی ہے تو ساتھ تردید بھی کی گئی ہے۔ بہر حال یہ تفسیر ابن عطیہ کی کتاب اور دوسرے ائمہ تفسیر کی کتابوں کا جامع قسم کا خلاصہ اور نچوڑ ہونے کی حیثیت سے بڑی مفید تفسیر نظر آتی ہے۔ فجزاہ اللہ خیرا

یہ تفسیر دار الکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۹۶ء میں تین جلدوں میں شائع کی ہے اور ابو محمد غماری ادریسی نے اس کی تحقیق کی ہے اور احادیث کی تخریج کی ہے۔

(۱۰) الدر المنثور فی التفسیر الماثور للسیوطی متوفی ۹۱۱ھ

یہ تفسیر تو سوفی صد تفسیر بالماثور ہے جیسا کہ اس کے نام سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے آیات کی تفسیر میں احادیث و آثار نقل کرنے کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا ہے' اس تفسیر کا پس منظر اور باعث تصنیف مصنف نے مقدمے میں خود ہی بیان کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

"میں نے جب اپنی کتاب ترجمان القرآن کی تالیف کئی جلدوں میں مکمل کی جس میں احادیث رسول اور آثار صحابہ اسانید کے ساتھ نقل کئے گئے تھے تو میں نے لوگوں کی ہمتوں میں کمزوری دیکھی اور اسانید کے بغیر صرف متون پر اکتفا کی جانب ان کی رغبت دیکھی' لوگوں کی ہمت میں کمی اور اختصار کی جانب ان کی رغبت اور میلان کی وجہ سے میں نے ترجمان القرآن کی تلخیص کر کے مختصر تفسیر مرتب کی اور اسانید کو حذف کر کے احادیث و آثار کے

متون پر اکتفا کیا مگر ہر روایت کے اول میں ان معتبر کتابوں کا حوالہ دیدیا جن سے وہ نقل کی گئی ہے اور جنہوں نے اس کی تخریج کی ہے اختصار کے بعد اس مختصر تفسیر کا میں نے نام رکھا ہے "الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور" میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اس کے مؤلف کے اجور ... اس کو اپنے کرم اور احسان کے ذریعے خطاؤں اور غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ یقیناً تو ہی احسان کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔"

مصنف کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ درمنثور دراصل ان کی مفصل تفسیر ترجمان القرآن کا اختصار ہے مگر اختصار صرف یہ ہے کہ اسانید حذف کر دیئے گئے ہیں ورنہ احادیث و آثار کے متون اپنی جگہ پر باقی ہیں۔

جلال الدین سیوطی کا مختصر تعارف

جلال الدین سیوطی سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں اور اہل علم کی درمیان معروف ہیں۔ اس لئے تفصیلی تعارف کے محتاج تو نہیں ہیں لیکن درمنثور طبع دارالفکر بیروت ۱۹۸۳ء کے مقدمے میں شیخ خلیل مدیرازہر لبنان نے ان کا جو مختصر تعارف کرلیا ہے اس کا خلاصہ پیش کرنا مناسب اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ یہ تعارف علامہ سیوطی کے اپنے بیان سے ماخوذ ہے:

سیوطی کا نام عبدالرحمٰن بن کمال ابی بکر بن محمد ہے اور لقب جلال الدین ہے لیکن مصر کے مشہور شہر اسیوط کی نسبت سے جلال الدین سیوطی کے نام سے مشہور ہیں اور اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت رجب ۸۴۹ھ میں ہوئی تھی اور ۹۱۱ھ میں انہوں نے وفات پائی تھی۔ آٹھ سال سے بھی کم عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا اور اس کے بعد فقہ کی کتاب "عمدۃ الاحکام" علم اصول کی کتاب "منہاج الفقہ والاصول" اور علم نحو کی کتاب "الفیہ ابن

مالک "تینوں یاد کرلی تھیں' اور پھر ۸۶۴ھ میں ۱۵ سال کی عمر میں مختلف علوم وفنون کا تفصیلی اور تحقیقی علم حاصل کرنے کے لئے اکابر و مشاہیر اساتذہ کی مجالس میں حاضر ہونے کا آغاز کیا مگر فقہ میں ان کے مشہور استاد شیخ الاسلام علم الدین بلقینی تھے جن کے ساتھ ان کا تعلق اس کی موت تک قائم رہا تھا اور اس کے بعد بلقینی کے بیٹے سے بھی بعض کتابیں پڑھی تھیں۔ طلب علم کے لئے انہوں نے مصر سے شام' حجاز' یمن' ہند اور مغرب یعنی اندلس کے سفر بھی کئے تھے اور اپنے ملک کے مختلف مراکز کے دورے بھی کرتے رہتے تھے مگر ان کی زندگی کا اکثر حصہ قاہرہ میں گزرا ہے جس میں اس وقت ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ' بدر الدین عینی متوفی ۸۵۶ھ اور علامہ سخاوی متوفی ۹۰۲ھ جیسے اکابر محدثین موجود تھے۔ ۸۷۱ھ میں ۲۲ سال کی عمر میں سیوطی نے فتویٰ دینا شروع کیا تھا' ۸۷۲ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں انہوں نے حدیث پڑھانا شروع کر دیا تھا اور ۸۸۶ھ میں ۳۷ سال کی عمر میں تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ سیوطی نے خود لکھا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے سات علوم میں تبحر اور مہارت عطا فرمائی ہے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' نحو' معانی' بیان اور بدیع۔ سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ" میں لکھا ہے کہ تفسیر اور قرآن سے تعلق رکھنے والی میری کتابیں ۲۵ تک پہنچ گئی ہیں اور ان کی کل تصنیفات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۵۰ سے بھی زائد ہیں۔ ان کی تفسیر الدر المنثور میں احادیث و آثار کا کافی ذخیرہ موجود ہے لیکن ان میں صحاح اور حسان کے ساتھ ضعاف بھی موجود ہیں اور اسرائیلی روایات کی بھی اس میں کمی نہیں ہے اس لئے اس کی بیان کردہ روایات پر بغیر تحقیق کے آنکھیں بند کر کے اعتماد اور استدلال کرنا تو مناسب نہیں ہے مگر روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرنا ان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر جزیل مرحمت فرمائے۔ آمین

الدر المنثور فی التفسیر الماثور کو بیروت کے نشریاتی ادارے دار الفکر نے ۱۹۸۳ء میں آٹھ جلدوں میں بہترین طباعت اور کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

تدبر اور تفکر کے ذریعے تفسیر کرنے والے مفسرین اور ان کی تفسیریں

گذشتہ عنوان کے تحت ان مفسرین اور ان کی تفاسیر کا تعارف پیش کیا گیا ہے جن کی تفاسیر کا اصل اور اہم ماخذ احادیث و آثار ہوتے ہیں اور دوسرے امور کا ذکر ان میں ضمنی طور پر کیا جاتا ہے' لیکن بعض مفسرین کا منہج تفسیر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ غور و فکر اور تدبر و تفکر کے ذریعے آیات کا مفہوم معلوم کیا جائے اور احادیث و آثار کو بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت ہی پیش کیا جائے۔ اس نہج پر تفسیر و تفہیم کرنے والے مفسرین لغوی' صرفی' نحوی اور اعراب سے متعلق مباحث میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور سیاق و سباق میں غور و فکر اور موضوع کلام میں تدبر و تفکر کے ذریعے معانی و مفاہیم کے تعین کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرز کو آپ "تفسیر بالرای الجائز" کا نام بھی دے سکتے ہیں اس لئے کہ تفسیر بالرای کی ایک قسم تفسیر "بالھوئی" ہے کہ اپنی ذاتی خواہش نفسانی غرض اور من گھڑت اور خود ساختہ عقیدے اور نظریئے کے اثبات کے لئے آیات میں تکلفی تاویلات کی جائیں اس قسم کی تفسیر بالرای حرام ہے اور اس طرح کی تفسیر کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے جیسا کہ پہلے دلائل کے ساتھ وضاحت کردی گئی ہے لیکن رائے کی دوسری قسم یہ ہے کہ سیاق و سباق' لغت اور دوسرے اصول تفسیر کی روشنی میں غور و فکر' تدبر و تفکر اور عقل و اجتہاد کے ذریعے آیات کے معانی و مفاہیم معلوم کرنے کی کوشش کی جائے اس قسم کی تفسیر بالرای نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ممدوح اور مامور بہ ہے جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے' لیکن اس طرز تفسیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیئے کہ احادیث و آثار کو بالکل نظر انداز کرکے تفسیر کی جائے اس لئے کہ احادیث صحیحہ کے مقابلے میں کوئی رائے قائم کرنا تو شرعاً جائز ہی نہیں ہے جیسا کہ

اصول تفسیر کے زیر عنوان آپ اس بات کو سمجھ چکے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبر و تفکر کے ذریعے تفسیر کرنے والے مفسرین احادیث و آثار کے حوالے کم دیتے ہیں اور دوسرے مآخذ تفسیر سے اخذ معانی اور فہم قرآن کی کوشش زیادہ کرتے ہیں' مذکورہ عنوان کے تحت اس نہج پر تفسیر کرنے والے ممتاز مفسرین کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

(۱) مفاتیح الغیب

المعروف بتفسیر کبیر للامام الرازی متوفی ۶۰۶ھ

امام رازی کا تعارف

امام رازی کا نام محمد بن عمر بن حسین ہے' لقب فخر الدین ہے مگر چونکہ ان کی ولادت اور تربیت مشہور علمی مرکز "رَی" میں ہوئی تھی اس لئے اس نسبت کی وجہ سے وہ امام رازی کے نام سے مشہور ہیں ان کے والد عمر بن حسین کا لقب ضیاء الدین تھا اور یہ رَی کے خطیب رہے تھے اس لئے امام رازی ابن الخطیب کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ امام رازی ۲۵ رمضان ۵۴۴ھ کو "رَے" میں پیدا ہوئے تھے اور یکم شوال ۶۰۶ھ کو (عید الفطر کے دن) ہرات میں فوت ہوئے تھے اور اسی روز شام کے وقت ہرات کے قریب "مزدرخان" نامی گاؤں کے پاس ایک پہاڑ میں دفن ہوئے تھے۔ علم کلام اور علم فقہ میں امام رازی کے پہلے استاد ان کے والد ضیاء الدین عمر بن حسین تھے اور ان کے استاد مشہور محدث امام بغوی تھے' مگر اپنے والد سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مشاہیر اور ممتاز اساتذہ سے مختلف علوم و فنون حاصل کئے اور پھر درس و تدریس' وعظ و خطابت' مناظروں و مباحثوں اور تصنیف و تالیف کے مشاغل جاری رکھے یہاں تک کہ لوگوں نے ان کو "امام رازی" اور "فخر الدین رازی" کا لقب دیدیا اور آج تک اسی لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ امام رازی علم الکلام

اور فلسفہ و معقولات میں اپنے دور کے تمام اہل علم پر فوقیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف فنون میں بڑی مفید کتابیں لکھی تھیں جنہوں نے مختلف علاقوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور لوگ دوسرے علماء کی کتابوں کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے' وعظ اور خطابت کی بے مثال صلاحیت رکھتے تھے' عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں تقریر کرتے تھے' دوران تقریر ان پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی تھی اور بہت زیادہ روتے تھے' شہر ہرات میں اس کی مجلس میں ہر قسم کے نظریات رکھنے والے لوگ شریک ہوتے اور قسم قسم کے سوالات کرتے مگر امام موصوف ہر ایک کو بڑے اچھے طریقے سے جواب دیا کرتے تھے' ان کی مجالس میں شرکت اور ان کے جوابات سننے کی وجہ سے فرقہ کرامیہ اور دوسرے اہل بدعت کے بہت سے لوگوں نے اہل سنت کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس دور میں ہرات اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں کرامیہ کی کثرت تھی' امام رازی نے ان کے ساتھ مناظرے بھی کیے تھے اور اس فرقے کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں۔ کرامیہ کے عقائد باطلہ میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ جسم بھی رکھتا ہے نعوذ باللہ۔ امام رازی کی ابتدائی زندگی بڑے افلاس اور فقر و احتیاج میں گزری ہے لیکن ان کی زندگی کا آخری حصہ بڑے تمول اور عیش و راحت میں گزرا ہے اور اس تمول کا ابتدائی ذریعہ شہر "رَے" کا ایک متمول اور دولت مند طبیب ثابت ہوا تھا' امام رازی جب خوارزم اور ماوراء النہر کے دورے پر گئے اور مختلف مذاہب اور نظریات کے لوگوں کے ساتھ مناظرے اور مباحثے کیے تو لوگوں نے ان کو اپنے علاقوں سے نکال دیا' آخر تنگ آکر وہ اپنے آبائی شہر "رَی" کو واپس تشریف لے آئے۔ رَی میں ایک دولت مند طبیب تھا جس کے بیٹے نہیں تھے صرف دو بیٹیاں تھیں اور اتفاق سے امام رازی کے بھی دو بیٹے تھے' طبیب جب مرض موت میں مبتلا ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ میرا زندہ رہنا اب ممکن نہیں ہے تو اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو امام رازی کے دو بیٹوں کے نکاح میں دیدیا اور اس کے تمام منقولہ اور غیر منقولہ اموال امام صاحب کے بیٹوں کے پاس آگئے اور اس سے

امام کی آسودہ حالی کا آغاز ہوا' اس کے بعد غزنی کے سلطان شہاب الدین غوری اور خوارزم کے سلطان خوارزم شاہ کی ساتھ ان کے تعلقات قائم ہو گئے' دونوں ان کے معتقد ہو گئے اور علماء و فضلاء اور عوام میں بھی ان کی مقبولیت عروج پر پہنچ گئی۔ مختلف علاقوں اور شہروں سے بڑے بڑے علماء اور فضلاء سفر کر کے امام رازی سے ملتے' ان سے علمی فیوض حاصل کرنے اور ان کے خطابات و مواعظ سننے کے لئے آتے رہتے تھے۔(۱)

حافظ عماد الدین ابن کثیر امام رازی کی مقبولیت اور تمول و تعیش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"خوارزم اور دوسرے علاقوں کے بادشاہوں کے ہاں امام رازی کو بڑی عظمت اور وجاہت حاصل تھی' ان کے لئے مختلف شہروں میں بہت سے مدارس بنائے گئے تھے' خالص سونے کے ۸۰ ہزار دینار ان کی ملکیت میں جمع تھے اور دوسری اشیاء استعمال' اثاثے' سواریاں اور کپڑے وغیرہ اس کے علاوہ تھے' ان کی ملکیت میں ۵۰ ترکی غلام بھی تھے ان کی مجلس وعظ و خطابت میں بادشاہ' وزراء' علماء' امراء' فقراء اور عام لوگ سب شریک ہوتے تھے اور ان کی عبادات اور اوراد و اذکار کے اوقات بھی متعین تھے' امام رازی اور کرامیہ کے درمیان مباحثے اور مناظرے بھی ہوتے تھے یہ ان سے نفرت کرتے تھے اور وہ اس سے نفرت کرتے تھے اور دونوں ایکدوسرے کی مذمت میں مبالغہ بھی کرتے تھے۔ علم کلام میں رسوخ اور پختہ علم کے باوجود امام رازی نے فرمایا تھا کہ مَنْ لَزِمَ مَذْهَبَ الْعَجَائِزِ كَانَ هُوَ الْفَائِزُ "جو شخص بوڑھی عورتوں کے مذہب کا پابند رہا وہی کامیاب رہے گا۔"(۲)

مقصد یہ ہے کہ فلسفیانہ اور متکلمانہ موشگافیوں اور تکلفی دلائل سے قطع نظر ایک سادہ سی بوڑھی عورت فطری طور پر اللہ اور رسول پر اور دین اسلام پر جو ایمان و یقین رکھتی ہے

---

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان بتقدیم و تاخیر و تلخیص ص۲۴۸ تا ۲۵۱ ج٤

(۲) البدایہ والنہایہ ص۵۵ ج۱۳

نجات اور کامیابی کے لئے یہی ایمان کافی ہے اور فلسفیانہ قیل و قال اور شبہات وجوابات سے انسانی ذہن الٹا الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے لوگوں کے سامنے تو فلسفی دلائل کے انبار لگا دیتا ہے لیکن اسے شرح صدر اور سکون قلبی کی دولت نصیب نہیں ہوتی مگر فطری ایمان کے ساتھ شبہات اور الجھنیں ہوتی ہی نہیں ہیں تاکہ ان کے ازالے کے لئے دلائل کی ضرورت پڑے۔

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "امام رازی" میں "مفتاح السعادۃ" کے حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

"امام رازی جب ہرات تشریف لائے تو وہاں کے تمام علماء، صلحاء اور امراء وسلاطین ملاقات کے لئے خدمت میں حاضر ہوئے' امام صاحب نے پوچھا کہ کیا شہر میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو میری ملاقات کے لئے نہیں آیا؟ لوگوں نے کہا کہ ایک نیک آدمی گوشہ نشین ہے اور وہ نہیں آیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا امام ہوں تو اس نے میری ملاقات کیوں نہیں کی؟ لوگوں نے جب امام صاحب کی یہ بات اس مرد صالح سے کہی تو وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد شہر کے لوگوں نے ایک باغ میں دونوں کو کھانے پر بلایا اور دونوں آگئے۔ امام رازی نے ان سے ملاقات نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں میری ملاقات سے آپ کو کوئی شرف حاصل نہیں ہو سکتا اور میری ملاقات نہ کرنے سے آپ کے شرف میں کوئی کمی نہیں آتی۔ امام صاحب نے فرمایا یہ جواب تو اہل ادب یعنی صوفیہ کا ہے' میرے سامنے پوری حقیقت بیان کرو۔ اس بزرگ نے کہا کہ آپ کی ملاقات کس بنا پر واجب ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا امام ہوں۔ اس مرد صالح نے کہا کہ آپ کا سرمایہ فخر علم ہے لیکن خدا کی معرفت راس العلوم ہے' تو یہ بتاؤ کہ تم نے خدا کو کیسے پہچانا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے خدا کو سو دلیلوں سے پہچانا ہے۔ اس بزرگ نے کہا کہ دلیل کی ضرورت تو شک کو زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے مگر خدا نے میرے دل میں ایسی روشنی ڈال دی ہے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گزر ہی

نہیں ہوتا تاکہ اس کے ازالے کے لئے مجھ کو دلیل کی ضرورت پڑے۔ امام رازی کے دل پر اس بات نے اثر کیا اور انہوں نے اسی مجلس میں اس مرد صالح کے سامنے توبہ کی اور خلوت نشین ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ مرد صالح شیخ نجم الدین کبریٰ قدس اللہ سرہ تھے۔"(۱)

امام رازی منطق' فلسفہ' کلام میں تو مسلمہ امام تھے اور معقولات میں اس کے مقابلے کے افراد شاذ نادر ہی ملتے ہیں لیکن دوسرے علوم و فنون میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ابن الاثیر جزری اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں لکھتے ہیں کہ وَكَانَ اِمَامَ الدُّنْيَا فِيْ عَصْرِهٖ یہ اپنے دور میں پوری دنیا کے امام تھے۔(۲)

لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ :

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا سِوٰى اَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ وَ قَالُوْا

"ہم نے اپنی لمبی عمر میں کچھ بھی حاصل نہیں کیا بجز اس کے کہ ہم نے اس میں قیل و قال جمع کیا ہے۔"

لَقَدِ اخْتَبَرْتُ الطُّرُقَ الْكَلَامِيَّةَ وَالْمَنَاهِجَ الْفَلْسَفِيَّةَ فَلَمْ اَجِدْهَا تَرْوِيْ غَلِيْلًا وَلَا تَشْفِيْ عَلِيْلًا وَ رَاَيْتُ اَقْرَبَ الطُّرُقِ طَرِيْقَةَ الْقُرْاٰنِ اِقْرَأْ فِي الْاِثْبَاتِ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى' اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَفِي النَّفْيِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا.(۳)

"میں نے علم کلام کے طرز استدلال کو بھی آزما لیا ہے اور فلسفیانہ مناہج سے بھی واقفیت حاصل کر لی ہے لیکن میں نے ان میں سے کسی کو نہیں پایا کہ لوگوں کی پیاس بجھاتا ہو یا کسی مریض کو شفا دیتا ہو' اور میں نے قریب ترین اور آسان ترین طریقہ قرآن کا طریقہ پایا ہے' صفات کے اثبات کے لئے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اور اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ

(۱) امام رازی از مولانا عبدالسلام ندوی ص۶-۷

(۲) الکامل طبع بیروت ۱۹۶۶ء ص۲۸۸ ج۱۲

(۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۶ ج۱۳

پڑھو اور تشبیہ کی نفی کے لئے لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیءٌ اور ھَل تَعلَمُ لَہٗ سَمِیًّا پڑھو۔"

معتزلہ و جہمیہ اللہ کی ذات کو تو مانتے ہیں مگر اس کی ذات کے علاوہ صفات کو نہیں مانتے' مشبہہ و مجسمہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور متکلمین کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات صفات سے متصف تو ہے مگر اس کی صفات عین ذات بھی نہیں ہیں اور غیر ذات بھی نہیں ہیں' تینوں مکاتب فکر نے اپنی فکر کے ثبوت کے لئے فلسفیانہ اور متکلمانہ دلائل پیش کئے ہیں جن سے امام رازی بخوبی واقف تھے اور انہوں نے معتزلہ و جہمیہ اور مشبہہ و مجسمہ کی تردید اور متکلمین کی تائید میں مناظرے بھی کئے تھے' کتابیں بھی لکھی تھیں لیکن آخر کار یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ متکلمین کے کلامی دلائل بھی پیاس نہیں بجھا سکتے اور فلاسفہ کے فلسفیانہ دلائل سے بھی تشفی نہیں ہو سکتی اور ذہن انسانی کے قریب ترین اور آسان ترین طرز بیان قرآن کریم کا ہے کہ اللہ استواء علی العرش اور دوسری صفات سے متصف ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے مگر جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی مثال نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات کی مثال بھی نہیں ہے اور جس طرح ذات خداوندی کی تشبیہ مخلوق کے ساتھ دینا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کے اسماء و صفات کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ صفات الٰہیہ کی ماہیت کیا ہے؟ تو ماہیت کا معلوم کرنا ضروری نہیں ہے اور اس کے لئے سوالات کرنا بھی مناسب نہیں ہیں بلکہ یہ عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ اللہ کی صفات کی حقیقت اور ماہیت وہی ہے جو اس کی شان الوہیت کے مناسب ہو۔ یہی مسلک تمام صحابہ و تابعین اور تمام محدثین اور ائمہ مجتہدین کا ہے اور امام رازی نے بھی عمر بھر کے مباحثوں اور قیل و قال کے بعد آخری عمر میں یہی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ مذکورہ عبارت میں انہوں نے اپنے اسی مسلک کا ذکر کیا ہے۔

امام رازی کے تعارف میں بات کچھ طویل ہو گئی ہے لیکن میں مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ آخر میں امام رازی کا وہ وصیت نامہ نقل کر دیا جائے جو انہوں نے مرض موت میں اپنے شاگرد سے لکھوایا تھا۔ تاج الدین سبکی متوفی ۷۷۱ھ نے "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ"

میں یہ وصیت نامہ نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

امام رازیؒ کا وصیت نامہ

"محمود بن عمر رازی کہتے ہیں کہ میں نے امام فخر الدین رازی سے سنا ہے کہ جب ان کی موت قریب آئی تو وہ اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر اصبہانی سے یہ وصیت لکھوا رہے تھے۔ اپنے رب کی رحمت کا امیدوار اور اپنے مالک کے کرم پر بھروسہ کرنے والا بندہ محمد بن عمر بن حسین رازی اس حال میں کہتا ہے کہ وہ اپنی آخرت کے پہلے وقت اور اپنی دنیا کے آخری وقت میں ہے' اور یہ وہ وقت ہے کہ جس میں سخت دل والا ہر شخص نرم پڑ جاتا ہے اور ہر مفرور اور نافرمان غلام اپنے مالک کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ کہ میں اللہ کی حمد و ثنا کہتا ہوں ان تعریفوں کے ساتھ جن کا ذکر اس کے عظیم ترین فرشتوں نے اوپر چڑھنے کے بہترین اوقات میں کیا ہے اور جن کا بیان اس کے عظیم ترین انبیاء نے اپنے مشاہدات کے کامل ترین اوقات میں کیا ہے' اور میں اس کی حمد و ثنا کہتا ہوں ان تعریفوں کے ساتھ جن کا وہ مستحق ہے خواہ میں ان کو جانتا ہوں یا نہیں جانتا اس لئے کہ خاک کو بادشاہوں کے بادشاہ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے' اور اللہ کی رحمتیں نازل ہوں اس کے مقرب فرشتوں پر' اس کے انبیاء اور رسولوں پر اور اس کے سب نیک بندوں پر' سمجھ لو اے میرے دینی دوستو! اور ایمان و یقین کی تلاش میں میرے بھائیو! کہ لوگ کہتے ہیں انسان جب مر جائے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور مخلوق کے ساتھ اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے لیکن اس عام میں دو طرح کی تخصیص کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ اگر اس کا کوئی عمل باقی رہا ہو (یعنی جس سے لوگ اس کی موت کے بعد بھی فائدہ اٹھا رہے ہوں جیسے شاگرد اور علمی کتابیں) تو وہ عمل دعا کا سبب بن جاتا ہے اور دعا کا اللہ کے ہاں اثر ہوتا ہے' اور دوسری تخصیص میت کی اولاد اور اس پر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی سے تعلق رکھتی ہے (کہ اولاد اس کے لئے دعا کرے یا اس پر لوگوں کے

حقوق کی ادائیگی کرے تو اسے فائدہ پہنچتا ہے) جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے (یعنی وہ عمل جس سے لوگ بعد از مرگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں) تو جان لو کہ میں علم سے محبت کرنے والا شخص تھا اور ہر چیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا تاکہ اس کی کمیت اور کیفیت (قدر و حیثیت) سے واقف ہو جاؤں' خواہ وہ حق ہو یا باطل' لیکن اپنی معتبر و معتمد کتابوں میں اس علم دوست شخص نے (یعنی میں نے) جو بات بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ عالم ایک ایسے مدبر کی تدبیر کے ماتحت ہے جو حیز اور مکان رکھنے والی چیزوں یعنی مخلوقات کی مشابہت و مماثلت سے بلند و بالا ہے اور کامل قدرت' کامل علم اور کامل رحمت سے متصف ہے۔ میں نے علم کلام کے طرز ہائے استدلال کو بھی آزما لیا ہے اور فلسفیانہ مناہج سے بھی واقفیت حاصل کر لی ہے لیکن میں نے ان میں وہ فائدہ نہیں دیکھا جو اس فائدے کے برابر ہو جسے میں نے قرآن میں پایا ہے اس لئے کہ وہ بندوں سے اللہ کی عظمت و جلال کو منوانے پر زور دیتا ہے اور متعارضات و مناقضات یعنی اعتراضات اور شبہات میں تعمق سے یعنی دور تک جانے سے روکتا ہے' یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ کو علم ہے کہ انسانی عقول ان تنگ اور گہری گھاٹیوں اور خفیہ راستوں میں گم ہو جاتی ہیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ جو کچھ قرآن کے ظاہری دلائل سے ثابت ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ واجب الوجود ہے' واحد اور یکتا ہے' شرکاء سے پاک ہے' قدیم ہے' ازلی ہے' تدبیر کرنے والا ہے' اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہی میرا عقیدہ ہے اور میں اسی عقیدے کے ساتھ اللہ سے ملوں گا۔ باقی رہے وہ امور جن میں دقت اور پوشیدگی پائی جاتی ہے تو ان کے بارے میں جو کچھ قرآن اور احادیث صحیحہ میں آیا ہے جس کا ایک ہی مفہوم اور معنی متعین ہے تو وہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ و رسول نے کہا ہے اور جو امور ایسے نہیں ہیں تو ان کے متعلق میں کہتا ہوں کہ اے سارے جہانوں کے معبود' میں جانتا ہوں کہ تیری مخلوق اس پر متفق ہے کہ تو کرم کرنے والوں میں سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے اور رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پس جو کچھ میرے قلم نے لکھا ہے اور میرے دل میں آیا ہے میں

اس پر تجھے گواہ بناتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر تجھے علم ہے کہ میں نے اس سے باطل کے اثبات اور حق کے بطلان کا ارادہ کیا تھا تو میرے ساتھ وہی سلوک کر جس کا میں مستحق ہوں اور اگر تو میرے بارے میں جانتا ہے کہ میں نے جو کوشش بھی کی ہے تیری پاکی بیان کرنے کے لئے کی ہے جس کے متعلق میرا عقیدہ تھا کہ یہ حق ہے اور جس کے بارے میں میری سوچ تھی کہ یہ سچ ہے تو تیری رحمت کو میری نیت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس نتیجے کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے جو میں نے حاصل کیا ہے' یہ ایک قلیل العلم اور کمزور شخص کی کوشش اور محنت ہے (جہد المقل ہے) تو اس سے بڑے کرم والا ہے کہ لغزش میں پڑ جانے والے ایک کمزور شخص کی گرفت کرے' پس میری فریاد رسی فرما' مجھ پر رحم فرما' میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دیجئے اور میرے گناہوں کو بخش دیجئے۔ اے وہ ذات جس کی بادشاہی میں عارفین کا عرفان اضافہ نہیں کر سکتا اور مجرموں کی خطائیں اس کی بادشاہی میں کچھ کمی نہیں کر سکتیں' میں کہتا ہوں کہ میرا دین محمد رسول اللہ ﷺ کی متابعت ہے' میری کتاب قرآن عظیم ہے اور دین کی تلاش میں میرا اعتماد انہیں دو پر ہے یعنی قرآن و سنت پر ہے۔ اے آوازوں کے سننے والے! اے دعاؤں کو قبول کرنے والے! اور اے لغزشوں کو معاف کرنے والے! میں تیرے بارے میں حسن ظن رکھتا تھا اور تیری رحمت سے بڑی امیدیں رکھتا تھا اور تو نے کہا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں' یعنی وہی کرتا ہوں جو میرے بارے میں میرا بندہ گمان کرتا ہے (مایوس نہیں ہوتا بلکہ رحم کی امید رکھتا ہے) اور تو نے کہا ہے کہ کون ہے جو پریشان حال کی پکار سنتا ہے جب وہ اسے پکارے؟ میں مانتا ہوں کہ میں تیرے پاس کچھ بھی لے کر نہیں آیا ہوں لیکن تو تو غنی اور کریم ہے میری امید کو نامراد نہ بنا اور میری دعا کو رد نہ فرما اور مجھے اپنے عذاب سے بچا' امن میں رکھ موت سے پہلے بھی' موت کے بعد بھی اور موت کے وقت بھی اور مجھ پر موت کی سختیاں آسان فرما۔ بے شک تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

میں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں بہت سے سوالات اور اعتراضات اٹھائے ہیں تو جو شخص ان میں غور و فکر کرے تو بطور احسان مجھے اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھے ورنہ میرے بارے میں بری بات نہ کہے اس لئے کہ میرا مقصد صرف بحث کو بڑھانا اور ذہنوں کو تیز کرانا تھا (کسی کی تذلیل میرا مقصد نہیں تھا) اور تمام امور میں میرا بھروسہ اللہ ہی پر ہے۔ اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے یعنی بچوں کی اصلاح تو اس بارے میں میرا اعتماد اور بھروسہ اللہ ہی پر ہے کہ وہ اس کا کوئی انتظام فرمائے گا' اور میں اپنے شاگردوں کو اور ان لوگوں کو جن پر میرا حق ہے حکم دیتا ہوں کہ میں جب مر جاؤں تو میری موت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں اور شرعی طریقے کے مطابق مجھے دفن کریں اور جب دفن کرلیں تو میری قبر پر جتنا بھی ان سے ہو سکے قرآن پڑھیں اور پھر یہ دعا کریں کہ اے کریم خدا ایک فقیر اور محتاج تیرے پاس آیا ہے پس تو اس پر احسان فرمادیجئے هٰذَا آخِرُ الْوَصِيَّةُ اس پر وصیت کا اختتام ہوا ہے۔(۱)

میں نے وصیت نامے کے اس متن کا ترجمہ کیا ہے جو سبکی نے طبقات الشافعیہ میں نقل کیا ہے' مگر اس وصیت نامے کو ابن ابی اصیبع نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں بھی نقل کیا جس کے متن میں کچھ کمی بیشی بھی ہے اور الفاظ و کلمات کا کچھ فرق بھی ہے' طبقات الاطباء ۱۸۸۳ء میں مصر سے پہلی بار دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی' اس کا اردو میں ترجمہ حکیم عبدالمجید اصلاحی نے کیا ہے اور یہ ترجمہ الفیصل ناشران کتب نے اردو بازار لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے۔ یہ وصیت نامہ اس کی جلد دوم میں ص ۷۷ تا ۸۰ پر نقل کیا گیا ہے۔

امام رازی کی اس وصیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ و کلام اور علوم عقلیہ میں ان کو جو فوقیت اور عبقریت حاصل تھی اور اس کی وجہ سے انہوں نے جس علمی رعب

---

(۱) طبقات الشافعية الكبرىٰ طبع فيصل عيسىٰ البابي مصر ۱۹۱۸ء ص ۹۰ تا ۹۲ ج ۸

اور دبدبے کے دن گزارے تھے۔ آخر میں اسے ایک سعی لاحاصل سمجھنے لگے تھے اور ان کے دل و دماغ اور فکر و نظر سے فلسفہ و کلام کا رعب اور دبدبہ نکل چکا تھا اور قرآن و سنت کی تعلیمات ان کے ظاہر اور باطن پر حاوی ہو گئی تھیں اور عقلیات کے بارے میں ان کے قلب و ضمیر کی آواز یہ بن گئی تھی کہ:

نِهَايَةُ اَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالٌ ‌ ‌ ‌ ‌ وَ اَكْثَرُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالٌ

"عقلوں کے قدموں کا انجام بندھن ہے یعنی رک جانا ہے' اور علم والوں کی اکثر کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔"

یعنی انسانی عقول کی دوڑ کا میدان محدود ہے' وہ آخر کار تھک کر رک جاتی ہیں' کمزور پڑ جاتی ہیں اور ان کے قدموں میں بندھن پڑ جاتے ہیں اور حقائق معلوم کرنے کے لئے اہل علم کی کوششیں اکثر ضائع ہو جاتی ہیں۔ حقائق سے پردہ صرف قرآن و سنت نے اٹھایا ہے۔

مولانائے روم نے بھی کہا ہے کہ ۔

چند خوانی حکمت یونانیاں ‌ ‌ ‌ ‌ حکمت ایمانیاں راہم خواں

اور مولائے روم کے روحانی شاگرد علامہ اقبال نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب ‌ ‌ ‌ ‌ روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

حقیقت یہی ہے کہ قلب و دماغ اور فکر و نظر کی بیماریوں کا علاج اور نسخہ کیمیا قرآن ہے:

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ.

"قرآن میں ہم وہ احکام اتار رہے ہیں جو شفاء ہیں۔"

شرح صدر' سکون قلبی اور اطمینان قلبی کا ذریعہ صرف قرآن ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

"یاد رکھو کہ اللہ کی کتاب ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔"

امام رازی کی تفسیر کا تعارف

(۱) امام رازی کی تفسیر کا نام تو "مفاتیح الغیب" ہے لیکن اگر ساتھ مصنف کا نام نہ لیا جائے تو "مخصوص علماء" کے علاوہ عوام اور خواص' طلباء اور اساتذہ دونوں سمجھ نہیں سکیں گے کہ یہ کس کی تصنیف ہے اس لئے کہ یہ "التفسیر الکبیر" کے نام سے مشہور ہے اور تفسیر کبیر کا نام سنتے ہیں علم تفسیر کے ساتھ تھوڑی سی مناسبت رکھنے والا شخص بھی سمجھ لے گا کہ یہ امام رازی کی تفسیر ہے۔ تفسیر کبیر کے نام سے شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ فی الواقع بڑی تفسیر ہے چھوٹی تفسیر نہیں ہے۔ کیفیت اور شان کی اعتبار سے بھی کبیر ہے کہ اس میں بڑے عظیم اور دقیق علوم و معارف بیان ہوئے ہیں اور ہر فن اور علم سے متعلق بڑی مفید مباحث حسن ترتیب اور حسن بیان کے ساتھ اس میں تحریر کی گئی ہیں اور کمیت و ضخامت کے لحاظ سے بھی کبیر اور طویل تفسیر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ امام رازی علم کا سمندر اور بحر زخار تھے اور سمندر سے جب لہریں اور موجیں اٹھتی ہیں تو ارد گرد کے وسیع و عریض علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں' امام رازی بھی جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں مختلف علوم و فنون سے متعلق مسائل کی موجیں اٹھتی ہیں جن کو کنٹرول کرنا اور موضوع کی حدود میں محدود رکھنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ترتیب وار سب مسائل کو ضبط تحریر میں لانا شروع کر دیتے ہیں خواہ وہ مسائل لغت اور صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہوں یا علم بلاغت کے فنون ثلاثہ سے تعلق رکھتے ہوں' حدیث اور فقہ سے متعلق ہوں یا فلسفہ و کلام سے متعلق ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب بات سے ضمنی باتیں نکلنا شروع ہو جائیں یا نکالی جائیں تو بات طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی اور آیت کا جو مفہوم چار پانچ یا دس بارہ سطروں میں بیان کیا جا سکتا ہو وہ چار پانچ یا دس بارہ صفحات پر پھیل جائے گا اور تفسیر کبیر اور ضخیم بن جائے گی' جو لوگ تفصیلی اور تحقیقی معلومات کا ذوق و شوق رکھتے ہوں اور ان کے پاس فارغ اوقات بھی

ہوں تو ایسی تفسیر ان کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے مگر جو طلبہ آیت کا صحیح مفہوم مختصر الفاظ میں سمجھنا چاہتے ہیں وہ مسائل و مباحث کے اس سمندر سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ کنفیوژن اور الجھن میں مبتلا ہو جائیں گے' اس لئے میرے نزدیک بحث و تحقیق کا ذوق و شوق رکھنے والے علماء و فضلاء کے لئے تو تفسیر کبیر کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ یہ علوم و معارف اور مسائل و مباحث کی انسائیکلوپیڈیا اور دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے لیکن مبتدی یا متوسط درجے کے طلبہ کے لئے اس تفسیر کی کچھ زیادہ افادیت نہیں ہے۔ امام رازی کی زبان سے ایک مرتبہ یہ بات نکل گئی تھی کہ سورہ فاتحہ سے دس ہزار مسائل نکالے جا سکتے ہیں۔ اس دعوے کو بعض لوگوں نے بعید از قیاس قرار دیا تو امام صاحب نے سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھی جو ۲۹۰ بڑے صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مستقل کتاب بھی ہے اور تفسیر کبیر کا حصہ بھی ہے۔ اس میں صرف' نحو' بلاغت' فقہ' فلسفہ' کلام اور دوسرے علوم و فنون کے تقریباً تمام اہم مسائل جمع کر دیئے گئے ہیں اور ابتداء میں لکھا ہے کہ ہزاروں مسائل اور فوائد و نفائس تو اکیلے اعوذباللہ سے بھی نکالے جا سکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ استعاذے سے مراد ہے منہیات اور ممنوعات سے اللہ کی پناہ مانگنا' منہیات یا اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں یا عمل سے تعلق رکھتے ہیں اور اعتقادات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ۷۲ فرقے دوزخی ہیں جن سے اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے اور ان گمراہ فرقوں میں سے ہر ایک کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر ایک شاخ کے بہت سے باطل عقائد ہیں اسی طرح ہر ایک کے اعمال سے تعلق رکھنے والے مسائل باطلہ بھی بے شمار ہیں۔ اس اعتبار سے تو تنہا اعوذباللہ ہزاروں مسائل پر مشتمل ہے' ظاہر ہے کہ جب تفسیر اور تحقیق کا انداز یہ ہو تو تفسیر کا کبیر ہونا لازمی ہے۔

(۲) تفسیر کبیر میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کے اثبات اور معتزلہ کے عقائد کے ابطال پر بڑی مفید بحثیں موجود ہیں۔ جن آیات سے اہل اعتزال نے اپنے نظریات فاسدہ کے

لئے استدلال کیا ہے امام صاحب نے اس کے جوابات دیئے ہیں اور استدلال کا بطلان ثابت کیا ہے۔ امام صاحب اہل سنت کے علم کلام میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور معتزلہ کے شدید مخالف تھے' ان کے ساتھ انہوں نے مباحثے اور مناظرے بھی کئے تھے جن کی وجہ سے ان کو خوارزم اور ماوراء النہر کے مختلف شہروں سے نکالا بھی گیا تھا اس لئے اپنی تفسیر میں جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ ان کے دلائل کا بودا پن ثابت کرتے ہیں اور اہل سنت کے دلائل کی صحت اور قوت واضح کرتے ہیں لیکن ان کی ایک عادت کو اہل علم نے معیوب سمجھا ہے اور وہ یہ کہ کسی مسئلے پر وارد ہونے والے شبہات کا ذکر تو بڑی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں مگر ان کے جو جوابات دیتے ہیں وہ مختصر بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی ہوتے ہیں اور اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں وارد ہونے والے اعتراضات اور شبہات تو بیٹھ جاتے ہیں مگر ان کے کافی اور شافی جوابات سے اس کی تشفی نہیں کی جاتی اور تشنگی باقی رہ جاتی ہے اس کی بجائے اگر ایسے مقامات پر شبہات اور جوابات دونوں کا ذکر ترک کر دیا جاتا تو اس کا نقصان اتنا زیادہ نہ ہوتا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وَ كَانَ يُعَابُ بِإِيْرَادِ الشُّبَهِ الشَّدِيْدَةِ وَ يَقْصُرُ فِي حَلِّهَا حَتّٰى قَالَ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ يُوْرِدُ الشُّبَهَ نَقْدًا وَ يَحِلُّهَا نَسِيْئَةً.(۱)

"امام رازی پر یہ عیب لگایا گیا ہے کہ یہ شبہات تو بڑے سخت کرتا ہے مگر ان کا حل ناقص اور کمزور پیش کرتا ہے یہاں تک کہ بعض اہل مغرب نے کہا ہے کہ امام رازی شبہات تو نقد پیش کرتے ہیں مگر ان کا حل ادھار چھوڑ دیتے ہیں۔"

(۳) تفسیر کبیر میں آیات کی تاویل و توجیہ میں اکثر تو جمہور مفسرین اور اہل سنت کے اقوال کو ترجیح دی گئی ہے لیکن بعض مقامات پر ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی تاویل کی تائید کی گئی

---

(۱) لسان المیزان ص۴۲۷ ج۴

ہے۔اس قسم کی تاویل میں امام صاحب سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہئے کہ امام رازی معتزلہ کے عقائد کی تائید کرتے ہیں اس لئے کہ جن مقامات پر انہوں نے ابو مسلم کی تائید کی ہے ان کا تعلق عقائد سے نہیں ہے۔مثلاً سورۃ طٰہٰ میں سامری کا قول نقل ہوا ہے کہ :

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِه فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ. (طٰهٰ ٩٦ پ ١٦)

اس آیت کی تفسیر میں امام رازی نے پہلے تو جمہور مفسرین کی تفسیر نقل کی ہے جو صحابہ و تابعین سے ماثور ہے اور اس کے بعد ابو مسلم اصفہانی کی تاویل نقل کی ہے جس کے مطابق آیت کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے کہ :

"میں نے موسیٰ علیہ السلام کے دین میں وہ چیز دیکھی تھی جو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) نہیں دیکھی تھی یعنی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ دین حق نہیں ہے' پس میں نے ان رسول (موسیٰ) کے قدم پر قدم رکھا تھا یعنی کچھ مدت تک اس کی پیروی کرتا رہا تھا مگر میں نے اب اس کی پیروی کو پھینک دیا ہے یعنی چھوڑ دیا ہے اور اسی طرح خوبصورت بنادیا تھا اس تدبیر کو یعنی کچھ مدت تک پیروی کرکے بعد میں چھوڑ دینے کو میرے نفس نے۔"

اور پھر اس تاویل کو اَقْرَبُ اِلَى التَّحْقِيْقِ کہہ کر چار وجوہات سے اس کی تائید کی ہے' تفسیر البحر المحیط اور تفسیر نیشاپوری میں ابو مسلم کی تاویل کو نقل تو کیا گیا ہے مگر نہ تردید کی گئی ہے اور نہ تائید کی گئی ہے۔مگر تفسیر روح المعانی میں اس تاویل کی تردید کی گئی ہے اور امام رازی کی وجوہات اربعہ کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ہمارا اس بارے میں امام رازی سے اتفاق نہیں ہے بلکہ جمہور مفسرین سے اتفاق ہے لیکن یہ کوئی عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ صرف آیت کی تاویل اور توجیہ کا مسئلہ ہے جس میں ابو مسلم کی تائید کرنا اس کے اعتزال کی تائید کرنے کے مترادف نہیں ہے۔باقی رہے آثار صحابہ و تابعین تو وہ رسول اللہ ﷺ سے

مروی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ صحابہ نے اہل کتاب سے حکایتا نقل کئے ہوں جیسا کہ ابن کثیر نے لکھا ہے۔

(۴) تفسیر کبیر میں سورتوں اور آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت کے بیان کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور مختلف مقامات پر وارد ہونے والے اشکالات بھی حل کئے گئے ہیں مگر امام صاحب کی عادت یہ ہے کہ وہ توجیہات کثیرہ بیان کرتے ہیں جن میں کمزور توجیہات بھی ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے قوی اور مضبوط توجیہات بھی کمزور سمجھ لی جاتی ہیں۔ اگر توجیہات کے تعدد اور کثرت کی جگہ قوی اور مضبوط توجیہات پر اکتفا کیا جاتا تو اس میں افادیت زیادہ ہوتی۔

(۵) امام رازی امام المتکلمین اور علوم و فنون کے بحر زخار تو تھے مگر ائمہ حدیث میں شمار نہیں ہوتے تھے اور حدیث میں کمزور بھی تھے۔ تفسیر کبیر میں احادیث و آثار کی تعداد تو بہت کم ہے لیکن جو روایات نقل کی گئی ہیں ان کی صحت، اور عدم صحت کی تحقیق بھی نہیں کی گئی اور اکثر مقامات پر حوالے بھی نہیں دیئے گئے اس لئے تفسیر کبیر میں نقل کردہ روایات پر استدلال تحقیق کے بغیر نہیں کرنا چاہئے۔

(۶) اس بات پر تو تقریباً اتفاق ہے کہ امام رازی نے اپنے قلم سے تفسیر مکمل نہیں کی تھی البتہ اس میں اختلاف ہے کہ انہوں نے کہاں تک خود لکھی تھی اکثر کی رائے یہ ہے کہ سورہ انبیاء تک لکھی گئی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا' تکملہ کس نے لکھا ہے؟ اس بارے میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی البتہ حافظ ابن حجر نے "الدرر الکامنہ" میں لکھا ہے کہ تفسیر کبیر کا تکملہ نجم الدین احمد بن محمد مخزومی مصری متوفی ۷۲۷ھ نے لکھا ہے اور بعض کے نزدیک تکملے کا کچھ حصہ قاضی القضاۃ شہاب الدین بن خلیل دمشقی نے بھی لکھا ہے۔ لیکن تکملہ جس نے بھی لکھا ہو تفسیر کا اسلوب آغاز سے لے کر آخر تک یکساں ہے اور قاری کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ امام رازی سے یہ تفسیر ادھوری رہ گئی تھی۔

(۲)انوار التنزیل و اسرار التاویل معروف بتفسیر بیضاوی للبیضاوی متوفی ۶۹۱ھ

بیضاوی کا تعارف

بیضاوی کا نام عبداللہ بن عمر بن محمد ہے' لقب ناصر الدین ہے اور کنیہ ابو الخیر ہے لیکن یہ فارس کے مشہور شہر بیضاء کی نسبت سے قاضی بیضاوی کے نام سے مشہور ہیں اور اہل علم میں اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ "بیضاء" کے بارے میں یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ لکھتے ہیں :

اَلْبَيْضَاءُ ضِدُّ السَّوْدَاءِ فِيْ عِدَةِ مَوَاضِعَ مِنْهَا مَدِيْنَةٌ مَشْهُوْرَةٌ بِفَارِسَ وَ كَانَ اِسْمُهَا فِيْ اَيَّامِ الْفُرْسِ دَرِسفيد فَعُرِّبَتْ بِالْمَعْنٰى وَ قَالَ الْاِصْطَخْرِيُّ اَلْبَيْضَاءُ اَكْبَرُ مَدِيْنَةٍ فِيْ كُوْرَةِ اِصْطَخَرَ وَ اِنَّمَا سُمِّيَتِ الْبَيْضَاءُ لِاَنَّ لَهَا قَلْعَةً تُبَيِّنُ مِنْ بُعْدٍ وَ يُرٰى بَيَاضُهَا وَ كَانَتْ مُعَسْكَرًا لِلْمُسْلِمِيْنَ يَقْصُدُوْنَهَا فِيْ فَتْحِ اِصْطَخَرَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ شِيْرَازَ ثَمَانِيَةُ فَرَاسِخَ وَ يُنْسَبُ اِلَيْهَا جَمَاعَةٌ.(۱)

"بیضاء جو سوداء کی ضد ہے کئی مقامات کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک فارس کا مشہور شہر بھی ہے' فارسیوں کے زمانے میں اس کا نام در سفید یعنی سفید دروازہ تھا' مگر اس کو مفہوم کے اعتبار سے عربی میں تبدیل کر دیا گیا ہے' اصطخری نے کہا ہے کہ بیضاء اصطخر کے علاقے یا ضلع میں ایک بڑا شہر ہے اور اس کو بیضاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک قلعہ تھا جس کی سفیدی دور سے دکھائی دیتی تھی یعنی اس کا سفید قلعہ دور سے نمایاں نظر آرہا تھا۔ بیضاء کا یہ شہر اصطخر کی فتح کے زمانے میں مسلمانوں کا لشکر گاہ (جہادی کیمپ) بھی رہا ہے' اس کے اور شیراز کے درمیان آٹھ فرسخ یعنی ۲۴ میل کا فاصلہ ہے اور اس شہر کی جانب

(۱) معجم البلدان طبع بیروت ۱۹۷۹ء ص۵۲۹ ج۱

علماء کی ایک جماعت منسوب ہے۔"

اور اصطخر کے بارے میں یاقوت فرماتے ہیں کہ :

"کہا گیا ہے کہ اصطخر (ہمزہ کی زیر' صاد کے سکون' طاء کی زبر اور خاء کے سکون کے ساتھ) کو سب سے پہلے فارسیوں کے بادشاہ اصطخر بن طہمورث نے آباد کیا تھا' اس کی کشادگی ایک میل ہے' فارس کے قدیم ترین اور مشہور ترین شہروں میں ایک شہر ہے' یہ اردشیر کے زمانے تک فارس کے بادشاہوں کا مسکن اور مرکز رہا ہے' اصطخر اور شیراز کے درمیان ۱۲ فرسخ کا فاصلہ ہے یعنی ۳۶ میل کا۔"(۱)

حافظ ابن کثیر نے قاضی بیضاوی کا ذکر اس طرح کیا ہے :

هُوَ الْقَاضِيْ الْإِمَامُ الْعَلَّامَةُ نَاصِرُ الدِّيْنِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ الشِّيْرَازِيْ قَاضِيْهَا وَ عَالِمُهَا وَ عَالِمُ اَذْرَبِيْجَانَ وَ تِلْكَ النَّوَاحِيْ مَاتَ بِتَبْرِيْزَ سَنَةَ خَمْسٍ وَ ثَمَانِيْنَ وَ سِتِّمِاْئَةٍ.(۲)

"وہ قاضی تھے' امام تھے' علامہ ناصر الدین عبداللہ بن عمر شیرازی تھے' شیراز کے قاضی اور عالم تھے' اذربیجان اور اس کے اطراف کے بھی عالم تھے اور ۶۸۵ء میں تبریز میں فوت ہوئے تھے۔"

تاج الدین سبکی نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ :

كَانَ اِمَامًا مُبَرِّزًا نَظَّارًا صَالِحًا مُتَعَبِّدًا زَاهِدًا.

"بیضاوی اپنے ہم سروں پر فوقیت رکھنے والے امام تھے' زیرک اور دانشمند تھے' عابد اور زاہد تھے۔"

شیراز کے قاضی القضاۃ تھے' تبریز میں اس وقت داخل ہوئے تھے کہ ایک فاضل عالم

(۱) معجم البلدان ص ۲۱۱ ج ۱

(۲) البدايه والنهايه ص ۳۰۹ ج ۱۳

اپنی درسگاہ میں درس دے رہے تھے' قاضی بیضاوی بھی اس مجلس کے آخر میں بیٹھ گئے' مدرس نے مجلس میں ایک نکتہ پیش کیا اور کہا کہ اس کی تشریح کرو اور اس کا جواب بتاؤ' اگر جواب نہیں دے سکتے تو صرف تشریح کرو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو میرے بیان کردہ نکتے کو میرے الفاظ میں دہرا دو۔ مدرس کا گمان یہ تھا کہ حاضرین میں سے اس نکتے کو کوئی بھی نہیں جانتا لیکن مدرس نے جب اپنی بات پوری کی تو قاضی ناصر الدین نے جواب دینا شروع کر دیا مگر مدرس نے کہا میں جواب نہیں سنوں گا جب تک کہ مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ تم نے اس نکتے کو سمجھ لیا ہے۔ قاضی نے کہا اس کی تشریح باللفظ کروں یا بالمعنی کروں یعنی آپ کے الفاظ دہراؤں یا اپنے الفاظ میں بیان کروں؟ مدرس پہلے تو کچھ متحیر ہو گئے لیکن پھر کہا کہ میرے الفاظ ہی دہرا دو۔ قاضی نے اس کے الفاظ دہرائے اور کہا کہ آپ کے بیان کردہ الفاظ کی ترکیب میں یہ نقص رہ گیا تھا۔ پھر اس نکتے کو حل کیا یعنی تشریح کی اور پھر اس کا جواب دیا اور فوراً اس طرح کا ایک اور نکتہ پیش کیا اور مدرس کو دعوت دی کہ آپ اس کو حل کریں مگر مدرس اس نکتے کو حل نہ کر سکے' مجلس میں وزیر بھی تشریف رکھتا تھا اس نے ان کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں بیضاوی ہوں اور شیراز کی قضاء کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ وزیر نے ان کا اکرام و اعزاز کیا' انہیں اسی روز خلعت پہنائی اور ان کی حاجت پوری کر کے واپس بھیج دیا۔(۱)

سبکی نے ان کی تاریخ وفات ۶۹۱ھ بتائی ہے اور مشہور قول بھی یہی ہے لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ۶۸۵ھ میں فوت ہوئے تھے واللہ اعلم۔

قاضی بیضاوی نے تفسیر کے علاوہ مختلف فنون میں دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں' علم اصول میں المنہاج اور اس کی شرح لکھی ہے اور حدیث میں مصابیح السنہ کی شرح لکھی ہے۔

بیضاوی کی تفسیر کی نوعیت اس کے خطبے میں انہوں نے خود بیان کی ہے جس کا ترجمہ

---

(۱) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ص۱۵۷۔۱۵۸ ج۸ ترجمہ نمبر ۱۱۵۳

یہ ہے:

"کافی مدت سے میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ میں فن تفسیر میں ایسی کتاب تصنیف کروں جو اکابر صحابہ' علماء و تابعین اور ان سے کم درجے کے سلف صالحین کے ان منتخب اقوال پر مشتمل ہو جو مجھ تک پہنچے ہیں اور وہ ان اعلیٰ نکتوں اور خوبصورت لطیفوں پر مشتمل ہو جو میں نے مستنبط کئے ہیں یا متاخرین کے بہترین علماء نے اور بزرگ تر محققین نے مستنبط کئے ہیں اور جس میں مشہور آٹھ ائمہ قراءت کی مشہور قراءتوں کی وضاحت و صراحت بھی کی گئی ہو اور معتبر قاریوں سے مروی شاذ قراءتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہو' لیکن میرے سرمایہ علم کی کمی مجھی اس اقدام سے روکتی تھی اور اس مقام پر کھڑا ہونے سے منع کرتی تھی' یہاں تک کہ استخارہ کرنے کے بعد اس کے آغاز کرنے کا پختہ عزم میرے دل میں ظاہر ہو گیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جب اس کتاب کو مکمل کر لوں تو اس کا نام رکھوں گا "انوار التنزیل و اسرار التاویل"

مصنف کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ان کی تفسیر پانچ امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے اقوال۔

۲۔ اس کی اپنی عقل و رائے سے معلوم کردہ نکات و لطائف۔

۳۔ متاخرین فضلاء و محققین کے بیان کردہ نکات و لطائف۔

۴۔ مشہور ائمہ قراءت کی قراءات مشہورہ۔

۵۔ اور دوسرے معتبر قاریوں سے مروی شاذ قراءات۔

جن نکات و لطائف کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے وہ لغت و عربیت' صرف و نحو اور بلاغت سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے امور سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ باقی رہیں شاذ قراءات تو ان کا ذکر قراءات مشہورہ کی تشریح کے لئے کیا گیا ہے یا کسی اور وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ اہل سنت کے تمام مفسرین کی تفسر دل کی بنیاد قراءات متواترہ یا مشہورہ ہیں جو

مصحف عثمانی کے مطابق ہوں۔ چونکہ بیضاوی کی تفسیر صرف احادیث و آثار پر مشتمل نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے خود تصریح کی ہے اس لئے ہم نے اس کو تفسیر بالماثور کی قسم میں شامل نہیں کیا بلکہ تفسیر "بالرائی الجائز" کی لسٹ میں شامل کیا ہے۔ بیضاوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا ماخذ زمخشری کی تفسیر کشاف ہے بلکہ بعض کے نزدیک یہ کشاف کی تلخیص ہے مگر اس نے زمخشری کے اعتزال کی تائید نہیں کی بلکہ جگہ جگہ اس کی تردید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کا پر زور دفاع کیا ہے البتہ عربیت اور بلاغت سے تعلق رکھنے والے امور اور دوسرے علمی نکات میں کشاف سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے امام رازی کی تفسیر کبیر سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ البتہ احادیث کی صحت و عدم صحت اور سندی تحقیق پر اس نے کچھ زیادہ توجہ نہیں دی اسی طرح سورتوں کے فضائل میں کشاف میں جو روایات نقل ہوئی ہیں وہ بیضاوی نے بھی بلا تحقیق نقل کر دی ہیں حالانکہ ان میں ضعاف بھی ہیں بلکہ بعض کو موضوعات بھی کہا گیا ہے' بیضاوی نے اگرچہ فن حدیث میں بغوی کی مصابیح السنہ پر شرح لکھی ہے لیکن اس کے باوجود یہ مشاہیر اور معتمد ائمہ حدیث میں شامل نہیں ہیں اس لئے جس طرح امام غزالی' امام رازی اور زمخشری کی کتابیں ضعیف روایات سے خالی نہیں ہیں۔ اسی طرح بیضاوی کی تفسیر میں بھی ضعیف روایات آگئی ہیں لیکن اسرائیلی روایات کا ذکر بیضاوی میں بہت کم ہوا ہے اور جہاں ہوا بھی ہے تو ضعف کے اشارے کے ساتھ ہوا ہے اور یہ اسکی بڑی خوبی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی مدارس کے نصاب میں تفسیر بیضاوی سورۃ البقرہ کے آخر تک شامل ہے مگر پوری شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ بقرہ کے آخر تک اس میں تحقیقات زیادہ تفصیل کے ساتھ کی گئی ہیں اور طلبہ جب اس حصے کو اچھی طرح استاد سے سمجھ لیتے ہیں تو باقی تفسیر کا خود بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں پڑھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بہر حال تھوڑی بہت خامیوں کے باوجود اس کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی مقبولیت دی ہے اور اس کی افادیت بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے دینی

مدارس میں اس کو اونچے درجے کے اساتذہ پڑھاتے ہیں تا کہ اس کی تدریس کا حق ادا کیا جاسکے۔

(۳) مدارک التنزیل وحقائق التاویل للنسفی متوفی ۷۰۱ ھ

نسفی کا نام عبداللہ بن احمد بن محمود ہے اور لقب ابوالبرکات بھی ہے اور حافظ الدین کے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں لیکن نسف کی نسبت کی وجہ سے نسفی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تفسیر کو بھی "تفسیر نسفی" کہا جاتا ہے نسف ماوراء النہر کے علاقے میں مشہور شہر ہے جس میں بڑے بڑے فضلاء اور فقہاء گزرے ہیں۔ ان کی وفات کے بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ ۷۱۰ ھ میں فوت ہوئے تھے لیکن صحیح اور مشہور قول یہی ہے کہ ان کا انتقال ایذج بروزن احمد نام کے شہر میں ۷۰۱ ھ میں ہوا تھا۔ "ایذج" کے بارے میں یاقوت حموی میں لکھا ہے کہ اس کا اطلاق دو جگہوں پر ہوتا ہے۔ ایک اہواز کے علاقے میں خوزستان اور اصبہان کے درمیان ایک بڑے شہر کا نام ہے اور دوسرا سمرقند کے پاس ایک شہر کا نام ہے۔ یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ یہ سمرقند کا ایذج ہوگا اس لئے کہ نسف بھی اسی علاقے میں ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی مولود ۱۲۶۴ھ اور متوفی ۱۳۰۴ھ علامہ نسفی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ اپنے زمانے میں حنفیہ کے کامل امام تھے جس کی نظیر نہیں ملتی تھی' فقہ اور اصول میں رئیس تھے اور حدیث اور اس کے معانی و مفاہیم میں فوقیت رکھتے تھے' شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری اور بدرالدین خواہر زادہ سے فقہ کا علم حاصل کیا تھا' ان کی معتبر و معتمد تصانیف بھی موجود ہیں مثلاً فقہ میں متن "الوافی" اور اس کی شرح "الکافی" اور "کنزالدقائق" علم اصول میں "المنار" اور علم تفسیر میں مدارک التنزیل' ان کی تمام تصانیف فقہاء کے نزدیک معتبر ہیں" "الجواہر المضیہ" میں لکھا ہے کہ "حافظ الدین" دو اماموں کا لقب

رہا ہے ایک محمد بن محمد بن نصر البخاری اور دوسرے ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی جس نے فقہ میں بڑی مفید تصانیف کی ہیں اور یہ دونوں شمس الائمہ کردری کے شاگرد تھے۔ جواہر المفید میں یہ بھی لکھا ہے کہ نسفی نے احمد بن محمد عتابی سے امام محمد کی کتاب "الزیادات" کی روایت کی ہے اور ملا علی قاری نے بھی اس کی متابعت میں اسی طرح کہا ہے لیکن علامہ کفوی نے لکھا ہے کہ عتابی ۵۸۶ھ میں فوت ہوئے تھے اور نسفی ۷۱۰ھ یا ۷۰۱ھ میں فوت ہوئے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے زیادہ فرق کے ہوتے ہوئے بھی نسفی عتابی سے روایت کر سکے۔"(۱)

امام نسفی نے اپنی تفسیر کا منہج خطبے میں اس طرح بیان کیا ہے:

"مجھ سے ان لوگوں نے درخواست کی جن کی بات ماننا ضروری تھا کہ میں قرآن کی تاویلات میں درمیانی درجے کی ایسی کتاب لکھوں جو وجوہ اعراب اور قراءات کی جامع ہو' علم بدیع اور علم اشارات کے باریک اور دقیق نکتوں پر مشتمل ہو' اہل سنت والجماعت کے اقوال سے مزین ہو' اہل بدعت وضلالت کی جھوٹی باتوں سے خالی ہو' اتنی طویل بھی نہ ہو کہ قاری اس کے پڑھنے سے تنگ آجائے اور اتنی قصیر اور مختصر بھی نہ ہو کہ اس کے سمجھنے میں خلل پڑ جائے' لیکن میں اپنی بشری قوت کے قصور کے احساس کی وجہ سے اپنا قدم آگے پیچھے کر رہا تھا یعنی پس و پیش کر رہا تھا اور اس پر خطر راستے پر چلنے سے احتیاط کر رہا تھا یہاں تک کہ میں نے اللہ کی توفیق سے اس کام کا آغاز کر دیا حالانکہ عوارض اور موانع بہت زیادہ تھے اور تھوڑی مدت میں اس کتاب کو مکمل کر دیا' میں نے اس کا نام رکھا ہے "مدارک التنزیل و حقائق التاویل" اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اس تفسیر میں اعراب و قراءات اور عربیت وبلاغت کے نکات بیان کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے' نیز اس میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کی ترجمانی کی گئی ہے اور اہل بدعت و ضلالت مثلاً معتزلہ' جہمیہ اور روافض کی جھوٹی اور بے سروپا

(۱) الفوائد البهیه از مولانا عبدالحی لکھنوی طبع نور محمد کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۱-۱۰۲

باتوں سے اس کو پاک رکھا گیا ہے 'اسرائیلیات کے ذکر سے بھی یہ کتاب تقریباً خالی ہے اور اگر کہیں ذکر آبھی گیا ہے تو وہاں پر تردید بھی کی گئی ہے 'معلوم ہوتا ہے کہ نسفی کی تفسیر بیضاوی اور کشاف کی تلخیص ہے لیکن کشاف میں اعتزال کی جو باتیں ہیں ان کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے اور اہل سنت والجماعت کے مسلک پر قائم رہے ہیں۔ البتہ کشاف میں بلاغت اور عربیت کے جو علمی دقائق اور نکات بیان کیے گئے ہیں ان کو نسفی نے بھی لے لیا ہے اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ اچھی چیز کو لے لینا چاہئے اگر چہ اس کا بیان کرنے والا اہل بدعت میں سے ہو اور بری چیز کو چھوڑ دینا چاہئے۔ بہر حال نسفی کی یہ تفسیر مختصر ہونے کے باوجود بڑی جامع اور پختہ تفسیر ہے 'اہل علم میں مقبول ہے اور بعض مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

(۴) لباب التاویل فی معانی التنزیل

معروف بتفسیر خازن متوفی ۷۴۱ھ

خازن کا نام علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی الشیحی ہے۔ شیحہ (شین کے زیر 'یاء کے سکون اور حاء مہملہ کے زبر کے ساتھ) شام کے شہر حلب کے پاس ایک بستی کا نام ہے اس کی نسبت کی وجہ سے اس کو شیحی بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ خازن کے نام سے مشہور ہیں اور اس کی تفسیر بھی تفسیر خازن ہی کے نام سے پہچانی جاتی ہے 'اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ دمشق کے ایک کتب خانے کے خازن رہے تھے اس لئے لوگوں میں خازن کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا لقب علاء الدین ہے اور یہ صوفی کے نام سے بھی مشہور ہیں 'علامہ خازن ۶۷۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ بغداد کے اہل علم سے استفادہ کرنے کے بعد دمشق چلے گئے تھے اور وہاں پر بہت سے فقہاء اور محدثین سے علوم حاصل کیے تھے۔ دمشق میں انہوں نے ایک خاتون محدثہ وزیرہ بنت عمر متوفاۃ ۷۱۶ھ سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا 'تفسیر کے علاوہ

انہوں نے "مقبول المنقول" کے نام سے دس جلدوں میں حدیث کی ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں مسند شافعی' مسند احمد' صحاح ستہ' مؤطا اور دارقطنی کی احادیث جمع کی گئی تھیں۔ ان دس کتابوں کی احادیث کو انہوں نے ابواب کی ترتیب سے مرتب کیا تھا' سیرۃ نبویہ پر بھی انہوں نے ایک بڑی کتاب لکھی تھی۔ حافظ تقی الدین محمد بن رافع دمشقی متوفی ۷۷۴ھ ان کے ہم عصر تھے وہ فرماتے ہیں کہ خازن اچھے اخلاق کے حامل تھے اور لوگوں سے محبت کرنے والے اور اچھے تعلقات رکھنے والے تھے۔ ان کا انتقال رجب یا شوال ۷۴۱ھ میں شام کے مشہور شہر حلب میں ہوا تھا۔(۱)

تفسیر خازن دراصل بغوی کی معالم التنزیل کی تلخیص ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے دوسرے مفسرین کی کتابوں سے بھی منتخب فوائد و نکات شامل کر لئے ہیں البتہ سوائے انتخاب اور اقتباس کے انہوں نے تفسیر میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔ علامہ خازن نے اپنی تفسیر کا تعارف خطبے میں خود کرایا ہے اور یہ تعارف بڑا جامع ہے اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اور حاصل مفہوم بیان کر دیا جائے:

"امام بغوی کی تفسیر معالم التنزیل علم تفسیر میں بہترین اور بلند ترین تفسیر ہے' صحیح اقوال کی جامع ہے' شبہات اور تصحیف سے خالی ہے' احادیث نبویہ سے مزین ہے' احکام شرعیہ' قصص غریبہ اور ماضی کے حالات عجیبہ پر مشتمل ہے' اس میں حسین ترین اشارات اور نکات سجائے گئے ہیں' اس کے مضامین و مفاہیم واضح' فصیح اور خوبصورت عبارات کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں' جب یہ کتاب میری بیان کردہ صفات سے متصف تھی تو میں نے یہ پسند کیا کہ اس کے روشن فوائد سے' اس کے قیمتی موتیوں سے' اس کی چمکتی دمکتی نصوص سے (عبارات سے) اور اس کے جواہر پاروں سے منتخب کر کے ایک ایسی مختصر کتاب تصنیف کروں جو قرآن کے معانی اور تاویل و تعبیر کے خلاصے کو سمیٹنے والی ہو' بغوی کی نقل

---

(۱) طبقات المفسرين از داوودی ص ۴۲۶۔۴۲۷ ج ۱

کردہ روایات اور ان کے بیان کردہ نکات اور اصول کے خلاصے پر مشتمل ہو اور اس کے ساتھ اس میں دوسرے فوائد اور علمی نکات بھی جمع کر دیے جائیں جو میں نے دوسرے مفسرین کی کتابوں سے نقل کئے ہیں' میں نے اس کتاب میں سوائے نقل اور انتخاب کے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا ہے' طول کلام سے اجتناب کیا ہے اور روایات کے اسانید کو حذف کر دیا ہے' آیت کی تفسیر کے لئے یا کسی حکم شرعی کے اثبات کے لئے میں نے جو احادیث نبویہ نقل کی ہیں تو ان کو تخریج کرنے والے محدثین کی طرف منسوب کر دیا ہے اور ان کے لئے حروف کی علامات لگادی ہیں۔ بخاری کے لئے (خ) مسلم کے لئے (م) دونوں کی متفقہ حدیث کے لئے (ق) اور ابو داؤد' ترمذی' نسائی کے لئے علامت نہیں مقرر کی بلکہ ان کا نام لیا ہے۔ جس حدیث کو میں نے مذکورہ کتابوں میں نہیں پایا اور صرف بغوی نے اسے نقل کیا ہے تو اس کے بارے میں میں نے تصریح کر دی ہے کہ اس کو بغوی نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ میری اس کتاب میں بغوی سے جو زائد احادیث نقل ہوئی ہیں یا حدیث کے مختلف الفاظ نقل ہوئے ہیں تو میں نے معتبر کتابوں سے مثلاً حمیدی کی الجمع بین الصحیحین اور ابن الاثیر کی جامع الاصول سے ان کی تصحیح کرنے میں پوری کوشش کی ہے' اسناد کے حذف کے عوض میں نے حدیث کے غریب الفاظ کی تشریح کی ہے تاکہ طالب علموں کے لئے اس کی افادیت زیادہ ہو' جہاں تک میرے بس میں تھا تو میں نے کوشش یہ کی ہے کہ کتاب میں ایجاز و اختصار ہو' ترتیب اچھی ہو اور اس کا سمجھنا آسان ہو' مناسب یہ ہے کہ جو مصنف نئی کتاب لکھتا ہے تو اس کی کتاب ۵ فوائد سے خالی نہ ہو۔ ایک معضل اور مشکل بات کی تحقیق کرنا۔ دوم متفرق اور منتشر باتوں کو جامع الفاظ میں جمع کرنا۔ سوم پوشیدہ اور دقیق باتوں کی تشریح کرنا۔ چہارم حسن ترتیب اور پنجم زوائد کو حذف کر دینا اور طول کلام سے اجتناب کرنا۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب ان فوائد خمسہ سے خالی نہیں ہو گی اور میں نے اس کتاب کا نام رکھا ہے "لباب التاویل فی معانی التنزیل"۔(۱)

(۱) خطبہ تفسیر خازن طبع دارالفکر بیروت ۱۹۷۹ء ص۳،٤ ج۱

علامہ خازن کے مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ ان کی تفسیر کا اصل ماخذ بغوی کی تفسیر ہے اور اس میں جو احادیث بغوی کی نقل کردہ احادیث سے زائد آئی ہیں ان کی تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے۔ خازن خود بھی محدث تھے اور علوم الحدیث سے ناواقف نہیں تھے لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ اس کی تفسیر میں اسرائیلی روایات بہت زیادہ نقل ہوئی ہیں۔ اسرائیلیات کا سب سے بڑا ماخذ ابو اسحاق ثعلبی نیشاپوری متوفی ۴۲۷ھ کی "تفسیر الکشف والبیان عن تفسیر القرآن" ہے اور ثعلبی کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں درست فرمایا ہے کہ:

وَالثَّعْلَبِيُّ هُوَ فِيْ نَفسِهِ كَانَ فِيْهِ خَيْرٌ وَ دِيْنٌ وَ كَانَ حَاطِبُ لَيْلٍ يَنقُلُ مَا وَجَدَ مِنْ كُتُبِ التَّفْسِيرِ مِنْ صَحِيْحٍ اَوْ ضَعِيْفٍ اَوْ مَوْضُوْعٍ

"ثعلبی میں بذات خود تو بھلائی اور دینداری موجود تھی لیکن یہ رات کے اندھیرے میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح تھے' تفسیر کی کتابوں میں جو کچھ بھی پاتے اسے نقل کر دیتے تھے خواہ صحیح ہو' یا ضعیف ہو' یا موضوعی ہو۔"

ثعلبی محدث ہونے کے باوجود عجائب و غرائب کے زیادہ شوقین تھے اور اسرائیلی روایات میں اعجوبوں کی بڑی کثرت ہے۔ خازن نے بھی علوم الحدیث سے واقف ہونے کے باوجود ثعلبی کا کردار ادا کیا ہے جو اس کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ بعض مقامات پر تو علامہ خازن نے اسرائیلی خرافات نقل کرنے کے بعد ان کی تردید کی ہے مثلاً سورۃ ص کی آیات ۱۲ تا ۲۵ کی تفسیر میں پہلے اُوریا کی بیوی سے متعلق اسرائیلی قصہ نقل کیا ہے مگر اس کے بعد فَصْلٌ فِيْ تَنْزِيْهِ دَاوٗد عليه السلام عَمَّا لَا يَلِيْقُ بِه کے زیر عنوان اس قصے کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور قاضی عیاض اور امام رازی نے اس روایت پر جو تنقید کی ہے اسے نقل کیا ہے۔(۱)

---

(۱)تفسیر خازن طبع دارالفکر بیروت ۱۹۷۹، ص۴۹۔۵۰ج۶

بعض دوسرے مقامات پر بھی تردید کی ہو گی لیکن اکثر مقامات پر اسرائیلی قصص و حکایات کو بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کر کے خاموشی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور ان بے سروپا قصوں کا تعاقب نہیں کرتے جس کی وجہ سے قارئین بڑی کنفیوژن اور الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خازن نے خطبے میں تو کہا ہے کہ میں نے اختصار کی بہت زیادہ کوشش کی ہے لیکن بعض مقامات پر یہ اپنے اس نہج پر قائم نہیں رہ سکے۔ مثلاً آیات الاحکام کی تفسیر میں فقہی احکام کی تفصیلات و جزئیات بیان کرنے میں بہت زیادہ تطویل و اطناب سے کام لیا ہے جس میں اگرچہ مفید معلومات ہم کو ملتی ہیں لیکن اختصار کا وعدہ تو برقرار نہیں رہ سکا۔ اسی طرح مواعظ اور ترغیب و ترہیب کی مباحث میں بھی ایجاز و اختصار کے منہج کو برقرار نہیں رکھ سکے اور اسی تطویل کی وجہ سے ترغیبی و ترهیبی روایات میں صحاح اور حسان کے ساتھ ضعاف بلکہ موضوعی روایات بھی نقل کر دی گئی ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا مزاج صوفیانہ بھی تھا اور واعظانہ و صوفیانہ مزاج کے لوگ بالعموم صحت سند کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جو بات بھی حاضرین کو متاثر کر سکے اسے بلا تحقیق بیان کر دیتے ہیں۔ بہر حال ان خامیوں کے باوجود تفسیر خازن افادیت رکھتی ہے اور اس میں بڑی اچھی معلومات بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ یہ تفسیر بیروت کے دار الفکر نے ۱۹۷۹ء میں سات اجزاء اور چار جلدوں میں شائع کی ہے جس کے حاشیئے پر معالم التنزیل بھی چھپی ہوئی ہے۔

(۵) البحر المحيط لابي حيان اندلسی متوفی ۷۴۵ھ

ابو حیان کا نام محمد بن یوسف بن علی اندلسی غرناطی ہے لیکن یہ ابو حیان اندلسی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا لقب امام اثیر الدین ہے' اسے النفزی بھی کہا جاتا ہے اور نفزہ بربر قوم کا ایک قبیلہ ہے' یہ اپنے دور کے بہت بڑے نحوی' لغوی' مفسر' محدث' مؤرخ' ادیب اور قاری تھے۔ اندلس کے شہر غرناطہ کے پاس ایک مقام پر شوال ۶۵۴ھ میں پیدا ہوئے تھے

اور یہیں پر ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی تھی اس لئے یہ مولد اور منشاء دونوں کے اعتبار سے غرناطی ہیں' نحو' لغت' قراءت اور دوسرے علوم انہوں نے غرناطہ ہی میں پڑھے تھے۔ ۷۷۵ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے انہوں نے سبتہ' تیونس اور اسکندریہ کا سفر کیا' اسی سال حج کی سعادت حاصل کی اور مکہ کے علماء سے علوم حاصل کئے پھر جدہ' قوص اور بحر قلزم کی بندرگاہ عیذاب میں مختلف اہل علم سے' تلمذ کا شرف حاصل کیا' ۶۸۰ھ میں مصر تشریف لے گئے اور وہاں پر اپنے وقت کے بڑے بڑے شیوخ سے علوم حاصل کئے' مصر کے جامع حاکمی اور جامع اقمر میں عربیت کے استاد مقرر ہوئے' جامع طولونی اور قبہ منصوریہ میں شیخ التفسیر کے فرائض انجام دیئے اور پھر قبہ منصوریہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اندلس' افریقہ' حجاز اور مصر وغیرہ کے ۴۵۰ شیوخ سے احادیث کا سماع کیا تھا' ان کا انتقال صفر ۷۴۵ھ میں قاہرہ میں ہوا تھا اور مقابر الصوفیہ میں دفن ہوئے تھے۔

اہل ظاہر کے مسلک کی جانب میلان رکھتے تھے اور بقول ابن حجر کہا کرتے تھے کہ اہل ظاہر کا مذہب جب ایک مرتبہ کسی کے ذہن میں آجائے تو پھر اس کا ذہن سے نکلنا مشکل ہوتا ہے لیکن آخر میں امام شافعی کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ فلسفے اور اعتزال کی بدعات سے ان کا عقیدہ پاک تھا' قرآن کی تلاوت کے وقت ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور بہت زیادہ روتے تھے' قدو قامت کچھ طویل تھی مگر چہرہ بڑا خوبصورت تھا اور آواز بڑی اچھی تھی' ابوحیان صرف اور نحو میں مجتہد مطلق تھے ساری عمر ان دو علوم کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ ان کے شاگرد ان کی زندگی ہی میں ائمہ اور شیوخ بن گئے تھے' شاگردوں کو امام سیبویہ کی کتاب بالالتزام پڑھایا کرتے تھے' شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے' ایک مرتبہ کسی مسئلے میں ان کے اور ابن تیمیہ کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ انہوں نے جب سیبویہ کا حوالہ دیا تو ابن تیمیہ نے فرمایا کیا سیبویہ نحو کے نبی تھے؟ انہوں نے تو اپنی کتاب میں ۴۰

مقامات پر غلطیاں کی ہیں' اس وقت تو ابو حیان نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنی کتاب "النہر الماد" تلخیص البحر المحیط میں انہوں نے ابن تیمیہ پر تنقید کی ہے۔ ابن مالک اور ابن حاجب کی تصنیفات پڑھنے پر اپنے شاگردوں کو ترغیب دلایا کرتے تھے مگر تفسیر اور حدیث میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔(۱)

ابو حیان نے اپنی تفسیر کا طویل خطبہ لکھا ہے جس میں انہوں نے مسجع و مقفی کلام میں اپنی عربیت اور ادبیت کی مہارت کا زور بھی دکھایا ہے' اپنی تفسیر کے باعث تصنیف' اس کے منہج' اس کے مراجع و مصادر اور اپنے شیوخ کے بارے میں بھی کافی مفید معلومات فراہم کی ہیں' اگر میری اس کتاب کے صفحات میں گنجائش ہوتی تو پورے خطبے کا ترجمہ نقل کر دیا جاتا لیکن صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے اس طویل خطبے کی اہم باتوں کا مفہوم نقل کیا جاتا ہے جس سے اس تفسیر کے بارے میں قارئین کو ضروری معلومات مل جائیں گی۔

۱۔ معارف اور علوم تو بہت زیادہ ہیں اور سارے بڑے اہم ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم علم وہ ہے جو حیات ابدیہ اور سعادت سرمدیہ کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب کا علم جو مقصود بالذات ہے اور باقی علوم آلات کی طرح ہیں۔ میرے ذہن اور فکر میں یہ بات ابتداء سے بیٹھی ہوئی تھی کہ جب میں پختہ عمر کو پہنچ جاؤں گا تو قرآن کی تفسیر لکھوں گا۔ ۷۱۰ھ میں جب مجھے قبہ منصوریہ مصر میں علم تفسیر کا استاد مقرر کیا گیا تو اللہ نے میرے لئے موقع فراہم کر دیا کہ میں اپنی پرانی خواہش پوری کروں اس وقت میری عمر کا ۵۷واں سال شروع ہو چکا تھا' اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اس کتاب کی تصنیف پر متوجہ ہو گیا اور اسی کام میں مصروف ہو گیا۔ دوسرے مصنفین کی تصنیفات سے بھی منتخب فوائد و نکات جمع کرتا رہا اور علم البیان و علم الاعراب کے جو لطائف و دقائق میری اپنی قوت مفکرہ سے

(۱)ذیل تذکرۃ الحفاظ از حافظ شمس الدین حسینی متوفی ۷۶۵ھ ص۲۳تا۲۶۔ طبقات المفسرین از حافظ شمس الدین داوودی متوفی ۹۴۵ھ ص۲۸۷تا۲۹۱ج۲

نکلتے تھے ان کو بھی لکھتا رہا' علم تو کسی زمانے اور کسی زمانے کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اللہ نے علم کو مختلف علاقوں میں پھیلا دیا ہے' ہمارا مغربی اندلسی علاقہ اگرچہ وحی نبوی کے مرکز سے دور ہے لیکن اس کے باوجود اس علاقے میں علوم اسلامیہ بالخصوص علم تفسیر کے بڑے کامل اور ماہر علماء موجود ہیں' جو شخص علم تفسیر کی طرف مائل ہو اور اس میں ترقی کر کے تحقیق کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ امام سیبویہ کی الکتاب کو پڑھنے اور سمجھنے میں مشغول ہو جائے اس لئے کہ اس فن میں یہی کتاب معتمد اور مستند ہے' میں اس فن میں ایسے عالم سے نہیں ملا ہوں جو اندلس کے علماء کے قریب بھی ہو چہ جائیکہ ان کے برابر ہو یا ان سے آگے ہو' میں جب سے تمیز اور شعور کی عمر کو پہنچا ہوں تو اسی علاقے کے علماء کی مجالس میں شرکت کرتا رہا ہوں' انہی کے تلمذ کا شرف حاصل کرتا رہا ہوں اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک اور ایک امام سے دوسرے امام تک دورے کرتا رہا ہوں یہاں تک کہ میں نے مصر کو اپنا مستقر بنا لیا یہیں پر میں نے اپنی تصانیف اور تالیف لکھی ہیں اور ان تصانیف کی برکات میری اس کتاب یعنی تفسیر پر بھی پڑی ہیں جو رب الارباب کے قرب کا ذریعہ ہے اور اللہ کے قرب اور اس کی خوشنودی کے علاوہ اس کی تصنیف سے میرا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔

۲۔ اس کتاب میں میں نے ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ پہلے میں آیت کے مفردات پر کلام کرتا ہوں اور ایک ایک لفظ کی لغوی اور نحوی تشریح کرتا ہوں' اگر ایک لفظ کے دو یا کئی معانی ہوں تو یہ لفظ پہلے مرتبہ جہاں بھی آیا ہو وہاں اس کے معانی کا ذکر کر دیتا ہوں تاکہ ہر مقام پر اس لفظ سے وہ معنی مراد لیا جائے جو اس مقام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو' اس کے بعد آیت کی تفسیر کرتا ہوں جس میں اس کے شان نزول' اس کے نسخ یا عدم نسخ' ما قبل سے اس کے مفہوم کا ربط' قراءات مستعملہ اور شاذہ کا ذکر کرتا ہوں' آیت کے معانی کے بارے میں سلف اور خلف کے اقوال نقل کرتا ہوں اعراب کے غوامض و مشکلات حل کرتا

ہوں اور بیان و بدیع کے دقائق بیان کرتا ہوں' احکام شرعیہ کے بیان میں فقہاء اربعہ کے اقوال نقل کرتا ہوں اور فقہ کی کتابوں کے حوالے دیتا ہوں' پھر کلام کو آیت سے متعلق علم بیان اور علم بدیع کے نکات پر ختم کرتا ہوں اور آیات کے آخر میں بیان کردہ مضامین اور معانی کا خلاصہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہوں' کبھی کبھی لفظ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے صوفیاء کی بات بھی نقل کر دیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے میں نے اکثر اجتناب کیا ہے' باطنیہ کے اقوال کو میں نے چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ یہ لوگ الفاظ کے متبادر لغوی معانی کو نظر انداز کر کے ان کو ان غیر معقول معانی پر محمول کرتے ہیں جن کو انہوں نے اللہ کی جانب' حضرت علی کی جانب اور اس کی اولاد کی جانب منسوب کیا ہے۔ میں نے ان کے رئیس کی ایک تفسیر دیکھی ہے جس میں سلف کے اقوال کو حقارت کے ساتھ رد کر کے آیت کے ایسے معنے بیان کئے گئے ہیں جو کسی عاقل کے ذہن میں گزر ہی نہیں سکتے مگر اس نے اسی کو آیت کی مراد قرار دیا ہے' اسی طرح انہوں نے شان نزول اور فضائل سے متعلق وہ احادیث اور روایات ذکر کی ہیں جو صحیح نہیں ہیں اور ایسے اسرائیلی واقعات نقل کئے ہیں جن کا ذکر علم تفسیر میں مناسب نہیں ہے۔ جو شخص الفاظ و کلمات کے مدلول کو ترکیب سے پہلے اچھی طرح جان لیتا ہے اور پھر ترکیب کے حسن و قبح کی تمیز بھی اسے حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ ان الفاظ سے مرکب کلام اور جملوں کو سمجھنے کے لئے کسی معلم اور استاد کا محتاج نہیں رہے گا۔

۳۔ قرآن میں غور و فکر کے مختلف پہلو ہیں :

☆ ایک علم لغت ہے اور اس موضوع پر ابن سیدہ' ابن فارس' ازہری کی کتابیں اور جوہری کی الصحاح مفید کتابیں ہیں۔ میں نے تو چھوٹی عمر میں عرب کے مشہور شعراء کے دواوین ستہ یاد کر لئے تھے اور بہت سی لغات بھی یاد کر لی تھیں۔

☆ دوسرا عربی کلمات کے افرادی اور ترکیبی احکام کو سمجھنا ہے اور یہ علم نحو کے ذریعے سمجھے جاسکتے ہیں اس موضوع پر سیبویہ کی الکتاب بہترین کتاب ہے میں نے یہ فن

اپنے استاد علامہ ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن زبیر ثقفی سے سیبویہ کی کتاب پڑھ کر حاصل کیا ہے۔

☆ تیسرا الفاظ اور تراکیب کا حسن اور فصاحت معلوم کرنا ہے اور یہ علم البیان اور علم البدیع سے معلوم ہوتا ہے میں نے یہ فن بھی اپنے استاد ابو جعفر بن زبیر سے حاصل کیا ہے۔

☆ چوتھا پہلو ہے قرآن کے مبہمات و مجملات کی تعیین و تبیین اور سبب نزول یا نسخ و عدم نسخ معلوم کرنا' یہ معلومات نقل صحیح اور علم حدیث سے حاصل کی جاسکتی ہیں' حدیث کی کتابوں مثلاً بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' سنن شافعی' سنن دار قطنی' طبرانی کی معجم کبیر اور صغیر' مستخرج ابی نعیم علی مسلم اور دوسری کتابوں سے یہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

☆ پانچواں پہلو ہے خصوص و عموم' اطلاق و تقیید' امر و نہی اور دوسری نصوص کی دلالات کی نوعیت معلوم کرنا' یہ معلومات اصول فقہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں اور اس فن میں جامع کتاب امام رازی کی المحصول ہے میں نے یہ فن جامع مسجد غرناطہ کے امام اور خطیب شیخ ابوالحسن فضل بن ابراہیم غافری سے اور اندلس کے دوسرے ماہرین فن سے حاصل کیا ہے۔

☆ چھٹا پہلو یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کس چیز کی نسبت اللہ کی جانب جائز ہے اور کسی چیز کی نسبت جائز نہیں ہے' کونسی صفات اللہ کے لئے واجب ہیں اور وہ ان سے متصف ہے اور کونسی صفات کی نسبت اس کی جانب مستحیل اور ممتنع ہے' اسی طرح نبوت اور اس سے متعلق امور پر غور کرنا یہ معلومات تو قرآن کی ان آیات سے حاصل کی جاسکتی ہیں جو باری تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے انبیاء سے متعلق ہیں اور یہ علم کلام کا موضوع ہے جو بڑا مشکل فن ہے اس لئے کہ اس میں پھسل جانا دنیا و آخرت دونوں کے خسارے کا سبب بن

سکتا ہے۔ میں نے یہ مسائل شیخ شمس الدین اصبہانی سے سمجھے ہیں۔

☆ ساتواں پہلو قراء ات کا اختلاف معلوم کرنا ہے اور یہ معلومات علم القراءات سے حاصل کی جاسکتی ہیں میں نے قرآن سبعہ قراء ات کے ساتھ جزیرہ اندلس میں غرناطہ کے خطیب ابو جعفر ابن الطباع سے پڑھا ہے اور میں نے اس علم میں ۱۴۰۰ ابیات پر مشتمل ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو شاطبی کے قصیدے کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ یہ وہ سات وجوہ ہیں جن پر عبور حاصل کرنا اور جن پر احاطہ کرنا قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

۴۔ ابوالقاسم محمد بن عمر المشرقی الخوارزمی الزمخشری اور ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ الاندلسی المغربی الغرناطی دونوں علم تفسیر میں تصنیفات کرنے والوں میں سے اعلیٰ ترین اور افضل ترین ہیں' اس فن میں ان کی شہرت سورج سے بھی زیادہ ہے اور مٹی میں دفن ہونے کے باوجود ان کا نام اور کام ہمیشہ کے لئے زندہ ہے' ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو نثر و نظم' معقول و منقول' فنون ادبیہ اور علم معانی و علم اعراب میں سب پر تقدم اور تمکن حاصل تھا اور ان کی تفسیروں کے خطبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اس میدان کے شہسوار تھے لیکن ان کی جلالت شان کے باوجود ان کے کلام میں بھی تنقید کی گنجائش موجود ہے' میں نے ان کی جانب تنقید کی نگاہ موڑ کر ان کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا ہے کہ یہ دونوں علم تفسیر میں اس مقام پر فائز ہیں جس تک دوسرا کوئی بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا' میری اس تنقید کو وہی شخص سمجھ سکے گا جو اہل نظر میں سے ہو اور اس کے ساتھ اس میں عدل و انصاف کی صفت بھی موجود ہو' یہ دونوں مفسرین ہم عصر بھی تھے' زمخشری خوارزم کے شہر زمخشر میں ۲۷ رجب ۴۶۷ھ کو پیدا ہوئے تھے اور خوارزم کے ایک گاؤں "جرجانیہ" میں شب عرفہ ۵۳۸ھ کو فوت ہوئے تھے اور ابن عطیہ غرناطہ میں ۴۸۱ھ کو پیدا ہوئے تھے اور لورقہ میں ۲۵ رمضان ۵۴۱ھ کو فوت ہوئے تھے۔ میں نے اپنی کتاب بحر

زیادہ تر نقول اپنے شیخ جمال الدین محمد بن سلیمان معروف "بابن النقیب" کی کتاب "التحریر و التحبیر لاقوال ائمۃ التفسیر" سے نقل کئے ہیں اس لئے کہ علم تفسیر میں جو کتابیں ہم نے دیکھی ہیں ان میں سب سے بڑی کتاب یہی ہے اس کی جلدوں کی تعداد ۱۰۰ کے قریب ہے لیکن اس میں تکرار اور تطویل بہت زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس کی تہذیب اور تبییض کا موقع نہیں مل سکا تھا اس کے بعد ابو حیان نے قرآن کی قراءت کی وہ سند نقل کی ہے جس میں ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ۱۳ واسطے ہیں اور اسے انہوں نے اپنے طبقے کے دوسرے علماء کی سندوں کے مقابلے میں "سند عالی" قرار دیا ہے۔

۵۔ البحر المحیط کے ۱۲ بڑے صفحات پر پھیلے ہوئے طویل خطبے کی موٹی موٹی باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو میں نے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کا بڑا ماخذ زمخشری اور ابن عطیہ کی تفسیریں ہیں اور اس نے اپنی تفسیر میں زیادہ تر توجہ لغت اور عربیت پر دی ہے اور یہ بھی قرآن کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ابو حیان کی تفسیر میں اسرائیلی روایات و حکایات بہت کم نقل ہوئے ہیں اور جہاں نقل ہوئے ہیں وہاں پر تردید بھی کی گئی ہے۔ ابو حیان نے اپنی تفسیر کا "النہر الماد من البحر" کے نام سے اختصار بھی کیا ہے جو تفسیر کے حاشیے پر چھپا ہوا ہے اور ان کے شاگرد تاج الدین احمد بن عبد القادر متوفی ۷۴۹ھ نے بھی "الدر اللقیط من البحر المحیط" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے لیکن اس کا زیادہ تر تعلق زمخشری اور ابن عطیہ پر تنقید سے ہے اور یہ اختصار بھی حاشیے پر چھپا ہوا ہے۔ البحر المحیط ۱۹۸۳ء میں بیروت سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(٦)غرائب القرآن و رغائب الفرقان للنیسابوری

معروف بتفسیر نیشاپوری

نیشاپوری کا نام حسن بن محمد بن حسین خراسانی نیشاپوری ہے اور لقب نظام الدین ہے' ان کا آبائی وطن تو ایران کا مشہور شہر "قُم" ہے لیکن ان کی پرورش نیشاپور میں ہوئی تھی اس لئے یہ نیشاپوری کے نام سے مشہور ہیں' نیشاپور میں یہ اساطین العلم میں شمار ہوتے تھے' علوم عقلیہ' لغت عربیہ اور علم التاویل والتفسیر میں بہت زیادہ رسوخ رکھتے تھے' ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں کوئی تصریح تو نہیں مل سکی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ نویں صدی ہجری کے اواخر میں گزرے ہیں' ان کی تفسیر کا نام تو "غرائب القرآن و رغائب الفرقان" ہے مگر تفسیر نیشاپوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس تفسیر کا بڑا ماخذ امام رازی کی تفسیر کبیر ہے بلکہ اس کو اگر تفسیر کبیر کی تلخیص کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ تفسیر کبیر کے علاوہ انہوں نے کشاف اور دوسری تفاسیر سے بھی اخذ کیا ہے اور ان کے اپنے فہم میں جو باتیں آئی ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ مصنف نے اپنی تفسیر کی نوعیت مقدمے میں اس طرح بیان کی ہے کہ :

"امام رازی کی تفسیر کبیر اسم با معنی ہے اس میں بے شمار بحوث موجود ہیں جن کو سمیٹنا اور سمجھنا طالب علموں کے لئے مشکل ہوتا ہے میں نے اپنی تفسیر میں ان کا حاصل مفہوم ذکر کیا ہے اور ساتھ کشاف اور دوسری تفاسیر سے نقل کردہ فوائد و لطائف کو بھی ملا دیا ہے اور میرے اپنے ذہن میں جو باتیں آئی ہیں ان کو بھی شامل کر دیا ہے۔"

اور تفسیر کے اختتام پر یعنی جلد سادس کے آخر میں مصنف نے اپنی تفسیر کے بارے میں مزید معلومات دی ہیں :

"میری یہ کتاب تفسیر کبیر کے حاصل مفہوم پر مشتمل ہے' اس میں تفسیر کشاف سے

اہم مضامین بھی شامل ہیں اور وہ نکات وفوائد بھی اس میں مذکور ہیں جو دوسری تفاسیر میں نہیں ملتے یا وہ منتشر ومتفرق اوراق میں پڑے ہوئے ہیں۔

☆ میری اس کتاب میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں وہ یا تو احادیث کی مشہور کتابوں سے ماخوذ ہیں جیسے جامع الاصول اور مصابیح وغیرہ اور یا پھر تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف سے لی گئی ہیں مگر کشاف میں سورتوں کی فضیلت میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کو میں نے حذف کر دیا ہے اس لئے کہ ان میں سے اکثر ضعیف ہیں۔

☆ وقوف امام سجاوندی سے ماخوذ ہیں۔

☆ اسباب نزول کی روایات جامع الاصول سے اور دونوں تفسیروں سے یا تفسیر واحدی سے ماخوذ ہیں۔

☆ لغت سے متعلق مباحث جوہری کی صحاح اور دونوں تفسیروں یعنی کبیر اور کشاف سے ماخوذ ہیں۔

☆ معانی وبیان سے متعلق مباحث اور دوسرے ادبی مسائل دونوں تفسیروں' سکاکی کی مفتاح العلوم اور عربیت سے متعلق دوسری کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

☆ اور فقہی وشرعی احکام دونوں تفسیروں اور فقہ کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں بالخصوص امام رافعی کی شرح الوجیز سے۔ میں نے اس تفسیر میں سوائے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے کسی اور مسلک کی جانب میلان نہیں کیا' انہی کے اصول اور انہی کے دلائل بیان کئے ہیں اور ان پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ اس تفسیر کو مکمل کرنے میں اگر میں چاہتا تو اتنی مدت بھی لگا سکتا تھا جو خلفاء راشدین کی مدت خلافت ہے یعنی ۳۰ سال لیکن میں نے اللہ کی توفیق سے اس کو اتنی مدت میں مکمل کیا ہے جتنی مدت حضرت علی کی خلافت کی تھی یعنی ۵ سال اور اگر درمیان میں طویل سفر پیش نہ آتے اور ہموم وغموم کا حملہ نہ ہوتا تو میں اسے اتنی مدت میں بھی مکمل کر سکتا تھا جتنی مدت ابوبکر صدیق کی خلافت کی ہے

یعنی ۲ سال ۳ ماہ ۱۰ دن۔ بعض لوگوں نے اس تفسیر کے مصنف یعنی نظام الدین نیشاپوری پر شیعیت کا الزام لگایا ہے لیکن کتاب کے آخر میں اس نے خود ہی تصریح کر دی ہے کہ میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کا پابند ہوں اور ہم نے اس کی تفسیر میں تشیع کی کوئی بات دیکھی بھی نہیں ہے۔ علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر کے آغاز میں طویل مقدمہ لکھا ہے جو گیارہ مقدمات پر مشتمل ہے اور ان میں شائقین علوم القرآن کو بڑی مفید معلومات مل سکتی ہیں اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں ان سب مقدمات کا ترجمہ پیش کر دیتا اس لئے کہ مجھے یہ بہت پسند آئے ہیں۔ نیشاپوری کی یہ تفسیر دار الکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۹۶ء میں ۶ جلدوں میں احادیث کی تخریج کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس سے پہلے یہ تفسیر ابن جریر کے حاشیے پر چھپی ہوئی تھی۔

(۷) اللباب فی علوم الکتاب لابن عادل دمشقی متوفی بعد ۸۸۰ھ

ابن عادل کا نام عمر بن علی ہے لقب سراج الدین ہے اور کنیہ ابو حفص ہے لیکن ابن عادل دمشقی، حنبلی، نعمانی کے نام سے مشہور ہے۔ دمشق تو شام کا مشہور شہر ہے اور اس کی نسبت کی وجہ سے اسے دمشقی کہا جاتا ہے، حنبلی امام احمد بن حنبل کی طرف نسبت ہے اس لئے کہ فقہی مسائل میں یہ ان کے متبع تھے، اور نعمانی نسبت ہے نعمانیہ کی جانب جو بغداد اور واسط کے درمیان ایک شہر ہے۔ شاید ابن عادل نے اس شہر کو وطن ثانی بنا لیا ہو گا۔ تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہے مگر یہ بات تقریباً اتفاقی ہے کہ ان کی وفات ۸۸۰ھ کے بعد ہوئی تھی اور ۸۸۰ھ میں یہ زندہ تھے، ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے بارے میں بھی معلومات نہیں مل سکی ہیں لیکن میں نے اس تفسیر کے مختلف مقامات کا جب مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بڑی مفید معلومات پر مشتمل تفسیر ہے۔ اس میں لغت اور لغوی معانی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دلائل کے طور پر عربی کے اشعار پیش کئے گئے ہیں اور فقہی و شرعی احکام کے بارے میں

فقہاء کے اقوال ان کے دلائل اور احکام کی جزئیات تک بیان کی گئی ہیں جو فقہ کی طویل کتابوں سے قاری کو مستغنی کر دیتی ہیں اور کئی نئے نکات اور فوائد بھی سامنے آجاتے ہیں مثلاً سورہ فاتحہ کی تفسیر سے اعوذباللہ اور بسم اللہ کی لغوی اور فقہی تحقیق پورے ۸۱ بڑے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور بڑی علمی معلومات پر مشتمل ہے۔ اس بحث کو جب میں نے توجہ سے پڑھا تو میری رائے یہ بنی کہ اگرچہ ابن عادل دمشقی کے حالات پردہ اخفاء میں ہیں لیکن یہ جامع العلوم عالم تھے اور اس کی تفسیر دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے' اس تفسیر کا بڑا ماخذ بھی امام رازی کی تفسیر کبیر ہے تقریباً ہر بحث کا اختتام امام رازی کے اقتباس پر کیا گیا ہے مگر ان کا ذکر ابن الخطیب کے نام سے کرتے ہیں۔ فقہی مسائل میں اگرچہ حنبلی ہیں مگر تعصب سے پاک ہیں۔ سارے ائمہ کا ذکر احترام کی ساتھ کرتے ہیں اور سب کے دلائل کا خلاصہ بھی اکثر مقامات پر ذکر کرتے ہیں۔ مصنف نے کوئی تفصیلی مقدمہ نہیں لکھا بلکہ خطبہ مسنونہ کے بعد صرف اتنا لکھا ہے کہ :

"یہ ایک کتاب ہے جس میں میں نے علوم القرآن کے علماء کے اقوال جمع کر دیئے ہیں جس کا نام ہے اللباب فی علوم الکتاب۔"

یہ تفسیر دار الکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۹۸ء میں ۲۰ جلدوں میں بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ بہترین کاغذ پر شائع کی ہے اور تین ماہر فضلاء سے اس کی تحقیق کروائی ہے اور تفصیلی تعلیق لکھوائی ہے جس میں اعلام و رجال کے بارے میں اور احادیث و اقوال کی تخریج کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات دی گئی ہیں۔

(۸) جلالین لجلال الدین المحلی متوفی ۸۶۴ھ

ولجلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ

جلالین ایک ہی تفسیر ہے مگر اس کے مصنف دو ہیں اور دونوں کا لقب جلال الدین تھا اس لئے ان کی تفسیر جلالین کے نام سے از خود مشہور ہو گئی ہے ورنہ تصنیف کرنے والوں نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا تھا ایک کو جلال الدین سیوطی کہا جاتا ہے جس کے حالات تفسیر الدر المنثور کے تعارف میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور دوسرے کو جلال الدین محلی کہا جاتا ہے جس کے مختصر حالات یہ ہیں :

جلال الدین محلی "المحلۃ الکبریٰ" کی طرف منسوب ہیں جو مصر کے ایک شہر کا نام ہے' مصر میں ۷۹۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور یکم محرم ۸۶۴ھ کو مصر ہی میں فوت ہوئے تھے۔ فقہ' اصول' نحو' کلام اور منطق وغیرہ فنون میں براعت اور مہارت حاصل کی تھی فہم وذکاء اور اور فطانت وذہانت میں اللہ کی قدرت کا نشان تھے۔ تقویٰ' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور حکام وامراء کے سامنے کلمہ حق کہنے میں سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ قضاء اکبر کا منصب ان کی سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا تھا البتہ "مدرسہ مؤیدیہ" میں فقہ کی تدریس کا منصب قبول کر لیا تھا مگر اپنی روزی تجارت کے ذریعے کماتے تھے۔ جلال الدین محلی نے سورہ کہف سے قرآن کے آخر تک کی تفسیر لکھی تھی اور اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تفسیر بھی انہوں نے ہی لکھی تھی۔(۱)

اور جلال الدین سیوطی نے سورہ بقرہ سے سورہ بنی اسرائیل کے آخر تک کی تفسیر تکملہ کے طور پر محلی ہی کے طرز پر لکھی ہے جیسا کہ انہوں نے سورہ بقرہ کی تفسیر کے آغاز میں لکھا ہے :

(۱) طبقات المفسرین از داوودی ص۸٤ ج۲

اَمَّا بَعْدُ فَهٰذَا مَا اشْتَدَّتْ اِلَيْهِ حَاجَةُ الرَّاغِبِيْنَ فِيْ تَكْمِلَةِ تَفْسِيْرِ الْقُرْآنِ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ اَلَّفَهُ الْاِمَامُ الْعَلَّامَةُ الْمُحَقِّقُ الْمُدَقِّقُ جَلَالُ الدِّيْنِ مُحَمَّدُ بْنُ اَحْمَدَ الْمَحَلِّيُّ الشَّافِعِيُّ وَ تَتْمِيْمِ مَا فَاتَه' وَ هُوَ مِنْ اَوَّلِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ اِلٰى آخِرِ سُوْرَةِ الْاِسْرَاءِ بِتَتِمَّةٍ عَلٰى نَمَطِهٖ مِنْ ذِكْرِ مَا يُفْهَمُ بِهٖ كَلَامُ اللّٰهِ وَالْاِعْتِمَادِ عَلٰى اَرْجَحِ الْاَقْوَالِ وَ اِعْرَابِ مَا يُحْتَاجُ اِلَيْهِ وَ تَنْبِيْهٍ عَلَى الْقِرَاءَاتِ الْمَشْهُوْرَةِ عَلٰى وَجْهٍ لَطِيْفٍ وَ تَعْبِيْرٍ وَجِيْزٍ وَ تَرْكِ التَّطْوِيْلِ بِذِكْرِ اَقْوَالٍ غَيْرِ مَرْضِيَّةٍ وَ اَعَارِيْبَ مَحَالُّهَا كُتُبُ الْعَرَبِيَّةِ وَاللّٰهَ اَسْاَلُ النَّفْعَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ عَلَيْهِ فِي الْعُقْبٰى بِمَنِّهٖ وَ كَرَمِهٖ.

”حمد و ثنا کے بعد کہتا ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی ان لوگوں کو شدید حاجت تھی جو امام ٗعلامہ ٗمحقق اور مدقق جلال الدین محلی شافعی کی تفسیر کو مکمل کرنے اور جو حصہ ان سے رہ گیا تھا اس کو پورا کرنے کی رغبت اور خواہش رکھتے تھے اور جو حصہ ان سے رہ گیا تھا وہ سورہ بقرہ کے آغاز سے سورہ اسراء کے آخر تک ہے ٗان کی خواہش یہ بھی تھی کہ تکملہ او تتمہ جلال الدین محلی ہی کے طرز پر لکھا جائے اور وہ اس طرح کہ انہی باتوں کا ذکر کیا جائے جو کلام اللہ کے فہم کے لئے ضروری ہوں۔ اقوال میں سے راجح قول پر اعتماد کیا جائے ٗاعراب کا ذکر بقدر حاجت کیا جائے ٗ واضح اور قطعی یعنی متواتر قراءات پر لطیف انداز میں اور مختصر تعبیر کی ساتھ تنبیہ کی جائے اور ناپسندیدہ یعنی مرجوح اقوال کے ذکر نے اور اعراب کی تفصیلات بیان کرنے کے ذریعے بات کو طول نہ دیا جائے جن کی جگہ عربیت کی کتابیں ہیں۔ میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعے دنیا میں لوگوں کو نفع پہنچائے اور اس پر آخرت میں اپنے احسان اور کرم کے وسیلے سے اچھا بدلہ عطا فرمائے۔“

سیوطی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انہوں نے تکملے میں وہی طرز اختیار کیا ہے جو جلال الدین محلی کا طرز ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو اختصار سے کام لیا جائے۔ مرجوح

اقوال اور اعراب ولغت کی تفصیلات کو چھوڑ دیا جائے' آیت اور کلمات کے معانی ومفاہیم مختصر ترین الفاظ میں بیان کئے جائیں اور قراءات کا ذکر بھی لطیف اور وجیز الفاظ میں کیا جائے' یہ اس تفسیر کا منہج ہے جو سیوطی نے اپنے الفاظ بتادیا ہے۔ سیوطی نے اس جگہ تو یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے تفسیر لکھتے وقت کونسی تفاسیر کو پیش نظر رکھا تھا لیکن اپنی کتاب "بُغْيَةُ الْوُعَاتِ فِي تَرَاجِمِ اللُّغَوِيِّيْنَ وَالنُّحَاةِ" میں احمد بن یوسف الکواشی الموصلی التوفی ۸۶۰ھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَلَهُ التَّفْسِيْرُ الْكَبِيْرُ وَالصَّغِيْرُ جَوَّدَ فِيْهِ الْاِعْرَابَ وَ حَرَّرَ اَنْوَاعَ الْوُقُوْفِ وَ اَرْسَلَ مِنْهُ نُسْخَةً اِلَى مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ وَالْقُدْسِ قُلْتُ وَ عَلَيْهِ اِعْتَمَدَ الشَّيْخُ جَلَالُ الدِّيْنِ الْمَحَلِّيُّ فِي تَفْسِيْرِهِ وَاعْتَمَدْتُ عَلَيْهِ فِيْ تَكْمِلَتِهِ مَعَ الْوَجِيْزِ وَ تَفْسِيْرِ الْبَيْضَاوِيْ وَابْنِ كَثِيْرٍ.

"علامہ کواشی متوفی ۸۶۰ھ کی ایک بڑی تفسیر ہے اور ایک چھوٹی تفسیر ہے جس میں انہوں نے اعراب اور وقوف کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے۔ انہوں نے اس کا ایک ایک نسخہ مکہ' مدینہ اور القدس (بیت المقدس) کو بھیجا تھا۔ میں کہتا ہوں یعنی جلال الدین سیوطی کہتے ہیں کہ شیخ جلال الدین محلی نے اپنی تفسیر میں اسی تفسیر پر اعتماد کیا ہے اور میں نے بھی اس کے تکملے میں کواشی کی تفسیر پر اعتماد کیا ہے اور اس کے ساتھ شیخ ابو الحسن واحدی متوفی ۴۶۸ھ کی تفسیر الوجیز' قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ کی تفسیر بیضاوی اور حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ کی تفسیر ابن کثیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔"

سیوطی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جلالین کا اصل ماخذ تو علامہ کواشی کی تفسیر ہے البتہ سیوطی نے واحدی کی الوجیز' بیضاوی اور ابن کثیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔

خاتمہ تفسیر السیوطیؒ

علامہ سیوطی نے تکملے کے آخر میں یعنی سورۃ الاسراء کے آخر میں اپنی تفسیر کا اختتامیہ لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

"یہ اس تکملے کا آخر ہے جس سے میں نے شیخ جلال الدین محلی کی تالیف کردہ تفسیر کو مکمل کیا ہے۔ میں نے اس کے دقیق اور قیمتی نکات کو ظاہر کرنے میں اپنی پوری کوشش اور اپنی فکر کی ساری قوت صرف کر دی ہے جو انشاء اللہ مفید ثابت ہوں گے۔ میں نے اس تکملے کی تالیف کو اس مدت میں مکمل کیا ہے جو موسیٰ کلیم اللہ کے لئے اللہ نے مقرر کی تھی یعنی ۴۰ روز میں، اور میں نے اس کو اپنے لئے جنات النعیم حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ یہ تکملہ حقیقت میں اسی کتاب سے مستفاد اور اخذ کردہ ہے جس کو اس کے ذریعے مکمل کیا گیا ہے (اس لئے کہ اس طرز کی بنیاد اسی نے رکھی تھی) اور آیات متشابہہ میں میرا اعتماد اسی کتاب پر رہا ہے، اللہ ہر اس شخص پر رحم کرے جو اس پر انصاف کی نگاہ ڈالے اور جب کسی غلطی پر واقف ہو جائے تو مجھے اطلاع دیدے۔ میں نے اس بارے میں یہ دو شعر کہے ہیں۔

حَمِدْتُ اللّٰهَ اِذْ هَدَانِيْ　　اَبْدَيْتُ مَعَ عِجْزِيْ وَ ضعفِي

فَمَنْ لِيْ بِالْخَطَا فَارْدُ عَنْهُ　　وَ مَنْ لِيْ بِالْقُبُوْلِ وَ لَوْ بِحَرْفٍ

"میں اللہ کی حمد و ثنا کہتا ہوں جو میرا رب ہے اور جس نے مجھے توفیق دی ہے اس کتاب کی جسے میں نے ظاہر کیا ہے یعنی تصنیف کیا ہے باوجود اس کے کہ میں عاجز اور ضعیف ہوں۔"

پس کون ہے جو مجھے میری غلطیاں بتادے تاکہ میں ان کی اصلاح کر سکوں ؟ اور کون ہے جو میری اصلاح قبول کر لے اگرچہ ایک حرف کی اصلاح ہو ؟"

اور میرے دل میں یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ میں اس کام یعنی تفسیر لکھنے کی طرف توجہ دوں گا اس لئے کہ مجھے علم تھا کہ میں ان راستوں میں داخل ہونے سے عاجز ہوں لیکن

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے لوگوں کو بہت زیادہ نفع پہنچادے' اس کے ذریعے ان دلوں کو کھول دے جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں' ان آنکھوں کو کھول دے جو اندھی ہیں اور ان کانوں کو کھول دے جو بہرے ہیں' اور شاید وہ لوگ جو مطولات (بڑی کتابیں) پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں وہ اس تکملے اور اس کے اصل سے قطعی طور پر روگردانی کر لیں گے' اور کھلے عناد کی طرف مائل ہو کر اس کے باریک فوائد کو سمجھنے کی طرف توجہ ہی نہیں دیں گے مگر جو اس مختصر کتاب سے اندھا ہو گا وہ دوسری کتابوں (مطولات) سے بھی اندھا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کے ذریعے حق کا راستہ معلوم کرنے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے دقیق کلمات کی تحقیق پر مطلع کرے اور ہم کو ان لوگوں میں شامل کرے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے جو انبیاء ہیں' صدیقین ہیں' شہداء ہیں اور صالحین ہیں اور یہ سب کے سب اچھے رفیق ہیں۔ اس تکملے کے لکھنے سے میں اتوار ۱۰ شوال ۸۷۰ھ کو فارغ ہوا ہوں اور اس کا آغاز بدھ یکم رمضان ۸۷۰ھ کو ہوا تھا اور اس کی تبییض بدھ ۶ صفر ۸۷۱ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ اللہ ہی صحیح باتوں کو جانتا ہے اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔"

سیوطی کی اپنی بیان کردہ تاریخوں سے معلوم ہوا کہ تکملے کی تسوید انہوں نے ۲۱ سال کی عمر میں کی تھی اور اس کی تبییض اس وقت کی تھی کہ بائیسویں سال میں داخل ہو گئے تھے کیونکہ سیوطی کی پیدائش ۸۴۹ھ میں ہوئی تھی اور جلال الدین محلی کی وفات کے ۶ سال بعد اس کی تفسیر کا تکملہ مکمل ہو گیا تھا اس لئے کہ محلی کی وفات ۸۶۴ھ میں ہوئی تھی۔ تفسیر جلالین کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقبولیت دی ہے جو شاذ و نادر ہی کسی اور تفسیر کو ملی ہو گی۔ عجم اور عرب دونوں کے اکثر مدارس دینیہ میں یہ تفسیر نصاب میں شامل ہے اور اس کی تدریس اونچے درجے کے استاد کے حوالے کی جاتی ہے اس کی مقبولیت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس کے دقائق اور لطائف کی تشریح کے لئے بہت زیادہ حواشی اور شروح لکھے گئے ہیں۔ بیروت کے ایک عالم قاضی شیخ محمد احمد کنعان نے ۱۴۰۲ھ میں "قرة العين على تفسير الجلالين" کے

نام سے جلالین پر ایک حاشیہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے حاشیئے کے علاوہ ۷ اور دوسرے حواشی کا ذکر کیا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن علقمی متوفی ۹۶۹ھ کا حاشیہ "قبس النیرین علی تفسیر الجلالین"۔

۲۔ شیخ محمد بن محمد کرخی متوفی ۱۰۰۶ھ کا حاشیہ "مجمع البحرین و مطلع البدرین علی الجلالین" ۴ جلدوں میں۔

۳۔ شیخ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۰ھ کا حاشیہ "جمالین علی الجلالین"۔

۴۔ شیخ سلیمان بن عمر عجیلی ازہری معروف "جمل" متوفی ۱۲۰۴ھ کا حاشیہ "الفتوحات الالٰهیه بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیة" چار جلدوں میں طبع شدہ ہے۔

۵۔ شیخ جمل کے شاگرد احمد بن محمد صاوی متوفی ۱۲۴۱ھ کا حاشیہ "الصاوی علی الجلالین" صاء مصر کے شہر کا نام ہے اس کی نسبت سے مصنف اور اس کے حاشیئے دونوں کو صاوی کہا جاتا ہے۔ جمل اور صاوی کے حاشیئے اساتذہ و طلبہ میں بہت زیادہ متداول ہیں۔

۶۔ شیخ سلام اللہ دہلوی کا حاشیہ "الکمالین علی الجلالین" یہ ۱۲۸۱ھ میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔

۷۔ شیخ محمد بن صالح السباعی مصری متوفی ۱۲۶۸ھ کا حاشیہ تین جلدوں میں مخطوطہ ہے۔

۸۔ شیخ سعد اللہ بن غلام قندھاری کا حاشیہ "کشف المحجوبین علی تفسیر الجلالین"۔

۹۔ شیخ مصطفیٰ الدومی کا حاشیہ "ضوء النیرین لفہم تفسیر الجلالین"۔

۱۰۔ شیخ علی بن محمد العقیبی یمنی متوفی ۱۱۰۱ھ کا حاشیہ۔

۱۱۔ شیخ اسماعیل بن عبدالباقی متوفی ۱۱۲۱ھ کی شرح علی الجلالین۔

۱۲۔ شیخ عطیۃ اللہ البرہانی الاجہوری متوفی ۱۱۹۰ھ کا حاشیہ "کتاب الکوکبین النیرین فی حل الفاظ الجلالین"۔

۱۳۔ شیخ عبدالرحمٰن بن محمد النطوانی متوفی ۱۲۳۷ھ کا حاشیہ۔

۱۴۔ شیخ عبداللہ بن محمد الشبراوی متوفی ۱۲۷۵ھ کا حاشیہ "قرۃ العین ونزھۃ الفواد" ۴ جلدوں میں۔

۱۵۔ شیخ احمد بن عبدالکریم الترمانینی متوفی ۱۲۹۳ھ کا حاشیہ۔

۱۶۔ شیخ محمد بن عبداللہ حسینی متوفی ۱۳۱۱ھ کا حاشیہ۔

۱۷۔ شیخ عبدالرحمٰن بن محمد القصری متوفی ۱۰۳۶ھ کا حاشیہ۔

۱۸۔ شیخ محمد احمد کنعان کا حاشیہ "قرۃ العینین علی تفسیر الجلالین" یہ حاشیہ ۱۴۰۲ میں لکھا گیا ہے۔

کثرۃ حواشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جلالین میں بہت زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اس لئے اس کے کلمات اور جملوں کو تشریح کے بغیر سمجھنا مشکل ہوتا ہے اور اسی تعقید اور ابہام واجمال کے ازالے کے لئے مختلف علماء نے اس پر حواشی لکھے ہیں۔ اگرچہ جلالین کے دونوں جلالوں نے اقوال راجحہ پر اکتفا کرنے اور اقوال مرجوحہ کو حذف کرنے کا منہج اپنایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں اپنے منہج پر قائم نہیں رہ سکے اور متعدد مقامات پر مرجوح اور ضعیف اقوال بھی نقل کئے ہیں اور اسرائیلی روایات بھی بغیر تردید و تنقید کے نقل کی ہیں مگر تعجب ہے کہ جلالین کے متداول حواشی یعنی جمل اور صاوی نے بھی نہ صرف یہ کہ ان کی تردید نہیں کی بلکہ ان کی تشریح میں مزید اسرائیلیات نقل کر دی ہیں لیکن دوسرے محققین نے اقوال مرجوحہ اور اسرائیلیات کی تردید کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ فجزاھم اللہ خیرا۔ اگر دونوں جلالوں نے اپنے منہج کا التزام کرتے ہوئے اقوال راجحہ کے ذکر پر اکتفا کیا ہوتا تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

(۹) ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم

معروف بتفسیر ابی السعود لابی السعود متوفی ۹۸۲ھ

ابوالسعود کا نام محمد بن مصطفیٰ العمادی ہے۔ یہ ۸۹۳ھ میں قسطنطنیہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے' ان کی پیدائش اس گھرانے میں ہوئی تھی جو علم و فضل میں مشہور تھا اور ان کی تربیت بھی ابتداہی سے دینی اور علمی ماحول میں ہوئی تھی' اکثر کتابیں تو انہوں نے اپنے والد سے پڑھی تھیں لیکن اپنے دور کے علماء کبار سے تلمذ کا شرف بھی ان کو حاصل رہا ہے اور ان سے بھی علوم کثیرہ حاصل کئے تھے۔ انہوں نے ترکی کے بہت سے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیئے تھے پھر "بروسہ" کے قاضی بنا دیئے گئے اور کچھ مدت کے بعد ان کی تبدیلی قسطنطنیہ کے محکمہ قضاء میں ہو گئی۔ مختلف علاقوں میں قضاء کے فرائض انجام دینے کے بعد ان کو افتاء کے منصب پر مقرر کر دیا گیا اور ۳۰ سال تک انہوں نے افتاء کا اہم ترین اور نازک ترین دینی فریضہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس سلسلے میں ان کے علم و فضل اور تجربے کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی منظوم سوال بھیجتا تو اس کا جواب بھی نظم میں دیتے۔ اگر عربی میں سوال آتا تو جواب بھی عربی میں دیتے اور اگر سوال ترکی زبان میں ہوتا تو جواب بھی ترکی میں دیتے' جمادی الاولی ۹۸۲ھ میں ان کا انتقال قسطنطنیہ میں ہوا تھا اور ابوایوب انصاری کے جوار میں دفن ہوئے تھے۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ لکھتے ہیں:

"ابوالسعود بن محی الدین محمد العمادی شیخ کبیر اور عالم نحریر تھے یعنی استاد کبیر اور زیرک و دانشمند عالم تھے۔ عجم میں اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کی نظیر نہیں تھی اس کے زمانے میں حنفیہ کی ریاست اس کے پاس تھی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی بڑے جلال اور علو

شان کی ساتھ گزاری تھی۔ بعض مسائل میں اجتہاد کرتے تھے اور بعض دلائل کو بعض پر ترجیح دیتے تھے' اصول و فروع دونوں میں اس کو کامل علمی قوۃ اور فضیلت حاصل تھی' انہوں نے "فنون ادبیہ" اپنے والد سے حاصل کیے تھے اور والد کی زندگی ہی میں براعت و مہارت اور کمال تک پہنچ گئے تھے سلطان سلیم خان نے بروسا اور قسطنطینیہ وغیرہ کے مدارس ان کی تحویل دیدیئے تھے۔ بروسا قسطنطینیہ اور ولایت "روم ایلی" کے منصب قضاء پر بھی فائز رہے ہیں اور اس کے بعد قسطنطینیہ میں ۳۰ سال سے زائد مدت تک منصب افتاء کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے ہیں۔ قسطنطینیہ ہی میں انہوں نے تفسیر لکھی تھی جس کا نام ہے "ارشاد العقل السلیم الی مزایاالکتاب الکریم" یہ تفسیر جب انہوں نے اپنے شاگرد اور داماد سید محمد نقیب کے ہاتھ پر سلطان سلیمان خان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی تو انہوں نے محبت کے ساتھ قبول کی اور قسطنطینیہ میں منصب افتاء کے ساتھ قضا کا منصب بھی ان کے حوالے کر دیا۔ سلطان سلیمان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سلطان سلیم خان بھی ان کا بڑا اکرام و اعزاز کرتے تھے اور موت تک انہوں نے بڑے محترم اور معزز شخصیت کی طرح زندگی گزاری ہے یہاں تک کہ ۹۸۲ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے یہ بڑی اچھی تفسیر ہے نہ اتنی طویل ہے کہ پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہو اور نہ اتنی مختصر ہے کہ فہم قرآن میں خلل ڈالتی ہو' یہ تفسیر بہترین لطائف و نکات اور فوائد و اشارات پر مشتمل ہے۔"(۱)

قاضی ابو السعود کی تفسیر کا بڑا ماخذ تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی ہے جیسا کہ انہوں نے تفسیر کے مقدمے میں خود لکھا ہے کہ :

"گذشتہ ایام میں جب میں تفسیر کشاف اور بیضاوی کی انوار التنزیل کا مطالعہ کرتا تھا تو میرے دل میں رات دن یہ خیال گزرتا تھا کہ مجھے ان کے فوائد کے موتیوں کو ایک باریک

(۱) الفوائد البهيه فی تراجم ائمة الحنفيه طبع نور محمد کراچی ص ۸۱۔۸۲

لڑی میں پرو دینا چاہئے اور ان کے چمکتے ہوئے نکات کو خوبصورت ترتیب کے ساتھ مرتب کر دینا چاہئے اور اس کے ساتھ دوسری کتابوں کے حقائق اور دقائق کے جواہر کا اضافہ بھی کر دینا چاہئے۔ میرا ارادہ یہ بھی تھا کہ جب بھی میں ایسی کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا نام رکھوں گا۔ "ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم"۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ابو السعود کا اعتماد کشاف اور بیضاوی پر رہا ہے مگر اس نے زمخشری کے اعتزال کی تائید نہیں کی بلکہ اہل سنت والجماعت کے مسلک پر قائم رہے ہیں۔ اسرائیلی روایات تو اس میں بہت کم نقل ہوئی ہیں لیکن سورتوں کی فضیلت میں کشاف میں جو ضعیف اسرائیلی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے ایک ایک حدیث کو ابو السعود نے بھی نقل کیا ہے۔

(۱۰) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی للآلوسی بغدادی متوفی ۱۲۷۰ھ

آلوسی کا نام سید محمود آلوسی بغدادی ہے "آلوس" نہر فرات میں شام اور بغداد کے درمیان ایک جزیرے کا نام ہے ان کے آباء واجداد اس جزیرے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اس کو آلوسی کہا جاتا ہے اور چونکہ یہ بغداد کے مفتی رہے ہیں اس لئے یہ علامہ آلوسی بغدادی کے نام سے مشہور ہیں' ان کی ولادت ۱۲۱۷ھ میں بغداد کے علاقے کرخ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے منقول و معقول' اصول و فروع اور تفسیر و حدیث کے علوم اپنے والد سے اور دوسرے ممتاز علماء سے حاصل کیے تھے' انہوں نے ۱۳ سال کی عمر میں تدریس و تصنیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ مختلف مدارس میں انہوں نے تدریس کے فرائض انجام دیے تھے اور جب حنفیہ کے مفتی مقرر کیے گئے تو پھر اپنے گھر پر تمام علوم کا درس دیا کرتے تھے' مختلف

علاقوں کے لوگ آکر ان سے فیض حاصل کرتے تھے طلبہ کے کھانے' لباس اور رہائش کا انتظام خود کرتے تھے اور اپنے مکان کے بہترین کمروں میں طلبہ کو ٹھہراتے تھے یہاں تک کہ "شیخ العلماء فی العراق" کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اور علم و فضل کی ریاست و سیادت کے اس مقام پر فائز ہو گئے تھے جس میں اس کا مد مقابل کوئی نہیں تھا اور نہ ان کی سیادت و قیادت سے کوئی انکار کرتا تھا' ۱۲۴۸ھ میں ۳۱ سال کی عمر میں حنفیہ کے مفتی مقرر ہوئے تھے اور اس سے چند ماہ پہلے مدرسہ مرجانیہ کے اوقاف کے متولی مقرر ہوئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ واقف کی شرط یہ تھی کہ شہر کا بڑا عالم متولی ہو گا اور وزیر علی رضا پاشا نے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ اس وقت شہر کا بڑا عالم آلوسی ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں ۱۵ سال افتاء کا کام کرنے کے بعد اس منصب سے الگ ہو گئے اور تفسیر کی تکمیل میں مشغول ہو گئے۔ مکمل ہونے پر ۱۲۶۷ھ میں خلافت عثمانی کے دارالخلافہ قسطنطنیہ تشریف لے گئے اور تفسیر سلطان عبدالمجید خان کی خدمت میں پیش کی اور انہوں نے اس تفسیر کو بے حد پسند کیا اور ۱۲۶۹ھ میں واپس بغداد تشریف لے آئے اور ۲۵ ذوالقعدہ ۱۲۷۰ھ کو جمعہ کے دن بغداد میں فوت ہو گئے اور شیخ معروف کرخی کے مقبرے میں دفن کر دیئے گئے۔(۱)

تفسیر روح المعانی کی تصنیف کا قصہ مصنف نے مقدمے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"میں چھوٹی عمر ہی میں قرآن کے پوشیدہ اسرار سے پردہ اٹھانے کا بہت زیادہ شوق رکھتا تھا۔ اسی شوق کو پورا کرنے میں میں نے اپنی نیندیں قربان کر رکھی تھیں اور اسی میں میں نے اپنے قیمتی اوقات صرف کئے تھے یہاں تک کہ اللہ نے مجھے قرآن کے بہت سے حقائق پر واقف ہونے کی توفیق عطا فرمادی' میری عمر ابھی ۲۰ سال کو نہیں پہنچی تھی کہ میں نے قرآن کے ظاہری نظم پر وارد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کرنا شروع کر دیا اور تفسیر کے دقائق

(۱) التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص۳۵۲تا۳۵٤ج۱

ظاہر کیے جو کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے تھے۔ میں نے ہم عصر علماء سے استفادہ کیا اور ان کے انوار علم سے روشنی حاصل کی۔ میرے دل میں خیال آتا جاتا تھا کہ ایک کتاب لکھی جائے جس میں وہ فوائد و نکات اور حقائق و دقائق جمع کر دیئے جائیں جو میرے ذہن میں ہیں لیکن میں تردد اور پس و پیش کی حالت میں تھا کہ رجب ۱۲۵۲ھ کی کسی شب جمعہ کو میں نے ایک خواب دیکھا کہ مجھے اللہ جل شانہ حکم دیتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کو سمیٹ لو میں نے ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور دوسرا ہاتھ نیچے پانی تک لٹکا دیا اور اسی حالت میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ میں نے جب اس خواب کی تعبیر تلاش کی تو ایک کتاب میں دیکھا کہ یہ تفسیر کی تالیف کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ میں نے ۱۶ شعبان ۱۲۵۲ھ کو تفسیر لکھنی شروع کر دی۔ اس وقت میری عمر ۳۴ سال تھی اور یہ سلطان محمود خان بن سلطان عبدالحمید خان کا دور حکومت تھا۔ آلوسی نے تفسیر کے خاتمے پر لکھا ہے کہ ۴ ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ منگل کی رات کو جب تفسیر کی تالیف اختتام پذیر ہوئی تو میں سوچنے لگا کہ اس کا نام کیا رکھا جائے لیکن کوئی دلوں کو مائل کرنے والا نام ذہن میں نہیں آرہا تھا اس لئے میں نے نام کا مسئلہ وزیر الوزراء علی رضا پاشا کے سامنے پیش کیا اور اس نے فی الفور کہا کہ اس کا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ہے۔ ان کا خواب اللہ کی جانب سے بشارت تھی اور غالباً اسی بشارت کی وجہ سے اس تفسیر کو بے حد مقبولیت حاصل ہو گئی ہے اور اس کی تصنیف میں بھی اللہ کی خصوصی امداد اور توفیق شامل تھی اس لئے کہ دن کو تو علامہ آلوسی افتاء اور تدریس کا کام کرتے تھے، رات کے ابتدائی حصے میں طلبہ اور احباب سے مذاکرات کرتے تھے اور رات کے آخری حصے میں کچھ صفحات لکھ کر صبح کو کاتبوں کی حوالے کر دیتے جو اس کام کے لئے ان کے گھر میں رہتے تھے اور وہ ان ورقوں کی تبییض کو دس گھنٹوں میں مکمل کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ آلوسی بغدادی کی تفسیر روح المعانی روایت و درایت یعنی تفسیر

بالماثور اور تفسیر بالرائی المحمود دونوں کے اعتبار سے ایک جامع تفسیر ہے۔ اس میں سلف کی آراء بھی نقل کی گئی ہیں اور خلف کے اقوال بھی پوری امانت و دیانت کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ سابقہ تفاسیر کے خلاصے پر مشتمل تفسیر ہے اس میں کشاف' تفسیر کبیر' تفسیر ابن عطیہ' تفسیر بیضاوی' تفسیر ابو حیان اور تفسیر ابوالسعود سب کے نقول موجود ہیں اور سب سے انہوں نے اخذ کیا ہے۔

آلوسی کا طرز یہ ہے کہ جب ابوالسعود سے نقل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ قال شیخ الاسلام' جب بیضاوی سے نقل کرتے ہیں تو اکثر مقامات پر کہتے ہیں کہ قال القاضی' اور جب امام رازی سے نقل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ قال الامام لیکن وہ جب ان تفاسیر سے نقل کرتے ہیں تو ان کے بارے میں اپنی آزاد رائے بھی پیش کرتے ہیں بہت سے مقامات پر تم دیکھو گے کہ انہوں نے ابوالسعود' بیضاوی' ابو حیان اور امام رازی پر اعتراضات کئے ہیں اور ان سے اختلاف رائے کیا ہے مگر جب وہ ان میں سے کسی کی رائے کو صحیح سمجھتے ہیں تو پھر اس کی تائید میں دلائل دیتے ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں۔

علامہ آلوسی سلفی المذہب اور سنی العقیدہ تھے اور اپنے مسلک اور عقیدے میں متصلب اور راسخ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تفسیر میں معتزلہ' شیعہ اور دوسرے بدعتی فرقوں کی آراء کی تردید کی گئی ہے اور سختی کے ساتھ ان کا ابطال کیا گیا ہے۔ نحوی مسائل کا ذکر اس تفسیر میں ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان جس فن میں زیادہ مہارت رکھتا ہو اس کے مسائل اس کی زبان و قلم سے زیادہ نکلتے ہیں۔ آیات الاحکام کی تفسیر میں پوری تحقیق کے بغیر آگے نہیں بڑھتے بلکہ فقہاء کی آراء اور ان کے دلائل کی بقدر حاجت پوری تفصیل بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر تو حنفی مسلک کو ترجیح دیتے ہیں لیکن میں نے حنفیت کے لئے تعصب اس کی تفسیر میں نہیں دیکھا اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں ثلاثۃ قروء کی تفسیر میں انہوں نے تین صفحات پر طویل علمی بحث کی ہے مگر آخر میں فرمایا

ہے کہ :

وَ بِالْجُمْلَةِ كَلَامُ الشَّافِعِيَةِ فِي هٰذَا الْمَقَامِ قَوِيٌّ .

یعنی "خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مقام پر شافعیہ کا کلام قوی ہے۔"

ان کی اس رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے ان کا حنفیت کے لئے عدم تعصب تو ثابت ہوتا ہے۔ تفسیر روح المعانی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غیر مستند قصص وحکایات اور اسرائیلی روایات پر شدید تنقید کی گئی ہے اور بڑے تند و تیز الفاظ میں ان کی تردید کی گئی ہے۔ ان کی شدت اور تندی کی ایک مثال سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مقام پر عوج بن عنق کا بے سروپا اور بے بنیاد قصہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے قصے اہل کتاب کے زندیقوں کے وضع کردہ ہیں اور اس سے ان کا مقصد انبیاء ورسل اور ان کے متبعین کا مذاق اڑانا ہے۔(۱)

علامہ آلوسی آیات کونیہ کی تشریح وتفسیر میں علوم جدیدہ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ آیات واحادیث اور جدید سائنس کے درمیان حتی الامکان مطابقت و موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آلوسی کے اس طرز و نہج کی ایک واضح مثال سورۃ الطلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں پائی جاتی ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے سات آسمان پیدا کئے ہیں اور زمین بھی انہی کی طرح پیدا کی ہے۔ اس کی تفسیر میں آلوسی نے احادیث کی روشنی میں اسی قول کو ترجیح دی ہے جو جمہور مفسرین کا قول ہے کہ آسمانوں کی طرح زمینوں کی تعداد بھی سات ہے لیکن اس قول کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے کہ اس سے اقالیم سبعہ مراد ہیں جیسا ایشیا، افریقہ، امریکہ وغیرہ اور اس قول کی بھی تردید کی ہے کہ اس سے زمین کے تہ بہ تہ جڑے ہوئے طبقات مراد ہیں اور فرمایا ہے کہ جس طرح آسمان کے درمیان فاصلے ہیں اور ہر

---

(۱) روح المعانی طبع رابعہ داراحیاء التراث الاسلامی بیروت ۱۹۸۵ء ص ۸۶۔۸۷ ج ۶

آسمان میں فرشتے رہتے ہیں اسی طرح سات زمینوں کے درمیان بھی فاصلے ہیں اور ہر زمین پر اللہ کی کوئی نہ کوئی مخلوق رہتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ زمینیں کہاں ہیں؟ اس کے جواب میں آلوسی نے جزم ویقین کے ساتھ تو نہیں مگر احتمال وامکان کے طور پر تسلیم کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان سے چاند، مریخ اور دوسرے کواکب مراد ہوں۔ اس پر سوال آتا ہے کہ کواکب تو سات نہیں ہیں بلکہ بے شمار ہیں تو اس کے دو جواب دیئے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ ممکن ہے کہ کواکب سبعہ مشہورہ مراد ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث رسول میں سات زمینوں سے مراد کثرت ہو یعنی اللہ نے بہت سی زمینیں پیدا کی ہیں۔(۱)

علامہ آلوسی نے آیات کی صوفیاء کے طرز پر اشاری تفسیر بھی کی ہے لیکن انہوں نے ابتداء میں جو فوائد لکھے ہیں ان میں الفائدہ الثانیہ میں تصریح کر دی ہے کہ الفاظ کے ظاہری معنی اور اشاری معنی کے درمیان تطبیق تلاش کی جاسکتی ہے صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آیت کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے بلکہ اشاری اور باطنی معنی ہی مراد ہے اس لئے کہ یہ تو فرقہ باطنیہ کے ملحدین کا اعتقاد ہے جس کے ذریعے وہ شریعت کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ صوفیہ نے تو اس بات کی تاکید کی ہے کہ پہلے آیت کا ظاہری مفہوم معلوم کیا جائے جو آیت کا اصل مقصود و مراد ہوتا ہے اور پھر اس کے مناسب احتمالی اشاری معنی کا ذکر کر دیا جائے تو منع نہیں ہے۔ اس طرح کے اشاری معانی بیان کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے لیکن میری ناقص رائے میں اگر روح المعانی جیسی تفسیر میں یہ اشاری معانی ذکر نہ کئے جاتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس لئے کہ عوام الناس بلکہ صوفیانہ مزاج رکھنے والوں کے علاوہ عام علماء بھی ان اشاروں کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کا سمجھنا ضروری بھی نہیں ہے اس لئے کہ صوفیاء نے خود کہا ہے کہ آیت کا اصل مفہوم وہی ہوتا ہے جو ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشاری تفسیر سلف صالحین کا طریقہ نہیں رہا بلکہ یہ بعض صوفیاء کا طریقہ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ سلفی طریقے میں برکت اور افادیت زیادہ ہے۔

---

(۱) اس بحث کے لئے ملاحظہ کیجئے روح المعانی طبع مذکور ص ۱۴۴۔ ۱۴۵ ج ۲۸ سورۃ الطلاق آیت ۱۲

آیات الاحکام کی تفسیریں

پورے قرآن کی جامع تفاسیر بھی آیات الاحکام کی تفسیر اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام و قوانین کے ذکر سے بالکل خالی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے بعض نے تو آیات الاحکام سے احکام شرعیہ ثابت کرنے کو بڑی اہمیت دی ہے اور احکام کی جزئیات تک بیان کی ہیں جیسے تفسیر قرطبی۔ لیکن اس نوع کی جامع تفاسیر صرف آیات الاحکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں پورے قرآن کی تفسیر کی جاتی ہے اور قرآن کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس نوع کی تفاسیر اور ان کے مفسرین کا تعارف تو گذشتہ دو عنوانات کے تحت مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان تفاسیر اور ان کے مفسرین کا تعارف کرایا جا رہا ہے جو صرف ان منتخب آیات کی تفسیر کرتے ہیں جو عملی احکام سے متعلق ہوں۔ اس نوع کی تفاسیر کو فقہی تفاسیر یا فقہاء کی تفاسیر بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۱) احکام القرآن للجصاص الحنفی متوفی ۳۷۰ھ:

جصاص کا نام ہے احمد بن علی ابو بکر رازی۔ ابو بکر ان کا کنیہ ہے اور جصاص ان کا لقب ہے۔ یہ لفظ جَصٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں چونہ۔ یہ چونے کا کام کرتے تھے اس لئے اس کو جصاص کہتے ہیں۔ رازی رَی کی طرف منسوب ہے جو جصاص کی جائے پیدائش ہے۔

خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"اپنے وقت میں اصحاب الرائے (حنفیہ) کے امام تھے' زہد اور ورع میں مشہور تھے' بغداد کو نوجوانی کی عمر میں آئے تھے' فقہ کا درس ابو الحسن کرخی سے لیا تھا اور فقہ کے حصول میں مشغول رہے تھے یہاں تک کہ فقہ حنفی کی ریاست تک پہنچ گئے اور فقہ کے طالب علم ان کے پاس آنے لگے۔ ان کو قضاء القضاء کا منصب سنبھالنے کی دعوت دی گئی تھی مگر انہوں

نے قبول نہیں کی دوبارہ دعوت دی گئی مگر انہوں نے پھر بھی قبول نہیں کی۔ ان کی تصنیفات مشہور ہیں' انہوں نے ابو العباس الاصم نیشاپوری سے' عبداللہ بن جعفر اصفہانی سے' قاضی عبدالباقی بن قانع سے اور سلیمان بن احمد طبرانی (معاجم ثلاثہ کے مصنف) اور دوسرے محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی نے کہا ہے کہ امام جصاص کی ولادت ۳۰۵ھ میں ہوئی تھی' ۳۲۵ھ میں یہ بغداد آئے تھے اور ابو الحسن کرخی سے علم حاصل کیا تھا۔ ان کا انتقال ۷ ذی الحجہ ۳۷۰ھ کو ۶۵ سال کی عمر میں ہوا تھا اور ان کی نماز جنازہ ابو بکر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے پڑھائی تھی۔"(۱)

مولانا عبدالحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ لکھتے ہیں :

"یہ اپنے زمانے میں حنفیہ کے امام تھے' بغداد میں ان کی تدریس کو قرار مل چکا تھا' زہد اور ورع میں یہ کرخی کے طریق پر گامزن تھے۔ انہوں نے کرخی سے نفع حاصل کیا تھا اور یہ انہیں کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے' جصاص کی تصانیف بھی موجود ہیں ان میں سے ایک احکام القرآن ہے' دوسری مختصر الکرخی کی شرح' تیسری مختصر الطحاوی کی شرح ہے' چوتھی امام محمد کی جامع کی شرح ہے' پانچویں اصول فقہ میں ایک کتاب ہے (جس کا نام ہے اصول الجصاص المعروف الفصول فی الاصول) چھٹی اسماء حسنیٰ کی شرح ہے اور ساتویں ادب القضاء ہے۔ ذوالحجہ ۳۷۰ھ میں فوت ہوئے تھے اور ۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے تھے' سمعانی نے ذکر کیا ہے کہ جصاص نسبت ہے عمل بالجص کی طرف یعنی چونے کا کام کرنے والے' "طبقات القاری" میں لکھا ہے کہ ابو بکر رازی عظیم الشان امام تھے اور جصاص کے لقب سے مشہور تھے۔ بعض نے اس کو رازی کہا ہے اور بعض نے جصاص کہا ہے مگر یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ یہ بغداد میں سکونت رکھتے تھے' بغداد کے فقہاء سے انہوں نے علم حاصل کیا تھا اور حنفیہ کی ریاست ان تک پہنچ گئی تھی۔ ۳۲۵ھ میں (۲۰ سال کی عمر میں) بغداد

(۱) تاریخ بغداد ص ۳۱۴۔۳۱۵ ج ٤ ترجمہ ۲۱۱۲ ؛

تشریف لائے تھے پھر اہواز چلے گئے اور پھر اپنے شیخ ابوالحسن کرخی کے مشورے سے حاکم نیشاپوری کے ساتھ نیشاپور تشریف لے گئے تھے۔ پھر ۳۴۴ھ میں واپس بغداد آگئے تھے' فقہاء کی ایک جماعت نے امام جصاص سے فقاہت حاصل کی تھی جن میں امام قدوری کے شیخ ابوعبداللہ محمد بن یحیی جرجانی اور ابوالحسن محمد بن احمد زعفرانی جیسے ائمہ فقہ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے حدیث کی روایت عبدالباقی بن قانع سے کی ہے اور احکام القرآن میں انہوں نے ان سے کافی روایات نقل کی ہیں۔(۲)

امام جصاص کے شیوخ میں دوسرے ائمہ فقہ بھی شامل ہیں لیکن جس فقیہ اور امام سے انہوں نے علوم کثیرہ حاصل کیے ہیں' جس کی درسگاہ سے انہوں نے سند فضیلت حاصل کی ہے اور جس کی "مسند تدریس" کے یہ خلف الرشید اور وارث تھے وہ شیخ ابوالحسن کرخی ہیں جس کا نام عبیداللہ بن حسین ہے۔ فقہ میں ان کے اور امام ابو حنیفہ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں انہوں نے فقاہت حاصل کی تھی ابو سعید بردعی سے' بردعی نے حاصل کی تھی اسماعیل سے' اسماعیل نے حاصل کی تھی اپنے والد حماد سے اور حماد نے حاصل کی تھی اپنے والد امام ابو حنیفہ سے' ابو خازم کے بعد حنفیہ کی ریاست اور سیادت ان کے ہاتھ میں آگئی تھی اور ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید امام جصاص کو منتقل ہو گئی تھی' ان کی پیدائش ۲۶۰ھ میں ہوئی تھی اور ان کی وفات ۳۴۰ھ میں ہوئی تھی۔ ابوالحسن کرخی کی وفات کے وقت امام جصاص نیشاپور میں تھے وفات کی خبر سن کر واپس بغداد تشریف لائے' اپنے شیخ کی علمی اور تدریسی کرسی سنبھالی اور امام الحنفیہ و شیخ الحنفیہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور بغداد ہی میں وفات پائی۔ ابوالحسن کرخی کثیر الصلوۃ والصیام تھے۔"(۲)

کرخی نسبت ہے کرخ کی جانب اور یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ نے لکھا ہے کہ کرخ

(۱) الفوائد البہیہ فی تراجم ائمۃ الحنفیہ ص ۲۷۔۲۸

(۲) الفوائد البہیہ ص ۱۰۸۔۱۰۹

مختلف مقامات کا نام ہے جو سب کے سب عراق میں ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کورخ جُدّان: یہ عراق کے آخر میں ایک شہر کا نام ہے۔

۲۔ کورخ بَصرہ: یہ بصرہ کے پاس ہے۔

۳۔ کَورخ بغداد: یہ بغداد سے باہر ایک بازار کا نام تھا۔

۴۔ کورخ رقّہ: یہ الجزیرہ میں ہے۔

۵۔ کَورخ سامَرّا: یہ ایک قدیم شہر کی جگہ کا نام ہے جو ویران ہو گیا ہے۔

۶۔ کورخ میسان: یہ عراق کے ایک علاقے (ضلع) کا نام ہے۔

۷۔ کورخ عبرتا: یہ نھر دون کے اطراف میں ہے۔

۸۔ کَورخ خوزستان: یہ خوزستان میں ایک شہر کا نام ہے۔(۱)

یاقوت کی تحقیق یہ ہے کہ مشہور صوفی معروف کرخی اور مشہور فقیہ ابوالحسن کرخی کرخ جدان سے تعلق رکھتے تھے۔(۲)

ابوالحسن کرخی کا زہد و قناعت، تقویٰ و ورع اور صوم و صلوٰۃ کا شوق و ذوق تو معروف و مشہور ہے اور ان کے تلمیذ خاص امام جصاص بھی ان صفات سے موصوف تھے۔ لیکن خطیب بغدادی نے ابوالحسن محمد بن عباس بن فرات سے ابوالحسن کرخی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وَ كَانَ مُبْتَدِعًا رَاسًا فِي الْاِعْتِزَال بدعتی تھے اور مسلک اعتزال کے رئیس تھے۔

(تاریخ بغداد ص۳۵۵ ج۱۰)

امام جصاص جس طرح اپنے شیخ کے زہد و ورع سے متاثر تھے اور شیخ کی صحبت کی وجہ سے ان کی زندگی میں پرہیزگاری، عبادت گزاری اور زہد و قناعت کی صفات حسنہ نمایاں تھیں اسی طرح اپنے شیخ کے اعتزال سے بھی متاثر ہو گئے تھے۔ ان کی تفسیر میں فروعی اور فقہی

(۱)معجم البلدان ص٤٤٧تا٤٤٩ ج٤

(۲)معجم البلدان ص٤٤٩ ج٤

مسائل میں تو امام ابو حنیفہ کے مسلک پر تصلب بلکہ ایک طرح کا تعصب پایا جاتا ہے اور حنفی مسلک کے لئے آیات کی تکلفی اور غیر متبادر تاویلات بھی میں نے اس تفسیر میں دیکھی ہیں لیکن اصولی مسائل میں سے بعض مسائل میں ان کی تفسیر میں اہل سنت والجماعت کے مقابلے میں معتزلہ کے مسلک کی تائید بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال سحر کے بارے میں جصاص کی رائے ہے جو معتزلہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک سحر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے تمویہ دھوکہ بازی' نظر بندی' خیال بندی' شعبدہ بازی اور چالاکی یا مسمریزم۔ اس قسم کے سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون جن جادوگروں کو لے کر آیا تھا ان کے پاس اسی قسم کا سحر تھا جو عصائے موسی کے مقابلے میں ناکام اور بے اثر ثابت ہوا تھا اور معجزے کے مقابلے میں ساحر کا سحر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا اِنَّہٗ ' لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی۔ اور سحر کی دوسری قسم وہ ہے جو مخفی' پوشیدہ اور لطیف اسباب پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ اسباب چونکہ عوام الناس کی نگاہوں میں نہیں آتے اس لئے وہ اس قسم کے سحر کو خرق عادت اور مافوق الاسباب سمجھ لیتے ہیں مگر حقیقت میں یہ اسباب پر مبنی ہوتے ہیں مافوق الاسباب نہیں ہوتے۔ یہ اسباب کبھی کوئی مشرکانہ یا مہمل اور بے معنی قسم کے کلمات اور منتر ہوتے ہیں جو پڑھ کر تانت کی گرہوں میں پھونکے جاتے ہیں' کبھی جنات سے استمداد کی قسم کے ہوتے ہیں' کبھی کواکب اور ستاروں سے استمداد کی قسم کے ہوتے ہیں اور کبھی دوسرے لطیف و پوشیدہ اسباب ہوتے ہیں جن کو ساحر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے جادو کی حقیقت اور تاثیر عقل و نقل دونوں کے خلاف نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح ظاہری اور محسوس اسباب پر اللہ کے حکم اور ارادے سے اثرات مرتب ہوتے ہیں' آگ جلاتی ہے گہرا پانی ڈبوتا ہے' تلوار' چاقو' نیزہ' تیر اور پتھر جسم کو زخمی کر دیتے ہیں مگر اللہ کے حکم اور ارادے کے بغیر یہ تمام چیزیں کچھ بھی نہیں کر سکتیں' اسی طرح جادوگروں کے خفیہ اور غیر محسوس اسباب پر بھی اللہ کے حکم اور ارادے سے اثرات مرتب

ہوتے ہیں اور اس کے حکم کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے' سحر بابل کے بارے میں قرآن میں صراحت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے اثر کرتا تھا اور ساحر اس کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرواتے تھے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (البقرہ ۱۰۲)

"یہ لوگ ہاروت ماروت سے وہ جادو سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعے وہ میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کروادیتے تھے اور وہ کسی کو بھی اس سحر کے ذریعے ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے حکم سے۔"

امام جصاص نے فرعون کے ساحروں کی شعبدہ بازی' نظر بندی اور خیال بندی سے متعلق آیات قرآنیہ پر استدلال کرتے ہوئے ہر قسم کے سحر کو تمویہ اور شعبدہ بازی پر محمول کیا ہے اور پورے ۹ صفحات پر شعبدہ بازوں کی چالاکیوں کی مثالیں پیش کی ہیں۔(۱)

شعبدہ بازوں کی چالاکیوں اور دھوکہ بازیوں کی مثالیں جمع کرنا تو ٹھیک ہے لیکن حیرت اور افسوس تو اس پر ہے کہ اس عظیم مفسر اور امام الحنفیہ نے اس کے بعد سحر کے اس اثر سے بھی انکار کر دیا ہے جو بخاری' مسلم کی متفق علیہ حدیث مرفوع سے ثابت ہے اور حدیث کو ملحدین کی وضع کردہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"انہوں نے ساحر کے اس فعل کو بھی جائز یعنی ممکن قرار دیا ہے جو بہت زیادہ سخت اور قبیح ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ نبی علیہ السلام پر جادو کیا گیا تھا اور اس جادو نے آپ پر اثر بھی کیا تھا یہاں تک کہ آپ کے خیال میں آتا کہ میں کوئی بات کر رہا ہوں یا کوئی کام کر رہا ہوں حالانکہ آپ نے نہ کوئی بات کی ہوتی اور نہ کوئی کام کیا ہوتا' اور ایک یہودی عورت نے آپ پر خوشہ کھجور کے غلاف میں کنگھی میں اور سر سے نکلے ہوئے بالوں میں جادو کیا تھا' یہاں تک

(۱) احکام القرآن طبع داراحیاء التراث الاسلامی بیروت ۱۹۸۵ء ص ۵۰ تا ۵۹ ج ۱

کہ جبریل نے آکر آپ کو اطلاع دی کہ یہودیہ نے تم پر خوشہ کھجور کے غلاف میں جادو کیا ہے اور یہ کنویں میں ایک پتھر کے نیچے رکھا ہوا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس خوشے کو نکالا اور آپ سے جادو کا یہ عارضہ زائل ہو گیا' حالانکہ اللہ نے کفار کے دعوے کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا. (الفرقان ۸)

"اور ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم اس شخص کے پیچھے لگے ہوئے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے اور اس قسم کی اخبار اور روایات ملحدین کی وضع کردہ یعنی خود ساختہ ہیں تاکہ اس قسم کی بے وقوفی کی باتوں کو معجزات کے ابطال کا اور ان پر ردو قدح کا ذریعہ بنایا جائے تاکہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ معجزہ اور جادو ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں' تعجب ہے ان لوگوں پر جو انبیاء اور ان کے معجزات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جادوگروں کے اس قسم افعال پر بھی یقین رکھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ :

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى (طٰہٰ ۶۹)

"جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا جہاں بھی آئے۔"

تو انہوں نے ان لوگوں کی تصدیق کر لی جن کی اللہ نے تکذیب کی ہے اور ان کے دعوے کا ابطال کیا ہے' ممکن ہے کہ یہودی عورت نے اپنی جہالت کی وجہ سے یہ کام کیا ہو اور گمان کیا ہو کہ میرا یہ عمل نبی کریم ﷺ پر اثر کرے گا تو اللہ تعالی نے اس پر اپنے نبی کو مطلع اور اس عورت کی جہالت اور ظن کو ظاہر کر دیا تاکہ یہ اطلاع دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ثابت ہو جائے' اس عمل نے آپ کو کوئی ضرر اور تکلیف نہیں پہنچائی تھی سب راویوں نے یہ بات نہیں کہی کہ آپ کے حال میں کچھ خلل آیا تھا بلکہ یہ لفظ حدیث میں کسی کا اضافہ ہے جس کا کوئی اصل موجود نہیں ہے۔"(۱)

(۱) احکام القرآن طبع مذکورہ ص ۶۰ ج ۱ باب السحر والساحر البقرہ آیت ۱۰۲

امام جصاص کی مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے کفار کے اس قول کی تکذیب کی ہے کہ محمد علیہ السلام پر جادو کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ پر کسی کا جادو اثر انداز نہیں ہو سکتا لیکن سیاق و سباق اور دوسری آیات کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قرآن کو سحر کہتے تھے اور مسحور سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی جادوگر نے ان کو جادو سکھایا ہے اور یہ اسے کلام الٰہی اور وحی خداوندی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے' نیز اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ساحر جہاں بھی آئے کامیاب نہیں ہو سکتا یعنی اس کا جادو بے اثر ہو جاتا ہے مگر یہ آیت ساحران فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے سیاق کلام میں آئی ہے اور سیاق کلام سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ساحر جہاں بھی اور جب بھی پیغمبر کے معجزے کے مقابلے میں آتا ہے تو ناکام ہو جاتا ہے اس لئے کہ معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور سحر جادوگر کا عمل ہوتا ہے اور بندہ کا عمل اللہ کے فعل کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ساحر اپنے سحر سے نبی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا' جسمانی تکلیف تو نبی علیہ السلام کو اللہ کے ارادے سے عام کفار و مشرکین کے ہاتھوں بھی پہنچ سکتی ہے اور ساحروں کے سحر سے بھی پہنچ سکتی ہے۔ تیسری بات ہمارے اس امام الحنفیہ نے یہ کہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کرنے اور اس جادو کے اثر کرنے کی اخبار و احادیث ملحدین کی وضع کردہ ہیں یا ان میں یہ الفاظ کسی کے اضافہ کردہ ہیں کہ اس جادو کی وجہ سے آپ کی حالت میں کچھ خلل آیا تھا اور آپ کو تکلیف پہنچی تھی حالانکہ جادو کرنے اور اس کی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچنے کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے جس کو امام بخاری' امام مسلم' امام احمد بن حنبل اور دوسرے محدثین نے صحیح اور قوی اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث کا مکمل ترجمہ نقل کر دیا جائے اس لئے کہ محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں نے ایک ہی راوی سے نقل کیا ہو اسے متفق علیہ کہتے ہیں اور اس کا درجہ صحیح

احادیث میں سب سے اونچا ہوتا ہے۔ اس متفق علیہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بنو زریق قبیلے کے ایک یہودی لبید بن اعصم نے جادو کیا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا حال یہ ہو گیا تھا کہ آپ کو خیال ہوتا کہ آپ کوئی کام کر رہے ہیں حالانکہ وہ کام آپ نے کیا نہیں ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ یہاں تک چلتا رہا کہ ایک دن یا ایک رات آپ میرے پاس تھے لیکن دعا پر دعا فرما رہے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا اے عائشہ! کیا تم جانتی ہو کہ اللہ نے مجھے وہ بات اپنے فضل سے بتا دی ہے جو میں نے ان سے پوچھی تھی' میرے پاس دو مرد آئے (فرشتے مردوں کی شکل میں آئے) ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا' ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا اس شخص کو (محمد کو) کیا بیماری ہے؟ اس نے جواب دیا اس پر جادو کیا گیا ہے' اس نے پوچھا کس نے اس پر جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا اس پر لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے۔ پہلے نے پھر پوچھا کہ جادو کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی کے دندانوں اور کنگھی کرتے وقت گرے ہوئے بالوں میں اور نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں یہ جادو (ٹوٹکہ) کیا ہے' پہلے نے پوچھا کہ یہ ٹوٹکہ (جادو کی یہ چیزیں) کہاں رکھی ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا کہ ذروان نام کے کنویں میں رکھا ہے۔ پس جب آپ اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ اس کنویں سے لوٹ کر واپس ہمارے پاس تشریف لائے تو فرمایا اے عائشہ! اس کنویں کا پانی مہندی کے پانی کی طرح تھا اور اس کے کھجور کے درختوں کے سر ایسے بھیانک اور بد صورت تھے جیسے سانپوں کے سر اور پھن۔ عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے پوچھا کہ آپ دوسرے جادوگر سے (منتر کرنے والے سے) اس کا توڑ یعنی ازالہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تو شفا دیدی ہے اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگوں میں بری چیز کی اشاعت کروں۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ ان چیزوں کو دفن کر دو اور وہ دفن کر دی گئیں۔"

یہ حدیث مختلف اسانید کے ساتھ صحیح البخاری میں ۵ مقامات پر آئی ہے۔

کتاب الطب باب السحر' کتاب الادب باب قولہ تعالی ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان' کتاب الدعوات باب تکریر الدعاء' کتاب بدء الخلق باب صفۃ ابلیس و جنودہ' کتاب الجزیہ باب ھل یعفی من الذمی؟ اور مسلم نے اسے کتاب السلام باب السحر میں نقل کیا ہے' نسائی نے کتاب التحریم باب سحرۃ اھل الکتاب میں نقل کیا ہے اور مسند احمد بن حنبل طبع دار صادر بیروت ص ۶۳ ج ۶ اور ص ۹۲ ج ۶ پر بھی امام احمد کی سند کے ساتھ یہ حدیث نقل ہوئی ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں آیا ہے کہ فَاشْتَكٰى لِذٰلِكَ اَيَّامًا اس جادو کی وجہ سے آپ کئی روز تک تکلیف اور پریشانی کی حالت میں رہے تھے اور جب اس کا اثر زائل ہوا تو آپ نے یوں محسوس کیا کہ کَاَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ گویا میں رسی سے باندھا ہوا تھا اور اب رسی کھول دی گئی ہے۔(۱)

ان روایات میں جادو کے اثر کرنے اور اس کی وجہ سے آپ کی تکلیف اور پریشانی کا ذکر ہوا ہے اور روایت و درایت دونوں کے اعتبار سے یہ صحیح احادیث ہیں۔ روایت کے اعتبار سے تو اس لئے صحیح ہیں کہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ احادیث ہیں اور درایت و مضمون کے لحاظ سے اس لئے قابل قبول ہیں کہ ان کے مضمون پر عقلاً و شرعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اس لئے کہ کفار و مشرکین اور جادوگروں کے اعمال کے ذریعے اللہ کی مشیئت سے انبیاء کو تکالیف پہنچنا آزمائش ہے اور شان نبوت کے خلاف نہیں ہے البتہ جادو کا ایسا اثر انبیاء پر ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ہوا ہے کہ وہ وحی الٰہی کو سمجھنے اور سمجھانے سے اور فرائض نبوت ادا کرنے سے عاجز آجائیں لیکن مذکورہ روایات میں تو صرف جسمانی تکلیف کا ذکر ہوا ہے۔ بہر حال صحیح احادیث کو ملحدین کی وضع کردہ قرار دینا بہت بڑی بات ہے جو اس بڑے امام کے قلم سے نکل گئی ہے۔

معتزلہ کی رائے کے ساتھ اتفاق اور اہل سنت کے متفقہ مسلک کے ساتھ اختلاف کی

---

(۱) مسند احمد ص ۳۶۷ ج ۴

دوسری مثال رؤیت باری تعالیٰ کا مسئلہ ہے۔ اہل سنت والجماعت سورہ قیمہ کی آیت اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَة احادیث مرفوعہ متواترہ اور اجماع صحابہ و تابعین کی بنیاد پر بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ اصول اہل سنت میں سے اہم ترین اصول ہے کہ قیامت کے روز جنت میں اہل ایمان اپنے رب کو آنکھوں سے دیکھیں گے اور سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۳ میں لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے معنے ابن عباس کے قول کے مطابق یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں لیکن امام جصاص آخرت میں بھی رؤیت باری تعالیٰ کو نہیں مانتے جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے 'احکام القرآن' میں انہوں نے اپنی رائے اس طرح بیان کی ہے:

"لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے معنے ہیں لَا تَرَاهُ الْاَبْصَارُ یعنی اسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں اور آنکھوں سے دیکھنے کی نفی اس کی صفت مادحہ ہے جیسے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ میں اونگھ اور نیند کی نفی صفت مادحہ ہے اور جس صفت کی نفی سے اللہ نے اپنی مدح اور تعریف کی ہو اس کے ضد کا اس کے لئے اثبات ذم اور نقص ہوتا ہے جو جائز نہیں ہے پس جب اللہ نے اپنی مدح کی ہے کہ مجھے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں تو اس کی ضد یعنی رؤیت بالابصار کا اس کے لئے اثبات کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس میں نقص اور عیب کا اثبات لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ اس آیت میں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. (القیمۃ ۲۲.۲۳) کے ذریعے تخصیص کی جائے (کہ دنیا میں تو اسے آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا مگر آخرت میں اہل ایمان کی آنکھیں اسے دیکھیں گی) اس لئے کہ لفظ 'نظر' کا لفظ کئی معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک معنی ثواب کا انتظار کرنا بھی ہے جیسا کہ سلف کی ایک جماعت سے یہ معنی مروی ہے تو جب اس لفظ میں تاویل کا احتمال ہے تو اس کی بنیاد پر اعتراض کرنا جائز نہیں اور رؤیت کے بارے میں جو احادیث و اخبار مروی ہیں وہ اگر صحیح ہوں تو ان سے مراد علم ہے یعنی وہ علم جس میں کسی شبہے اور شک کا اختلاط نہ ہو' اس لئے کہ عربی لغت میں رؤیت علم کے معنوں میں مشہور ہے۔"(۱)

---

(۱) احکام القرآن طبع مذکور ص ۱۷۰،۱۶۹ ج ٤

قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جب دو آیتوں کے درمیان بظاہر تناقض اور تعارض نظر آئے تو تاویل کے ذریعے اس کے ازالے کی کوشش کرنی چاہئے مگر جو تاویل احادیث صحیحہ سے ٹکراتی ہو تو وہ اگر لغت کے اعتبار سے صحیح بھی ہو پھر بھی اسے نظر انداز کر کے وہ تاویل اختیار کی جائے گی جو احادیث کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو اس لئے کہ قرآن کی صحیح تفسیر وہی ہو سکتی ہے جو احادیث رسول سے ثابت ہو۔ عربی لغت میں تو الفاظ کے کئی معانی ہو سکتے ہیں مگر مراد وہی معنی ہوگا جو حدیث سے ثابت ہوتا ہو۔ اہل سنت کے درمیان مسلمہ اور متفقہ اس اصول کی روشنی میں جب ہم لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ اور إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے درمیان تطبیق اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتے ہیں تو یہ تاویل صحیح نظر آتی ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے معنے یہ ہیں کہ دنیا میں اللہ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا اور إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں ایمان والے اپنے رب کو آنکھوں سے دیکھیں گے اس لئے کہ یہ تاویل احادیث رسول کے مطابق ہے اور معتزلہ کی یہ تاویل صحیح نظر نہیں آتی کہ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے معنے ہیں إِلَىٰ نِعَمِ رَبِّهَا مُنْتَظِرَةٌ یعنی اپنے رب کی نعمتوں اور اس کے اجر وثواب کے منتظر ہوں گے۔

ایک تو اس وجہ سے یہ تاویل صحیح نہیں ہے کہ عربی لغت میں جب نَاظِرَةٌ کو حرف الی کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کے معنے رؤیت بالبصر ہوتے ہیں انتظار کرنا نہیں ہوتے جیسا کہ مدارک التنزیل اور دوسری تفاسیر میں لکھا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر لغت میں اس کی گنجائش نکل بھی آئے پھر بھی یہ تاویل صحیح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ احادیث رسول سے ٹکراتی ہے جن میں جنت میں اہل ایمان کے لئے رؤیت باری تعالی کی صراحت موجود ہے۔

باقی رہی امام جصاص کی یہ بات کہ احادیث میں مروی لفظ رؤیت سے علم مراد ہے تو یہ بات تین وجوہات سے ناقابل قبول ہے بلکہ تکلف اور تعسف پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ علم

رؤیت کے حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ مجازی معنی ہیں اور مجازی معنی مراد لینے کے لئے قرینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر رؤیت سے علم مراد بھی لیا جائے تو اس سے علم بالمشاہدہ اور علم بالرؤیت مراد ہوگا جو دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا اور علم بالغیب یعنی اللہ کو آنکھوں سے دیکھے بغیر ماننا اور اس کے وجود پر یقین کرنا تو اہل ایمان کو دنیا میں بھی حاصل ہے۔ اور تیسری بڑی وجہ اس معنی کے صحیح نہ ہونے کی یہ ہے کہ احادیث رسول میں رؤیت عیاناً کی تصریح موجود ہے اس لئے رؤیت سے علم مراد لینا خلاف حدیث ہے اور خلاف حدیث تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

اِنَّکُم سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ عِیَانًا.

"بے شک تم لوگ اپنے رب کو کھلی آنکھوں سے دیکھو گے۔"(۱)

عربی میں عیان اور معاینہ آنکھوں سے دیکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے بغیر دیکھے علم کے لئے یہ لفظ نہیں آتا' بخاری و مسلم میں ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ کیا قیامت کے روز ہم اپنے رب کو دیکھیں گے ؟ آپ نے فرمایا کیا تم سورج اور چاند کے دیکھنے میں ایک دوسرے کو دھکے دے کر تکلیف اور ضرر پہنچاتے ہو جب کہ ان کے نیچے بادل بھی نہ ہوں؟ انہوں نے کہا نہیں (اس لئے کہ دھکے دینے اور ضرر پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑتی) آپ نے فرمایا :

فَاِنَّکُمْ تَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَذَالِکَ.

"پس تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح سورج اور چاند کو دیکھتے ہو۔"(۲)

اس حدیث میں اللہ کی تشبیہ سورج اور چاند کے ساتھ نہیں دی گئی بلکہ رؤیت باری

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید

(۲) بخاری کتاب التوحید و مسلم کتاب الایمان

تعالیٰ کی تشبیہ سورج اور چاند کی رؤیت کے ساتھ دی گئی ہے جس کے نیچے بادل نہ ہوں یعنی جس طرح تم پردے کے بغیر سورج اور چاند کو دیکھتے ہو اور ہر شخص یوں محسوس کرتا ہے کہ سورج اور چاند میری ہی جانب دیکھ رہا ہے اسی طرح قیامت کے روز تم اپنے رب کو بلا حجاب اس طرح دیکھو گے کہ ہر شخص یوں محسوس کرے گا کہ میرا رب مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔

اس مضمون کی احادیث تواتر معنوی کے درجے کو پہنچی ہوئی ہیں اور اس پر صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اجماع بھی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ :

"عالم آخرت میں ایمان والوں کے لئے اللہ کی رؤیت طرق متواترہ کے ساتھ مروی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جن کا نہ جواب دیا جاسکتا ہے اور نہ ان سے انکار کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، جبیر بن عبداللہ بجلی، ابو موسیٰ اشعری، صہیب رومی، جابر بن عبداللہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں احادیث مرفوعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں احادیث صحیحہ اور احادیث حسنہ کو ان کے طرق و اسانید کے ساتھ نقل کرتا لیکن یہ احادیث اس کتاب میں متفرق مقامات پر نقل کی گئی ہیں۔ وَهٰذَا بِحَمْدِ اللّٰهِ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ بَيْنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَ سَلَفِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ كما هُوَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ بَيْنَ اَئِمَّةِ الْإِسْلَامِ وَ هُدَاةِ الْأَنَامِ. "اور الحمد للہ یہ مسئلہ صحابہ و تابعین اور امت کے سلف صالحین کے درمیان اجماعی مسئلہ ہے اور اس پر ائمہ اسلام اور خلق خدا کے راہنماؤں کا بھی اتفاق ہے۔" اور جس نے اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی یہ تاویل کی ہے کہ اپنے رب کے ثواب کا انتظار کریں گے تو اس نے دور دراز کی تاویل کی ہے اور باطل مذہب اختیار کیا ہے۔ اس کے ذہن سے یہ آیت کیسے نکل گئی تھی کہ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (المطففین ۱۵)

امام شافعی نے فرمایا ہے کہ "فجار کو اس لئے محجوب کہا ہے کہ ابرار اللہ عزوجل کو دیکھیں گے۔"(۱)

(۱) تفسیر ابن کثیر سورۃ القیامۃ آیت ۲۲۔۲۳

رؤیت باری تعالیٰ سے انکار اور رؤیت کے بارے میں وارد شدہ آیات واحادیث کی تاویل جہمیہ' معتزلہ اور بعض خوارج وامامیہ کا مسلک ہے۔ اہل سنت والجماعت اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مسلک یہ نہیں ہے' امام جصاص اگرچہ امام الحنفیہ تھے مگر رؤیت کے بارے میں ان کی رائے انفرادی رائے ہے۔ حنفیہ کا مسلک نہیں ہے اگر کوئی جصاص کی رائے کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ اور اس کے تلامذہ کو منکرین رؤیت باری تعالیٰ میں شامل کرتا ہے اور مسلک حنفیہ کو مسلک معتزلہ کے مطابق قرار دیتا ہے تو وہ بہت بڑی بے انصافی کرتا ہے اس لئے کہ کسی حنفی عالم کی انفرادی رائے کو حنفی مسلک نہیں کہا جاسکتا۔

حنفیہ کے ممتاز امام اور امام ابو حنیفہ کے مسلک کو سب سے جاننے والے امام طحاوی متوفی ۳۲۲ھ ہیں اور انہوں نے اپنے رسالہ "العقیدۃ الطحاویہ" میں حنفیہ اور دوسرے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ اس طرح بیان کیا ہے :

وَالرُّؤْيَةُ حَقٌّ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ بِغَيْرِ اِحَاطَةٍ وَ لَا كَيْفِيَّةٍ كَمَا نَطَقَ بِهٖ كِتَابُ رَبِّنَا وُجُوْهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیمۃ ۲۲۔۲۳) وَ تَفْسِيْرُهٗ عَلٰى مَا اَرَادَ اللّٰهُ وَ عَلِمَهٗ وَ كُلُّ مَا جَاءَ فِيْ ذَالِكَ مِنَ الْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَهُوَ كَمَا قَالَ وَ مَعْنَاهُ عَلٰى مَا اَرَادَ لَا نَدْخُلَ فِيْ ذَالِكَ مُتَأَوِّلِيْنَ بِآرَائِنَا وَلَا مُتَوَهِّمِيْنَ بِاَهْوَائِنَا فَاِنَّهٗ مَا سَلِمَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلَّا مَنْ سَلَّمَ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ رَدَّ عِلْمَ مَا اشْتَبَهَ عَلَيْهِ اِلٰى عَالِمِهٖ

"اہل جنت کے لئے اللہ تعالیٰ کی رؤیت حق ہے لیکن اللہ کی ذات کا علم محیط کسی کو بھی حاصل نہیں ہے اور رؤیت کی کیفیت کا جاننا بھی ضروری نہیں ہے جیسا ہمارے رب کی کتاب نے بیان کیا ہے کہ اس روز بہت سے چہرے چمک رہے ہوں گے اور اپنے رب کی جانب دیکھ رہے ہوں گے۔ اللہ کے اس کلام کی تفسیر وہی ہے جو اللہ کی مراد ہے اور وہی اسے جانتا ہے۔ (یعنی رؤیت کی کیفیت وہی ہو گی جو اللہ کی مراد ہے اور وہ اسے جانتا ہے دنیا کے اجسام واشیاء

کی رویت کی طرح نہیں ہوگی) اور وہ تمام صحیح حدیثیں جو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے وارد ہوئی ہیں ان کے معنے وہی ہیں جس طرح کہ آپ نے فرمایا ہے اور جو آپ کی مراد ہے (یعنی آنکھوں سے عیاناً دیکھنا) ہم اس بارے میں اپنی آراء سے کسی تاویل میں بھی داخل نہیں ہوتے اور اپنے نفس کی خواہشات سے کسی وہم (تشبیہ کے وہم) میں بھی مبتلا نہیں ہوتے اس لئے کہ دین اسی کا سلامت رہ سکتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات کو تسلیم کرتا ہو (خواہ عقل میں آتی ہو یا نہ آتی ہو) اور جس بات میں اسے اشتباہ پیش آجائے تو اسے عالم کے سپرد کردے یعنی اللہ اعلم کہدے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

وَلَا يَصِحُّ الْإِيْمَانُ بِالرُّؤْيَةِ لِأَهْلِ دَارِ السَّلَامِ لِمَنِ اعْتَبَرَهَا مِنْهُمْ بِوَهْمٍ أَوْ تَأَوَّلَهَا بِفَهْمٍ.

"اور اہل جنت کے لئے رویت باری تعالی پر ان لوگوں کا ایمان صحیح نہیں ہے جنہوں نے وہم یا اپنے فہم کے مطابق تاویل کے ذریعے اس کو تسلیم کیا ہے۔"

یعنی جن لوگوں نے رویت میں تاویل کی ہے مثلاً رویت سے علم مراد لیا ہے اور نظر سے انتظار مراد لیا ہے وہ منکرین رویت میں شامل ہیں اور جو دنیوی رویت کے ساتھ تشبیہ کے وہم میں مبتلا ہیں وہ بھی منکرین رویت میں شامل ہیں۔ امام طحاوی کی مذکورہ بالا عبارت کی تشریح کے لئے اور رویت باری تعالی کے دلائل کی تفصیل کے لئے اور معتزلہ کے دلائل کے جوابات کے لئے ملاحظہ کیجئے قاضی ابن ابی العز دمشقی حنفی کی شرح "العقیدۃ الطحاویہ" طبع مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۱۹۹۰ء ص ۲۰۷ تا ۲۵۹ ج ا۔

امام جصاص کے اعتزال کی مذکورہ دو مثالیں میں نے اس لئے ذکر کی ہیں کہ کسی شخص یا کسی امام کے تعارف میں اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے بشرطیکہ ان کمزوریوں کا تعلق علمی آراء سے ہو شخصی اور اخلاقی کمزوریوں سے نہ

ہو۔ مگر فقاہت میں یہ حنفیہ کے مسلمہ امام اور فقیہ ہیں اور ان کی احکام القرآن حنفی مسلک کی مستند کتاب ہے لیکن مسلکی طرز پر آیات الاحکام کی تفسیر کرنے والوں کا یہ منہج میرے فہم ناقص میں مناسب اور مفید منہج نہیں ہے کہ پہلے اپنے ذہن میں فقہی مسالک میں سے ایک مسلک کو راجح قرار دیدیا جائے اور پھر کتاب اللہ کی آیات کی تفسیر اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی تشریح اسی مسلک کے مطابق کی جائے بلکہ صحیح طرز تفسیر اور مناسب منہج تحقیق یہ ہے کہ پہلے خالی الذہن ہو کر اصول تفسیر 'اصول حدیث اور بحث و تحقیق کے مسلمہ اصول کے مطابق آیات و احادیث کی تشریح کی جائے اور اس کے نتیجے میں جو بات اور جس کی بات راجح نظر آئے اس کو قول راجح قرار دیا جائے اور اس کی پروانہ کی جائے کہ یہ قول ابو حنیفہ کا ہے یا شافعی کا ہے یا مالک کا ہے یا احمد کا ہے یا بخاری کا ہے یا کسی دوسرے امام کا ہے۔ اس طرز پر تفسیر و تحقیق کرنے میں انسان اگر غلطی اور خطا میں بھی مبتلا ہو جائے تو عند اللہ قابل مؤاخذہ نہیں ہو گا اس لئے کہ تحقیق اور رائے کی غلطی اللہ معاف کر دیتا ہے بشر طیکہ آزاد اور شتر بے مہار قسم کی رائے زنی نہ کی گئی ہو بلکہ اصول تفسیر اور اصول تحقیق کو ملحوظ رکھا گیا ہو لیکن اگر طرز تفسیر یہ اختیار کیا گیا ہو کہ ایک خاص فقہی اور اجتہادی (اجماعی نہیں) مسلک کی روشنی میں اور اسی کی تائید میں تفسیر و تحقیق کی جائے گی تو ایسا مفسر تکلف و تعسف اور مسلکی و گروہی تعصب کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس امام الحنفیہ کا طرز تفسیر بھی یہی ہے اور اسی وجہ سے بہت سے مقامات پر غیر متبادر اور تکلفی تاویلات اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے لیکن بعض مقامات پر انہوں نے متصلب حنفی ہونے کے باوجود اعتدال و توازن کی باتیں بھی کی ہیں مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۸ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ پر امام جصاص نے عنوان قائم کیا ہے "باب کیفیة شهود الشهر" اور اس باب میں چاند دیکھنے کے بارے میں تفصیلی احکام بیان کئے ہیں جن میں سے ایک مسئلہ یہ بیان کیا ہے کہ اگر چاند کے مطلع کے نیچے بادل یا گرد و غبار یا کوئی دوسری رکاوٹ ہو یعنی اس کا مطلع صاف نہ ہو تو رمضان کا ثبوت ایک

عادل مرد کی گواہی سے بھی ہو سکتا ہے اور شوال وذوالحجہ کا ثبوت دو عادل گواہوں سے ہوتا ہے لیکن اگر چاند کا مطلع صاف ہو اور کوئی علت اور رکاوٹ موجود نہ ہو تو اس صورت میں رمضان' شوال اور ذوالحجہ تینوں کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ چاند کو "جماعت کثیرہ" نے دیکھا ہو جن کی شہادت اور خبر سے چاند ہو جانے پر علم اور یقین حاصل ہو جاتا ہو اور کوئی شک و شبہ باقی نہ رہتا ہو۔ اور امام ابو یوسف سے اس کے لئے ۵۰ کی حد بھی نقل کی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب یعنی ائمہ حنفیہ نے مطلع صاف ہونے کی حالت میں جماعت کثیرہ کی شہات اس لئے ضروری قرار دی ہے کہ رمضان' شوال اور ذوالحجہ کے چاند پر شرعی احکام موقوف ہیں اور سب لوگ چاند دیکھنے پر مامور اور مکلف ہیں اس لئے کہ اس سے تعلق رکھنے والے احکام پر سب لوگ مکلف ہیں اور مطلع صاف ہونے کی حالت میں جب عام لوگوں نے کوشش کے باوجود چاند نہیں دیکھا اور نفر یسیر یعنی تھوڑے سے لوگوں نے آکر گواہی دی کہ ہم نے دیکھا ہے تو عام لوگوں اور جماعت کثیرہ کا نہ دیکھنا اس بات کا قرینہ ہے کہ گواہی دینے والے یا تو غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں کسی اور چیز کو چاند سمجھ کر گواہی دیدی ہے یا پھر قصداً جھوٹی گواہی دی ہے۔ یہ ایک صحیح قاعدہ ہے جو تقاضائے عقل کے مطابق ہے اور اسی قاعدے کی بنیاد پر ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ جن احکام شرعیہ کی معرفت کے سب لوگ محتاج ہوں اور ان احکام کا تعلق عامۃ الناس سے ہو تو ایسے احکام کا ثبوت اخبار الآحاد سے نہیں ہو سکتا بلکہ ان کے ثبوت کے لئے استفاضہ ضروری ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کو جماعت کثیرہ نے نقل کیا ہو اس لئے کہ جب ان احکام کے مکلف عامۃ الناس ہیں تو لازماً رسول اللہ ﷺ نے ان کا بیان بھی عام لوگوں کے سامنے کیا ہو گا اور اس کے باوجود نقل کرنے والے راوی جماعت کثیرہ نہیں ہیں بلکہ چند لوگ ہیں تو یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ یاد رکھنے میں یا سمجھنے میں غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس قاعدے کی متعدد مثالیں اور ان کی تشریح و تفصیل میں بڑی اچھی بحث کی گئی

ہے۔(۱)

اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ :

"اگر کوئی اس قاعدے پر اعتراض کرے کہ اذان' اقامت' رکوع کی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھانا' عیدین کی تکبیرات اور ایام تشریق کی تکبیرات کا تعلق بھی تو عامۃ الناس سے ہے اس لئے کہ سب لوگ ان پر عمل کرنے کے مکلف ہیں مگر فقہاء کا ان احکام میں اختلاف ہے (مثلاً اذان میں ترجیع کرنا یا نہ کرنا' اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہنا یا دو دو مرتبہ کہنا' رکوع کے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنا یا نہ کرنا' عیدین کی نماز میں زائد تکبیروں کی تعداد اور تکبیرات تشریق ۱۰ ذوالحجہ کی عصر تک کہنا یا ۱۳ ذوالحجہ کی عصر تک کہنا) اور جو فقیہ بھی اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث نقل کرتا ہے تو وہ خبر واحد ہوتی ہے جسے استفاضہ اور تواتر حاصل نہیں ہوتا' اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ احکام عام لوگوں کے سامنے بیان نہیں کئے تھے بلکہ مخصوص لوگوں کے سامنے بیان کئے تھے باوجود اس کے کہ ان کا تعلق عامۃ الناس سے ہے تو اس صورت میں بھی آپ کا بیان کردہ یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے کہ جس چیز کی حاجت سب لوگوں کو ہو تو آپ اس کا ذکر بھی سب کے سامنے کرتے تھے اور اگر رسول اللہ ﷺ نے سب کے سامنے یہ احکام بیان کئے تھے مگر چند افراد کے علاوہ باقی لوگوں نے ان کو روایت نہیں کیا تو اس صورت میں بھی آپ کا یہ قاعدہ منہدم ہو جاتا ہے کہ جس چیز کا تعلق عامۃ الناس سے ہو تو اس کے ثبوت کے لئے عام لوگوں کا نقل کرنا ضروری ہوتا ہے تو اعتراض کرنے والے کو جواب دیا جائے گا کہ یہ اس شخص کا سوال ہے جس نے ہمارے بیان کردہ قاعدے کو سمجھا نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ ان احکام کے بارے میں ہے جو سب لوگوں پر فرض ہوں' سب لوگ اس فرض کی ادائیگی کے مکلف ہوں اور ان کا ترک کسی کے لئے جائز نہ ہو تو ایسے احکام کا بیان رسول اللہ ﷺ سب کے سامنے کرتے تھے اور ایسے

---

(۱) احکام القرآن ص ۲۴۹ تا ۲۵۲ ج ۱

فرض احکام کی فرضیت کے ثبوت کے لئے استفاضہ یعنی جماعت کثیرہ کا نقل کرنا ضروری ہے چند افراد یا چھوٹی جماعت کی روایت سے ان احکام کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی مگر جو احکام فرض نہ ہوں بلکہ لوگوں کو اختیار دیا گیا ہو کہ جو چاہیں کریں اور فقہاء کے درمیان ان احکام میں اختلاف افضلیت اور غیر اولویت میں ہو تو ایسے احکام کا سب لوگوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ ذکر بھی نہیں کرتے تھے اور ایسے احکام کے ثبوت کے لئے اخبار الآحاد بھی کافی ہیں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم جواز کے لئے اور لوگوں کو اختیار دینے کے لئے سب منقولہ طریقوں پر عمل کیا تھا کسی نے ایک طریقہ نقل کر دیا' کسی نے دوسرا طریقہ نقل کر دیا اور کسی نے تیسرا طریقہ نقل کر دیا تو اذان' اقامت' تکبیرات العیدین' تکبیرات تشریق اور اس قسم کے دوسرے وہ امور جن میں ہم کو اختیار دیا گیا ہے کہ منقولہ طریقوں میں سے جس پر چاہیں عمل کریں اور فقہاء کے درمیان ان میں اختلاف افضلیت میں ہے فرضیت اور عدم فرضیت میں نہیں ہے ان کا ثبوت اگر اخبار الآحاد سے ہو جائے تو کافی ہے۔"(۱)

یہ ساری بحث انصاف اور اعتدال پر مبنی تحقیقی بحث ہے اور اس میں انہوں نے حنفیت کے لئے تکلف نہیں کیا اس لئے کہ حنفیہ کا متداول مسلک تو یہ ہے کہ رکوع کے وقت ہاتھ اٹھانا منسوخ ہے اور مکروہ ہے مگر امام جصاص نے رفع الیدین کے مسئلے میں بھی فقہاء کے اختلاف کو اولی اور غیر اولی کا اختلاف قرار دیا ہے' بہر حال آیات سے احکام معلوم کرنے کے لئے امام جصاص کی احکام القرآن بڑی مفید کتاب ہے اور اہل علم میں مقبول اور متداول ہے۔

جصاص کی احکام القرآن دار احیاء التراث الاسلامی بیروت نے ۱۹۵۸ء میں ۵ جلدوں میں شائع کی ہے۔

(۱) احکام القرآن ص۲۵۳ ج۱

(۲) احکام القرآن للکیا الهراسی متوفی ٥٠٤ھ:

ہراسی کا نام علی بن محمد بن علی الطبری ہے' اس کا کنیہ ابو الحسن ہے اور لقب عماد الدین ہے مگر "الکیاالہراسی" کے نام سے مشہور ہے۔

ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

ابو الحسن علی بن محمد بن علی طبری کا لقب عماد الدین تھا مگر یہ الکیاالہراسی کے نام سے مشہور ہیں فقہ شافعی کے فقیہ تھے۔ اصل میں تو طبرستان سے تعلق رکھتے تھے مگر نیشاپور چلے گئے تھے اور کافی مدت تک امام الحرمین الجوینی سے علم فقہ حاصل کرتے رہے تھے یہاں تک کہ اس فن میں کمال تک پہنچ گئے۔ ان کا چہرہ خوبصورت تھا' آواز بلند تھی' اور باتیں فصیح اور میٹھی کرتے تھے' امام الحرمین سے فقہ حاصل کر کے نیشاپور سے بیہق چلے گئے اور کچھ مدت تک یہاں تدریس کرتے رہے۔ اس کے بعد عراق تشریف لے گئے اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس مقرر ہو گئے یہاں تک کہ بغداد ہی میں وفات پا گئے امام جوینی کے شاگرد حافظ عبدالغافر بن اسماعیل فارسی متوفی ۵۲۹ھ نے اپنی کتاب "سیاق تاریخ نیشاپور" میں لکھا ہے کہ جو تلامذہ امام الحرمین کے کلام دہرانے اور پہنچانے والے تھے۔ ہراسی ان کے رئیسوں میں شامل تھے' امام الحرمین کے شاگردوں میں امام غزالی کے بعد ان کا درجہ ہے بلکہ خوش آوازی کی وجہ سے یہ ان سے بہتر تھے اس کے بعد یہ ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے مجد الملک برکیاروق کے دربار سے منسلک ہو گئے بہت سا مال و جاہ کمایا اور سلجوقی سلطنت میں منصب قضا پر فائز ہو گئے' یہ محدث تھے اور اپنے مناظروں اور مباحثوں میں اور اپنی مجالس میں احادیث کا استعمال زیادہ کرتے تھے' حافظ ابو طاہر سلفی کہتے ہیں کہ میں نے ۴۹۵ھ میں بغداد میں اپنے استاذ الکیاالہراسی سے ایک مسئلے کے بارے میں استفتا کیا جو ان دنوں مدرسہ نظامیہ میں میرے اور دوسرے فقہاء کے درمیان موضوع بحث تھا وہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرے مال کا تیسرا حصہ علماء اور فقہاء کو دیدیا جائے تو کیا اس میں احادیث

لکھنے اور یاد کرنے والے شامل ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے نیچے ہراسی نے لکھا ہے کہ ہاں شامل ہیں اور کیوں شامل نہیں ہوں گے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس نے میری امت میں سے دین سے تعلق رکھنے والی چالیس احادیث یاد کی ہوں تو اللہ تعالی قیامت کے روز اس کو فقیہ اور عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا۔"(۱)

ابن خلکان آگے لکھتے ہیں کہ الکیا کی ولادت ذوالقعدہ ۴۵۰ھ میں ہوئی تھی اور وفات محرم ۵۰۴ھ میں بغداد میں ہوئی تھی اور شیخ ابواسحٰق شیرازی کے مقبرے میں دفن ہوئے تھے، مجھے علم نہیں ہے کہ اس کو الکیا کس وجہ سے کہا جاتا ہے؟ عجمی لغت میں تو الکیا معزز شخص اور مرتبے کے لحاظ سے لوگوں میں آگے نکل جانے والے کو کہا جاتا ہے یہ لفظ کاف کی زیر یاء کی زبر بلا شد اور الف کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔(۲)

الکیا کے عجمی معنے تو ابن خلکان نے بیان کر دیئے لیکن "ھراسی" کی وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی خیال تھا کہ شاید کسی شہر یا جگہ کا نام ہو مگر معجم البلدان دیکھی تو اس میں یہ لفظ باب الہاء مع الراء کے باب میں نہیں مل سکا اور جب لغت کی کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ ھراس بروزن فعال شیر کو بھی کہتے ہیں اور "ہریسہ" بنانے والے یا بیچنے والے کو بھی کہتے ہیں ہریسہ ایک قسم کا کھانا ہے جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں سے تیار کیا جاتا تھا اور دور نبوی میں بھی مروج تھا اور ہراس بغیر شد کے کانٹے دار درخت کو بھی کہتے ہیں۔ معلوم نہیں کس وجہ سے اس فقیہ کو ہراسی کہا جاتا ہے بہر حال وجہ جو بھی ہو یہ الکیا الہراسی کے نام سے اہل علم کے درمیان معروف ہے۔ وجہ تسمیہ معلوم کرنا مفید تو ہوتا ہے مگر ضروری نہیں ہوتا۔ ہراسی کی احکام القرآن مسلک شافعی کی تائید میں لکھی گئی ہے اور مسلکی تعصب اس میں بھی پایا جاتا ہے اور بعض مقامات پر انہوں نے امام جصاص پر حملے بھی کیے ہیں۔ انہوں نے کتاب کی ابتداء میں

---

(۱) وفیات الاعیان لابن خلکان ص۲۸۶۔۲۸۷ج۳

(۲) وفیات الاعیان لابن خلکان ص۲۸۹ج۳

خود لکھا ہے کہ میں نے یہ تفسیر امام شافعی کی آراء کی تائید اور تشریح کے لئے لکھی ہے :

میں نے جب متقدمین اور متاخرین کے مذاہب اور آراء میں غور کیا اور ان کے مطالب ومباحث کو ملاحظہ کیا تو میں نے ان میں سے امام شافعی کے مسلک کو زیادہ صحیح اور قوی پایا اور اچھی راہنمائی اور وضاحت کرنے والا پایا' ان کی سوچ اور فکر بڑے بڑے آراء اور مباحث میں ظن و تخمین سے ترقی کر کے حق ویقین کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب اور آراء کو کتاب اللہ سے مستنبط کیا ہے اور ان کو اللہ تعالی نے کتاب اللہ کے بحر ناپید اکنار سے علوم واحکام کے موتی نکالنے کے لئے علمی اسباب اور صلاحیتیں اتنی زیادہ عطا کی تھیں جس طرح ذوالقرآن کو حکومت چلانے اور فتوحات حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ اسباب عنایت فرمائے تھے۔ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو میں نے احکام القرآن میں ایسی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کر لیا جس میں امام شافعی کی ان آراء کی تشریح کی گئی ہو جو انہوں نے دلائل سے اخذ کئے ہیں اور ان کے ساتھ ان آراء کو بھی ملا دیا ہے جو میں نے اپنی طاقت اور کوشش کے مطابق انہی کے طرز پر اخذ کئے ہیں۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جو امام شافعی کے طرز استدلال کو سمجھنے سے عاجز ہیں اور ان کے اغراض و مقاصد تک پہنچ نہیں سکے ہیں اور انہوں نے اپنی کم فہمی کو امام شافعی پر نقد و جرح کا ذریعہ بنا لیا ہے۔(۱)

اس عبارت سے ان کا منہج معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلکی طرز تفسیر ہے اور اس کے بین السطور میں مسلکی تعصب بھی صاف طور پر نظر آرہا ہے' لیکن ان خامیوں کے باوجود فقہ شافعی کو سمجھنے کے لئے یہ اچھی کتاب ہے۔ احکام القرآن کے نام سے ایک کتاب خود امام شافعی کی طرف بھی منسوب ہے لیکن وہ دراصل امام بیہقی کی تصنیف ہے۔ ہراسی کی احکام القرآن دار الکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۸۵ء میں دو جلدوں میں شائع کی ہے۔

---

(۱) الاحکام للهراسی ص ۲ ج ۱

(۳) احکام القرآن لابن العربی متوفی ۵۴۳ھ:

ابن العربی کا نام محمد بن عبداللہ بن محمد ہے' کنیہ ابوبکر ہے مگر ابن العربی کے نام سے مشہور ہیں۔ اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس کو ابن عربی اندلسی اشبیلی بھی کہا جاتا ہے۔ قاضی ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔ ابن بشکوال نے اپنی کتاب "الصلہ" میں لکھا ہے کہ ابن العربی حافظ تھے' علم کا سمندر تھے' اندلس کے علماء' ائمہ اور حفاظ کا ختام تھے۔ (یعنی اندلس میں اس پر ائمہ کا اختتام ہو گیا تھا) میں ۲ جمادی الآخرہ ۵۱۰ھ میں سوموار کے دن چاشت کے وقت اشبیلیہ میں ان سے ملا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میں اپنے والد کے ساتھ ۴۸۵ھ میں مشرق (مصر) کے سفر پر نکلا تھا اور شام بھی گیا تھا۔ شام میں ابوبکر طرطوشی سے فقہ کا علم حاصل کیا تھا' بغداد بھی گیا تھا اور بغداد کے ممتاز مشائخ سے حدیث کا سماع کیا اور علوم حاصل کئے' پھر ۴۸۹ھ میں حجاز گیا اور حج کیا' حج کے بعد واپس بغداد آئے اور ابوبکر شاشی' امام غزالی اور دوسرے علماء و ادباء کی صحبت اختیار کی' مصر اور اسکندریہ میں بھی محدثین کی ایک جماعت کی صحبت کا شرف بھی ان کو حاصل ہوا تھا۔ ان سے استفادہ کیا تھا اور ان کو بھی فائدہ پہنچایا تھا۔ ۴۹۳ھ میں علوم کثیرہ کے ساتھ اشبیلیہ واپس آئے' ابن عربی مختلف علوم و فنون میں مہارت اور تجربہ رکھتے تھے اور ان کی تعلیم و اشاعت میں حریص بھی تھے' ذہین تھے' آداب و اخلاق' حسن معاشرت' سخاوت و شرافت نفس کی صفات سے متصف تھے۔ وعدے کے پابند تھے اور دوستی نبھانے والے تھے' اشبیلیہ میں قاضی مقرر ہوئے تو لوگوں کو اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا اس لئے کہ وہ احکام شرعیہ کی تنفیذ میں بڑے سخت تھے اور ظالموں پر ان کی بڑی ہیبت طاری رہتی تھی۔ پھر قضا کی ذمہ داری سے الگ ہو گئے اور تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ان سے تاریخ ولادت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں ۲۲ شعبان ۴۶۸ھ میں جمعرات کی رات کو پیدا ہوا تھا اور ان کی وفات ربیع الثانی ۵۴۳ھ کو

ہوئی تھی اور فاس شہر میں دفن ہوئے تھے۔ابن بشکوال کی بات ختم ہوئی۔(۱)

حافظ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے لکھا ہے کہ :

و تخرّجَ بالإمام أبی حامد الغزّالی والعلّامه ابی زکریا التّبریزی والفقیهِ ابی بکر الشاشی و جمع وصنّف و برع فی الأدبِ والبلاغةِ و بعُد صیتُه' .... و کان متبحرًا فی العِلَلِ ثاقبَ الذّهنِ کریمَ الشّمائلِ کثیر الأموالِ ولّی قضاءَ اشبیلیه فحُمِد و أجادَ السّیاسةَ و کانَ ذا شدّةٍ و سطوةٍ.(۲)

"ابن عربی امام غزالی علامہ ابو زکریا تبریزی اور فقیہ ابو بکر شاشی کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل ہیں اور ان کی مجالس علمیہ کے فضلاء میں سے ہیں۔انہوں نے معلومات جمع کیں' تصنیفات کیں' ادب اور بلاغت میں کمال حاصل کیا اور دور دور تک ان کے علم کی شہرت پہنچی .... علم میں گہرے دریا کی طرح تھے' چمکتا ہوا ذہن رکھتے تھے' اچھے اخلاق کے حامل تھے اور اللہ نے ان کو اموال کی کثرت سے بھی نوازا تھا۔جب اشبیلیہ کے قاضی مقرر ہوئے تو لوگوں نے اس کی تعریف کی اور انہوں نے بڑی اچھی سیاست کی تھی (بہترین نظم و نسق چلایا تھا) قضاء میں شدت اور رعب و ہیبت والے تھے۔"(احکام شرعیہ کے نفاذ میں اور مظلوم کو حقوق دلوانے میں سخت گیر تھے)

حافظ عماد الدین ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے ان کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں :

الفقیه ابوبکر بن العربی المالکیُّ شارحُ التّرمذیّ کانَ فقیهًا عالمًا و زاهدًا عابدًا و سمعَ الحدیثَ بعْدَ اشتغالِه فی الْفقهِ و صحبَ الْغزالیَّ و اخذَ عنْهُ و کانَ یتّهمُه' برأی الْفلاسفةِ و یقولُ دخلَ فی اجوافِهمْ فلمْ یخرجْ منها واللہ اعلم.(۳)

---

(۱)وفیات الاعیان لابن خلکان ص۲۹۶۔۲۹۷ ج٤

(۲)تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص۱۲۹۵ ج٤

(۳)البدایہ والنہایہ ص۲۲۸۔۲۲۹ ج۱۲

"فقیہ ابن العربی مالکی تھے' ترمذی کے شارح تھے' فقیہ اور عالم تھے' زاہد اور عابد تھے' انہوں نے فقہ میں مشغول ہونے کے بعد حدیث کا سماع کیا تھا' غزالی کی صحبت میں رہے تھے اور ان سے علوم حاصل کئے تھے مگر فلاسفہ کی رائے کی طرف میلان کی وجہ سے ان پر اعتراض بھی کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ امام غزالی فلاسفہ کے پیٹوں میں داخل ہو گئے تھے مگر پھر ان سے نکل نہیں سکے تھے۔ واللہ اعلم"

قاضی ابن العربی کے شاگردوں میں قاضی عیاض اور ابو القاسم سہیلی جیسے ائمہ حدیث بھی شامل ہیں اور انہوں نے شاگردوں کے علاوہ بہت مفید تصانیف بھی علمی میراث میں چھوڑی ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :

ا۔ احکام القرآن (۲) عارضۃ الاحوذی شرح ترمذی (۳) الناسخ والمنسوخ (۴) العواصم من القواصم (۵) القبس فی شرح مؤطا ابن انس (۶) المسالک علی مؤطا مالک (۷) الانصاف فی مسائل الخلاف (۸) المحصول فی اصول الفقہ (۹) اعیان الاعیان (۱۰) قانون التاویل۔

ان میں سے ابتدائی چار کتابیں تو مطبوعہ ہیں اور متداول ہیں۔

حافظ شمس الدین داوودی متوفی ۹۴۵ھ نے لکھا ہے کہ :

"ابن العربی نے اپنی کتاب القبس فی شرح مؤطا ابن انس میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "انوار الفجر فی تفسیر القرآن" اس کتاب کو میں نے ۲۰ سال میں مکمل کیا ہے اور یہ ۸۰ ہزار ورقوں پر مشتمل ہے۔ شیخ برہان الدین فرحون نے کہا ہے کہ مجھے شیخ ابو الربیع برغواطی نے مدینہ منورہ میں ۷۶۱ھ میں بتایا تھا کہ ان کو شیخ یوسف الحزام مغربی نے اسکندریہ میں ۷۶۰ھ میں بتایا تھا کہ میں نے ابن العربی کی تفسیر انوار الفجر پوری کی پوری دیکھی ہے۔ یہ کتاب میں نے امیر المسلمین ابو عنان بن امیر المسلمین ابو سعید کے خزانے (یعنی کتابوں کے مخزن) میں دیکھی تھی اور اس وقت سلطان ابو عنان مراکش کے شہر میں تھے' سلطان کا کتب خانہ سفر میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا اور میں ایک جماعت کے

ساتھ کتابوں کی پیکنگ اور ان کو اٹھانے کی خدمت پر مامور تھا' میں نے جب اس کی جلدیں شمار کیں تو تعداد ۸۰ جلدوں کو پہنچ گئی اور کتاب پوری تھی ناقص نہیں نہیں تھی' ابو الربیع کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ خبر دینے والا شخص یوسف الحزام ثقہ' سچ بولنے والا اور نیک آدمی ہے اور ہمیشہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتا ہے۔"(۱)

ابن العربی کی احکام القرآن میں تطویل واطناب نہیں ہے بلکہ مختصر اور کلمات جامعہ پر مشتمل تفسیر ہے' ترتیب بھی بہت زیادہ اچھی اور آسان ہے' ہر سورہ کے آغاز میں بتا دیتا ہے کہ اس سورت میں آیات الاحکام کی تعداد اتنی ہے اور پھر المسئلۃ الاولی' المسئلۃ الثانیہ الی الآخر کے عنوانات کے تحت ہر آیت سے متعلق احکام و مسائل بیان کرتا ہے۔ اکثر تو امام مالک کے مسلک کو ترجیح دیتا ہے مگر بعض مسائل میں امام مالک کی رائے کے مقابلے میں اپنی الگ رائے بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کے مسائل میں سے المسئلۃ الثانیہ کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے نزدیک مقتدی بھی فاتحہ پڑھے گا اگر اس نے نہ پڑھی تو اس کو نماز کا کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا۔ لیکن ہمارے علماء مالکیہ کے اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ ابن القاسم کا قول یہ ہے کہ صرف سری نماز میں مقتدی فاتحہ پڑھے گا' ابن وہب اور اشہب کا قول یہ ہے کہ سری میں بھی نہیں پڑھے گا اور ابن عبد الحکم کا قول یہ ہے کہ پڑھنا مستحب اور افضل ہے لیکن اگر نہ پڑھی ہو تو نماز ہو جائے گی۔ (مؤطا امام مالک میں یہی قول نقل ہوا ہے اور مالکیہ کا متداول مسلک یہی ہے) مگر میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ سری نماز میں مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور جہری نماز میں جب امام کی قراءت سن رہا ہو تو فاتحہ پڑھنا حرام ہے اس لئے کہ اس حالت میں مقتدی کو خاموش رہ کر قراءت سننے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر مقتدی دور کھڑا ہو اور قراءت سن نہ سکتا ہو تو اس کے لئے جہری نماز سری نماز کی طرح ہے۔(۲)

---

(۱) طبقات المفسرین ص۱۶۹ تا ۱۷۰ ج ۲

(۲) احکام القرآن ص ۱۰ ج ۱

اس قسم کی اور مثالیں بھی احکام القرآن میں موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلے میں امام مالک اور مالکیہ کے مسلک کا التزام ضروری نہیں سمجھتے تھے' ابن عربی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اسرائیلی روایات اور ضعیف روایات سے بہت زیادہ نفرت کرتے تھے۔ فقہ مالکی کے معتمد ائمہ فقہ میں شامل ہیں۔ قرطبی میں بھی ان کے حوالے بکثرت موجود ہیں۔ ابن العربی کی احکام القرآن دارالکتب العلمیہ بیروت نے ۱۹۸۸ء میں چار جلدوں میں شائع کی ہے اور ذیل میں احادیث کی تخریج بھی کی گئی ہے۔

میری پسندیدہ تفاسیر

عربی کی جن ۳۳ تفاسیر اور ان کے مصنفین کا تعارف اس باب میں کرایا گیا ہے یہ سب اپنی جگہ اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں اور یہ سب میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور تفسیر و تحقیق کے دوران نہ صرف ان سے بلکہ ان کے علاوہ دوسری تفاسیر سے بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا رہتا ہوں لیکن جو تفاسیر اکثر میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں اور جو میری پسندیدہ تفاسیر ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) تفسیر ابن جریر جوام التفاسیر ہے۔

(۲) تفسیر ابن کثیر جو دراصل ابن جریر کی تلخیص ہے مگر اس میں روایات کی صحت و عدم صحت پر بحث کی جاتی ہے اور اسرائیلی روایات پر نقد و جرح کی جاتی ہے۔

(۳) تفسیر قرطبی جس میں جامعیت بھی ہے اور احکام شرعیہ کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔

(۴) تفسیر مدارک التنزیل اختصار کے باوجود اس کی افادیت بہت زیادہ ہے۔

(۵) احکام القرآن للجصاص حنفی مسلک کے دلائل معلوم کرنے کے لئے مفید ہے۔

(۶) احکام القرآن لابن العربی حسن ترتیب اور حسن بیان کے اعتبار سے جصاص کی احکام القرآن پر فوقیت رکھتی ہے اور اختصار کے باوجود بڑی افادیت رکھتی ہے۔

مسائل کی تحقیق و تنقیح کے دوران امام رازی کی تفسیر کبیر' ابن عطیہ کی المحرر الوجیز' علامہ آلوسی کی روح المعانی اور تفسیر بیضاوی کی جانب بطور خاص مراجعت کرتا ہوں۔

اردو زبان میں قرآن کی تفسیریں

اردو زبان کی جو تفاسیر اکثر میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی :

میں نے سب سے زیادہ استفادہ بیان القرآن سے کیا ہے' اس میں پہلے عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے جو محاوراتی ترجمانی نہیں ہے بلکہ اس میں لفظی ترجمے کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ محاورے ہر علاقے کے الگ الگ ہوتے ہیں اس لئے جس علاقے میں وہ محاورہ مشہور نہ ہو اس علاقے کے لوگ محاوراتی ترجمانی سے قرآن کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس کے علاوہ لفظی ترجمے کے اندر جو معنویت ہوتی ہے وہ ترجمانی سے پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ف لکھ کر جامع قسم کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے اور اس میں شبہات کے ازالے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر کوئی شبہہ اور اشکال پھر بھی رہ گیا ہو تو اس کا جواب حاشیئے میں دیدیا گیا ہے۔ سورتوں اور آیات کے باہمی ربط بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے اور آیات سے مستنبط ہونے والے ضروری مسائل کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ بیان القرآن کی ایک امتیازی خصوصیت اور بڑی خوبی یہ ہے کہ مضمون واحد سے تعلق رکھنے والی آیات کے آغاز میں ایک جامع قسم کا عنوان لکھ دیا گیا ہے جس سے ان آیات کا حاصل مفہوم ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ ان عنوانات کے ذریعے سورتوں کے مضامین کا خلاصہ بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ تصوف اور سلوک کے جو مسائل آیات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کا ذکر بھی ذیل میں مسائل السلوک کے نام سے کر دیا گیا ہے۔ حضرت تھانوی کو چونکہ تمام علوم و فنون میں پختگی اور رسوخ حاصل تھا اس لئے ان کے ترجمے اور تفسیر میں مختلف علوم و فنون کے لطائف و دقائق کو ملحوظ رکھا گیا ہے البتہ مولانا تھانوی کی اس تفسیر میں فنی زبان کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور اردو بھی بالعموم پرانی استعمال کی گئی ہے اس لئے عام اردو دان لوگوں کے لئے اس سے

استفادہ کرنے میں دقت پیش آسکتی ہے مگر اس کی تلافی مفتی محمد شفیع مرحوم کی معارف القرآن سے ہو جاتی ہے۔ معارف القرآن میں پہلے بیان القرآن کا خلاصہ تفسیر نقل کیا گیا ہے اور اس کے بعد معارف و مسائل کے زیر عنوان آسان اور عام فہم زبان میں تفسیر کی گئی ہے اور احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۲) معارف القرآن از مولانا مفتی محمد شفیعؒ:

معارف القرآن دراصل بیان القرآن ہی کی تسہیل ہے لیکن اردو دان طبقے کے عوام اور خواص دونوں کے لئے یہ تفسیر اس لئے زیادہ افادیت رکھتی ہے کہ اس میں الفاظ و کلمات کے معانی عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں اور آیات سے ثابت ہونے والے احکام شرعیہ اور دوسرے معارف و مسائل کی تحقیق و تنقیح بھی بڑے اچھے اسلوب بیان میں کی گئی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے ۲۶ سال تک دارالعلوم دیوبند میں تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دی ہیں اور علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا اعزاز علی جیسے راسخ العلم اکابر کے تلمذ اور صحبت کا شرف بھی ان کو حاصل ہے اس لئے ان کے معارف و مسائل میں بڑی گہرائیت اور پختگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس دینیہ اور مراکز علمیہ کے متعلمین اور معلمین دونوں معارف القرآن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں بھی بیان القرآن کے بعد معارف القرآن سے زیادہ استفادہ کرتا ہوں۔ بعض مباحث سے اتفاق کرنا میرے لئے بھی مشکل ہو جاتا ہے اور ان کی ہر بات سے اتفاق کرنا ضروری بھی نہیں ہے لیکن بحیثیت مجموعی میرے نزدیک یہ اردو کی بہترین تفسیر ہے۔

(۳) تفہیم القرآن از مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ متوفی ۱۹۷۹ھ :

مولانا مودودیؒ کا تعارف

مفکر اسلام مولانا مودودی کی ولادت ۳ رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو حیدر آباد دکن کے مشہور شہر اورنگ آباد میں ہوئی تھی اور ۱۹۷۹ء میں ۷۶ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی تھی۔

مولانا مودودی کے والد مولوی سید احمد حسن مرحوم ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے تھے' علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خان رشتہ میں ان کے ماموں لگتے تھے چنانچہ سر سید نے ان کو اپنے مدرسے میں داخل کروادیا اور انہوں نے ایف اے تک تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی اور پھر الٰہ آباد جاکر وکالت کی تعلیم حاصل کی جس کے لئے اس زمانے میں گریجویٹ ہونا شرط نہیں تھا۔ وکالت کی سند لینے کے بعد مختلف شہروں میں پریکٹس کرنے کے بعد اورنگ آباد میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے اور ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۸۹۷ء کو ۴۲ سال کی عمر میں انہوں نے مولانا محی الدین خان صاحب سے بیعت کی اور ان کی صحبت سے ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ انگریزی وضع قطع چھوڑ دی' داڑھی رکھ لی' کبائر سے توبہ کی اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ادعیہ و اذکار کا اہتمام بھی بمعہ گریہ وزاری کے شروع کر دیا' مولوی محی الدین خان صاحب مولوی رشید الدین خان کے صاحبزادے تھے اور مولوی رشید الدین خان مولوی مملوک علی خان کے استاد تھے اور مولوی مملوک علی خان وہ بزرگ ہیں جن سے مولانا احمد علی سہارنپوری' مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا رشید احمد گنگوہی اور دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے بزرگوں کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ مولانا مودودی کی ولادت کے چھ ماہ بعد ان کے والد مولوی سید احمد حسن نے وکالت کا پیشہ ترک

کر دیا۔ وکالت کے زمانے میں جو کچھ کمایا تھا اس سے بھی دست بردار ہو گئے اور دہلی جا کر مقبرہ ہمایوں کے قریب ایک گاؤں میں فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے جس کو "عرب سرائے" کہتے تھے' مولانا مودودی کے جد اعلیٰ جس سے آپ کا خاندانی نام وابستہ ہے خواجہ قطب الدین مودود چشتی تھے جس نے سلطان سنجر بن ملک شاہ کے دور حکومت میں ۵۲۷ھ میں ۹۷ سال کی عمر میں وفات پائی تھی۔ ان کی اولاد میں خواجہ مودود ثانی وہ پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان تشریف لائے تھے۔ خواجہ مودود ثانی کے پوتے حضرت شاہ خواجگی واپس اپنے آبائی وطن چشت تشریف لے گئے اور وہاں پر شاہ خراسان نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دی جن کے بطن سے ۱۸۷۹ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی رکھا گیا اور یہی ابوالاعلیٰ مودودی سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے۔ سکندر لودھی اس زمانے میں راجہ نرور سے جنگ میں مصروف تھے۔ ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس جنگ میں شریک ہو گئے اور اتفاق سے انہی کے تیر سے راجہ نرور قتل ہو گئے۔ سکندر لودھی نے انعام میں قصبہ براس بمعہ ۱۲ گاؤں کے ان کی جاگیر میں دیدیا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی اولاد میں خواجہ کرم الٰہی پہلے شخص تھے جن کا تعلق دہلی سے قائم ہوا کیونکہ ان کی شادی ایک شیخ طریقت شاہ محمد امان صاحب کی بیٹی سے ہو گئی تھی اور خواجہ کرم الٰہی کی تیسری پشت میں مولانا مودودی کے والد مولوی سید احمد حسن تھے جس کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی۔(۱)

یہ تو تھے مولانا مودودی کے خاندانی کوائف جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خاندان اولیاء کرام اور بزرگان دین کا خاندان ہے اور یہ بہت بڑا شرف اور اعزاز ہے۔

اب مولانائے مرحوم کی تعلیم کے بارے میں مختصر معلومات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مولانا مودودی نے ابتدائی تعلیم حسب روایت گھر پر حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۶ء میں تیرہ سال کی عمر میں مولوی کا

(۱) مولانا مودودی کی خود نوشت یادداشتیں وثائق مودودی شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور ص ۹۷

امتحان پاس کیا جو میٹرک کے مساوی تھا۔ اس مدرسے میں مولوی کا نصاب یہ تھا۔

(۱) صرف ' نحو ' ادب ' منطق ' قوانین (۲) فقہ و فرائض (۳) سائنس و جبر و مقابلہ (۴) انگریزی ادب (۵) انگریزی گرائمر و مضمون نگاری (۶) انگریزی سے اردو ترجمہ (۷) عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ (۸) اقلیدس و مساحت۔ سرٹیفیکیٹ کی عبارت یہ ہے:

تصدیق کی جاتی ہے کہ ابو الاعلیٰ بن سید احمد حسن صاحب طالب علم مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ اورنگ آباد امتحانات علوم والسنہ مشرقیہ دولت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کے امتحان مولوی میں بمقام بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد دکن بدرجہ دوم کامیاب ہوا اور اس کا نمبر بسلسلہ کامیاباں ۶ ہے 'کمشنر امتحانات وناظم تعلیمات دولت آصفیہ۔(۱)

(۲) ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۲۶ء کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ۲۲ سال کی عمر میں مولانا محمد شریف اللہ خان مدرس مدرسہ دار العلوم فتح پوری دہلی سے علوم عقلیہ و ادبیہ وبلاغت اور علوم اصلیہ و فرعیہ میں سند فراغت حاصل کی تھی (یہ دار العلوم فتح پوری کی سند نہیں ہے بلکہ مولانا محمد شریف اللہ مرحوم نے شخصی طور پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی جس کی حیثیت اہل علم کے نزدیک مدرسے کی سند سے زیادہ ہوتی ہے) یہ سند عربی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ اس طرح ہے:

"حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد۔ علوم اپنے فنون اور انواع کی کثرت کے باوجود اپنے اندر بلند ترین مطالب اور مفید ترین مقاصد رکھتے ہیں' اللہ نے اپنے بندوں میں سے ان لوگوں پر احسان کیا ہے جنہوں نے ان علوم کے طلب کرنے اور ان کو حاصل کرنے کا اہتمام کیا ہو اور جو ان کو کامل طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ ان طالب علموں میں سے ایک وہ ہے جو انسانی فضائل پر حاوی ہے اور اونچی سیڑھیوں پر چڑھ گیا ہے اس نے علوم عقلیہ '

(۱) اصلی سرٹیفیکیٹ کے عکس کے لئے ملاحظہ کیجئے وثائق مودودی ص ۱۱

عقلیہ اور ادبیہ کی آخری کتابیں انتہائی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھ لی ہیں اور جو کتابیں اس نے مجھ سے پڑھی ہیں ان میں یہ براعت و کمال کو پہنچ گیا ہے' اور یہ طالب علم فاضل ہے' ذہین ہے' روشن ذہن والا ہے' تیز فہم والا ہے۔ (مولانا شریف اللہ نے اَلفَاضِلُ الذَّکِیُّ وَ الْمُتَوَقِّدُ الْاَلْمَعِیُّ کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کا میں نے لفظی مگر عام فہم ترجمہ کیا ہے) اس کا نام مولوی ابوالاعلی مودودی ہے۔ یہ جب مرتبہ کمال کو پہنچا تو اس نے مجھ سے علوم عقلیہ' ادبیہ' بلاغت اور باقی علوم اصلیہ و فرعیہ میں عام اجازت طلب کی۔ میں نے اس کی درخواست اور خواہش پوری کر دی' مجھے امید ہے کہ یہ اپنے تمام اوقات میں مجھے اپنی نیک دعاؤں میں نہیں بھولے گا۔ میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ خفیہ مجالس اور کھلی مجالس دونوں میں تقویٰ اختیار کریں اور کتاب اللہ و سنن رسول اللہ کی متابعت کریں اور میں اپنے آپ کو بھی وصیت کرتا ہوں و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین محمد و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔

یہ سند اور اجازت لکھی ہے ایک حقیر بندے نے جو اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے' جس کا نام محمد شریف اللہ ہے اور مدرسہ فتح پوری دہلی کا مدرس ہے۔

فقط

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ۔(۱)

(۳) ۱۹۲۷ء میں مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی سے حدیث' فقہ اور ادب میں سند فراغت حاصل کی تھی (یہ سند بھی مولانا اشفاق الرحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی جس کی بڑی اہمیت ہے) سند عربی میں ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

(۱) اصل سند کے عکس کے لئے ملاحظہ کیجئے وثائق مودودی ص ۱۲

حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد :

ہمارے دینی بھائی سید ابو الاعلیٰ مودودی نے مجھ سے حدیث ' فقہ اور ادب کے علوم پڑھے ہیں اور میں نے ابتدائی کتابیں خانقاہ امدادیہ میں پڑھی ہیں اور اس کے بعد میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوا اور باقی کتابیں اس مدرسے میں پڑھی تھیں اور سند بھی میں نے اسی مدرسے سے حاصل کی تھی۔ جب اس شیخ نے (ابو الاعلیٰ مودودی نے) مجھ سے ان فنون کے علماء کے نزدیک شرائط معتبرہ کے مطابق سند اور اجازت طلب کی تو میں نے یہ لکھا ہوا کاغذ سند کے طور پر اسے دیدیا' یہ الحمد للہ نیک ' ذہین اور صاحب کمال نوجوان ہے اور تدریس و افادہ کا اہل ہے میں اس کو پوشیدہ اور کھلی دونوں مجالس میں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ وصیت بھی کرتا ہوں کہ یہ مجھے اپنی خلوت اور جلوت دونوں کی دعاؤں میں نہیں بھولیں گے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

یہ سند اشفاق الرحمٰن کاندھلوی نے لکھا ہے جو مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس ہے۔(۱)

(۴) ۱۹۲۸ء میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی مدرس مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی سے جامع ترمذی اور مؤطا امام مالک کے سمع و قراءت کی تکمیل کے بعد سند فراغت حاصل کی تھی (یہ سند بھی مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے) سند عربی میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد :

ہمارے دینی بھائی سید ابو الاعلیٰ مودودی نے میرے سامنے جامع ترمذی اور مؤطا امام مالک دونوں کتابیں پڑھی تھیں اور میں نے یہ دونوں کتابیں پڑھی تھیں مدرسہ سہارنپور میں شیخ خلیل احمد سے اور اس کے بعد مولانا خلیل احمد کی سند ابو عیسیٰ ترمذی اور امام مالک تک مفصل

(۱) اصل سند کے عکس کے لئے ملاحظہ کیجئے وثائق مودودی ص ۱۳

طور پر لکھی گئی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ :

جب اس شیخ نے (ابوالاعلیٰ مودودی نے) اس فن کے علماء کے نزدیک شرائط معتبرہ کے مطابق مجھ سے سند اور اجازت طلب کی تو میں نے اسے یہ لکھا ہوا کاغذ سند کے طور پر دیدیا' یہ نوجوان الحمد للہ نیک' ذہین اور صاحب کمال ہے اور درس وافادہ کا اہل ہے میں اسے خفیہ اور کھلی دونوں مجالس میں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ وصیت بھی کرتا ہوں کہ یہ مجھے اپنی خلوت و جلوت دونوں کی دعاؤں میں نہیں بھولیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

یہ سند اشفاق الرحمٰن کاندھلوی نے لکھی ہے جو مدرسہ فتح پوری دہلی کے مدرس ہیں۔(۱)

وثائق دراصل مجلہ تذکرہ سید مودودی کا الحاقیہ ہے جو ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ وثائق مودودی میرے کتب خانے میں بھی موجود ہے اور ادارہ معارف اسلامی سے بھی مل سکتا ہے جو لوگ دیکھنا چاہیں آکر دیکھ سکتے ہیں۔

یہ وہ تین اسانید ہیں جو دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم سہارنپور سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیئے ہیں اور ان میں مولانا مودودی کو ذہین' صاحب کمال اور درس و تدریس کا اہل قرار دیا ہے۔ ان اسانید سے معلوم ہوا کہ مولانا ئے مرحوم اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ سے مولوی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ذاتی مطالعے میں بھی مصروف رہے تھے اور انفرادی طور پر ماہرین اور تجربہ کار اساتذہ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں مختلف علوم وفنون کی فنی مہارت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ سند کے بارے میں ایک بات نوٹ کرنے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ اساتذہ سے براہ راست پڑھنے اور سند حاصل کرنے میں بڑی برکت اور

---

(۱) اصل سند کے عکس کے لئے ملاحظہ کیجیے وثائق مودودی ص ۱۴

افادیت ہے اور یہی سلسلہ تسلسل کے ساتھ امت میں چلا آرہا ہے لیکن یہ تحصیل علم کا واحد طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔

حدیث اور دوسرے علوم کے حصول کے چار طریقے

امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب العلم میں اور ابن الصلاح نے مقدمہ ابن الصلاح میں حدیث اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے چار طریقے بیان کئے ہیں اور چاروں محدثین کے نزدیک مقبول و معتبر ہیں۔

۱۔ قراءت علی الشیخ: کہ حدیث کی کتاب یا کسی دوسرے فن کی کتاب استاد کے سامنے پڑھی جائے اور استاد سن کر تصدیق کرے کہ ٹھیک سمجھی ہے اور صحیح پڑھی ہے اور اگر شاگرد نے غلطی کی ہو تو استاد نے اس کی اصلاح کرلی ہو اس کا حکم وہی ہے جو استاد سے سننے کا ہے۔ استاد کو سنانے اور اس سے سننے کا حکم ایک ہے۔ بعض اہل علم اس طریقے کو بہتر سمجھتے ہیں۔

۲۔ سماع من الشیخ: کہ استاد پڑھے اور تشریح کرے اور شاگرد سنے۔ جمہور علماء اس طریقے کو بہتر قرار دیتے ہیں۔

۳۔ المناولہ: اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ محدث یا کسی دوسرے فن کا عالم اپنی لکھی ہوئی کتاب یا کاپی یا تحریر اپنے ہاتھ سے شاگرد کو دیدے اور کہے کہ اس میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لو اور اسے میری طرف سے دوسروں تک پہنچاؤ اور درس و تدریس کے ذریعے اس کی اشاعت کرو۔ یہ مناولہ کی بہترین قسم ہے یا زبان سے تو کچھ نہ کہے بلکہ خاموشی کے ساتھ اپنی کتاب یا تحریر شاگرد کو دیدے۔ تو اپنے ہاتھ سے دینا بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ استاد نے شاگرد کو آگے پہنچانے کی اجازت دیدی ہے ورنہ وہ کہہ دیتا کہ یہ اشاعت کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف اپنے پاس رکھنے کے لئے ہے یہ مناولہ کی بہترین

صورت تو نہیں ہے لیکن جائز اور معتبر ہے۔ مناولہ کی دونوں صورتوں میں قراءت کسی نے بھی نہیں کی ہوتی نہ شیخ نے اور نہ تلمیذ نے لیکن اس کا حکم وہی ہے جو شیخ کو سنانے یا اس سے سننے کا ہے اگرچہ اس کا درجہ سننے سنانے سے کم ہے مگر جائز اور معتبر بالاتفاق ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے وَعَلَّمَهُ الْبَيَانَ میں کلام کو تعلیم و تعلم کا ذریعہ قرار دیا ہے اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں قلم کی تحریر کو بھی ذریعہ تعلیم و تعلم بتایا ہے۔ تو ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر استاد زبانی تعلیم دے تو یہ بھی معتبر ہے اور اگر لکھ کر شاگردوں کو دیدے تو یہ بھی معتبر ہے اور دونوں صورتوں میں استاذی شاگردی کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور شاگرد جس طرح استاد کی تقریر اور قراءت کو اس کی طرف منسوب کر کے بیان کر سکتا ہے اسی طرح اس کی تحریر اور کتاب کو بھی اس کی طرف منسوب کر سکتا ہے۔

۴۔ المکاتبہ: اس کی صورت وہی ہے جو مناولہ کی ہے مگر فرق یہ ہے کہ مناولہ کی دونوں صورتوں میں استاد اپنی کتاب یا تحریر شاگرد کو خود اپنے ہاتھ سے دیتا ہے اور مکاتبہ کی صورت میں استاد یا امیر و امام یا مفتی اور قاضی اپنی کتاب یا تحریر یا حکم یا فتوی یا فیصلہ کسی معتبر و معتمد قاصد کے ذریعے بھیجتا ہے یا آج کل کے ذرائع ابلاغ میں سے کسی محفوظ و معتمد ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اگرچہ مرسل اور مرسل الیہ یعنی خط بھیجنے والے اور خط وصول کرنے والے نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ ہو۔ یہ صورت بھی تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم کا ایک ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ ذریعہ ابلاغ معتمد ہو' اس صورت میں بھی مکتوب الیہ کتاب اور تحریر میں لکھے ہوئے مضمون کی نسبت خط بھیجنے والے کی طرف کر سکتا ہے اور اس کے نام سے آگے دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور یہ بھی تعلیم و تعلم اور استادی شاگردی کا ایک طریقہ ہے بشرطیکہ مکتوب الیہ مکتوب کے مضمون و مفہوم کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اس کے جواز کی دلیل وہی ہے جو مناولہ کے جواز کے لئے پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ زبان کی طرح قلم بھی تعلیم و تعلم کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ عملا رسول اللہ ﷺ نے اس ذریعے کو استعمال کیا ہے۔ آپ نے

غالباً ۱۰۸ مکاتیب مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے نام اپنے معتمد قاصدوں کے ذریعے بھیجے تھے۔ اگر اس کو زبانی ارشادات وہدایات کا درجہ حاصل نہ ہوتا اور ان مکاتیب پر عمل کرنا اور آگے پھیلانا اسی طرح واجب نہ ہوتا جس طرح زبانی ارشادات وہدایات پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے تو پھر ان مکاتیب کا بھیجنا ایک لایعنی کام ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ میں جس طرح مکالمہ افادے اور استفادے کا ذریعہ رہا ہے اور اب بھی ہے اسی طرح مکاتبہ بھی باہمی تبادلہ افکار کا ذریعہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔

مکاتبے کی پھر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب اور تحریر کسی خاص فرد یا افراد کے نام بھیجی گئی ہو۔ اس صورت میں وہ خاص فرد یا افراد ہی اس مکتوب پر عمل کرنے اور اس کو آگے دوسروں تک پہنچانے یا مکتوب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اقدامات کرنے کے مجاز ہوں گے۔ عام لوگوں کے ہاتھ میں اگر وہ مکتوب آبھی گیا ہو پھر بھی وہ اس کے مطابق اقدامات کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے اس لئے کہ جب صاحب مکتوب نے مخصوص شخص یا اشخاص کے نام اپنی تحریر بھیجی ہے عامۃ الناس کے نام نہیں بھیجی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو انہی مخصوص اشخاص پر اعتماد ہے کہ وہ کتاب کو سمجھ سکتے ہیں اور دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں تو ان مخصوص لوگوں کا کتاب اور تحریر کو پڑھنا اور سمجھنا بھی استادی اور شاگردی کا رشتہ قائم ہونے کا ایک ذریعہ ہے اور معتبر ہے۔

محدثین اور مصنفین کی کتابوں سے علم حاصل کرنے کا حکم وہی ہے جو خود مصنفین سے حاصل کرنے کا ہے

مکاتبے کی دوسری قسم یہ ہے کہ محدث یا کسی دوسرے فن کا مصنف کتاب عام لوگوں کے استفادے کے لئے لکھ کر شائع کردے یا کسی جگہ پر رکھ دے یا کسی شاگرد سے لکھوادے۔ مگر یہ کتاب کسی مخصوص شخص یا اشخاص کے لئے مخصوص نہ ہو بلکہ عامۃ الناس کے لئے ہو کہ ان میں سے جو بھی کتاب کو سمجھ کر پڑھ سکتا ہو اور دوسرں کو سمجھا سکتا ہو وہ اس کتاب یا تحریر کے مضمون پر عمل کر سکتا ہے۔ اس کی تدریس بھی کر سکتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دے سکتا ہے اگرچہ اس کے اور مصنف کتاب کے درمیان سلسلہ سند موجود نہ ہو بشرطیکہ یہ بات مشہور اور مستفیض ہو کہ یہ کتاب اسی مصنف کی تصنیف ہے جس کی طرف یہ منسوب ہے اور یہ نسبت مشکوک اور ظنی نہیں ہے۔ اس صورت میں محدثین اور مصنفین کی کتابوں سے علم حاصل کرنے کا حکم وہی ہے جو خود مصنفین سے براہ راست حاصل کرنے کا ہے بشرطیکہ کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کا ملکہ اور استعداد و صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اگر فہم و تفہیم کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ایسا غبی شخص مصنف کی زبانی تقریر کو بھی نہیں سمجھ سکے گا اور اس کی کتاب کو بھی سمجھ نہیں سکے گا۔ کئی لوگوں کے پاس لکھے ہوئے سند اور سرٹیفکیٹ ہوتے ہیں مگر وہ کتاب کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں اور کئی لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان کے پاس کسی مدرسے یا کسی شیخ کا تحریری سند نہیں ہوتا مگر وہ سند یافتہ لوگوں سے زیادہ اچھی طرح کتابوں کو سمجھتے بھی ہیں اور ان کی تعلیم و تدریس بھی کر سکتے ہیں۔ آج کل محدثین و مصنفین کی کتابیں بہترین انداز میں شائع ہو رہی ہیں اور ان کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف مشکوک بھی نہیں ہے بلکہ مشہور و مستفیض ہے اس لئے فہم و تفہیم کی

صلاحیت رکھنے والے کے لئے اپنے مطالعے سے سمجھنا اور سمجھانا کافی ہے اگرچہ تحریری سند اس کے پاس موجود نہ ہو البتہ اساتذہ سے پڑھنا' ان کی صحبت میں کچھ مدت تک رہنا اور ان سے سند فراغت لینا مفید ترین ہے اور بہترین ہے لیکن عالم و فاضل ہونے کے لئے شرط لازم نہیں ہے۔ مولانا مودودی کے پاس تو تحریری سندات موجود تھے لیکن اگر موجود نہ ہوتے تو پھر بھی کوئی مضائقہ اور حرج نہ ہوتا اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان کو ذکاوت' فطانت اور ذہانت دی تھی اور ابتدائی علوم آلیہ انہوں نے حاصل کر لئے تھے اس لئے اپنے مطالعے سے کتابوں کو سمجھ بھی سکتے تھے اور سمجھا بھی سکتے تھے۔

مولانا مودودی مدرسہ فوقانیہ سے مولوی کا امتحان پاس کرنے کے بعد انفرادی طور پر اساتذہ سے اور اپنے مطالعے کے ذریعے اپنے علم میں بھی اضافہ کرتے رہے اور معاش کے لئے صحافت کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ مختلف اوقات میں مختلف اخبارات و رسائل کی ادارت کا کام کرتے رہے۔ اسی دور میں مولانا جمعیت علماء ہند کے سہ روزہ اخبار الجمعیت کی ادارت کے فرائض بھی کافی مدت تک انجام دیتے رہے ہیں۔ الجمعیت کی ادارت ہی کے دور میں مولانا نے اسلام میں جہاد اور جنگ و صلح کے احکام کی وضاحت کے لئے ۲۴ سال کی عمر میں اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" لکھی جو ۱۹۲۷ء میں الجمعیت میں قسط وار شائع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا الجمعیت کی ادارت سے استعفی دے کر واپس اورنگ آباد تشریف لے گئے اور علمی و تحقیقی کام جاری رکھا اور مئی ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن جاری کیا جس کے ذریعے دین اسلام کے مختلف شعبوں کی تعلیم و تفہیم اور تحقیق و تشریح کا دعوتی کام شروع کر دیا۔ غیر اسلامی نظریات اور غیر اسلامی سیاست پر بھرپور تنقید کی' دین بحیثیت مکمل نظام حیات کے تصور کو اجاگر کیا اور اسلامی سیاست یعنی اسلام کے اجتماعی نظام کی تشریح کی اور دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قرآن و سنت کے بتائے ہوئے اصول اور منہج رسول کے مطابق ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی ضرورت اور اہمیت واضح

فرمائی اور آخر کار اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس اور تشکیل ہو گئی جو آج ایک عالمی اسلامی تحریک کے ایسے شجرہ طیبہ کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس طرح مولانا کی تصنیفات اور ان کی تفسیر تفہیم القرآن ان کے لئے صدقہ جاریہ ہیں اسی طرح ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی اور ان کی برپا کردہ تحریک اسلامی بھی ان کے لئے بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے۔ اس جماعت و تحریک کی ارکان' امراء اور کارکنان مولانا کی روحانی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سب کا فرض ہے کہ وہ اس شجرہ طیبہ کو اس کی اصلی شکل میں قائم رکھنے' اس کی حفاظت کرنے اور مزید نشوونما کے لئے اس کی آبیاری اور تہذیب و تلقیح کے لئے اپنے جہود و مساعی کو جاری رکھیں بلکہ تیز تر کر دیں تاکہ دنیا و آخرت میں اس شجرہ طیبہ کے ثمرات طیبہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

تفسیر تفہیم القرآن کا تعارف :

مولانا مودودی نے تفسیر تفہیم القرآن لکھنے کا آغاز محرم ۱۳۶۱ھ مطابق فروری ۱۹۴۲ء میں کیا تھا جو ماہنامہ ترجمان القرآن میں قسط وار شائع ہوتی تھی اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ۷ جون ۱۹۷۲ء کو یہ مبارک کام پایہ تکمیل کو پہنچا تھا اور اس کی تکمیل میں ۳۰ سال اور چار ماہ لگے تھے۔ تفہیم القرآن کی پہلی تین جلدوں میں بالخصوص پہلی جلد میں تشریح و تفسیر میں کچھ زیادہ اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے مگر اس کی تلافی آخری تین جلدوں میں ہو گئی ہے جیسا کہ مولانا نے خاتمہ تفسیر میں خود لکھا ہے کہ :

"ابتداء میں میرے پیش نظر زیادہ تفصیل سے کام لینا نہ تھا اس لئے پہلی جلد کے حواشی مختصر رہے۔ بعد میں جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا مجھے حواشی میں زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی گئی یہاں تک کہ بعد کی جلدوں کو دیکھنے والے اب پہلی جلد کو تشنہ محسوس کرنے لگے ہیں لیکن قرآن مجید میں مضامین کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس مضمون کی تشریح ایک جگہ تشنہ رہ گئی وہ چونکہ بعد کی سورتوں میں بھی آیا ہے اس لئے ان کی پوری

تشریح بعد کی سورتوں کے حواشی میں ہو جاتی ہے۔"

مصنفین کے مناہج مختلف ہوتے ہیں بعض عدم توجہ یا مواد کی عدم دستیابی کی وجہ سے ابتداء میں تشریحات اور تحقیقات میں اختصار سے کام لیتے ہیں اور بعد میں زیادہ تفصیل سے کام لیتے ہیں اور بعض اس کے برعکس ابتداء میں تفصیل اور بعد میں اجمال سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں ابتدائی جلدوں میں ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور بعد کی جلدوں میں بڑی تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں مگر بخاری کے دوسرے شارح علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں اس کے برعکس ابتدائی جلدوں میں بہت زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے اور حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے بڑے عمدہ اور دقیق مباحث بیان کئے ہیں مگر آخری جلدوں میں ضرورت کے مطابق تشریح پر اکتفا کیا گیا ہے مولانا مودودی نے حافظ ابن حجر کا منہج اختیار کیا ہے اور بعض دوسرے مصنفین و مدرسین نے علامہ عینی کا منہج پسند کیا ہے اور دونوں افادیت سے خالی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ بعد کی تفصیل ابتداء کے اجمال کی تلافی کر لیتی ہے یا ابتداء کی تفصیل بعد کے اجمال کی تلافی کر لیتی ہے اور قرآن کی آیات اور بخاری کی احادیث کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔

دیباچہ تفہیم القرآن :

☆ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کے دیباچے میں اپنی تفسیر کی نوعیت اس طرح بیان کی ہے کہ میرے پیش نظر علماء اور محققین کی ضروریات بھی نہیں ہیں اور ان لوگوں کی ضروریات بھی نہیں ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ ایسے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں نے ان اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے جو عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور تفاسیر کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا ان کے لئے مشکل ہے' ابتداء میں تو مولانا کے پیش نظر یہی

طبقہ تھا لیکن آخری ۴ جلدوں میں انہوں نے جو تفصیلی اور تحقیقی مباحث لکھے ہیں وہ علماء اور محققین کی ضرورت بھی پوری کرتی ہیں۔

☆ مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے اس لئے کہ ترجمے کی ضرورت شاہ عبدالقادر' شاہ رفیع الدین' مولانا محمود الحسن' مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا فتح محمد جالندھری کے تراجم سے پوری ہو جاتی ہے لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمے سے پوری نہیں ہو سکتیں انہی کو میں نے ترجمانی کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے آزاد ترجمانی کے فوائد اور مصالح بیان کئے ہیں۔ میری رائے میں آزاد محاوراتی ترجمانی میں اگر لفظی ترجمے کی معنویت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہو تو یہ بڑی افادیت رکھتی ہے مگر تفہیم القرآن میں بعض مقامات پر ایسی ترجمانی کی گئی ہے جو الفاظ کے لغوی معانی سے بہت زیادہ دور ہو گئی ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر جامع قسم کا لفظی ترجمہ کر کے آگے اس کی تشریح کی جائے تو فہم و تفہیم کے لئے یہ طریقہ زیادہ مفید ہوتا ہے البتہ الفاظ کے جامع اور بامعنی ترجمے کے لئے لغت' صرف و نحو اور بلاغت کے قواعد کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ترجمانی میں محاوروں کا استعمال ہوتا ہے اور محاورے ہر علاقے کے جدا جدا ہوتے ہیں اور ہر شخص محاوروں کی معنویت کو سمجھ نہیں سکتا۔ مولانا نے حواشی میں قرآن کے اصل مفہوم سے غیر متعلق بحثیں نہیں چھیڑیں مگر آیات الاحکام کی تشریح میں احکام و قوانین کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ بالخصوص آخری جلدوں میں۔

مقدمہ تفہیم القرآن :

اکثر مفسرین اپنی تفاسیر کے مقدموں میں تفسیر' اصول تفسیر' طرز تفسیر' تدوین قرآن اور قرآن سے متعلق بعض دوسرے امور کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے اپنے طرز تفسیر کا ذکر تو دیباچے میں کیا ہے جس کا خلاصہ گذشتہ عنوان کے تحت آپ پڑھ چکے ہیں

لیکن ۱۸ صفحات پر مشتمل مقدمے کا جب میں نے توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا کا مقصد ایک اہم ترین سوال کا جواب دینا ہے تاکہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے اس جواب کی روشنی میں اپنے مطالعے کا آغاز کریں۔ اور میرے خیال میں طویل مقدمہ لکھنے کے مقابلے میں اس ایک سوال کا جواب دینا بہت زیادہ اہم ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ :

عام طور پر کتابوں میں متعین موضوع پر مباحث و دلائل کو ابواب و فصول اور عنوانات کے تحت مخصوص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے' قرآن اگرچہ جامع اور کامل کتاب ہے اور زندگی کا مکمل قانون ہے اور اس کے معارف و مضامین انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں جیسا کہ آپ میری اس کتاب کے باب ہشتم میں پڑھ چکے ہیں لیکن علوم و معارف کے یہ بے بہا جواہر پارے پورے قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں ایک لڑی میں پروئے ہوئے نہیں ہیں اور مخصوص عنوانات کے تحت جمع کردہ نہیں ہیں تو کیا وجہ ہے کہ قرآن لوگوں میں متعارف تصنیفی طرز پر نازل بھی نہیں ہوا اور تصنیفی طرز پر مرتب اور مدون بھی نہیں ہوا؟

مولانائے مرحوم نے اس مشکل سوال کا جواب دینے سے پہلے "کتاب اللہ" کی نوعیت بتانے کی کوشش کی ہے اور ۶ نکاتی تمہید کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ قرآن کتب سابقہ کی طرح دعوت و ہدایت کی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ انبیاء سابقین کی طرح داعی الی اللہ تھے۔ جو دعوت دین کا کام کرتے تھے اور قرآن ان کو حسب حال ہدایات دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ دعوت دین ایک مسلسل عمل اور محنت کا نام ہے اور ایک چلتی ہوئی تحریک ہے جس پر مختلف اور متنوع قسم کے حالات' مراحل اور منازل آتے جاتے ہیں اور ہر مرحلے پر بلکہ قدم قدم پر داعی کو ہدایات کی ضرورت پڑتی ہے اور ہر مرحلے کے لئے خصوصی ہدایات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب قرآن کی یہ نوعیت متعین ہوگئی کہ دعوت کی کتاب ہے تو اس سے معمولی غور و فکر کے بعد خود بخود یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کا موضوع انسان ہے اس حیثیت

سے کہ اس کی فلاح کس چیز میں ہے؟اور اس کا خسران کس چیز میں ہے؟ ہماری فنی اصطلاح میں کسی کتاب کا موضوع وہ ہوتا ہے جس کے گرد اس کتاب کے مباحث گھومتے رہتے ہوں۔ قرآن کے تمام مباحث و مضامین' مواعظ و تذکیرات اور احکام و قوانین کا تعلق ظاہر ہے کہ انسان ہے۔انسان ہی کے اردگرد قرآنی ہدایات و تعلیمات گھومتی رہتی ہیں اور انسان ہی قرآن کا مخاطب ہے اس لئے اس کا موضوع بھی انسان ہی ہو سکتا ہے۔اسی طرح کتاب اللہ کی نوعیت کے تعین سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مرکزی مضمون دعوت الی اللہ ہے یعنی پورا قرآن اس بات کی تاکید اور تشریح کرتا ہے کہ انسان کے لئے زندگی کا صحیح نظام وہی ہے جو انسان اول کو خلیفہ بناتے وقت اللہ نے خود بتادیا تھا اور جسے تمام انبیاء ورسل اور دعاۃ و ھداۃ لوگوں کو بتاتے رہے ہیں اور وہ ہے "دین اسلام" یعنی اللہ کی عبادت اور بندگی کا راستہ اور اسی کو توحید کہتے ہیں۔حاصل یہ نکلا کہ قرآن کا مرکزی اور اساسی مضمون اللہ کے دین اور اللہ کی عبادت کی دعوت دینا ہے۔ قرآن کی نوعیت' اس کے موضوع اور اس کے مرکزی مضمون کو ذہن نشین کرنے کے بعد جو شخص بھی قرآن کا مطالعہ کرے گا تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور اپنے مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر پارے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ یہ کتاب چونکہ دعوتی کتاب ہے اس لئے یہ خطبوں اور تقریریوں کی صورت میں نازل ہوئی ہے جس میں داعی الی اللہ کو ہر مرحلے میں مطابق حال ہدایات دی گئی ہیں۔ خطبوں اور تقریروں میں کبھی ایک ہی بات کو اسالیب مختلفہ کے ساتھ بار بار دھرایا جاتا ہے' کبھی ترغیب و ترہیب اور جذبات کو ابھارنے والا انداز اختیار کیا جاتا ہے' اور کبھی دلیل و برہان کی ساتھ بات کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے' کبھی قصص و حکایات اور ایام ماضیہ کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور کبھی تمثیلات و تشبیہات کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے اور

کبھی آیات کو نیہ اور انعامات الٰہیہ کے ذریعے قلوب کو مائل کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطابی اور تقریری انداز تصنیفی انداز میں مرتب کردہ کتاب میں اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

تفہیم القرآن کے ۱۸ صفحات پر پھیلے ہوئے مقدمے کا یہ جامع خلاصہ اور حاصل مفہوم ہے جو میں نے اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے جس میں مولانائے مرحوم نے ایک دقیق اشکال اور سوال کا عام فہم الفاظ میں ایسا جواب دیا ہے جو کتاب اللہ کی دعوتی نوعیت اور رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مراحل کے عین مطابق ہے۔ مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کی دعوت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں اور قرآن کے معارف و علوم اور ہدایات و تعلیمات کو حالات حاضرہ پر وہی لوگ منطبق کر سکتے ہیں جو دعوت کا کام کرتے ہوں۔ بہر حال قرآن دعوتی کتاب ہے' تفہیم القرآن دعوتی تفسیر ہے اور اس کے مصنف دعوت دین اور اقامت دین کی تحریک کی اپنی وفات تک قیادت کرتے رہے ہیں۔ اس لئے تفہیم القرآن میں علمی و تحقیقی معارف و مباحث کے علاوہ دعوتی رنگ نمایاں نظر آرہا ہے جو قرآن کا مرکزی مضمون ہے اور یہی تفہیم القرآن کی امتیازی خصوصیت ہے۔

تفہیم القرآن کا اصل مقدمہ مولانا کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" ہیں

میری رائے میں اگر مولانا مودودی اپنی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں کو تفہیم القرآن کا مقدمہ بنا دیتے اور اس کو پہلی جلد کی ابتداء میں شائع کروا دیتے تو اس کی افادیت بہت زیادہ ہوتی۔ قرآنی دعوت کی روح اور قرآن کے مرکزی مضمون یعنی توحید کا لب لباب قرآن کی ان چار اصطلاحوں کے اندر موجود ہے جن کی تشریح مولانا نے اس کتاب میں کی ہے۔ میں سب سے پہلے تو "الجہاد فی الاسلام" سے متاثر ہوا تھا مگر سب سے زیادہ متاثر

"قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" سے ہوا تھا۔ وہ چار اصطلاحیں جن کو میں فہم قرآن کی چابی کہا کرتا ہوں یہ ہیں :

الٰہ ــــــ رب ــــــ عبادت ــــــ دین ــــــ

○ الٰہ کا لفظ قرآن کریم میں ۱۴۰ مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ اکثر مقامات پر تو یہ لفظ غیبی اور مافوق الاسباب اقتدار کی بنا پر کارساز' مشکل کشا' حاجت روا اور فریاد رس کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر بعض آیات میں یہ لفظ حاکم' شارع' قانون ساز اور مطاعِ مطلق یعنی غیر مشروط اطاعت کے مستحق کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

○ لفظ رب کے تین بنیادی معنے ہیں۔ مالک' پروردگار اور حاکم و بادشاہ۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے رب ہونے کا ذکر قرآن کریم میں ۹۶۰ مقامات پر ہوا ہے ان میں سے ۱۴۴ مقامات وہ ہیں جن کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات پر رب حاکم' شارع اور قانون ساز کے معنوں میں آیا ہے یا پھر مذکورہ تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

○ عبادت کے اساسی معنے تو ہیں اپنے معبود کے سامنے انتہائی درجے کی عاجزی کرنا اور اس کے سامنے اپنے آپ کو بے بس اور کمزور سمجھنا مگر اسی بنیادی معنوں کی مناسبت سے عبادت کا لفظ تینوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غلامی' پرستش یعنی تعظیم اور اطاعت حکم۔ قرآن کریم میں اللہ کی عبادت کا حکم یا غیر اللہ کی عبادت سے منع ۲۴۴ بار آیا ہے جن میں سے ۳۷ مقامات وہ ہیں جن کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جگہوں پر یہ لفظ پرستش و پوجا کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ غیر مشروط اطاعت حکم کے معنوں میں آیا ہے۔

○ دین کا لفظ چار معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اقتدار' غلبہ اور تسلط۔

۲۔ اطاعت' بندگی اور فرمانبرداری

۳۔ قانون' ضابطہ اور طرز و طریقہ۔

۴۔ جزاوسزا اور محاسبہ۔

قرآن کریم میں لفظ دین اور اس کے مشتقات کا ذکر ۹۳ آیات میں ہوا ہے اور بعض آیات میں اقتدار یا اطاعت یا حساب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جب یہ اصطلاحات اربعہ اتنی زیادہ کثرت کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں تو ان کے معانی و مفاہیم کا علم و فہم دراصل ان سینکڑوں آیات کا فہم ہے جن میں یہ اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور ان کے فہم سے قرآن کی دعوت اور مرکزی مضمون بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کا حاکم' بادشاہ اور مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے باقی سب مخلوق' مملوک' غلام اور بندے ہیں لہٰذا اسی کو مافوق الاسباب اقتدار کا مالک اور کارساز و حاجت روا تسلیم کیا جائے' اسی سے غیبی مدد مانگی جائے' اسی کی پرستش کی جائے' اسی کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے اور اسی کے بتائے ہوئے نظام حیات اور طریقہ زندگی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

مولانا مودودی نے لغات اور آیات کی روشنی میں الٰہ' رب' عبادت اور دین کے یہی مذکورہ معانی اپنے مخصوص طرز تحریر میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

تفہیم القرآن میں سورتوں کے دیباچے

تفسیر تفہیم القرآن میں قرآن کریم کی سورتوں کے جو دیباچے لکھے گئے ہیں میری نظر میں ان کی بہت بڑی افادیت اور اہمیت ہے۔ ان دیباچوں میں بالعموم چار امور بیان کئے گئے ہیں۔

ایک سورۃ کے نام کی وجہ تسمیہ۔

دوسرا زمانہ نزول کا تعین۔

تیسرا شان نزول اور پس منظر یعنی ان حالات کا بیان جن میں وہ سورۃ نازل ہوئی تھی۔

چوتھا مضامین و مباحث۔

زمانہ نزول کے اعتبار سے جہاں تک مکی اور مدنی ہونے کا تعلق ہے تو چند سورتوں کے علاوہ باقی تمام سورتوں میں مکی اور مدنی سورتیں معلوم اور معروف ہیں۔ اسی طرح مدنی سورتوں اور ان کی آیات کے بارے میں شان نزول کی روایات کافی تعداد میں موجود ہیں اس لئے مدنی سورتوں کا بعد از ہجرت زمانہ نزول معلوم کرنے کے لئے دلائل و شواہد نسبتاً زیادہ ہیں اگرچہ ہر مدنی سورت کا متعین و متیقن زمانہ نزول معلوم نہیں ہے لیکن جہاں تک مکی سورتوں کا تعلق ہے۔ دور مکی میں ان کا زمانہ نزول معلوم کرنے کے لئے روایات اور دلائل و شواہد بہت کم ہیں جیسا کہ مولانا مودودی نے سورۃ الانعام کے دیباچہ میں فرمایا ہے لیکن قرائن و علامات سے اور سورتوں کے مضامین اور اسالیب بیان سے قیاس و اندازے کے مطابق مولانا نے نزول کے ادوار اور مراحل کا جو تعین کیا ہے وہ اگرچہ حتمی اور یقینی نہیں ہے لیکن بالکل بے بنیاد اور محض خیالی بھی نہیں ہے اور اس کی بڑی افادیت ہے۔

شان نزول کے بارے میں تفصیلی مباحث میری اس کتاب کے نزول قرآن کے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ مولانا کا مقصد شان نزول سے وہ پس منظر اور حالات ہیں جن میں سورت نازل ہوئی تھی۔ احادیث و آثار' سیرت رسول سے متعلق روایات اور خود سورت کے اندر قرائن و شواہد کی روشنی میں ہر سورہ کے پس منظر کا جامع قسم کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے جس کی سورۃ کے مضامین کو سمجھنے میں بہت زیادہ اہمیت اور افادیت ہے اور یہ بہت بڑا کام ہے جو مولانا نے اللہ کی توفیق سے انجام دیا ہے۔ اس لئے کہ خیالی اور تصوراتی منظر کشی تو اتنی مشکل نہیں ہوتی مگر واقعاتی اور حقائق پر مبنی پس منظر کا خلاصہ بیان کرنا وسیع مطالعے اور عمیق غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

جہاں تک مضامین و مباحث کا تعلق ہے تو مفصلات بالخصوص قصار مفصلات یعنی قرآن کی آخری چھوٹی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ بآسانی مرتب کیا جا سکتا ہے لیکن لمبی

سورتوں کے مباحث کا جامع خلاصہ نکالنا بڑا مشکل کام ہے مثلاً سورہ بقرہ تاریخ بنی اسرائیل کے عبرت انگیز اور سبق آموز واقعات پر مشتمل ہے اور امت مسلمہ کے لئے اس میں سینکڑوں کی تعداد میں احکام و قوانین اور مختلف قسم کی تعلیمات اور ہدایات موجود ہیں تو آخر ۲۸۶ آیات میں بیان کردہ واقعات' احکام اور ہدایات کا خلاصہ دو تین صفحات میں کون پیش کر سکتا ہے؟ اور کیسے پیش کر سکتا ہے جب کہ قرآن میں انسانی تحریر کی طرح زوائد موجود بھی نہیں ہیں اس لئے مضامین و مباحث کا صحیح علم تو خلاصوں سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے قرآن کے تفصیلی اور تحقیقی مطالعے کی ضرورت ہے۔ لیکن مولانائے مرحوم نے سورتوں کی دیباچوں میں ہر سورت کے مضامین و مباحث کی نوعیت بیان کی ہے اور یہ بھی بہت بڑا مشکل کام ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دی ہے۔

مضامین کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے سورت کا بار بار مطالعہ کرنے اور نوٹس لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری مرحوم نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں بھی سورتوں کے تعارف کے زیر عنوان کچھ معلومات مرتب کی ہیں اور مفتی محمد شفیع مرحوم نے معارف القرآن میں بھی سورتوں کے اوائل میں اختصار کے ساتھ بڑی مفید معلومات تحریر فرمائی ہیں لیکن مولانا مودودی نے سورتوں کے جو دیباچے لکھے ہیں ان میں بڑی گہرائیت اور جامعیت ہے۔

تفہیم القرآن میں اہل سنت کے مسلمہ اصول تفسیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے

میں عربی تفاسیر میں ابن جریر' ابن کثیر' ابن عطیہ غرناطی' قرطبی' ابو حیان اندلسی' امام رازی' جصاص' ابن عربی' علامہ آلوسی اور علامہ قاسمی کی تفاسیر سے استفادہ کرتا رہتا ہوں اور یہ سب ممتاز ائمہ تفسیر اور امت مسلمہ کے قائدین تھے لیکن میں نے یہ التزام نہیں کیا کہ ان قائدین امت میں سے ہر ایک کی ہر بات سے اتفاق کروں گا اور یہ التزام عقلاً و شرعاً ضروری

بھی نہیں ہے البتہ ادب واحترام اور عقیدت و محبت اہل سنت کے تمام ائمہ تفسیر اور قائدین ملت کے ساتھ موجب سعادت ہے۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں بیان القرآن' معارف القرآن' تفہیم القران اور تفسیر ماجدی کو میں اکثر زیر مطالعہ رکھتا ہوں لیکن میں نے یہ التزام نہیں کیا کہ آیات کی تفسیر و تاویل میں یا فقہی مسائل کی تحقیق و تنقیح میں مولانا سودودی کی ہر بات سے اتفاق کروں گا اور اس کی تائید کروں گا حالانکہ میں جماعت اسلامی کا رکن ہوں۔ ۹ سال تک امیر صوبہ رہا ہوں اور ۱۹۶۳ء سے لے کر آج تک جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا رکن ہوں اور مولانا مودودی کے ساتھ ان کے علم' اخلاص اور دعوت دین واقامت دین کے لئے ان کی جہود و مساعی کی وجہ سے بے حد محبت بھی رکھتا ہوں اور یہ التزام مجھ پر نہ شریعت نے لازم کیا ہے اور نہ جماعت اسلامی کے نظم نے لازم کیا ہے البتہ جماعت کے تنظیمی فیصلوں کی پابندی ہر رکن پر لازم ہے۔ بعض آیات کی تاویل اور بعض فقہی مسائل میں مولانا مودودی کی رائے سے میرا اختلاف میری کتاب تفہیم المسائل حصہ سوم و چہارم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور دورہ تفسیر فی المنصورہ اور فی المردان دونوں میں سینکڑوں طلبہ کے سامنے اس کا اظہار بھی کرتا رہا ہوں مگر دوسرے فرقہ وارانہ تنظیموں اور فرقہ وارانہ مدارس میں ایسا کبھی نہیں ہوتا بلکہ اپنے اکابر سے علمی اختلاف بھی ان کی بے ادبی سمجھی جاتی ہے اور اسے اس فرقے سے خروج کے مترادف سمجھا جاتا ہے مگر جماعت اسلامی فرقہ نہیں ہے اور فرقہ بننے سے اللہ کی پناہ مانگتی ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد میں بغیر کسی تحزب کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن پر ایک مختصر سا تبصرہ کرتا ہوں۔

۱۔ اس کتاب کے باب ہشتم میں اہل سنت والجماعت کے متفقہ و مسلمہ جو اصول تفسیر بیان کئے گئے ہیں تفہیم القرآن میں ان اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ ان کا التزام کیا گیا ہے اور متجددین کی جدت و بدعت سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۲۔ تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالاحادیث والآثار کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ آیات کے سیاق وسباق اور دوسرے مقامات پر ان کے نظائر میں غور وفکر کر کے ایسے معانی و مفاہیم بیان کئے گئے ہیں جو موقع محل اور تالیف کلام کے بھی مطابق ہیں اور نظائر کے ساتھ بھی مطابقت ومناسبت رکھتے ہیں۔ جو مضمون یا واقعہ قرآن میں پہلی مرتبہ ذکر ہوا ہو تو اس جگہ پر تقریباً ان تمام دوسرے مقامات کا حوالہ دیا گیا ہے جن مقامات پر اس مضمون کا تکرار ہوا ہے تاکہ قارئین موازنہ کر کے صحیح مفہوم کا تعین کر سکیں۔ اسی طرح آیات کی تفسیر میں احادیث رسول و آثار صحابہ و تابعین سے اکثر استدلال کیا جاتا ہے۔ احادیث کی تصحیح وتضعیف اور توجیہ و تاویل میں تو اہل علم کے درمیان اختلاف رائے ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا لیکن جب صحیح الاسناد اور صریح الدلالت حدیث رسول میں کسی آیت یا کسی لفظ کا مفہوم متعین ہو جائے تو اس کے خلاف تفسیر جائز نہیں ہے۔ میرے علم کی حد تک تفہیم القرآن میں اس ضابطے کی پابندی کی گئی ہے۔

۳۔ الفاظ وکلمات کے لغوی معانی میں متبادر اور کثیر الاستعمال مفاہیم کو لیا گیا ہے۔ شاذ و نادر اور دور دراز کے معانی پر آیات کو محمول کرنے سے احتراز کیا گیا ہے جیسا کہ علماء راسخین کا طریقہ ہے۔

۴۔ آیات الاحکام کی تفسیر میں ائمہ فقہ کی آراء دلائل کے ساتھ مستند کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اور دلائل کی روشنی میں جو رائے قوی نظر آئی ہو اس کو ترجیح دی گئی ہے۔ اکثر مسائل میں تو امام ابو حنیفہ کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے لیکن ہر معاملے اور ہر مسئلے میں کسی مخصوص فقیہ اور امام کی رائے کا التزام نہیں کیا گیا اور یہ شرعاً علماء ورا سخین پر لازم بھی نہیں ہے۔

۵۔ آیات کونیہ اور دلائل آفاقیہ کی تشریح میں بقدر ضرورت سائنسی تحقیقات کے حوالے دیئے گئے ہیں لیکن ایسا انداز اختیار نہیں کیا گیا کہ تفہیم القرآن سائنس کی کتاب نظر

آنے لگے جیسا کہ علامہ طنطاوی جوہری نے اپنی تفسیر جواہر القرآن کو سائنس کی کتاب بنا دیا ہے۔

۶۔ تاریخی واقعات بالخصوص تاریخ بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے امور کی تفصیل و تنقیح مستند حوالوں کی روشنی میں بڑے اچھے اور آسان اسلوب بیان کے ذریعے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔

۷۔ اسرائیلی روایات کا اکثر تو ذکر نہیں کیا گیا اور اگر کیا گیا ہے تو پھر ان پر سخت گرفت کی گئی ہے اور روایت و درایت دونوں کے اعتبار سے ان پر تنقید کی گئی ہے۔

۸۔ منکرین ختم نبوت' منکرین سنت متجددین و مبتدعین اور مغربی تہذیب کے ملحدین پر جگہ جگہ بڑی سخت تنقید کی گئی ہے مگر انداز مناظرہ بازی اور محاذ آرائی کا اختیار نہیں کیا گیا بلکہ مثبت' علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۹۔ حواشی میں تفہیم کا بڑا آسان اور عام فہم طرز بیان اختیار کیا گیا ہے اور غیر ضروری مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے جامع و مانع قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تاکہ قارئین کنفیوژن میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

۱۰۔ تفہیم القرآن میں اور مولانائے مرحوم کی بعض دوسری کتابوں میں بھی غیر مناسب تعبیر اور الفاظ موہمہ یعنی قاری کو غلط فہمی میں ڈالنے والے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ بعض کی اصلاح تو دوسرے ایڈیشنوں میں کر دی گئی ہے لیکن بعض کی اصلاح نہیں ہو سکی ایسے مقامات کی توجیہ مولانا کی دوسری عبارات یا ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں کرنی چاہئے اور ان کو غلط معانی پر محمول نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ سوء تعبیر کو سوء اعتقاد اور سوء نیت کی دلیل قرار دینا متعصبین کا طریقہ ہے علماء ربانیین کا طریقہ نہیں ہے۔ غیر مناسب اور موہم الفاظ بڑے بڑے علماء کی تحریروں اور تقریروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جب بات کرنے والا صحیح العقیدہ اور سلیم الفکر ہو تو اس کے الفاظ کی حتی الامکان صحیح تاویل کرنی چاہئے الا یہ کہ وہ غلط مفہوم کا خود اعتراف کر لے۔

(۴) تفسیر حقانی از علامہ ابو محمد عبدالحق حقانیؒ :

تفسیر حقانی بلا مبالغہ علوم و معارف کے ایک دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ حقانی چونکہ بہت سے علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے اس لئے ان کی تفسیر میں بہترین علمی نکات اور دقیق مباحث عام فہم زبان میں بیان کیے گئے۔ الفاظ کے لغوی معانی اور آیات کی نحوی ترکیب بیان کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ فرق باطلہ بالخصوص نیچریوں مثلاً سر سید احمد خان وا ان کے ہم فکر لوگوں کے نظریات باطلہ پر بڑی مضبوط اور معقول تنقید بھی اس تفسیر اور اس کے مقدمے میں پائی جاتی ہے۔ احادیث و آثار مستند کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ روایات ضعیفہ اور اسرائیلی روایات سے یہ تفسیر پاک ہے اور جہاں ذکر ہوئی ہیں وہاں پر ان کی تردید بھی ہوئی ہے۔ احکام اور مضامین کی تشریح میں فرقہ وارانہ تعصب اور گروہی عصبیت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ انگریزی تہذیب اور انگریزی سامراج کے وفاداروں پر اس تفسیر میں شدید گرفت کی گئی ہے۔ علامہ حقانی نے اپنی تفسیر کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس کے تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں چار فصول ہیں جن میں توحید و رسالت' معجزات' ملائکہ و جن اور جنت و دوزخ سے متعلق بڑی مفید مباحث تحریر کی گئی ہیں اور نیچریوں کی تاویلات باطلہ اور اعتراضات رکیکہ کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ باب دوم میں آٹھ فصلیں ہیں جن میں وحی و الہام' جمع قرآن' بعثت نبوی' مضامین قرآن' علوم قرآن' تفسیر اور مفسر' اسماء سور اور رموز او قاف سے متعلق بڑی دقیق اور قیمتی تحقیقات ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں اور دوران بحث عیسائی مشنریوں' نیچریوں اور مستشرقین کے اعتراضات کے معقول اور مثبت جوابات دیئے گئے ہیں۔ اور باب سوم میں پانچ فصلیں ہیں جن میں کتب سماویہ' عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابیں' تورات و انجیل' کتب ہنود اور پارسیوں کی کتابوں کے بارے میں بڑی علمی اور تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور مقدمے کے خاتمے میں قرآن مجید کی بعض تفاسیر کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تفسیر حقانی میں بھی سلفی طریقے اور اصول اہل سنت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اہل جدت و بدعت کے منہج سے اجتناب کیا گیا ہے۔

(۵) تفسیر ماجدی از مولانا عبد الماجد دریابادیؒ:

مولانا عبد الماجد دریابادی نے انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر لکھی تھی۔ اسی طرز پر انہوں نے اردو میں بھی تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا اور اللہ کی توفیق سے اردو میں بھی تفسیر مکمل کر دی۔ انہوں نے دیباچہ تفسیر میں لکھا ہے کہ میں نے تفسیر لکھتے وقت درج ذیل تفاسیر سے استفادہ کیا ہے۔

تفسیر ابن جریر، تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر قرطبی، معالم التنزیل، تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیضاوی، البحر المحیط، احکام القرآن لابن عربی اور احکام القرآن للجصاص۔ لغات کی کتابوں میں مفردات القرآن، لسان العرب اور تاج العروس سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور اردو تفاسیر میں علامہ ماجدی نے سب سے زیادہ اخذ و استفادہ مولانا تھانوی کی بیان القرآن سے کیا ہے اور ترجمہ تو ۷۵ فی صد بیان القرآن ہی سے نقل کیا ہے۔ مولانا دریابادی کی یہ تفسیر اہل سنت کے اصول تفسیر کے مطابق لکھی گئی ہے اور جدید علوم سے واقف ہونے کے باوجود متجددین کا منہج انہوں نے اختیار نہیں کیا اور یہ مولانا تھانوی اور دوسرے علماء ربانیین کی صحبت کی برکات ہیں ورنہ ان کی پرانی زندگی تو متجددین سے بھی بدتر تھی۔ ہر اہم بات کے لئے عربی کی مستند تفاسیر میں سے کسی نہ کسی کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ آیات کونیہ کی تشریح میں سائنسدانوں کے حوالے دیئے ہیں، مستشرقین، متجددین اور عیسائی مشنریوں کے اعتراضات کے مختصر مگر مدلل جوابات دیتے ہیں۔ اس تفسیر کا پہلا مسودہ سوا تین سال کی مدت میں ۱۸ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء بروز سوموار مکمل ہوا تھا اور اس وقت مصنف کی عمر ۵۱ سال تھی۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو نظر ثانی مکمل ہوئی تھی اور نظر ثالث سے فراغت کی تاریخ ۴ ذوالحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۹۵۰ء بروز اتوار دو بجے دن ہے۔[1] یعنی تفسیر ماجدی کی تسوید، نظر ثانی اور نظر ثالث کی تکمیل میں سوا ۶ سال لگے ہیں۔

---

(۱) خاتمہ تفسیر ماجدی

(۶) تفسیر عثمانی از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ :

اس کو فوائد عثمانی بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کا ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا ہے اور غالباً سورۃ النساء تک مختصر حواشی بھی شیخ الہند کے ہیں اور اس کے بعد کے حواشی شیخ الہند کے شاگرد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھے ہیں۔ یہ ایک مختصر تفسیر ہے جو اردو خوان طبقے کے لئے زیادہ افادیت رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں فنی اصطلاحات اور طویل علمی مباحث کی بجائے آیات کے اصل مفہوم کو مختصر اور مفید حواشی کے ذریعے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن چونکہ علامہ عثمانی تفسیر و حدیث اور دوسرے علوم وفنون میں وسیع و عمیق علم رکھتے تھے، تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا طویل تجربہ رکھتے تھے اور ان کی معلومات میں پختگی اور گہرائیت تھی اس لئے علماء دین اور تفسیر کے اساتذہ بھی اس تفسیر سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ پختہ علم والے عالم کی بات اگر مختصر ہو پھر بھی بڑی وزنی اور قیمتی ہوتی ہے مگر اس وزن اور قیمت کے باوجود میرے دل میں دو مقامات کے حواشی کے بارے میں کافی مدت سے ایک خلش ہے جس کا ذکر میں اس جگہ مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ "اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں" کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ :

"اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت در حقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔"

یہ حاشیہ شاید شیخ الہند کا ہے اور اس کی تاویل و توجیہ بھی کی جاتی ہے اس لئے کہ یہ "سوء اعتقاد" کی بات نہیں ہے بلکہ "سوء تعبیر" ہے اور "کلمہ موہمہ" ہے۔ مگر محشی کی علمی شان کے مناسب نہیں ہے اس لئے کہ واسطہ رحمت اور وسیلہ رحمت مؤمن کا ایمان و عمل بھی ہے، اللہ کے مقبول و محبوب بندوں کی دعا بھی ہے، ان کی صحبت اور ہم نشینی بھی ہے اور ان

کی عقیدت و محبت بھی ہے اور ان سب وسائل و وسائط کے ذریعے اللہ تعالی سے استعانت کرنا تو موجب سعادت ہے لیکن ان کی ذوات کو واسطہ رحمت الہی سمجھ کر انہی سے استعانت ظاہری کی کوئی اطمینان بخش توجیہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی۔ میرے ناقص فہم میں تو حاشیہ اس طرح ہونا چاہئے تھا کہ "غیبی اور مافوق الاسباب" مدد اس کی ذات کے سوا کسی اور سے مانگنا بالکل ناجائز ہے ہاں اگر کسی مقبول بندہ کی دعا' صحبت اور محبت کو واسطہ اور وسیلہ بنا کر اللہ سے استعانت کرے تو یہ جائز ہے۔"

اور دوسرا مقام سورۃ کہف کی آیت ۹۴ میں یاجوج ماجوج پر حاشیہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"میرا خیال ہے (واللہ اعلم) کہ یاجوج ماجوج کی قوم عام انسانوں اور جنات کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہے اور جیسا کہ کعب احبار نے فرمایا اور نووی نے فتاوی میں جمہور علماء سے نقل کیا ہے ان کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے آدم علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے مگر ماں کی طرف سے حضرت حواء تک نہیں پہنچتا گویا وہ عام آدمیوں کے محض باپ شریک بھائی ہوئے۔"

یہ حاشیہ تو یقیناً مولانا شبیر احمد عثمانی کا ہے اور ان کے علم کی گہرائیت اور وسعت کے پیش نظر تعجب اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ الفاظ ان کی قلم سے کیسے نکل گئے؟ کعب الاحبار کی یہ روایت نووی ہی نے نہیں بلکہ بہت سے مفسرین نے نقل کی ہے مگر کعب الاحبار نے یہ قول رسول اللہ ﷺ سے نقل نہیں کیا بلکہ یہ ان کا اپنا قول ہے اور وہ اگرچہ حضرت عمر کے زمانے میں ایمان لا چکے تھے اور تابعی تھے لیکن اصل میں اہل کتاب کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کی روایات بیان کیا کرتے تھے اور بیان کرنے کی اجازت رسول اللہ ﷺ نے دی بھی ہے مگر جب ان کی روایت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی تکذیب لازم ہوتی ہے اور قرآن کہتا ہے کہ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ "اور ہم نے نوح علیہ السلام کی اولاد ہی کو باقی چھوڑا ہے۔" اس

سے معلوم ہوا کہ طوفان نوح کے بعد تمام انسان نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں' تفسیر قرطبی میں ابو ہریرہ سے مروی ایک مرفوع روایت میں بھی آیا ہے کہ یاجوج ماجوج کی قومیں یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ جمہور محدثین کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور کعب الاحبار کی اسرائیلی روایت کی ابن کثیر' قرطبی اور دوسرے مفسرین نے سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ خود ساختہ اور من گھڑت روایت ہے۔

(۷) تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحیؒ :

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ۵ سال تک مولانا فراہی کے زیر تعلیم و تربیت رہے ہیں اور کافی مدت تک مولانا مودودی کے رفیق کار بھی رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین میں شامل رہے ہیں اور جماعت میں قیادت اور راہنمائی کی مناصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ جماعتی اجتماعات اور مجالس میں مولانا مودودی کے ہم نشین رہے ہیں اور سالوں تک مولانا مودودی کے "صاحب سجن" یعنی جیل کے ساتھی بھی رہے ہیں لیکن اپنے آپ کو فکر فراہی کا ترجمان سمجھتے تھے اور اپنی تفسیر کو بھی فکر فراہی کی ترجمان قرار دیتے تھے مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی دونوں کا منہج یہ ہے کہ قرآن کو خود قرآن میں تدبر کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ تدبر فی القرآن کا تو خود اللہ نے حکم دیا ہے اور تفسیر القرآن بالقرآن اصول تفسیر میں سے بنیادی اصول ہے لیکن قرآن میں غور و فکر کے کچھ اصول ہیں جو امت مسلمہ میں تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں جن کی تفصیل اس کتاب کے باب ہشتم میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ مولانا فراہی اور ان کے ترجمان مولانا اصلاحی عربیت کے ماہر تھے اور عربی لغات پر ان کو عبور حاصل تھا لیکن احادیث رسول' آثار صحابہ و تابعین اور امت مسلمہ کے ہزاروں محدثین' مفسرین اور فقہاء کے تدبر و تفقہ کو نظر انداز کر کے یا ان پر صرف ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر خالص اپنی عربی دانی کی بنیاد پر تفسیر کرنا اور اسلاف کے تدبر کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے اور اپنے شیخ کے تدبر پر اعتماد کرنا بہت بڑی خود اعتمادی اور بے احتیاطی ہے جو کبھی

کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ میں مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کو منکرین سنت میں شمار نہیں کرتا سنت رسول کی حجیت کے دونوں قائل تھے اور اس کے اثبات میں انہوں نے دلائل بھی دیئے ہیں لیکن احادیث و آثار کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی اپنی عربی دانی اور اپنے تعقل، اور تفکر کو دیتے تھے جو حدیث ان کے تدبر کے مطابق نہ ہو اور ان کے نزدیک درایتاً نا قابل قبول ہو وہ اگر سند کے اعتبار سے کندن سونا ہو بخاری مسلم کی متفق علیہ ہو اور امت کے فقہاء و محدثین سب نے اسے روایت اور درایت دونوں کے اعتبار سے صحیح قرار دیا ہو پھر بھی یہ مفکرین اسے اپنے ناقدانہ الفاظ کے سحر سے قارئین کے سامنے ایک بے بنیاد بات کے طور پر پیش کر دیتے تھے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ جسے آیت الحرابہ کہا جاتا ہے اس کی تاویل میں آپ مولانا اصلاحی کے منہج کو دیکھ سکتے ہیں اگرچہ مولانا اصلاحی کی بعض تصنیفات بڑی تحقیقی اور علمی مباحث پر مشتمل ہیں اور میں ان کی اس نوع کی تصنیفات اور مقالات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اسی طرح انہوں نے اپنے جماعتی دور میں جو دعوتی اور تحریکی کتابیں لکھی ہیں ان سے آج بھی میں اور جماعت کے دوسرے لوگ استفادہ کرتے ہیں اور ان کی تفسیر بھی افادیت سے بالکل خالی نہیں ہے۔ لغات اور ربط السور والآیات سے متعلق اس میں بڑے اچھے فوائد اور نکات ملتے ہیں لیکن اہل سنت والجماعت کے مسلمہ اصول تفسیر کا خیال نہیں رکھتے تھے اور مولانا فراہی کے تدبر کے مقابلے میں امت کے سینکڑوں ہزاروں مفکرین کے تدبر اور تفکر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

الحمد للہ آج بروز جمعرات ۸ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰ جولائی ۲۰۰۲ء رات ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ پر علوم القرآن کی تکمیل ہوئی۔ اور یہ تکمیل خالص اللہ کی توفیق اور مدد سے ہوئی ہے ورنہ ۷ ماہ سے میں ضیق النفس اور وجع الساقین کی بیماری میں مبتلا ہوں اور ڈاکٹر کے زیر علاج ہوں۔ اس وقت بھی میری پنڈلیوں، بازوؤں اور کمر میں شدید درد ہے اور اسی حالت میں یہ آخری سطور لکھ رہا ہوں۔ والحمدللہ علی کل حال و صلی اللہ تعالی علی سیدنا و نبینا محمد و علی آلہ و اصحابہ و اتباعہ اجمعین۔

مصنف کی دیگر تیار اور زیر طبع کتب

- ☆ تفہیم المسائل (حصہ اول)
- ☆ تفہیم المسائل (حصہ دوم)
- ☆ تفہیم المسائل (حصہ سوم)
- ☆ تفہیم المسائل (حصہ چہارم)
- ☆ تفہیم المسائل (حصہ پنجم)
- ☆ علوم القرآن (حصہ اول)
- ☆ علوم القرآن (حصہ دوم)
- ☆ اسلامی سیاست
- ☆ حقیقت توحید وسنت
- ☆ حرمت سود پر عدالتی بیانات
- ☆ اجتہاد وتقلید اور امام ابوحنیفہ کے فقہی اصول
- ☆ نفاذ شریعت اور اتحاد ملت
- ☆ عورت کی دیت شرعی دلائل کی روشنی میں
- ☆ عورت کی حکمرانی قرآن وسنت کی روشنی میں
- ☆ تصویر سازی اور فوٹو گرافی کی شرعی حیثیت وشبہات کا ازالہ
- ☆ تفہیم المسائل (حصہ ششم) (زیر طبع)

مکتبہ تفہیم القرآن ملاکنڈ روڈ مردان صوبہ سرحد پاکستان

ادارہ تفہیم الاسلام کے

اغراض و مقاصد

ادارہ تفہیم الاسلام جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن کا اہم ترین شعبہ ہے جو افتاء، تصنیف و تالیف اور اجتماعی بحث و تحقیق کا کام کرتا ہے اور جماعتی، گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں سے بالاتر ہو کر حق جوئی، حق پرستی کے اصولوں کو مدنظر رکھتا ہے۔

اس کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں

- جدید حل طلب مسائل کی تنقیح اور ان کے شرعی حکم کی تحقیق۔
- دینی احکام کی جدید عصری طرز میں تدوین وتشریح
- سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے درمیان پہلے سے جو مسائل اختلافی چلے آرہے ہوں ان میں سے دینی اور ملی مصالح کی بنا پر یا دلیل کی قوت کی بنا پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینا۔
- نصوص کی اجماعی تعبیر اور اہلسنّت کی متفقہ رائے کے خلاف متجددین کی تعبیرات و تاویلات پر علمی تنقید کرنا۔
- قومی اور بین الاقوامی طور پر زیر بحث مسائل میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کرنا اور قرآن وسنت کی روشنی میں ان پر تبصرہ کرنا۔
- استفتاءات واستفسارات کے جوابات دینا۔
- عوام کے اندر فہم دین، شعور دین، محبت دین، اور فکر اقامت دین پیدا کرنے کے لیے دعوتی، تبلیغی، تعلیمی اور اصلاحی کام کرنا۔
- نسلی، لسانی، علاقائی، جماعتی وگروہی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے استیصال اور امت مسلمہ کے اتحاد و یکجہتی کیلئے علمی اور دعوتی دونوں میدانوں میں کام کرنا۔